بسلسلۂ جشنِ الماسی
(۱۹۴۷ء۔۲۰۲۲ء)

مکالماتِ افلاطون

(جلد سوم)

مترجم: ڈاکٹر ذاکر حسین
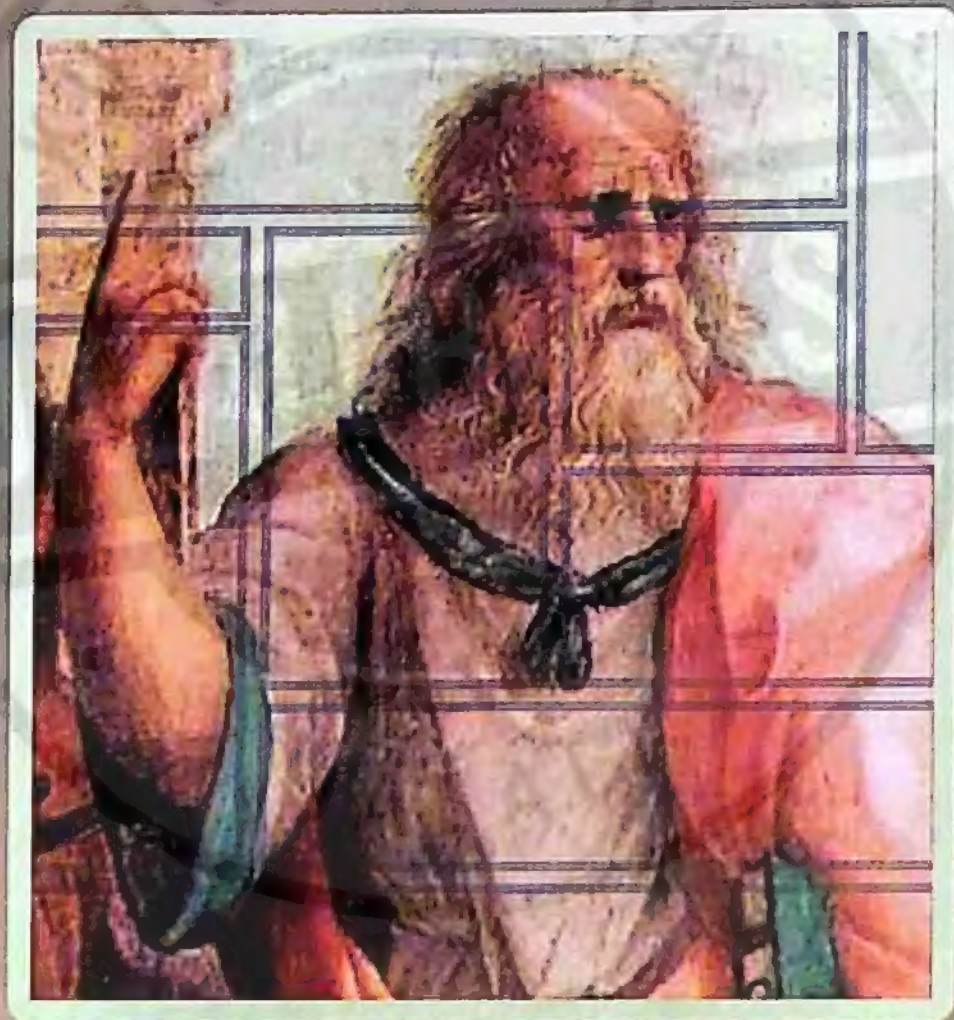
ادارۂ فروغِ قومی زبان

۲۰۲۲ء

مکالماتِ افلاطون

(جمہوریہ)

(جلد سوم)

مترجم

ڈاکٹر ذاکر حسین

ادارۂ فروغِ قومی زبان

۲۰۲۲ء

فہرست

☆☆☆

عرضِ ناشر

افلاطون(Plato) کا شمار ان فلسفیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے نہ صرف قدیم یونان اور مغرب کے فلسفے پر گہرے اثرات مرتب کیے بلکہ اسے ان اہم ترین شخصیات میں بھی شمار کیا جاتا ہے جنھوں نے پوری انسانی تاریخ وتہذیب کو اپنے فکر وفلسفے سے متاثر کیا۔

افلاطون کا زمانہ لگ بھگ ۴۲۷قبلِ مسیح سے ۳۴۷قبلِ مسیح تک بتایا جاتا ہے۔اس کی زندگی کے ابتدائی حالات سے متعلق بہت کم معلومات حاصل ہو سکی ہیں لیکن جن فلسفیوں نے افلاطون کو بہت زیادہ متاثر کیا ان میں خاص طور پر اس کے استاد سقراط(Socrates) نیز فیثا غورث(Pythagoras) کا نام لیا جاتا ہے۔افلاطون کو بعض فلسفیانہ نظریات کے بنیاد گذاروں میں شامل کیا جاتا ہے اور ان فلسفیانہ نظریات میں مذہبیات اور سیاسیات کے علاوہ اخلاقیات، شعر وفنونِ لطیفہ اور بعض دیگر موضوعات بھی شامل ہیں۔

افلاطون کو جدلیات(dialectics) اور مکالمے (dialogue) کا بانی بھی کہا جاتا ہے، لیکن افلاطون سے پہلے بھی کچھ فلسفیوں کے ہاں جدلیات کے تصورات ملتے ہیں۔یہاں تفصیل میں جانا تو ممکن نہیں اور ویسے بھی مارکسی فکر میں جدلیات کی اصطلاح کسی اور مفہوم میں بھی برتی جاتی ہے، لیکن مختصراً عرض ہے کہ افلاطون کے ہاں جدلیات سے مراد ہے:

''مختلف ومتضاد آرا پر بحث کر کے حقیقت کو تلاش کرنے کا فن۔''

یہ مختلف نظریات رکھنے والے افراد کے درمیان ایسی گفتگو ہوتی ہے جس کا مقصد فکری وعلمی سچائی تک پہنچنا ہوتا ہے اور جس میں عقلی دلائل کی بنیاد پر بحث ہوتی ہے۔جدلیات کی اصطلاح بظاہر مباحثے کے مفہوم سے مماثل نظر آتی ہے لیکن اس میں مباحثے کے برعکس جذباتیت، موضوعی باتوں اور لفاظی سے گریز کیا جاتا ہے۔مکالمہ بنیادی طور پر باہمی گفتگو ہوتی ہے لیکن اس میں عقل اور دلائل کی مدد سے تبادلۂ خیال کر کے اپنی بات واضح کی جاتی ہے۔چنانچہ افلاطون کے مکالمات کی زیرِ نظر جلدوں میں کئی مقامات پر قارئین کو شرکائے گفتگو کے باقاعدہ نام اور سوال جواب بھی نظر آئیں گے۔اس گفتگو اور سوال جواب کا مقصد فکری مغالطوں کو دور کر کے حقائق تک رسائی ہے۔

مکالمہ مغربی ادب میں ایک باقاعدہ نثری صنف بھی رہا ہے۔اس کی ابتدا کا سراغ تو سقراط کے ہاں بھی ملتا ہے لیکن افلاطون نے مکالے کو ایک ایسی باقاعدہ فلسفیانہ یا جدلیاتی شکل دی جس میں ایک گفتگو کرنے والا گفتگو میں شامل کچھ دوسرے لوگوں سے بات کرتا ہے، سوالات قائم کرتا ہے اور دلائل، منطق اور عقل کے ذریعے حقیقت یا سچائی تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی کام افلاطون نے اپنے مکالمات میں کیا جو فلسفے کی دنیا میں بہت احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اگرچہ اس کے بعض مباحث سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔

افلاطون کے فلسفے کی اہمیت کے پیش نظر ادارۂ فروغ قومی زبان (سابقہ مقتدرہ قومی زبان) نے افلاطون کے مکالمات کو اپنے ایک اہم منصوبے بعنوان ''سائنسی، تکنیکی و جدید عمومی موادِ مطالعہ کی قومی زبان میں تیاری'' کو شامل کیا اور اس کی چھے (۶) جلدوں کا ترجمہ کروا کے شائع کیا۔تراجم کے سلسلے کی ان چھے جلدوں کے مترجمین کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

پہلی جلد	پروفیسر اے ڈی میکن
دوسری جلد	جناب عبدالحمید اعظمی
تیسری جلد	ڈاکٹر ذاکر حسین
چوتھی جلد	جناب عبدالحمید اعظمی
پانچویں جلد	جناب عارف حسین
چھٹی جلد	جناب عارف حسین

ان تراجم کی تیاری میں خطیر رقم، وقت اور محنت صرف ہوئی ہے اور جن مختلف مترجمین نے ان تراجم میں حصہ لیا ان کا شکریہ واجب ہے۔ادارے کے افسران و کارکنان نے جس محنت سے ان تراجم کے مسودے کو مختلف مراحل سے گزار کر طباعت تک پہنچایا اور اس کی اشاعت کے لیے کاوش کی اس کا اعتراف نہ کرنا ناسپاسی ہوگی۔

ان چھے (۶) جلدوں کے تراجم، طباعت اور اشاعت کا کام محترم پروفیسر فتح محمد ملک اور محترم افتخار عارف کے دور میں ہوا تھا اور باوجود اس کے کہ ان کو خاصی بڑی تعداد میں شائع کیا گیا تھا یہ جلد ہی فروخت ہو گئیں اور ان میں سے بعض جلدوں کو دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے تا کہ یہ اہم فلسفیانہ مباحث مکمل طور پر قارئین کی دست رس میں رہیں۔

——— رؤف پاریکھ

پیش لفظ

وطنِ عزیز میں علم وحکمت اور عقل ودانش کی روایات کوفروغ دینے کی خاطر مقتدرہ قومی زبان کے شعبۂ درسیات نے اپنے نئے ترقیاتی منصوبے "سائنسی، تکنیکی وجدید عمومی موادِ خواندگی کی قومی زبان (اُردو) میں تیاری" میں فلسفہ ونفسیات کے بنیادی تصورات پر مبنی دائمی اہمیت کی کتابوں کے اُردو تراجم کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔"مکالماتِ افلاطون (چھ جلدیں)" اِس سلسلۂ کتب کی پہلی کڑی ہیں۔"مکالمات افلاطون" ایک اعتبار سے دُنیائے انسانیت کومسلمانوں کی عطا ہے۔یہ مسلمان اہلِ علم ہی تھے جنھوں نے پہلے پہل یونانی دانش کوعربی زبان میں منتقل کیا، اُسے ردوقبول کی چھلنی سے گزارا اور اُس پر تحقیقی، تنقیدی اور تجزیاتی کتابیں لکھیں۔مسلمانوں کے یہ علمی کمالات پہلے پہل لاطینی زبان میں اور پھر لاطینی سے مختلف مغربی زبانوں میں منتقل ہوکر مغربی علم ودانش کا سب سے بڑا سرچشمہ بن گئے۔

افلاطون (۴۲۷-۳۴۷ قبل از مسیح) ایتھنز کی اشرافیہ کا ایک نامور فرد تھا۔اِس کا دورِ حیات معاشرتی اور سیاسی بے چینی کا دور تھا۔افلاطون اوّل اوّل سیاسی عزائم کا حامل تھا مگر جب سن ۳۹۹ قبل از مسیح میں عہد کے عظیم ترین مفکر اور اُستاد سقراط کو سزائے موت دی گئی تو افلاطون ایتھنز کو خیرباد کہہ کر مدت تک یہاں وہاں پناہ کی تلاش میں سرگرداں رہا۔وہ یونان، مصر، اٹلی اور سسلی وغیرہ میں مارا مارا پھرتا رہا اور بالآخر ۳۸۷ قبل از مسیح میں اُس نے واپس ایتھنز آکر سائنس اور فلسفہ میں ریسرچ کی خاطر اکادمی قائم کی۔"مکالماتِ افلاطون" اِسی دور کی یادگار ہے۔ترقیاتی منصوبے کے تحت مقتدرہ قومی زبان یونانی دانش کے اِس عظیم شاہکار کی چھ کی چھ جلدوں کو پہلی بار اُردو دُنیا کی نذر کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔اُمید ہے کہ اِن مکالمات کی اشاعت ہمارے ہاں عقل ودانش کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کرے گی۔

یہاں ایک وضاحت ضروری ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کا یہ حسین ترجمہ پہلی بار ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔ترجمہ کی خوبی اور مترجم کی عظمت کے اعتراف میں مقتدرہ اسے جوں کا توں شائع کر رہا ہے۔مکالمات کی تمام جلدوں کے تراجم میں یکسانیت پیدا کرنے کی خاطر فقط املا میں معمولی سا ردوبدل ضروری سمجھا گیا ہے۔

—— پروفیسر فتح محمد ملک

۱

مُقدّمہ

دنیا کے سب سے بڑے مصنف کی سب سے اہم کتاب کو اُردو زبان میں پیش کرتے ہوئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں مترجم سے نہ جانے کتنی جگہ فہمِ مطالب اور اظہارِ معانی میں غلطیاں ہوئی ہوں گی جن کے لیے وہ بہ ادب معذرت خواہ ہے۔ لیکن شاید ان غلطیوں کے باوجود اُردو بولنے، سمجھنے والے اس یونانی فلسفی اور شاعر، عالم اور مصلح کے سالہا سال کی کاوشِ ذہنی کے نتائج سے تھوڑی بہت واقفیت حاصل کر سکیں گے اور یہ بھی کچھ کم نہیں۔ ذیل میں مصنف اور کتاب کے متعلق چند ضروری باتیں لکھی جا رہی ہیں جن سے شاید کتاب کے سمجھنے میں مدد ملے۔

افلاطون کا سالِ ولادت یقینی نہیں، لیکن غالب گمان یہ ہے کہ وہ حضرت مسیح سے ۴۲۷ برس قبل پیدا ہوا۔ اس کا خاندان ''ایتھنز'' (اثینہ) میں بہت ممتاز تھا۔ حسب نسب کے اعتبار سے بھی اور جاہ و دولت کے لحاظ سے بھی۔ دادا نے ارسٹاکلس نام رکھا تھا لیکن بچپن ہی سے اس کی صحت بہت اچھی تھی اور جسم چوڑا چکلا۔ اس لیے ایک اُستاد نے اس رعایت سے اس کا نام ''پلاٹون'' رکھ دیا جس کے معنی چوڑے چکلے کے ہیں۔ اسے ہم نے معرب کر کے فلاطون اور افلاطون کر لیا ہے۔ لڑکپن ہی سے جوش اور ولولے کے ساتھ سمجھ بوجھ کے آثار نمایاں تھے۔ چنانچہ ساری عمر حیاتِ نظری و عملی میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا اور یہ چیز اس کی زندگی کی امتیازی خصوصیت بن گئی۔

یہ جوشیلا، من چلا امیرزادہ، اپنے عہد کی ساری متاعِ علمی سے بہرہ اندوز، فلسفے اور ادب میں ماہر، وقت کے سیاسی ہنگاموں سے متاثر ہوا اور کیوں نہ ہوتا۔ اس کا لڑکپن ہی تھا کہ اہلِ اثینہ نے سسلی کی مہم شروع کی اور شباب شروع ہوتے ہوتے شہر کی قوت کا تقریباً خاتمہ ہی ہو گیا۔ ایک طرف خارجی جنگیں اپنا اثر دکھا رہی تھیں دوسری طرف داخلی مفاسد سر اُٹھا رہے تھے۔ افلاطون شریف متمول خاندان کا نوجوان تھا۔ ادھر عوام نے حکومت پر قبضہ کر رکھا تھا۔ جمہوریت کا دور دورہ تھا۔ اشراف اور امرا محض بے بس تھے۔ یہ نوجوان

دیکھتا تھا کہ جماعتی زندگی کا یہ سب سے دشوار اور سب سے اہم کام ''حکومت'' کرنے کے لیے ہر کس و ناکس، ہر چھوٹا بڑا، ہر اچھا بُرا آمادہ بلکہ کوشاں ہے۔ یہ سمجھتا تھا کہ یہ جمہوری ریاست ایک بے ملاح کی ناؤ ہے، کہاں دیکھیے تھمے۔ پھر صرف جمہوریت کا یہ سیاسی طوفانِ بے تمیزی ہی اس شریف زادے کے لیے سوہانِ روح نہ تھا بلکہ یہ نیک دل منصف مزاج نوجوان جمہوریت کی مادی ترقیوں سے بھی اثر لے رہا تھا۔ یہ دیکھتا تھا کہ عام زندگی میں سکون اور سادگی کی جگہ مسابقت اور تعیش نے لے لی ہے۔ یہ تجارت کے انتظامات دیکھتا اور کاروبار کا فروغ، تجارتی بیڑے اور اچھی اچھی بندرگاہ، مگر انہی بندرگاہوں، انہی تجارتی منڈیوں کی ریل پیل میں ننگے بھوکوں کی بپتا پر بھی اس کی نظر پڑتی۔ تمول کے ساتھ افلاس اور محلوں کے قریب جھونپڑیاں بھی دکھائی دیتیں اور جمہوریت کی سیاسی کمزوریاں ہی نہیں سرمایہ داری کی اجتماعی مضرتیں بھی اس کا دل دُکھاتیں اور اسے سوچنے پر مجبور کرتیں۔

افلاطون ان سب چیزوں کو دیکھتا اور سوچتا، سوچتا اور دیکھتا۔ لیکن اس نے نتائج پر پہنچنے میں عجلت سے کام نہیں لیا۔ شاید اس وجہ سے کہ اس کا عہد یونانی تاریخ کا وہ زمانہ ہے جب جماعتی زندگی نے گویا اپنے معراجِ کمال پر پہنچ کر رُو بہ زوال ہونا شروع ہی کیا تھا اور ان زوال آمادہ اداروں کا بھرم ابھی اچھی طرح کھلا نہ تھا۔ اس لیے آثارِ زوال کا احساس بھی نہ بہت قوی تھا اور نہ بہت واضح۔ ابھی علم اور فن و شاعری اور ناٹک، تعمیرات اور صورت تراشی، غرض ذہنی زندگی کے سارے مظاہر نہایت اچھی شکل میں سامنے موجود تھے۔ کھلی خوبیوں کے سامنے چھپی برائیوں پر نظر پہنچ بھی جائے تو آدمی آسانی سے انھیں درست کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ واقعے کے مقابلے میں خیال اور موجود کے سامنے موہوم کے لیے کوئی عجلت سے آمادۂ عمل کیسے ہو؟ چنانچہ جوانی میں افلاطون نے عملی سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ یہ اثینہ کی علمی صحبتوں سے مستفید ہوتا رہا۔ اسے ادب اور شعر سے شغف تھا اور سنا ہے کہ شعر کہتا بھی تھا مگر ابھی اُس کے ذہن کی گرہ نہیں کھلی تھی، اس کی روح کی کلی نہیں کھلی تھی۔ سیرت کا ہیولیٰ تشکیل کے لیے بے تاب تھا اور ذہنی زندگی اپنے مرکز کی تلاش میں بے قرار۔

انسانی زندگی، ذہنی زندگی یعنی جماعتی زندگی ہے۔ ساری ذہنی زندگی کا خاصہ ہے کہ وہ اجتماع میں یا کم سے کم دوئی سے پیدا ہوتی ہے۔ حیاتِ انفرادی کا پودا جماعت کی نمو بخش فضا ہی میں پرورش پاتا ہے۔ من و تو دونوں یکساں طور پر ذہنی زندگی کے لوازم ہیں۔ بچہ ہی ماں کو ماں بناتا اور اس میں وہ ساری ذہنی خصوصیات

پیدا کر دیتا ہے جو عورت میں محض بحیثیتِ جنس نہیں ہوتیں۔ اور ماں ہی اپنی محبت اور شیفتگی سے بچے کی ذہنی زندگی کو وہ متاعِ گراں مایہ دے سکتی ہے، جس کا بدل دنیا کی اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اچھا اُستاد شاگرد سے اور اچھا شاگرد اُستاد سے، سچا گرو چیلے سے اور سچا چیلا گرو سے، وہ منازلِ ذہنی و روحانی طے کرا دیتا ہے جو اس کے بغیر ناقابلِ تصور ہوتے۔ جس زندگی کے ساز کو کسی دوسری زندگی کا مضراب نہیں چھیڑتا اس کے نغمے خاموش ہی رہتے ہیں۔ جس زندگی کی کلی کو دوسری زندگی کی حیات بخش شبنم نہیں نصیب ہوتی وہ شگفتہ ہونے کی جگہ مرجھا جاتی ہے۔ افلاطون کی زندگی کی کلی اس وقت کھلی جب اس پر اس انوکھے بوڑھے سقراط کی نظرِ بہار اثر پڑی۔

ان دونوں میں شروع سے خیالات و رجحانات کی مطابقت تو یوں تھی کہ افلاطون امرا اور اشراف میں سے تھا۔ اس لیے جمہوری نظامِ حکومت سے چنداں لگاؤ نہ رکھتا بلکہ اس سے متنفر ہی تھا۔ ادھر ایک غریب کا بیٹا، سقراط، خاندانی اثرات سے نہیں بلکہ عقلاً و اعتقاداً جمہوریت کا مخالف تھا۔ جمہوریت کی مخالفت نے اسے طبقۂ اشراف کے نوجوانوں سے جا ملایا۔ ان ہی نوجوانوں میں افلاطون بھی تھا جس کی زندگی کی کایا اس بوڑھے فلسفی کے فیضِ صحبت نے بالکل پلٹ دی۔ روایت ہے کہ اس نے سقراط سے ملنے کے بعد اپنی شاعری کا سارا دفتر سپردِ آتش کر دیا۔ نہ جانے ادبِ عالم کو اس سے کیا ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہوگا۔ مگر شاعری کا کیسا ہی نقصان ہوا ہو انسانیت کو ایک انسان مل گیا، جس کی ذہنی قوت کے ارتعاشات آج تک نوعِ انسانی کی حیاتِ ذہنی و عملی دونوں کے لیے تموج و حرکت کا باعث ہیں۔

حیات بخشی کے اس احسان سے افلاطون نے یوں سبکدوشی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے کہ اپنی اکثر تصانیف میں خود اپنے خیالات کو سقراط کی زبان سے ادا کیا ہے اور اس طرح اپنی فکر کے سارے نتائج کو اپنے اُستاد ہی کی طرف منسوب کیا ہے۔ کہنے والوں نے کہا ہے کہ جہاں تک نظریاتِ عقلی کا تعلق ہے افلاطون کو سقراط سے بہت کم ورثہ ملا ہے، اس لیے کہ سقراط غریب کے پاس مشکل ہی سے کوئی مثبت نظریۂ عقلی تھا۔ بتانے والوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ سقراط میں وہ مذہبیت یکسر مفقود تھی جس میں افلاطون کا سارا تخیل ڈوبا ہوا ہے۔ اس شریف زادے کو مذہبی گداز اپنے خاندان کی روایتوں سے ملا تھا نہ کہ سقراط کے تشکیکی فلسفے سے۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ سقراط کی تعلیم بے ترتیب تھی، افلاطون ایک مکمل نظامِ فلسفہ کا موجد ہے۔ سب صحیح، سب درست۔ لیکن اس قسم کا فرق دیکھنے والے شاید اس حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ سقراط کے فیضِ نظر نے افلاطون کو محض ایک شاعر، محض ایک فلسفی یا مذہبی رسمیت کے دلدادۂ محض بننے سے بچا کر ایک زندگی بخش قوت

بنادیا۔اس کی مردہ رسمی اور خاندانی مذہبیت کو اصلاحِ اجتماعی کے جذبے سے کس نے آشنا کیا؟اس کے وقتی سیاسی رجحانات کو ایک مستقل اخلاقی مطالبہ کس نے بنایا؟اشرافِ اثینہ کے فرقہ وارانہ تعصبات رکھنے والے نوجوان کو کس نے یقین دلایا کہ ہیئتِ اجتماعی کی نجات خود اس کے فرقے سے بھی ممکن نہیں؟اور یہ حقیقت کس نے افلاطون کو ذہن نشین کرائی کہ مصائب وقت اور مفاسدِ زمان سے بچنے کی راہ کسی عارضی اور جزوی تدبیر سے نہیں نکل سکتی بلکہ صرف اس طرح کہ کسی مخصوص گروہ یا طبقے کے اغراض پر ریاست کی بنیاد رکھنے کے بجائے اس کی اساس تعلیم اخلاق پر ہونی چاہیے۔یہ سب کچھ سقراط ہی کا فیض تھا۔ان ہی خیالات سے افلاطون کا دماغ مرتے دم تک معمور رہا اور انہی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ مدت العمر اپنی تصانیف، اپنے درس، اپنے سیاسی اشغال کے ذریعے جان توڑ کوشش کرتا رہا۔اس نے دنیا کے اس سب سے بڑے مصنف میں ایک شانِ اصلاح، اس بے مثل معلم میں شانِ تدبّر اور اس مفکرِ اعظم میں شانِ پیغمبری پیدا کردی۔

☆☆☆

افلاطون کی زندگی کا یہ سب سے اہم معاملہ یعنی سقراط سے اس کا تعلق ۳۹۹ ق۔م میں ختم ہوگیا۔ سقراط کو زہر کا پیالا پینا پڑا اور چونکہ اس کی سزائے موت کے اسباب سیاسی تھے اس لیے اُستاد کی رحلت کے بعد شاگردوں کو بھی اثینہ سے ہجرت کرنی پڑی۔یہ سب کے سب میگارا میں اقلیدس کے ہاں چلے گئے۔انہی میں افلاطون بھی تھا۔اس کے بعد حالات کا تفصیلی پتا نہیں چلتا۔قیاس ہے کہ اثینہ واپس آنے سے پہلے افلاطون نے افریقہ کا سفر کیا۔قیرواں اور مصر میں فلسفے اور ریاضی کی تحصیل کی اور اثینہ واپس پہنچا۔پھر ۳۹۰ ق۔م سے پہلے سسلی اور جنوبی اٹلی کا سفر کیا۔اس سفر میں علمی اغراض کے علاوہ افلاطون کے پیشِ نظر عملی سیاسی مقاصد بھی تھے۔اپنی ریاست کی جمہوریت سے اس کے دل میں جو بیزاری سی پیدا ہوگئی تھی اور اصلاحِ حکومت کے جو نئے نئے منصوبے اس کے ذہن میں پیدا ہوئے تھے وہ اس جوشیلے نوجوان کے لیے دعوتِ عمل کا کام دے رہے تھے۔اپنی ریاست میں اسے مشکل سے کوئی ہمنوا ملتا تھا۔خود اس کے خاندان کے بہت سے لوگ، امرا و اشراف، زمانے کا رنگ دیکھ کر جمہوریت کے قائد بن بیٹھے تھے۔جب اس نے اپنوں میں کوئی ساتھی نہ پایا تو باہر کا رُخ کیا اور یونانی تمدن کے مغربی علاقوں کی راہ لی۔اسے توقع تھی کہ وہاں اپنے سیاسی خیالات کو عملی جامہ پہنانے میں متبعینِ فیثاغورث سے مدد ملے گی۔

یہ جماعت چھٹی صدی ق۔م میں قائم ہوئی تھی۔ آئے دن کے سیاسی تغیرات نے اس جماعت کو کبھی ابھارا، کبھی گرایا۔ اس نے بہت کچھ دھوپ چھاؤں دیکھی۔ ہوتے ہوتے سیاسی اثر میں خاصی کمی بھی ہوگئی۔ لیکن پھر بھی چونکہ ان کا مذہبی اور علمی تسلط برابر بڑھتا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے سیاسی مقاصد کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا اس لیے یہ لاکھ کمزور ہوں ان کا تھوڑا بہت سیاسی اقتدار اب تک باقی تھا۔ ان کے پیشِ نظر بھی اصلاحی مقاصد تھے۔ یہ عوام کی حکومت کو عقل و دانش کے تفوق اور اخلاقی تعلیم اور مذہبی عقائد کے اثر سے بدلنا چاہتے تھے اور جمہور کے مقابلے میں ہمیشہ طبقہ امرا کی طرفداری کرتے تھے۔ اس سیاسی مسلک کے باعث نیز ان علمی اور مذہبی خیالات کی وجہ سے افلاطون کو ان سے لگاؤ پیدا ہوا اور اس نے سوچا کہ سرا کیوز میں اس کے لیے عملی کام کا اچھا موقع ہے۔

اس شہر میں عرصہ سے ایک مطلق العنان حکمران ڈائیونائیسس کی حکومت تھی۔ سیاستِ خارجی میں اس نے کارتھیج اور یونانی ریاستوں سے اپنا معاملہ استوار کر لیا تھا۔ اندرونِ ملک میں مختلف فرقوں کے باہمی نفاق سے فائدہ اُٹھا کر اس نے اپنا اقتدار خوب جما لیا تھا اور اپنے دربار کو علم دوستی اور فن پروری سے چار چاند لگا چکا تھا۔ درباریوں میں طبقہ اشراف کا سرگروہ اور خود اس کا بہنوئی دیون بھی تھا۔ جس کا فیثا غورثی جماعت سے تعلق تھا۔ چنانچہ اس واسطے سے افلاطون کی دربار میں رسائی ہوئی۔ پہلے بہت کچھ آؤ بھگت کی گئی۔ افلاطون نے بادشاہ پر اپنے خیالات کا بہت کچھ اثر بھی ڈالا۔ مگر دربار کی سازشوں نے زیادہ دن تک یہ حالت قائم نہ رہنے دی۔ انجام کار وہ دربار کی اشراف پارٹی کی سازشوں میں شرکت کے الزام پر قید کیا گیا اور پھر غلام کی حیثیت سے بیچ دیا گیا۔ شاہی بے رخی کے بعد کسی تیروانی فلسفی کی علم دوستی اس کے کام آئی کہ اس نے اس قیمتی غلام کو خرید کر آزاد کر دیا۔

عملی سیاست میں افلاطون کی یہ پہلی کوشش ناکام رہی اور جب یہ کوئی ۳۸۸ ق۔م میں اثینہ لوٹا تو غالباً یہ تہیہ کر کے کہ عملی سیاست کو خیرباد کہے اور اپنے جماعتی و سیاسی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے درس اور علمی تحقیق سے کام لے۔ چنانچہ اس نے اپنی مشہور تعلیم گاہ ''اکادمی'' قائم کی۔ اس کے اکھاڑے اور عمارتوں کے لیے زمین غالباً اس نے خود اپنے روپے سے خریدی۔ کچھ مدد دوستوں نے دی اور اس طرح یہ سب سے قدیم یونیورسٹی وجود میں آئی۔ تعلیم کا کوئی مالی معاوضہ یہاں نہ لیا جاتا تھا۔ ہاں کبھی کوئی طالب علم، کبھی کوئی ہمدرد، روپیہ یا جائیداد وقف کر دیتا، اس سے رفتہ رفتہ اکادمی کے پاس خاصی جائیداد ہوگئی۔ کتب خانہ بھی اسی طرح عطیوں

سے بنا۔ جیتے جی افلاطون ہی اس علمی جماعت کا صدر رہا۔ اس کے بعد سابق صدر کی وصیت کے مطابق اراکین میں سے ایک شخص صدر بنایا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ کوئی ۹۰۰ سال تک چلتا رہا حتی کہ ۵۲۹ء میں شہنشاہ جسٹی نین نے اسے ختم کر دیا۔ مرتے دم تک اس اکادمی میں درس و تدریس ہی افلاطون کا مخصوص شغل رہا۔ شادی اس نے نہیں کی۔ اس لیے اس کا یہ مدرسہ ہی گویا اس کا خاندان تھا۔ سیاسی زندگی میں شرکت کے ولولے نے بھی یہی شکل اختیار کی کہ اس کے وقتی ہنگاموں سے الگ رہ کر آنے والی نسل کو اس تعمیر نو کے لیے تیار کرے۔

لیکن اس کے دل میں سیاسی اصلاح کے جذبے کی قوت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ساٹھ برس کی عمر میں جب علمی مشاغل کی پُرسکون فضا میں ایک مدت گزر چکی ہے اسے (۳۶۸ ق۔م میں) خبر ملتی ہے کہ ڈائیونائیسس کی وفات کے بعد تخت و تاج اس کے بیٹے کو ملا اور اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ تمام سسلی اور جنوبی اٹلی میں فیثا غورثی جماعت کا اثر از سر نو بڑھ گیا ہے تو یہ بے چین ہو جاتا ہے اور جہاں اسے دعوت پہنچتی ہے کہ آ کر اپنے مشورے سے سیاسی تشکیل میں مدد دے، تو اس سے نہیں رہا جاتا اور یہ پیرانہ سال معلم چل کھڑا ہوتا ہے۔ وہاں پہنچ کر نوجوان حکمران کے مزاج میں خاصا دخل بھی پا لیتا ہے۔ لیکن کچھ دن بعد اس کی سیاسی جماعت کے سرگروہ دیون کو بادشاہ جلاوطن کرتا ہے تو ناچار افلاطون بھی اثینہ واپس چلا آتا ہے۔ دیون بھی اس کے ساتھ ہی اثینہ آتا ہے اور ان کے ہمراہ فیثا غورثی جماعت کے اور بہت سے لوگ آ کر اکادمی میں شریک ہوتے ہیں۔ لیکن سیاسی دلچسپی اب بھی ختم نہیں ہوتی۔ ۳۶۳ ق۔م میں افلاطون ایک مرتبہ اور سسلی کا سفر کرتا ہے تاکہ اپنے اثر سے دیون اور بادشاہ میں مصالحت کرا دے۔ اس مرتبہ بھی پہلے تو خوب خاطر مدارات ہوتی ہے لیکن آگے چل کر سیاسی اختلافات خطرناک صورت اختیار کر لیتے ہیں اور حکومت ٹارنٹ کی مداخلت سے جو فیثا غورثی جماعت کے زیر اثر تھی افلاطون کی جان بچتی ہے۔

عملی سیاست سے دل برداشتہ ہونے کے لیے اتنی پیہم ناکامیوں اور مایوسیوں کی ضرورت تھی! اس کے بعد افلاطون نے کبھی عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا اور آخر عمر تک اکادمی میں پڑھانے اور لکھنے کے کام میں مشغول رہا اور جب وہ وقت آیا جو سب کے لیے آتا ہے تو عقیدت مند شاگردوں اور ہونہار نوجوانوں کے حلقے میں جان دی۔ سال وفات ۳۴۷ ق۔م بتایا جاتا ہے۔

☆☆☆

اس عظیم الشان شخصیت کی عملی ناکامیوں کی داستان کیسی عبرت انگیز ہے اور اس کا حال کو بدلنے میں ناکام رہ کر درس و تصنیف سے مستقبل کو متاثر کرنے کا تہیہ کس قدر سبق آموز۔ تاریخِ عالم ایسی بہت کم شخصیتوں سے آشنا ہے جن میں خیال اور فکر کے مراتبِ اعلیٰ غیر معمولی عملی صلاحیتوں سے توام ہوں۔ افلاطون بھی ان بڑے انسانوں میں تھا جن کے دل میں تشکیلِ نو کی آگ بھری ہوتی ہے۔ جن کا ذہن اس تشکیل کے مفصل سے مفصل نقشے بنا سکتا ہے۔ مگر انھیں عملی دنیا کی قوتیں ارزانی نہیں ہوتیں۔ چنانچہ اس صفِ اوّل کے مفکرِ سیاسی کو بھی تدبیرِ سیاسی کا موقع نہیں ملتا۔ اور یہ ناچار امروز سے آنکھیں بند کر کے فردا سے لَو لگاتا ہے اور عملی وقتی و آنی کے بجائے اپنی تصانیف کے ذریعے اس عمل جاری کی طرح ڈالتا ہے جس کے اثرات آج تک دنیا سے فکر اور دنیائے عمل میں محسوس ہوتے ہیں اور نہ جانے کب تک محسوس ہوتے رہیں گے۔

افلاطون کی نظر چونکہ مستقبل پر تھی اس لیے اس نے اپنے تعلیمی کام کو درس ہی تک محدود نہ رکھا۔ ہر چند اس کی زندگی کا بڑا حصہ اس شغل میں صرف ہوا لیکن اس درس کے نتائج اس نے آنے والی نسلوں کے لیے اپنی متعدد تصانیف میں چھوڑے ہیں اور اس کا درس ہمارے لیے اس شان سے محفوظ ہے کہ کتابوں کو پڑھتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود افلاطون کے حلقۂ تلمذ میں جا بیٹھے۔ مصنف کی حیثیت سے افلاطون کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ ایک شاعرانہ تخیل رکھنے والے معلم کی کاوشِ ذہنی و ادبی کا نتیجہ ہیں جن میں سیاسی اور مذہبی مقاصد اور علمی افکار کا ایک زندہ مرقع ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ دنیا کی تاریخِ ادبی میں مشکل ہی سے یہ بات کہیں اور اس درجہ کمال پر مل سکے گی۔ افلاطون کی کتابیں ایک طرف تو مجددانہ مقالات ہیں جن میں ایک نئے تصورِ حیات، ایک جدید دستورِ زندگی کی شروع سے آخر تک حمایت کی گئی ہے۔ دوسری طرف وہ نہایت بلند پایہ علمی تحقیق کی شان رکھتی ہیں اور پھر اپنے شاعرانہ حُسن اور ادبی کمال کی وجہ سے بے مثل ہیں۔ سچ یہ ہے کہ تصنیف کے میدان میں افلاطون کو وہ مرتبہ ملا جو اور کسی کو حاصل نہیں۔ بقول ونڈل بانڈ ''اس کی شخصیت کے نظری اور علمی پہلو دونوں آ کر جمالیاتی کمال میں مل گئے ہیں۔ مصلح اور مفکر کا تضاد آرٹسٹ کی ذات میں غائب ہو گیا ہے''۔ افلاطون کا یہ جرمن سوانح نگار ایک اور جگہ کیا خوب لکھتا ہے کہ ''اکثر فلسفیوں مثلاً ارسطو، اسپنوزا، ہیوم، کانٹ، ہیگل کو ہم ان کے علمی تعمق کی داد دیتے ہیں۔ بعض مثلاً فشٹے، کونت کے یہاں اس علمی گہرائی کے ساتھ ایک پیغمبرانہ شان سی نظر آتی ہے اور اوروں میں مثلاً دیکارت، شیلنگ، شوپن ہاور کے یہاں اس کے ساتھ حسنِ بیان کی آمیزش ہے لیکن یہ تینوں چیزیں ایک جگہ اگر ملتی ہیں تو بس افلاطون کی

تصانیف میں"۔ اس خوبی کا کمال افلاطون کو اپنی آخری تصانیف خصوصاً "ریاست" میں حاصل ہوا ہے۔

یہ کتاب جو افلاطون کے شجرِ علم کا پختہ ثمر ہے ہم تک دو ناموں سے پہنچی: "جمہوریہ" (ریاست) اور "تحقیقِ عدل"۔ ان ناموں سے یہ سمجھ لینا کہ یہ سیاست یا قانون پر ایک تصنیف ہے غلط ہوگا۔ سچ یہ ہے کہ اس میں انسان کی پوری زندگی پر نظر ڈالی گئی۔ البتہ زیادہ توجہ انسانی زندگی کے عملی پہلو پر ہے۔ اس لیے کتاب کا زیادہ حصہ اخلاقی اور سیاسی مسائل سے پُر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ نہیں ہے کہ فکر و خیال کی دنیا کو یک قلم نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ فلسفہ کی بلندیاں دیکھنی ہوں تو عین خیر میں، سب چیزوں کے اتحاد کا جلوہ بھی اس کتاب میں دکھائی دیتا ہے۔ اخلاق کا سبق لینا ہو تو اس میں روحِ انسانی کے محاسن کی گہری اور لطیف تحقیق موجود ہے۔ تعلیم کے مسائل پر روشنی درکار ہو تو بقول روسو "فنِ تعلیم پر آج تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں یہ سب سے بہتر ہے"۔ سیاسی زندگی میں رہنمائی کے لیے یہ ایک جدید ہیئتِ اجتماعی اور اس کے اداروں کی جیتی جاگتی تصویر لا کر کھڑی کر دیتی ہے اور انسانی جماعتوں کے تغیر، عروج و زوال کے اسرارِ سربستہ کی کنجی کی تلاش ہو تو فلسفۂ تاریخ کے یہ مشکل مسائل بھی اس میں پانی کر دیے گئے ہیں۔

اس سے شاید یہ خیال پیدا ہو کہ مختلف مسائل کا ایک کتاب میں اس طرح جمع ہو جانا اس وجہ سے ہے کہ قدما کے یہاں علوم کی تقسیم کچھ بہت واضح نہ تھی۔ یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ "ریاست" کی تیاری میں افلاطون نے دس سال سے زیادہ صرف کیے۔ شاید مختلف وقتوں میں لکھے ہوئے رسائل کو یکجا کر دیا ہو اور جوڑ پیوند لگا کر ان میں تسلسل قائم کیا ہو۔ لیکن یہ خیالات صحیح نہیں۔ افلاطون نے ان مختلف مسائل پر اپنے مرکزی مسئلے کی خاطر مجبوراً بحث کی ہے اور اس کا مرکزی مسئلہ یہ ہے کہ آدمی اچھا آدمی کیسے بنے۔ اس سوال کا جواب دینے کے لیے اجتماعیات کے اس مرکزی مسئلے کا حل ضروری ہے کہ فرد اور جماعت میں تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ افلاطون کے نزدیک انسان محض انفرادی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اپنی تمام صلاحیتوں کو درجۂ کمال تک پہنچانے کے لیے کسی جماعت، کسی ریاست کی رکنیت کا محتاج ہوتا ہے۔ اچھا آدمی اچھی ریاست ہی میں پیدا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اپنے اصل سوال کے جواب کی خاطر افلاطون کو اچھی ریاست کا خاکہ بنانا پڑا اور فلسفۂ اخلاق کا مسئلہ ریاست کا مسئلہ بن گیا اور اس سیاسی مسئلے پر بحث میں افلاطون کو معاصرانہ سیاست کے خلاف جہاد بالقلم کا موقع بھی ملا۔

افلاطون کے زمانے میں اقتدار سیاسی شخصی آرزوؤں کو پورا کرنے کا وسیلہ بن گیا تھا۔انفرادیت کا بھوت سب کے سر پر سوار تھا اور افلاطون فرد کو جسمِ اجتماعی کا ایک عضو مانتا تھا۔اس لیے اس نے اس اخلاقی صفت پر بحث کی جس کی وجہ سے آدمی ہوائے نفس کا بندہ بن جانے کے بجائے ضبطِ نفس سے کام لیتا ہے اور جماعت کی فلاح کے لیے بس ایک کام اختیار کر لیتا ہے یعنی اپنے وظیفۂ اصلی کو پورا کرتا ہے۔اس انفرادیت کے بجائے جو جمہوریت کے پردے میں پھیلی ہوئی تھی۔افلاطون اجتماعی تعاون کا پیام دیتا ہے اور اس کی تکمیل کے لیے تخصیصِ کار کا اصول پیش کرتا ہے تا کہ ہر فرد اور ہر طبقہ اپنے فرضِ مفوضہ کو قناعت اور خوش دلی سے انجام دیتا رہے۔اپنا ''دھرم'' پورا کرتا رہے کہ افلاطون کی نظر میں یہی اجتماعی زندگی کا سچا اُصول یعنی عدل ہے۔اسی وجہ سے ''جمہوریہ'' (ریاست) کا دوسرا نام ''تحقیقِ عدل'' بھی ہے۔

اس تخصیصِ کار کو کامیاب بنانے کے لیے لازمی ہے کہ ہر فرد اور ہر طبقے کو اس کے وظائفِ مخصوص کے لیے تیار کرنے کا انتظام کیا جائے۔یہ تعلیم کا کام ہے۔چنانچہ افلاطون اس کتاب میں تعلیم کا نہایت مفصل نظام پیش کرتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ''جمہوریہ'' (ریاست) دراصل تعلیمات پر ایک مقالہ ہے۔پھر حکمران کی تعلیمِ اعلیٰ کے سلسلے میں علمِ مطلق یعنی مابعد الطبیعات کی فلسفیانہ بحثیں آجاتی ہیں۔اس نظامِ تعلیم کی تفصیلی بحث کے بعد افلاطون محسوس کرتا ہے کہ اسے کامیابی کے ساتھ عمل میں لانے اور مستقل بنانے کے لیے اجتماعی زندگی کے بہت سے اداروں کو بدلنا ضروری ہے۔چنانچہ معیشت کا ایک اشتراکی نظام تجویز کر کے گمراہیوں کا سدّباب کرتا ہے۔ہم ذیل میں کتاب کے ان تین اہم مباحث کا خلاصہ ناظرین کی سہولت کے لیے پیش کرتے ہیں۔یعنی (۱) ماہیتِ عدل (۲) نظامِ تعلیم (۳) نظامِ معیشت۔

(۱). ماہیتِ عدل:

ریاست میں عدل کے رائج الوقت نظریات نہایت خوبی سے پیش کیے گئے ہیں اور ان پر بحث کر کے مخصوص سقراطی انداز میں انھیں رد کیا گیا ہے۔سب سے پہلے عدل کا روایتی نظریہ کیفیلس کی زبان سے پیش ہوتا ہے کہ عدل قرض ادا کرنے یا ماوجب کو پورا کرنے کا نام ہے۔اثنائے گفتگو میں ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ عدل کوئی مہارت یا ہنر ہے جس سے دوستوں کو نفع اور دشمنوں کو نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔افلاطون یہ جتا دیتا ہے کہ عدل کوئی ہنرمندی یا مہارت نہیں بلکہ روح کی ایک صفت اور ذہن کی ایک عادت ہے جس کا حامل بس

ایک ہی طریقہ پر عمل پیرا ہو سکتا ہے اور وہ طریقہ ہرگز ایسا نہیں ہوتا جس سے کسی کو چاہے دوست ہو چاہے دشمن نقصان پہنچے یا اس کی ذات میں کسی طرح کا زوال یا انحطاط پیدا ہو۔

کیفیلس اور اس کے بیٹے کے بعد مشہور سوفسطائی تھریسی میکس اس روایتی تصورِ عدل کے مقابلے میں انقلابی اور تنقیدی نظریہ پیش کرتا ہے۔ یہ عدل کو قوی تر فریق کے اغراض سے تعبیر کرتا ہے یعنی جس کی لاٹھی اُس کی بھینس کا اُصول نہایت بے باکی اور دیدہ دلیری سے پیش کرتا ہے۔ یہ صاف صاف کہتا ہے کہ ریاست میں حکمران کے اغراض کی پابندی عدل ہے یعنی قوی کے لیے اپنی غرض اور کمزور کے لیے دوسرے کی غرض پورا کرنے کا نام عدل ہے۔ عدل کا یہ نظریہ انفرادیت کی حد ہے جس کے جواب میں افلاطون اس موقع پر اپنا نظریۂ جماعت پیش نہیں کرتا کہ افراد اور گروہ کے جدا جدا بے تعلق و بے ربط اغراض ہوتے ہی نہیں بلکہ ہر ایک کی غایت یہ ہے کہ کُل کی بھلائی کے لیے اپنے اپنے وظائفِ مخصوص کو پورا کرے۔ یہاں تو وہ صرف اپنی بے پناہ سقراطی جرح سے اس نظریۂ انفرادی کو ختم کر دیتا ہے اور یہ ثابت کر دیتا ہے کہ اگر حکومت کوئی فن ہے تو ہر فن کی طرح اس کا مقصد بھی اپنے موضوع کے نقائص کو رفع کرنا ہوگا اور حکمران کے لیے، اگر وہ سچا حکمران ہے، بے غرض اور محکوموں کے مفاد کا ضامن ہونا لازمی ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ تھریسی میکس سے رفتہ رفتہ یہ بھی منوالیتا ہے کہ عادل شخص ظالم سے زیادہ دانشمند، زیادہ قوی، اور زیادہ خوشحال ہوتا ہے۔ زیادہ دانشمند اس لیے کہ وہ ہر ایک سے جا و بے جا مقابلہ اور مسابقت میں وقت ضائع نہیں کرتا۔ اس کا مقصد خوبی و کمال حاصل کرنا ہے نہ کہ کسی دوسرے سے بڑھ جانا۔ زیادہ قوی اس لیے کہ غیر عادل ظالم لوگوں کے کسی گروہ کو بھی قوت حاصل کرنی ہو تو وہ ایک دوسرے سے عدل و انصاف ہی سے پیش آنے پر مجبور ہوتے ہیں، ورنہ ساری قوت منتشر ہو جاتی ہے۔ زیادہ خوشحال یوں کہ ہر چیز کا ایک مخصوص وظیفہ ہوتا ہے جسے بس وہی انجام دے سکتی ہے اور کوئی دوسری چیز اس سے خوبی سے ادا نہیں کر سکتی۔ ہر چیز کا کمال یہی ہے کہ وہ اپنے مخصوص وظیفے کو باحسن وجوہ پورا کرے۔ جس طرح آنکھ کا کمال اچھی طرح دیکھنا اور کان کا کمال اچھی طرح سننا ہے اسی طرح انسانی روح کا مخصوص کمال اچھی زندگی ''حیاتِ طیبہ'' ہے۔ روح عدل سے محروم ہو کر جو اس کی مخصوص خوبی ہے یہ حیاتِ طیبہ حاصل نہیں کر سکتی اور اس کے بغیر اسے حقیقی مسرت و خوش حالی نصیب نہیں ہوتی۔

افلاطون کے سقراط نے تھریسی میکس کو چُپ تو کرا دیا، لیکن حاضرین کے دل سے یہ خیال جو بہت عام خیال ہے نہیں ہٹا کہ عدل اچھی چیز سہی مگر ایک غیر فطری سی چیز ہے اور آدمی اس پر بس اس لیے عمل کرتا ہے

کہ رسم و رواج نے اس پر عمل کرنا سکھایا ہے اور رسم و رواج ہی اس کی پابندی پر مجبور کرتے ہیں۔ چنانچہ جو تیسرا نظریۂ عدل اس بحث کے سلسلے میں سامنے آتا ہے وہ یہی ہے کہ عدل ایک مصنوعی رسمی چیز ہے۔ آدمی جب قدرتی حالت میں رہتا تھا تو بس بھر ظلم کرتا تھا اور سکت بھر ظلم سہتا تھا۔ لیکن بہت سے افراد کے لیے یہ صورت حال ناقابل برداشت ہوگئی۔ ظلم سہنا زیادہ پڑا اور ظلم کرنے کے مواقع اتنے نہ ملے تو آدمیوں نے باہم معاہدہ کرلیا کہ نہ ظلم کریں گے نہ ظلم سہیں گے۔ اس معاہدے کو قانون کی شکل دے کر کچھ معیارِ عمل مقرر کردیے۔ رفتہ رفتہ اس قانون کے اثر سے انسانی فطرت اپنی اصلی جبلت سے ہٹ کر ظلم سہنے کے ڈر سے عدل کی خوگر ہوگئی۔ یوں عدل گویا خوف کا آفریدہ ہے یا یوں کہیے کہ بہترین حالت یعنی ظلم کرسکنے اور بدترین حالت یعنی ظلم سہنے پر مجبور ہونے کے درمیان ایک مصالحت کی صورت ہے۔ اگر تھریسی میکس کے نزدیک عدل قوی فریق کے مفاد کا نام تھا تو یہاں عدل سے مراد کمزور کی ضرورت ہے۔

گفتگو میں اس نقطے پر پہنچ کر افلاطون کو محسوس ہوتا ہے کہ عدل کے جتنے نظریے پیش کیے جاتے ہیں ان میں یہ بات مشترک ہے کہ سب کے سب عدل کو کوئی خارجی چیز سمجھتے ہیں اور افلاطون اسے ثابت کرنا چاہتا ہے، روح کی ایک ذاتی داخلی صفت، اس لیے اب وہ منطقی استدلال اور جرح کو چھوڑ کر نفسیاتی تحلیل سے کام لیتا ہے۔ لیکن فوراً انسانی نفس (انفرادی) کی تحلیل شروع نہیں کرتا بلکہ بالکل نئی راہ اختیار کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ اگر کسی کتاب کے دو نسخے ہوں ایک بہت جلی لکھا ہوا، دوسرا خفی، تو جلی تحریر کے پڑھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اسی طرح کتابِ عدل کے بھی دو نسخے ہیں۔ جلی نسخہ تو اجتماعی زندگی میں ملتا ہے اور خفی حیاتِ انفرادی میں۔ پہلے میں یعنی ریاست میں اس کا دیکھنا اور پہچاننا زیادہ سہل ہے۔ اور اگر یہ ریاست ابھی بن رہی ہو اور اجتماعی زندگی کا ہیولیٰ پہلی مرتبہ متعین سیاسی شکل اختیار کر رہا ہو تو اس وقت عدل کا جلوہ موجودہ تاریخی ریاستوں کی عارضی آلودگیوں سے پاک نظر کے سامنے آجائے گا۔ چنانچہ افلاطون خیال میں ایک ریاست کی بنیاد رکھتا ہے اور اسی طرح عدل کی تلاش میں ایک ریاست کا دستور مرتب ہو جاتا ہے۔

دستورِ ریاست کی ترتیب میں انفرادی نفسیات کی فیثاغورثی تقسیم سہ گانہ افلاطون کے پیشِ نظر رہی ہے۔ جس طرح انسانی روح تین عناصر سے مرکب ہے یعنی عنصرِ اشتہائی، عنصرِ جری اور عنصرِ عقلی، اسی طرح ریاست بھی تین طبقوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ افلاطون سب سے پست عنصر یعنی عنصرِ اشتہائی سے شروع کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ انسانی احتیاجات اور ضروریات کی نوعیت اسے باہمی تعاون پر مجبور کرتی ہے۔ ابتدا ہی سے اس

معاشی نظام میں تخصیصِ کار اور تقسیمِ عمل نظر آتی ہے۔ پھر انسان اپنی ضروری احتیاجات کی تسکین پر قانع نہیں ہوتا۔ نفیس اور لطیف چیزیں بھی مانگتا ہے۔ نقاشی، شعر، موسیقی سب اس کی ضرورتیں بن جاتے ہیں اور ان کی فراہمی کے لیے خاصی بڑی آبادی درکار ہوتی ہے اور اس آبادی کے لیے خاصا رقبۂ زمین۔ اس رقبے کے حاصل کرنے اور اسے محفوظ رکھنے کے لیے جنگ ریاست کے وظائف میں شامل ہو جاتی ہے اور اس طرح نفسِ اجتماعی کا عنصرِ جری منظم ہو کر ریاست میں فوجی طبقے کی صورت اختیار کرتا ہے جو ظاہر ہے کہ پیشہ ور سپاہیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جوتے گانٹھنے اور کپڑے سینے کے کام کو تو اتنا اہم سمجھا جائے کہ ایک آدمی ساری عمر بس یہی کرے، اور کچھ نہ کرے۔ لیکن ریاست کی حفاظت کا اہم تر کام ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جائے جنھیں اس کے انجام دینے کی خاص تعلیم نہ دی گئی ہو۔ یہ کام سپاہیوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے، جن کا یہی پیشہ ہو اور کچھ اور نہ ہو۔ جن اشخاص میں عنصرِ جری زیادہ نمایاں ہو انھیں اس کام کے لیے منتخب کرنا اور انھیں یہ کام خاص اہتمام سے سکھانا چاہیے۔ لیکن ان محافظوں میں صرف عنصرِ جری کا ہونا کافی نہیں۔ ان کی مثال محافظ کتوں کی سی ہے جو گھر کے لوگوں سے تو نہیں بولتے لیکن اجنبیوں پر جھپٹتے ہیں۔ یہ محافظ کتے جنھیں جانتے ہیں ان سے محبت کرتے ہیں اور جن کو نہیں جانتے ان سے نفرت۔ یعنی ان کے نزدیک دوست دشمن میں وجہ امتیاز علم یا عنصرِ عقلی ہے۔ لہٰذا ریاست کے جنگی طبقے میں بھی یہ عنصرِ عقلی ضرور موجود ہونا چاہیے۔ پھر اگر عام محافظوں میں اس عنصرِ عقلی کا وجود ضروری ہے تو کامل محافظ یا حکمران میں تو یہ بدرجۂ اتم موجود ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس کامل محافظ کے تصور کے ساتھ افلاطون تیسرے عنصر کو پوری طرح ریاست میں داخل کرتا ہے اور محافظوں کی دو قسمیں کر دیتا ہے یعنی فوجی محافظ جنھیں بعد میں "مددگار" کا لقب دیا گیا ہے، اور فلسفی محافظ جن کی خصوصیتِ امتیازی عنصرِ عقلی کا کمال ہے اور حقیقی معنوں میں یہی ریاست کے حکمران یا فلسفی بادشاہ ہیں۔

غرض ان تین طبقوں کی ایک ریاست بنا کر افلاطون اس میں عدل کی تلاش کرتا ہے کہ یہی اس [illegible] کی وجہ تھی۔ یہ ریاست کے چار محاسن قرار دیتا ہے یعنی حکمت، شجاعت، عفت اور عدل۔ پہلے تین محاسن [illegible] تین طبقوں کے وظیفۂ خاص سے تعبیر کر کے یعنی حکمت کو حکمرانوں کا کمال بتا کر، شجاعت کو مددگار [illegible] اور عفت یا ضبطِ نفس کو دولت آفریں طبقے کا، وہ عدل کے متعلق سوال کرتا ہے کہ آخر یہ کس طبقے کا مخصوص جوہر ہے اور جواب دیتا ہے کہ عدل کسی مخصوص جزو کا جوہر نہیں بلکہ کُل کا جوہر ہے اور اس سے مراد یہ

ہے کہ ہر طبقہ اور ہر فرد اپنے مخصوص وظیفے کو بخوشی انجام دے اور دوسرے کے کام میں دخل نہ دے۔ محافظ کا عدل یہ ہے کہ وہ حکمت کی روشنی میں ریاست کے لیے مقاصد متعین کرے اور اس کے وسائل تجویز کر کے ریاست سے ان پر عمل کرائے۔ مددگار محافظ کا عدل یہ ہے کہ وہ شجاعت و جرأت سے ریاست کی حفاظت کرے۔ دولت آفریں گروہ کا عدل یہ ہے کہ وہ معاشی زندگی کے کل پرزوں کو اعتدال کے ساتھ چلاتا رہے اور چونکہ کسی طبقے یا کسی فرد میں اس وقت تک اپنا مخصوص جوہر پیدا نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنا مفوضہ کام پورے انہماک سے انجام نہ دے اس لیے عدل تمام محاسنِ اخلاق کی شرطِ اوّل ہے۔

''جمہوریہ'' (ریاست) کے نسخۂ جلی میں عدل کی یہ ماہیت معلوم کر کے افلاطون اس کو نفسِ انفرادی پر منطبق کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اگر ریاست میں عدل مختلف طبقوں کے اپنے اپنے فرائض کو انجام دینے کا نام ہے تو انفرادی زندگی میں یہ اس سے عبارت ہے کہ روح کے اجزائے ثلاثہ اپنا اپنا کام انجام دیں اور عقل، جذبات اور شہوات اپنی اپنی حدود میں کارفرما ہوں اور شخصی زندگی ان میں مناسب ہم آہنگی اور توازن پیدا کرے۔

(۲) نظامِ تعلیم:

اگر عدل کی ماہیت وہی ہے جو افلاطون نے بتائی ہے تو ظاہر ہے کہ جماعت کے اہم ترین فرائض میں سے تعلیم ہے جو مختلف طبقوں کے لوگوں کو اپنے مخصوص وظائف کے پورا کرنے کے قابل بنا سکے۔ چنانچہ افلاطون نے کتاب ''جمہوریہ'' کا معتدبہ حصہ ایک نظامِ تعلیم کے بیان میں صرف کیا ہے۔

افلاطون سے پہلے بھی عام طور پر یونانیوں میں جمہوریہ کو ایک اخلاقی جمعیت مانا جاتا تھا۔ یعنی ایسی جمعیت جو ایک مشترکہ روحانی و اخلاقی متاع کی مالک ہو۔ اس لیے جمہوریہ کے فرائضِ لازمی میں سے یہ تھا کہ وہ اس مشترکہ روحانی متاع میں اپنے سب اراکین کو حصہ دار بنانے کا اہتمام کرے یعنی اپنے آپ کو ایک تعلیمی ادارہ بنا دے جس میں رہ کر ہر شخص اپنی صلاحیتوں کو پوری ترقی دے سکے اور اس مشترکہ روحانی متاع کے ذریعے دوسرے افراد سے رشتۂ اتحاد پیدا کرے۔ اس مشترکہ متاع سے مراد وہ لکھے اور بے لکھے قوانین تھے جن پر عمل پیرا ہونا جماعت کی فلاح اور حُسنِ اخلاق کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔

افلاطون بھی جماعت کے اس تعلیمی مقصد کا قائل ہے۔ وہ بھی مانتا ہے کہ ریاست میں حکومت کا کام تعلیم ہے اور تعلیم کا کام افراد کو جمعیت کے مقاصد سے آشنا کرنا اور انھیں سیاسی جسم کا صحیح عضو بنانا۔ البتہ

افلاطون کے نزدیک اس اجتماعی پہلو کے علاوہ تعلیم فی نفسہٖ بھی ایک قدر ہے۔ اس کا ایک انفرادی اور شخصی پہلو بھی ہے یعنی حق مطلق، خیر مطلق کا ادراک۔ اس انفرادی حیثیت سے تو افلاطون کا تصورِ تعلیم یونانی خصوصاً سوفسطائی تصورات سے مختلف ہے، جو تعلیم کو محض اجتماعی کامیابی کا ذریعہ قرار دیتے تھے لیکن اجتماعی حیثیت سے بھی افلاطون اس کا ہمنوا نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ اجتماعی کامیابی کی جگہ اجتماعی عدل کے حصول کو تعلیم کا مقصد بتاتا ہے۔

تعلیم کو اجتماعی اور انفرادی دونوں حیثیتیں دے کر افلاطون نے دراصل یونان کے دو اہم ترین مذاہب تعلیمی کو یکجا سمونے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سے ایک تو خود افلاطون کے شہر اثینہ کا مذہب تھا جسے مختصراً مذہب انفرادیت کہہ سکتے ہیں۔ یہاں حکومت کو تعلیم سے سروکار نہ تھا۔ شہری خود اپنا انتظام کرتے تھے۔ معمولاً ابتدائی تعلیم میں لکھنے پڑھنے کے علاوہ کچھ شعر و موسیقی کی تعلیم ہوتی اور کچھ جسمانی ورزش کی، جو لوگ اس سے زیادہ تعلیم کے خواہاں ہوتے وہ سوفسطائی معلموں کے ہاں دام دے دے کر سیاست اور خطابت کے فنون سیکھتے۔ اس کے بعد ۱۸ سے ۲۰ سال کی عمر تک حکومت سب شہریوں کو فوجی تعلیم دیتی تھی۔ تعلیم کا بڑا حصہ خاندان کے ذمے تھا۔ افلاطون کے نزدیک اثینہ میں جاہل اور نادان لوگوں کے برسرِ اقتدار ہونے کی ذمہ داری اس تعلیمی آزادی کے سر تھی۔ دوسرا مذہبِ تعلیمی سپارٹا کا تھا۔ یہاں بچہ ۷ سال کی عمر میں اپنے والدین سے جدا کر لیا جاتا۔ علیحدہ مکانوں میں سرکاری نگرانوں کے زیرِ نظر اس کی پرورش ہوتی اور اس کی تعلیم کا بیشتر حصہ جسمانی ورزش اور فوجی تربیت پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہاں خاندان کو تعلیم میں کوئی دخل نہ تھا جو کچھ کرتی حکومت کرتی اور افراد کو اپنے فوجی اغراض کے لیے بطور سپاہیوں کے تیار کرتی تھی۔

افلاطون کو سپارٹا کا طریقہ زیادہ بھایا اس لیے کہ فرد و جماعت کے باہمی تعلق کا تصور یہاں افلاطون کے نظریے سے زیادہ مطابق تھا۔ اس کے نزدیک بھی فرد کی حیثیت جماعت کے ایک جزو اور خادم کی تھی اور سپارٹا کے نظام میں بھی۔ لیکن افلاطون پھر اثینہ کا خوش مذاق اور وسیع النظر شہری تھا۔ ادب اور موسیقی سے سیرت کی جو تربیت اور تہذیب ہوتی ہے اس سے افلاطون سے زیادہ اور کون آشنا ہو سکتا تھا۔ یہ بھلا اپنی ریاست میں لوگوں کو محض اکھڑ سپاہی بنانے پر کیسے قناعت کر لیتا۔ وہ سمجھ گیا کہ سپارٹا کے نظامِ تعلیم کا مرکزی خیال اگرچہ صحیح ہے لیکن اس کے عمل میں بہت تنگی ہے جس سے سیرتِ انسانی کا بس ایک عنصر یعنی عنصرِ جری نشو و نما پاتا ہے اور دوسرے عناصر بالکل نہیں پنپنے پاتے۔ چنانچہ افلاطون نے اپنے نظامِ تعلیم میں سپارٹا اور

ایتھنہ دونوں کی خوبیوں کو یکجا کر دیا۔ ایتھنہ کے شہری کی حیثیت سے اس نے تعلیم میں سیرتِ انسانی کے تمام ترکیبی عناصر کے نشوونما کی تکمیل کی۔ بحیثیت سپارٹا کے معتقد اس نے کامل انسان کو جماعت کا خادم بنایا اور اس کی تعلیم کو کلیتاً حکومت کے سپرد کر دیا۔

''جمہوریہ'' میں جو نظامِ تعلیم بہ تفصیل پیش کیا گیا ہے وہ جنگ آزماؤں اور حکمرانوں کے لیے ہے۔ تیسرے یعنی دولت آفریں طبقے کی تعلیم کا ذکر نہیں ہے۔ اس نظام میں تعلیم کے دو حصے کر دیے گئے ہیں۔ پہلے حصے کی تعلیم تمام جنگ آزماؤں کے لیے ہے اور اس کا زمانہ لڑکپن اور شباب کا زمانہ ہے۔ دوسرا حصہ صرف حکمرانوں کے لیے ہے اور اس کا زمانہ شباب سے کہولت کی عمر تک رہتا ہے۔ پہلے حصے کی تعلیم کا مقصد ہے شہریوں کو جمہوریہ کے تحفظ کے لیے بطور سپاہی تیار کرنا۔ دوسرے کا مقصد ہے ان میں سے چند کو ''کامل محافظت'' یا حکمرانی کا اہل بنانا۔ پہلے میں جذبات کی تہذیب، سیرت کی تربیت پیشِ نظر ہے۔ دوسرے میں فلسفہ وحکمت کی معرفت، عقل وخرد کی تعلیم۔ پہلے حصے میں تمام تر اجتماعی اغراض پیشِ نظر ہیں، دوسرے میں، بالکل نہ سہی، پھر بھی بہت کچھ انفرادی تکمیل۔

پہلے حصے کا نصاب جو ۱۸ سال کی عمر تک کے لیے ہے، دو اجزا پر مشتمل ہے، ورزش اور موسیقی۔ لیکن دونوں لفظ ذرا وسیع معنی میں استعمال کیے گئے ہیں، مثلاً ورزش میں صحیح غذا اور علاج بھی شامل ہے اور موسیقی میں ادب اور فنونِ لطیفہ۔ افلاطون چاہتا ہے کہ ورزش اور موسیقی کے دوگونہ عمل سے سیرتِ انسانی کی ہم آہنگ نشوونما کا کام لے۔ اگرچہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ورزش سے جسم اور موسیقی سے ذہن کی تربیت مقصود ہوگی۔ مگر دراصل جسم کی تربیت بھی ذہن اور روح ہی کی خاطر ہے کہ اس سے جرأت وپامردی کی صفتیں پیدا ہوں، طبیعت کے عنصرِ جری کی صحیح نشوونما ہو جو نوجوانوں کو اچھا سپاہی اور بہادر جنگ آزما بنائے اور ریاست کا اچھا اور سچا خادم۔ موسیقی سے اس عنصرِ جری کو مناسب حدود میں رکھنا اور عقل کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا مطلوب ہے۔ اس سے ہر چند علم کا حصول ممکن نہیں تاہم صحیح ''رائے'' کا پیدا کرنا ممکن ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ روح کو جو ابھی جذبات کی منزل سے گزر رہی ہے اس بات کا عادی بنا دیا جائے کہ وہ حل طلب مسائل کے متعلق صحیح احساس رکھے اور جب یہ احساس بطور عادت راسخ ہو جائے تو روح صحیح راہِ عمل اختیار کرے۔ یہ جانے بغیر کہ اس عمل کی وجہ یا علت کیا ہے[1]۔ موسیقی، ادب اور فنونِ لطیفہ کو نصاب کا جزو بنایا ہی اس لیے گیا ہے کہ ان کی

(۱) "Barker: Greek Political Theory" صفحہ ۱۹۲ (۱۹۱۸ء)

دلکشی خود بخود نوجوان روحوں کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔ شعر کے وزن اور بحر سے، چنگ و رباب کی سامعہ نوازی سے، حسین مجسموں کے حُسنِ صورت اور دلفریبیِ الوان سے، روح آپ ہی آپ متاثر ہوتی ہے اور اس طرح ان کی اخلاقی تعلیم کو بے جانے بوجھے قبول کرتی جاتی ہے۔

افلاطون فنونِ لطیفہ کی اس تاثیر کو اخلاقی مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ موسیقی، شعر اور صورت تراشی کے ہر طرز کو نوجوانوں کی تعلیم کا جزو نہیں بننے دیتا بلکہ صرف ان طرزوں کو جن سے روح کی صحیح اخلاقی تربیت ہو سکے۔ چنانچہ ''جمہوریہ'' (ریاست) میں نظامِ تعلیم کے ساتھ ادبیات اور موسیقی کے احتساب کا بھی ایک مکمل پروگرام پیش کیا گیا ہے۔ ادب کی اصلاح میں صحیح جواب کے کوئی غلط بات کہہ دوں؟ ایسی صورت میں آپ کیا فرمائیں گے؟

تھریسی میکس: آپ تو ایسے پوچھ رہے ہیں گویا یہ دونوں صورتیں ایک سی ہیں۔

میں: کیا اس میں بھی کوئی شبہ ہے؟ اور اگر بفرضِ محال میں تسلیم بھی کر لوں کہ یہ یکسانیت حقیقی نہیں بلکہ صرف ظاہری ہے تو بھی کیا یہ بے جا بات نہیں کہ آپ ایک شخص کو اپنے اصلی خیالات کے اظہار سے منع کرتے ہیں۔

تھریسی میکس: کہیے تو، آخر آپ کا ارادہ کیا ہے؟ شاید جناب انھیں منع کیے ہوئے جوابات میں سے کوئی جواب دینا چاہتے ہیں!

میں: کیا عجب ہے! ممکن ہے غور کرنے کے بعد میں ایسا ہی کروں۔

تھریسی میکس: اور اگر میں ان سب سے بہتر جواب پیش کر دوں تو پھر آپ کی کیا سزا ہوگی؟

میں: سزا؟ میری سزا یا جزا وہی ہوگی جو ہر جاہل بے علم آدمی کی ہوتی ہے یعنی عقل مندوں سے سبق لینا۔

تھریسی میکس: خوب۔ اور کچھ جرمانہ نہ دلوایئے گا۔

میں: اگر میرے پاس روپیہ ہوتا تو میں اس کے لیے بھی تیار تھا۔

گلوکون: آپ روپے کا خیال نہ کریں اور تھریسی میکس کو بھی روپے کی فکر نہ کرنی چاہیے۔ سقراط کی طرف سے ہم لوگ روپے ادا کر دیں گے۔

تھریسی میکس: مگر صاحب، یہ حضرت تو وہی حرکت کریں گے جو ہمیشہ کیا کرتے ہیں، خود جواب دیں گے نہیں اور دوسرے کے جواب کو کسی نہ کسی طرح رد کر دیں گے۔

میں: عزیزِ من۔ آپ کیا فرماتے ہیں؟ وہ غریب کیا جواب دے جو اوّل تو کچھ جانتا نہیں اور ساتھ ہی اپنے جہل کا احساس بھی رکھتا ہے اور فرض کیجیے وہ کچھ کہنا بھی چاہے تو آپ جیسا قابل شخص اُسے منع کرتا ہے۔ اس لیے مناسب تو یہی ہے کہ وہ شخص جواب دے جو اس معاملے میں علم کا مدعی ہے اور اپنا خیال ظاہر کرنے میں آزاد بھی ہے۔ مجھ پر اور سب حاضرین پر آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ عدل کی کوئی تعریف پیش کریں۔

گلوکون اور دوسرے حاضرین نے بھی اس درخواست میں میری ہم نوائی کی۔ تھریسی میکس چونکہ بزعم خود مذہبی عقائد، افکار و خیالات پر اس کا تسلط ہے کہ ادب اور آرٹ میں بس انھیں چیزوں کی تلقین ہو جنھیں حکومت چاہے اور "ستم بالائے ستم" اندازِ تلقین بھی وہی ہو جو حکومت کو بھائے۔ لیکن اگر غور سے دیکھیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ افلاطون ادب اور آرٹ کو ان کی ماہیت کے خلاف ریاست کی خدمت پر زبردستی مجبور نہیں کرنا چاہتا بلکہ آرٹ کی غایت ہی اس خدمت کو جانتا ہے۔ اس کی نظر میں سچا آرٹ، اچھا آرٹ ہے ہی وہی جو جماعت کے مقاصد میں ممد ہو۔ وہ زندگی میں اصول خیر کی کارفرمائی دیکھتا اور ساری کائنات میں ایک مقصد مضمر پاتا ہے۔ آرٹ چونکہ زندگی اور کائنات کی تعبیر اور ترجمانی کا نام ہے اس لیے اسے بھی اس خیرِ مطلق کا پرتو ہونا چاہیے جس سے زندگی اور کائنات معمور ہیں۔ وہ آرٹ کو ریاست کا غلام نہیں بنانا چاہتا بلکہ اس سے صرف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اپنے حقیقی مقصد کو پورا کرے۔

افلاطون نے نوجوانوں کی تعلیم کا جو نصاب بنایا ہے اس کا مختصر ذکر تو ہو چکا۔ اس نصاب کے ختم ہونے کے بعد اس نے اعلیٰ تعلیم کا ایک خاکہ بھی ان لوگوں کے لیے پیش کیا ہے جو ریاست کے اصلی حکمران بننے والے ہیں۔ پہلی منزل میں تعلیم کا خاص ذریعہ ادب اور آرٹ تھا۔ اس اعلیٰ منزل میں ریاضی اور فلسفہ ہے۔ افلاطون کے زمانے میں اعلیٰ تعلیم کا ایک اور نصاب بھی جاری تھا جسے اس نے یکسر بدل دیا۔ اثینہ میں سوفسطائی معلموں کے مدارس تھے جن میں ۱۷-۱۸ برس کے نوجوانوں کو ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد خطابت اور سیاست کا درس دیا جاتا تھا تاکہ اس کی تکمیل کر کے یہ جمہوریت کی سیاسی زندگی میں امتیاز اور کامیابی حاصل

کر سکیں۔ افلاطون خطابت کی خود فریبی سے بیزار ہے اس لیے اس کے لیے نصاب میں کوئی جگہ نہیں پاتا۔ وہ اپنے نصاب میں وہ مضمون رکھتا ہے۔ (۱) علم الحساب۔ (۲) علم الاشکال۔ (۳) ہیئت۔ (۴) موسیقی۔ (۵) فلسفہ۔ ان میں پہلے ۱ تا ۴ اور بعد میں ۵ یعنی فلسفے کی تعلیم رکھی ہے اور چونکہ موسیقی میں بھی یہاں تناسب کی ریاضیاتی بحثیں مقصود ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ افلاطون نے اپنے نصاب میں ریاضی کو فلسفے کی تعلیم کا پیش خیمہ بنایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ریاضیاتی علوم اگر ایک طرف محسوس عملی دنیا میں بھی مفید اور کارآمد ثابت ہوتے ہیں تو دوسری طرف دنیائے محسوس پر غور کے بجائے، مجرد اور غیر محسوس تصورات پر غور وفکر کی عادت ڈال کر، یہ غیر محسوس عالم اعیان تک پہنچنے کا ایک زینہ بھی بن جاتے ہیں جن کا پورا پورا علم پھر فلسفے سے حاصل ہوتا ہے۔

ان چاروں مضامین کے مطالعے کے لیے افلاطون نے ۱۰ سال کا زمانہ تجویز کیا ہے یعنی ۲۰ سال سے ۳۰ سال تک کی عمر۔ گویا ۱۸ برس کی عمر میں ابتدائی تعلیم ختم کر کے دو سال خالص فوجی تعلیم ہو اور اس کے اختتام پر جو لوگ اس اعلیٰ تعلیم کے اہل نظر آئیں انھیں اس نصاب کے مطابق تعلیم دی جائے۔ اس نصاب کی تکمیل کے بعد ۵ سال فلسفے کی تعلیم کے لیے رکھے گئے ہیں۔ فلسفہ کا یہ نصاب صرف ان کے لیے ہے، جنھوں نے گزشتہ دس سال میں ریاضیاتی مضامین کے باہمی ربط وتعلق کا سب سے قوی اور واضح احساس ظاہر کیا ہو۔ اس لیے کہ ریاضی محسوس سے غیر محسوس تک پہنچنے کا وسیلہ ہے اور فلسفہ دنیائے فکر و عالم اعیان کے علم اور اس علم سے بالآخر عین خیر تک پہنچنے کا نام ہے۔ فلسفہ حقیقتِ محض یعنی عین خیر کا علم ہے کہ یہی غایت وجود بھی ہے اور مقصود علم بھی اور فلسفی وہ ہے جو حقیقتِ اشیاء سے آشنا ہو جائے اور عین خیر کا ادراک رکھتا ہو۔

تجویز یہ ہے کہ فلسفے کی اس پنج سالہ تعلیم میں امتحانوں اور آزمائشوں کا ایسا سلسلہ رکھا جائے کہ سچی فلسفیانہ طبائع کا پورا پورا پتا چل جائے۔ جن میں خامی ہو وہ دور کر دیے جائیں جو سب آزمائشوں میں پورے اُتریں وہ ریاست کے فلسفی حکمراں یا محافظ بنیں۔ ۳۵ سے ۵۰ سال کی عمر تک یہ ریاست کی خدمت کریں اور حکومت کے وہ تمام کام انجام دیں جو زیادہ معمر بزرگوں سے مخصوص نہیں ہیں۔ اس زمانہ خدمت میں بھی برابر ان کی آزمائش ہوتی رہے۔ وہ جوان آزمایشوں میں پورے اُتریں اُنھیں سب سے بڑے اعزاز اور سب سے زیادہ ذمہ داری کے کام تفویض کیے جائیں۔ اب یہ لوگ اپنا کچھ وقت تو فلسفیانہ غور وفکر میں صرف کریں اور جب ان کی باری آئے تو کچھ وقت ریاست کے عملی فرائض انجام دینے میں اور آنے والی نسلوں کو ریاست کی خدمت اور حفاظت کے لیے تیار کرنے میں۔

ذوقِ علم اور جوشِ عمل کی جس کشمکش کی آماجگاہ خود افلاطون کا دل تھا اور جس کا تصفیہ آخر دم تک نہ ہو سکا اس کا اثر تعلیم کی اس آخری منزل میں بھی رونما ہے۔ اس منزل میں بھی جہاں فلسفی مقصودِ علم کو پہنچ جاتا ہے اور غایتِ وجود کا محرم ہو جاتا ہے۔ افلاطون اسے بالکل فکر کی دنیا کے لیے نہیں چھوڑتا بلکہ علم و عمل میں ہم آہنگی اور توازن کا مطالعہ یہاں بھی قائم رہتا ہے۔ علمِ حقیقت کچھ گونگے کا گڑ نہیں جسے فلسفی اکیلے اکیلے چکھے اور دوسروں کو اس مزے سے آگاہ نہ کرے۔ فلسفی کا ایک مقصد اگر عینِ خیر کا علم حاصل کرنا ہے تو دوسرا اس علم کی روشنی میں نوعِ انسانی کو سدھارنا بھی ہے۔ اگر اس علم سے اپنی ذہنی تکمیل اور سیرتِ شخصی کی بہترین تشکیل ہوتی ہے تو پھر اس سے ہیئتِ اجتماعی کی فلاح و بہبود کی سبیل نکلنی چاہیے۔ کامل مفکر کا صاحبِ عمل ہونا بھی ضروری ہے۔

یہی اربابِ علم اور اصحابِ عمل افلاطون کی اصطلاح میں فلسفی حکمران، فلسفی بادشاہ ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں جاہل اور خود غرض اہلِ سیاست کا خاتمہ کرانا چاہیے۔ یہی حکمت اور خردمندی سے حکومت کر سکتے ہیں کہ نظارۂ حقیقت سے بہرہ یاب ہیں۔ یہی بے لوث اور بے لاگ حکومت کر سکتے ہیں کہ ان کے لیے حکومت کی زحمت کوئی شرف نہیں بلکہ ایک فرض ہے اور بنی نوع کی سچی خدمت کا ایک موقع۔ حیاتِ اجتماعی و انفرادی کے سارے مضمر مقاصد ان پر روشن ہوتے ہیں اور یہ ان کو پیشِ نظر رکھ کر حکومت کر سکتے ہیں اسی لیے ان پر پھر نہ قانون کی پابندی عائد ہوتی ہے نہ بے جا رسم و رواج کی بندش۔

یہ آخری بات قابلِ لحاظ ہے اس لیے کہ افلاطون نے جہاں حکومت کو مذہب پر، ادب پر، آرٹ پر، پورا اقتدار دے دیا ہے وہاں ایک چیز میں ریاست کے کام کو بہت کم بھی کر دیا ہے۔ عام طور پر یہ ریاست کے خاص کاموں میں شمار کیا جاتا ہے کہ وہ قانون بنائے اور انھیں نافذ کرنے کے لیے عدالتیں قائم کرے، پولیس رکھے۔ لیکن افلاطون کو اپنی صحیح تعلیم کے نتائج پر اس درجہ اعتماد ہے کہ وہ جسم کی نگہداشت کے لیے ڈاکٹروں، طبیبوں اور معاملات کے تصفیے کے لیے عدالتوں، وکیلوں سے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتا ہے۔ صحیح تعلیم کے بعد نہ امراضِ جسم کی گنجایش ہے نہ امراضِ روح کی اور طبیب اور وکیل انھیں امراض کی علامت ہیں۔ افلاطون نہ مرض کو باقی رکھنا چاہتا ہے نہ علامات کا روادار ہے۔ اس کے نزدیک تو ریاست جماعتِ عاملہ ہے جس پر قانون بنانے کی کوئی پابندی نہیں۔ اس جماعتِ عاملہ کا کام دراصل تعلیمی کام ہے اور ریاست ایک تعلیمی ادارہ ہے اور بس۔

(۳) نظام معیشت:

ریاست کو اساسِ عدل پر قائم رکھنے کے لیے نظامِ تعلیم کے ساتھ ساتھ افلاطون نے معیشت کے ایک اشتراکی نظام کا خاکہ بھی پیش کیا ہے لیکن اس کو صرف حکمرانوں اور سپاہیوں تک محدود کر دیا ہے، مثلاً املاک کے متعلق افلاطون کی تجویز ہے کہ تیسرا یعنی محنت و مشقت کرنے والا دولت آفرین طبقہ اپنی پیداوار کا اتنا حصہ حکمرانوں اور جنگ آزماؤں کو دے دیا کرے کہ بس ان کی لابد ضرورتیں پوری ہو جائیں۔ اور وہ بھی اس طرح نہیں کہ یہ دولت روپے پیسے کی شکل میں بطور تنخواہ ان میں تقسیم ہو اور یہ اس کو جس طرح چاہیں صرف کریں بلکہ سب ایک جگہ ایک سا کھانا کھائیں، ایک سا کپڑا پہنیں۔ یعنی افلاطون ان طبقوں کو دولت آفرینی ہی سے منع نہیں کرتا بلکہ صرف دولت کو بھی اجتماعی شکل دیتا ہے۔

اشتراکِ املاک کے ساتھ ساتھ افلاطون نے اشتراکِ ازواج کی بھی حمایت کی ہے اور اس تجویز پر ''ریاست'' میں کافی بحث ہے۔ حکمرانوں اور سپاہیوں کے لیے شادی بیاہ کرنا اور الگ الگ خاندان رکھنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ بوڑھے تجربہ کار حکمرانوں کا یہ کام ہے کہ مقررہ اوقات پر تندرست نوجوان مرد عورتوں کو یکجا کر دیں اور ان کے اختلاط سے جو اولاد پیدا ہو اسے اس کا علم ہی نہ ہو کہ اس کے والدین کون ہیں۔ بچوں کو پیدا ہوتے ہی ریاست ماؤں سے لے کر اپنی آغوش میں پرورش دے تا کہ ہر نئی نسل اپنے سے پہلی نسل کو من حیث الکل اپنے ماں باپ سمجھے اور ہر پُرانی نسل چھوٹوں سے ایسی ہی محبت رکھے جیسی اپنی اولاد سے۔ افلاطون کی خواہش ہے کہ شخصی خاندان کی خود غرضیوں اور تنگ نظریوں کو مٹا کر ریاست کے دو اعلیٰ طبقوں کو بس ایک خاندان بنا دے تا کہ یہ محدود خاندانی تعلقات ان طبقوں کی یگانگت میں مخل نہ ہوں۔ عورتوں کو بھی زندگی کے چھوٹے چھوٹے تفکرات سے نجات ملے اور وہ مہماتِ امور میں مردوں کے دوش بدوش کام کر سکیں۔

اس سلسلے میں افلاطون نے مرد عورت کی مساوات پر بڑی دلچسپ بحث کی ہے۔ اس کے معاصرین غالباً اس تجویز پر سب سے زیادہ بھڑکے ہوں گے۔ اس لیے کہ یونان میں عورتوں کی حیثیت وہ تھی جس سے ہم مشرقی ممالک کے لوگ خوب آشنا ہیں۔ یونانی زندگی مردوں کی زندگی تھی۔ عورتیں گھروں کی چار دیواری میں رہتی تھیں اور گھر کی دیکھ بھال، کھانا پکانے اور بچے پیدا کرنے کا کام کیا کرتی تھیں۔ سیاست میں انھیں بالکل دخل نہ تھا۔ اس مساوات کے اُصول کو منوانا منطقی طور پر افلاطون کے لیے ضروری نہ تھا۔ وہ جو ریاست میں ہر

ایک کو اپنا وظیفہ مخصوص دینا چاہتا تھا اور جس نے پورے محنت کش طبقے کو سوائے دولت آفرینی کے اور کسی ذہنی شغل کا اہل نہ جانا وہ آسانی سے عورتوں کے لیے وہی وظیفہ مخصوص کر سکتا تھا جو اس وقت کے معاشرہ نے اُنھیں تفویض کر رکھا تھا۔

بظاہر ایسا نہ کرنے کی دو وجوہات سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک تو شاید یہ ہو کہ یونان میں ڈائیونائیسی (دیونیسی) مذہب کے فروغ دینے میں عورتوں کا حصہ مردوں سے کم نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی تھا۔ حال اور جذب میں، مذہب کے ساتھ والہانہ شیفتگی میں اور اس کی خاطر جسمانی تکلیفیں برداشت کرنے میں عورتیں مردوں سے کچھ آگے ہی تھیں۔ افلاطون جس نے یہ دیکھا تھا کیوں نہ سیاسی زندگی میں بھی انھیں برابر کا موقع دینے، نہیں، بلکہ ان سے برابر کام لینے کا فیصلہ کرتا۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانے کے ذہنی اور سیاسی ہیجان سے حرم سرا کی عزلت نشین خواتین یوں بھی متاثر ہو چلی تھیں۔ آس پاس اکثر جگہ عورتوں نے خانگی امور کے علاوہ وسیع تر معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا تھا۔ اس زمانے کے ادب میں خود یونان میں بھی عورتوں کے گھر سے باہر نکل کر عام زندگی میں مداخلت کرنے کے تذکرے اور اشارے ملتے ہیں بلکہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ عام انتشار و بدنظمی میں لوگ یہ سوچنے لگے تھے کہ چلو یہ آخری آزمائش بھی کر دیکھیں، مردوں کو دیکھ چکے اب یہی سہی، عورتوں کے ہاتھ میں سیاست دے دیں۔ اس لیے افلاطون نے بھی، جو بنیادی اصلاح کا علمبردار تھا اور نئے اصولوں پر ہیئتِ اجتماعی کی جدید تشکیل چاہتا تھا، عام روایات اور رسم کے خلاف اس مساواتِ مرد و زن کی حمایت کی جو خاندان اور اِملاکِ شخصی کو مٹانے کی ہمت رکھتا تھا، وہ عورت و مرد کے فرق کو کیوں نہ کالعدم کر دیتا۔

مشترکہ املاک، مشترکہ خاندان اور مساواتِ مرد و زن کی تجاویز اس قدر انقلابی ہیں کہ ''ریاست'' کے اکثر پڑھنے والوں کی زیادہ تر توجہ ان کی طرف منعطف ہو جاتی ہے اور خیال ہوتا ہے کہ اشتراک کے یہ مسائل پیش کرنا ہی اس کتاب کا اصل مقصود ہے۔ لیکن یہ خیال درست نہیں۔ اس لیے کہ افلاطون کے نزدیک اس نظامِ اشتراک کی حیثیت اصولی نہیں بلکہ فرعی ہے۔ افلاطون جانتا تھا اور ارسطو اور اس کے آیندہ معتقدین کی یک طرفہ تنقید اور نکتہ چینی سے پہلے جانتا تھا، کہ ریاست ذہن انسانی کی ایک خارجی تشکیل ہے۔ اس لیے اس کی حقیقی اصلاح ذہن ہی کی اصلاح سے ممکن ہے۔ گویا ارسطو اور متبعینِ ارسطو کا اصرار کہ معاشی نظام میں تبدیلی بے سود اور غیر ضروری ہے، سچی اصلاح صرف تعلیم کی اصلاح سے ہو سکتی ہے۔ دراصل پڑھے کو پڑھانا

اور سیکھے کو سکھانا ہے۔ ہاں، مگر افلاطون یہ بھی جانتا تھا کہ انسانی ذہن اپنے ماحول سے ضرور متاثر ہوتا ہے اور اگر عدل ایک روحانی کیفیت، ایک ذہنی عادت سے عبارت ہے جس کی وجہ سے ہر آدمی بس اپنا مخصوص وظیفہ پورا کرنا چاہتا ہے تو اس کیفیت، اس عادت کی کماحقہٗ پختگی کے لیے ضرور ہے کہ جس حالت میں ذہن پرورش پائے وہ اس کی نشوونما کے لیے مضر اور مخالف نہ ہوں۔ افلاطون کے نزدیک اس عادت کے نشوونما پانے اور راسخ ہونے کے لیے سب سے مساعد حالات ایک اشتراکی نظام ہی میں ممکن ہیں۔ اس لیے اس نے یہ نظام پیش کیا ہے جس کا تمام تر مقصد یہ ہے کہ تعلیمی نظام کو اپنے نتائج حسنہ کے پیدا کرنے میں خارجی ماحول کی مخالفت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

افلاطون کی اشتراکی تجاویز سے ایک غلط فہمی اور پیدا ہوتی ہے۔ اس وقت چونکہ اکثر ممالک میں معاشی زندگی کا ایک اشتراکی مسلک رفتہ رفتہ رواج پا رہا ہے اس لیے افلاطون کی تجاویز کو ذرا سطحی نظر سے دیکھنے والے اس کے نظامِ معیشت کو جدید اشتراکی نظام سے ملا دیتے ہیں، جو صحیح نہیں۔ افلاطون کے اشتراک کو جدید اشتراک سے دور کی نسبت بھی نہیں ہے۔ اشتراکِ جدید پوری ہیئتِ اجتماعی کے لیے ایک تجویز ہے اور افلاطون کا اشتراک ریاست کے صرف ایک مخصوص طبقے کے لیے جدید اشتراک دولت آفرینی کا سارا کام ریاست کے سپرد کرنا چاہتا ہے۔ افلاطون کے نظام میں دولت آفرینی بدستور افراد ہی کے سپرد رہے اور اس مجوزہ نظام کا براہ راست کوئی اثر کسی دکاندار، مزدور یا کسان پر نہیں پڑتا۔ جدید اشتراک ہر ایک سے دولت آفرینی کا کام لے کر دولت کو بڑھانا اور پھر اس دولت کو سب میں برابر تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ افلاطون کے اشتراک میں وہ طبقہ جس کے لیے یہ نظام تجویز کیا گیا ہے۔ دولت آفرینی میں حصہ ہی نہیں لے سکتا۔ جدید اشتراک کے پیشِ نظر ایک معاشی مسئلہ ہے۔ افلاطون کے سامنے ایک اخلاقی مہم ہے۔ جدید اشتراک سیاسی اور معاشی قوت کا حامل جمہور کو بنانا چاہتا ہے۔ افلاطون کا اشتراک تزکیہ سیاست کی خاطر اپنے حکمران طبقے کو معاشی زندگی سے بالکل بے تعلق کرنا چاہتا ہے۔ جدید اشتراک دولت کا اشتراک ہے، افلاطون کا اشتراک ترکِ دولت کا اشتراک ہے۔

☆☆☆

میں نے یہ مقدمہ فروری ۱۹۳۲ء میں لکھا تھا جب یہ کتاب پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ میں نے اس میں کوئی ترمیم اس لیے نہیں کی ہے کہ پھر اسے شاید بالکل نئے ڈھنگ سے لکھنا ہوتا۔ ترجمہ کی نظر ثانی البتہ کی ہے

اور اس میں جگہ جگہ ترامیم کی ہیں۔ افسوس کہ یونانی سے ناواقف ہوں اس لیے ترجمہ انگریزی سے کیا ہے۔ آکسفورڈ کے مشہور پروفیسر بی۔ جووٹ کا انگریزی ترجمہ اس اُردو ترجمہ کی اصل ہے۔ مدد ڈیوالیس اور واگھن کے ترجمے سے بھی لی ہے۔ نظرثانی کرتے وقت آگسٹ ہورنفر کے جرمن ترجمے سے بھی مدد لی ہے۔ پہلی بار جب کتاب شائع ہوئی تھی تو اشاعت سے پہلے اسے اپنے محترم دوست ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کو دکھا لیا تھا اور ان کے مفید مشوروں اور اصلاحات سے فائدہ اُٹھایا تھا۔ اس بار طباعت سے پہلے میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر یوسف حسین نے اس کو شروع سے آخر تک دیکھ لیا ہے اور اُن کے مشورے سے میں نے ترجمے کو بہت کچھ بدلا ہے۔ یہ دونوں میرے ترجمے کی سب خامیاں کیسے دور کرتے۔ اس لیے جہاں مطالب کے ادا کرنے میں کوتاہی ہوئی ہے وہ میرا قصور ہے۔ اُن کی اعانت نہ ہوتی تو کوتاہیاں اور زیادہ ہوتیں۔ اُن کے تعاون کا دل سے شکرگزار ہوں۔

ذاکر حسین

پہلی کتاب

شرکائے گفتگو:

سقراط، جوکہ راوی ہے۔

گلوکون (Glaucon)، ایڈیمنٹس (Adeimantus)،

پولیمارکس (Polemarchus)، کیفیلس (Cephalus)،

تھریسی میکس (Thrasymachus)، کلیٹوفون (Cleitophon)۔

دیگر حضرات جوکہ خاموش سامعین تھے۔

یہ منظر پائریئس میں کیفیلس کے گھر میں واقع ہوا اور سقراط نے ساری گفتگو کو اس کے اصل میں وقوع پذیر ہونے کے ایک روز بعد ٹیمیئس (Timaeus)، ہرموکریٹس (Hermocrates)، کریٹیاس (Critias) اور ایک بے نام شخص جسے ٹیمیئس نے متعارف کرایا تھا، وغیرہ کے سامنے بیان کیا۔

میں ارسٹن (Ariston) کے بیٹے گلوکون کے ساتھ کل پائریئس گیا تھا کہ دیوی کی پوجا بھی کرلوں گا اور یہ بھی دیکھ لوں گا کہ یہ تہوار، جو ایک نئی چیز ہے، آخر کس طرح منایا جاتا ہے۔ خود ایتھنز کے باشندوں کے جلوس سے بھی بہت خوش ہوا، اگرچہ تھریسی والوں کا جلوس بھی کچھ کم شاندار نہ تھا۔ پوجا کر کے اور تماشا دیکھ کر ہم شہر واپس آ رہے تھے کہ کیفیلس کے بیٹے پولیمارکس نے کہیں دور سے ہمیں دیکھ لیا اور اپنے نوکر کو دوڑایا کہ انھیں ٹھہرالو۔ نوکر نے پیچھے سے میری عبا کھینچ کر کہا کہ پولیمارکس فرماتے ہیں کہ آپ ذرا توقف فرمائیں۔

میں نے مڑ کر اس سے پوچھا کہ وہ کہاں ہیں؟

نوکر نے کہا: ذرا ٹھہریے۔ وہ آپ کے پیچھے پیچھے ہی آ رہے ہیں۔

گلوکون نے کہا اچھا، تو ہم ٹھہرتے ہیں۔

چند ہی لمحوں میں پولیمارکس نظر آئے۔ گلوکون کا بھائی ایڈیمنٹس اور نیکیاس (Nicias) کا بیٹا نکریٹس (Niceratus) اور کئی اور لوگ جو جلوس میں شریک ہوئے تھے، ان کے ساتھ تھے۔

پولیمارکس نے مجھے مخاطب کر کے کہا: ایسا لگتا ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھی شہر واپس جا رہے ہیں۔

میں نے جواب دیا: ہاں! آپ کا گمان کچھ زیادہ غلط نہیں ہے۔

پولیمارکس نے پھر کہا: لیکن آپ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہم کتنے ہیں؟

میں نے کہا: جی، جی۔

پولیمارکس نے کہا: اب آپ یا تو اپنی جماعت کو ہم سے زیادہ مضبوط ثابت کریں یا بس یہیں ٹھہر جائیں۔

میں نے کہا: نہیں یہ کیوں؟ ایک صورت یہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ ہم سمجھا بجھا کر آپ کو راضی کر لیں کہ ہمیں جانے دیا جائے۔

پولیمارکس: اور اگر ہم آپ کی سُنیں ہی نہیں تو کیا آپ پھر بھی ہمیں قائل کر سکتے ہیں؟

گلوکون نے جواب دیا، یقیناً نہیں۔ بھلا یہ کیسے ہوگا!

پولیمارکس نے کہا: تو پھر آپ مطمئن رہیں، ہم آپ کی ایک نہ سُنیں گے۔ اتنے میں ایڈیمنٹس نے اپنے رفیق کے مطالبے کو تقویت دینے کے لیے یہ تذکرہ چھیڑ دیا "کیوں آپ لوگوں کو کچھ اس کی بھی خبر ہے کہ آج شام کو دیوی کے نام پر مشعلوں کی دوڑ ہوگی، گھوڑوں پر"۔

میں نے کہا: گھوڑوں پر مشعلیں! یہ تو ایک طرفہ تماشا ہوگا۔ کیا سوار دوڑتے میں ایک دوسرے کو مشعلیں دیں گے یا کچھ اور؟

پولیمارکس نے کہا: جی ہاں۔ اور اس کے علاوہ ایک اور رسم بھی تو ادا ہوگی جو آپ کو ضرور دیکھنی چاہیے۔ رات کا کھانا کھا کر ہم سب کے سب یہ رسم دیکھنے چلیں گے، نوجوانوں کا بڑا مجمع ہوگا اور دلچسپ بات چیت کا موقع ملے گا۔ بس انکار نہ کیجیے، ٹھہر ہی جایئے۔

گلوکون نے کہا: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں ٹھہرنا ہی پڑے گا۔

میں نے کہا: اچھا تو پھر جیسی تمھاری خوشی۔

چنانچہ ہم سب پولیمارکس کے ساتھ اُن کے گھر گئے۔ اُن کے دونوں بھائی لائسیاس (Lysias) اور یوتھیڈیمس (Euthydemus)، کالسیڈونیا کا تھریسی میکس، پائین کا کارمینڈیس (Charmantides) اور ارسٹونیمس (Aristonymus) کے صاحبزادے کلیٹوفون سب وہاں موجود تھے۔ پولیمارکس کے والد کیفیلس سے بھی ملاقات ہوئی۔ بہت دنوں بعد میں نے اُنھیں دیکھا تھا اس لیے کچھ زیادہ بوڑھے لگ رہے تھے۔ ایک آرام کرسی پر تشریف رکھتے تھے اور کسی قربانی کے ادا کرنے کے سلسلے میں سر کے چاروں طرف ایک پھولوں کا ہار لپٹا ہوا تھا۔ ارد گرد ایک نیم بیضاوی دائرے میں کچھ کرسیاں پڑی تھیں جن پر ہم لوگ بیٹھ گئے۔ نہایت تپاک سے سلام کر کے اُنھوں نے مجھے یوں مخاطب کیا:

> ''آپ سے تو ملاقات کا موقع بہت ہی کم ملتا ہے۔ آپ تشریف نہیں لاتے۔ اگر میں چلنے پھرنے کے قابل ہوتا تو بجائے اس کے کہ آپ سے یہاں آنے کو کہوں خود ہی آ جایا کرتا۔ لیکن اب اس عمر میں کمزوری اور بڑھاپے کی وجہ سے میں تو شہر جا نہیں سکتا۔ آپ ہی کبھی کبھی آ جایا کریں۔ ہاں، یہ آپ سے کہہ دوں کہ اگرچہ بدن کی لذتیں دن بہ دن کم ہوتی جا رہی ہیں لیکن بات چیت کا مزہ اور لطف دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے۔ اس لیے مجھے امید ہے کہ آپ میری درخواست کو رد نہ فرمائیں گے اور اکثر غریب خانے کو تشریف آوری سے عزت بخشا کریں گے تاکہ اُن نوجوانوں کو آپ کی صحبت سے فیض پانے کا موقع مل سکے۔ ہمارے تعلقات تو ایسے پُرانے ہیں کہ تکلف کی چنداں گنجایش نہیں''۔

میں نے جواب دیا: میرے نزدیک اپنے بزرگوں سے گفتگو کا موقع ملنا عین خوش نصیبی ہے۔ اُن کی مثال اُس مسافر کی سی ہے جو اُس راہ پر چل چکا ہے جس پر مجھ کو خود چلنا ہے۔ میرا فرض ہے کہ اُن سے پوچھوں کہ آیا راہ ہموار اور سہل ہے یا ناہموار اور دشوار گزار۔ آپ چونکہ اس مقام پر پہنچ چکے ہیں جس کو شاعر منزلِ پیری کے آستان سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس لیے یہی سوال میں آپ سے بھی پوچھنا چاہتا ہوں۔ کہیے، کیا زندگی کی آخری منزلیں کڑی معلوم ہونے لگتی ہیں؟ یا آپ اس منزل کی کیا خبر دیتے ہیں؟

کیفیلس نے کہا: میں آپ کو اس معاملے میں اپنا ذاتی احساس بتاتا ہوں۔ یوں تو میرے ہم عمر

لوگ اکثر آپس میں ملتے رہتے ہیں۔ پُرانی مثل ہے ''کند ہم جنس باہم جنس پرواز'' ان صحبتوں میں لوگ عام طور پر اپنا اپنا دُکھڑا روتے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ اب کھایا نہیں جاتا اور کوئی کہتا ہے کہ پیا نہیں جاتا۔ کوئی گلستانِ شباب کی خزاں رسیدگی پر نوحہ خوان ہے اور کوئی جذباتِ عشق و محبت کی پژمردگی پر ماتم گسار۔ گزرے دنوں کی یاد ان کو ستاتی ہے اور شباب کے بغیر ان کے نزدیک زندگی زندگی ہی نہیں۔ بعض اپنے عزیزوں کی طعنہ زنی کی کے شاکی ہیں اور بڑھاپے کو ان تمام آفتوں کی وجہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک تو یہ الزام غلط ہے کیونکہ اگر ضعیفی اور بڑھاپا ہی ان تمام باتوں کا سبب ہوتا تو پھر میں یا اکثر اور بوڑھے لوگ اُن سے کیسے بچے رہتے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں ان سب بلاؤں سے محفوظ ہوں۔

مجھے اکثر اس بوڑھے شاعر سوفوکلس (Sophocles) کا قصہ یاد آ جاتا ہے کہ بڑھاپے میں جب کسی نے اس سے پوچھا کہ کہیے اس عمر میں بھی آپ کو عشق و محبت بھاتی ہے اور اب بھی اس بارے میں آپ کے محسوسات وہی ہیں جو کبھی پہلے تھے تو اس نے کیا خوب جواب دیا تھا کہ خدا کا شکر ہے میں اب اس بلا سے محفوظ ہوں اور اپنی آزادی پر اسی قدر خوش ہوں جیسے کوئی ایک وحشی اور بدمزاج آقا سے چھٹکارا پانے پر ہوتا ہے۔ یہ لفظ مجھے اکثر یاد آتے ہیں اور میں اپنے لیے انھیں آج بھی اتنا ہی صحیح خیال کرتا ہوں جتنا کہ وہ شاعر کی زبان سے نکلتے وقت تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کر سکتا کہ عمر کی زیادتی کے ساتھ ساتھ سکون اور آزادی کا احساس بڑھتا جاتا ہے، شہوانی جذبوں کا تسلط کم ہو جاتا ہے اور ہم ایک ہی نہیں بہت سے وحشی آقاؤں کی اطاعت سے گلوخلاصی حاصل کر لیتے ہیں۔ سچ تو یوں ہے کہ تمام رنج و ملال اور عزیزوں کی شکایتوں کا سبب بس ایک ہی ہے اور وہ خود ان لوگوں کی عادتیں اور خصلتیں اور خود اُن کی طبیعت نہ کہ بڑھاپا۔ جس شخص کی طبیعت میں انبساط و سکون ہے اس کے لیے عمر کی زیادتی کوئی بار نہیں۔ لیکن جن طبیعتوں کی افتاد اس کے برعکس ہے ان کے لیے جوانی بھی ویسی ہی بوجھل ہوتی ہے جیسے بڑھاپا۔

میں نہایت توجہ کے ساتھ یہ ساری تقریر سُنتا رہا اور اس ارادے سے کہ یہ سلسلہ جاری رہے۔ میں نے کہا: بے شک آپ صحیح فرماتے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ اپنے ہم عمر لوگوں کو تو ان باتوں سے قائل نہ کر پاتے ہوں گے۔ کیونکہ غالباً ان کے نزدیک آپ پر جو عمر کی زیادتی گراں نہیں گزرتی اس کا سبب آپ کی فطرت اور طبیعت کی افتاد نہیں بلکہ آپ کی دولت ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ دولت سکون و راحت پیدا کرنے کا کیسا قوی وسیلہ ہوتی ہے۔

کیفیلس نے کہا: آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ بے شک وہ لوگ قائل نہیں ہوتے اور سچ تو یہ ہے کہ ان کی بات میں بھی کچھ سچائی ضرور ہے، لیکن اتنی نہیں جتنی کہ وہ غلطی سے سمجھتے ہیں۔ میں ایسے موقع پر ان لوگوں کو وہی جواب دیتا ہوں جو تھیمسٹوکلس (Themistocles) نے ایک سیریفی (Seriphian) کو دیا تھا۔ آپ نے تو غالباً وہ قصہ سُنا ہوگا۔ سیریفی اپنے مخاطب کو ملامت کر رہا تھا اور اس کی شہرت اور اس کی خوبیوں کو ایتھنز کا باشندہ ہونے پر محمول کرتا تھا نہ کہ خود اس کے ذاتی جوہر پر، تھیمسٹوکلس نے کیا خوب جواب دیا کہ ''بے شک میں آپ کے ملک کا رہنے والا ہوتا تو مجھے یہ شہرت نصیب نہ ہوتی۔ لیکن آپ تو ایتھنز کے باشندے ہو کر بھی یہ امتیاز حاصل نہ کر پاتے''۔ اس قسم کا جواب میں اُن لوگوں کو دیتا ہوں جو غربت کی وجہ سے عمر کی زیادتی کے شاکی ہیں۔ بلاشبہ ممکن ہے کہ ایک مفلس اور نادار شخص کو باوجود نیک دلی بڑھاپا گراں گزرے لیکن ساتھ ہی یہ بھی تو یقینی ہے کہ ایک بدطینت شخص کو تو دولت بھی دل کا سکون نہیں بخش سکتی۔

کیفیلس کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کی ساری دولت خود آپ کی کمائی ہوئی ہے یا ورثے میں آپ کو ملی تھی؟

کیفیلس نے کہا: میری کمائی ہوئی! شاید آپ یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس کا کتنا حصہ میرا کمایا ہوا ہے۔ دنیا کمانے کے معاملے میں میں اپنے دادا اور والد کے بین بین ہوں۔ دادا مرحوم کو (جن کا میں ہم نام ہوں) جس قدر جائیداد ملی تھی اُسے اُنھوں نے جیتے جی دوگنا بلکہ تگنا کر دیا تھا لیکن والد مرحوم کے زمانے میں اس کا بہت سا حصہ کم ہو گیا۔ چنانچہ میری موجودہ جائیداد سے بھی اُن کے زمانے میں کچھ کم رہ گئی تھی۔ میرے لیے یہ اطمینان بہت ہے کہ میں اپنے وارثوں کے لیے اپنے دادا کی جائیداد کو بلا کم کیے بلکہ کچھ تھوڑے بہت اضافے کے ساتھ چھوڑ جاؤں گا۔

میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ آپ مال و دولت کی طرف سے کچھ بے نیاز سے معلوم ہوتے ہیں اور یہ بات اکثر ان لوگوں میں پائی جاتی ہے جن کو یہ چیزیں بلا ذاتی محنت اور کاوش کے ورثے میں مل جاتی ہیں۔ یوں تو افادے کے خیال سے مال سے کسے محبت نہیں ہوتی لیکن جو لوگ ذاتی کوشش سے دولت پیدا کرتے ہیں اُنھیں اس سے کچھ مزید تعلق سا ہو جاتا ہے، اور چونکہ یہ اُسے اپنی محنت کا پھل جانتے ہیں اس لیے اُنھیں دولت سے ایسی ہی الفت ہو جاتی ہے جیسے شاعر کو اپنے شعر سے یا ماں باپ کو اپنی اولاد سے۔ خدا ایسے لوگوں کی صحبت سے بچائے رکھے، ان بے چاروں کے پاس سوائے دولت کے گُن گانے کے اور کوئی بات

کرنے کو ہوتی ہی نہیں۔

اس نے کہا: یہ سچ ہے۔

ہاں، یہ تو ضرور سچ ہے، مگر میں ذرا ایک بات اور پوچھوں۔ یہ تو فرمایئے کہ آپ نے اپنی دولت سے سب سے بڑا فائدہ کیا حاصل کیا؟

اس نے کہا: میں آپ کو بتاؤں تو ضرور لیکن اکثر لوگ میرے قول کو باور کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ خیر، سُنیے۔ جب انسان زندگی کی دلچسپیاں ختم کرنے کے بعد موت کے قریب ہوتا ہے تو طرح طرح کے خیال اور طرح طرح کے ڈر اُس کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں جن کاموں کے کرتے وقت اس کو کسی قسم کا خیال بھی نہ ہوا تھا، اب اُن پر مواخذہ کا خوف اُس کو ستاتا ہے۔ عقبیٰ اور آخرت کی روایتیں، جو اب تک محض افسانہ معلوم ہوتی تھیں، اب اُن کے سچ ہونے کا امکان اس کو پریشان کرتا ہے اور یا تو بڑھاپے کی کمزوری کی وجہ سے یا اُس دوسرے عالم سے دم بدم قریب ہونے کے سبب سے یہ خیال دن بہ دن زیادہ زور پکڑتے جاتے ہیں۔ اس کی روح پر خوفناک شبہات چھا جاتے ہیں اور بالآخر وہ اپنے اعمال کی نیکی اور بدی کا جائزہ لینا شروع کرتا ہے۔ بُرے اعمال کی گراں باری کے احساس کے ساتھ ہی قوتِ متخیلہ اُس کے سامنے اُس کے مستقبل کو بڑی تاریک شکل میں پیش کرتی ہے اور وہ ڈر کے مارے بچوں کی طرح نیند میں چونک چونک پڑتا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے عمل کے دامن کو گناہوں کی گرد سے پاک پاتا ہے تو جزا کی اُمید اُس کے بڑھاپے کو پُرسکون بنا دیتی ہے۔ پنڈر (Pindar) نے کیا خوب کہا ہے:

> ''آس اور اُمید ان لوگوں کی روحوں کی پرورش کرتی ہے جو عدل اور پاکی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ ان کی شریکِ راہ ہوتی ہے اور ایامِ پیری میں مونسِ جان نواز کا کام کرتی ہے۔ انسان کی بے چین اور پریشان روح کو سکون بخشنے کے لیے اس سے قوی اور کون سی طاقت ہے''۔

اس کے یہ الفاظ کتنے قابلِ تعریف ہیں۔ ہر شخص کے لیے تو نہیں لیکن ایک نیک خصلت انسان کے لیے دولت کی یہ سب سے بڑی برکت ہے کہ اُسے ارادے سے یا بے ارادہ جعل اور فریب سے محفوظ رکھتی ہے اور جب وہ دوسری دُنیا کا سفر شروع کرتا ہے تو اُس کی رُوح ان خیالوں سے پریشان نہیں ہوتی کہ اس کی گردن پر کسی کے قرض کا بوجھ ہے یا کسی دیوتا کی قربانی ادا کرنے سے رہ گئی ہے۔ دولت اس سکونِ قلب کے

حاصل کرنے میں بڑی حد تک مدد کرتی ہے اور اگر مقابلہ کیا جائے تو میرے نزدیک دولت کا یہ فائدہ (کہ اس سے انسان کو عدل کرنے میں مدد ملتی ہے) دوسرے فائدوں سے کہیں زیادہ وقیع ہے۔

میں نے جواب دیا: بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے کیفیلس۔ لیکن آپ نے اس تقریر میں عدل کا جو ذکر کیا اس سے کیا مطلب ہے؟ کیا اس کی منشا صرف سچ بولنا اور قرض ادا کر دینا ہے اور بس؟ اور کیا اس تعریف میں مستثنیات نہیں؟ مثلاً فرض کیجیے کسی دوست نے بہ ثبات عقل و ہوش میرے پاس کچھ ہتھیار امانت رکھوائے۔ کچھ عرصے بعد اس بے چارے کا دماغ خراب ہو گیا اور اسی حالت میں اس نے مجھ سے یہ ہتھیار واپس مانگے۔ کیا میرا فرض ہے کہ میں یہ امانت واپس کر دوں؟ غالباً کوئی نہ کہے گا کہ میں ایسا کروں اور اگر میں کروں تو شاید کوئی شخص اسے ٹھیک نہیں سمجھے گا اور نہ شاید کوئی یہ کہے گا کہ ایسی حالت میں اس آدمی سے ہمیشہ سچ ہی بولا جائے۔

اس نے کہا: آپ بجا فرماتے ہیں۔

میں نے کہا: یعنی سچ بولنا اور قرض ادا کرنا عدل کی تعریف نہ ہوئی۔

پولیمارکس نے بات کاٹ کر کہا: کیوں؟ سقراط! اگر آپ سیمونیڈس (Simonides) کی بات مانیں تو پھر تو یہی صحیح تعریف ہے۔

کیفیلس نے کہا: میں نے ذرا قربانی کا انتظام کرنا ہے اس لیے مجھے تو اب اجازت دیجیے۔ بحث کا سلسلہ پولیمارکس اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھ میں چھوڑے جاتا ہوں۔

میں نے کہا: ہاں کیوں نہیں، یہ حق تو پولیمارکس کو ورثے میں بھی پہنچتا ہے۔

کیفیلس نے جواب دیا: جی ہاں، یقیناً اور یہ کہہ کر مسکراتے ہوئے قربانی کی رسم ادا کرنے چلے گئے۔

میں نے پولیمارکس سے کہا: اس بحث کے وارث آپ ٹھہر چکے تو اچھا فرمایئے۔ آپ کے سیمونیڈس صاحب کیا فرماتے ہیں اور آپ کی رائے میں ٹھیک کہتے ہیں وہ؟

اس نے کہا: بقول اس کے ادائے قرض یا واجب الادا چیزوں کی واپسی عدل ہے اور میری رائے میں اس کا یہ قول صحیح ہے۔

میں نے کہا: سیمونیڈس جیسے فہیم اور دانشمند شخص کی رائے سے اختلاف کرنا میرے لیے سہل نہیں ہے

لیکن کیا کروں میں اس کا اصلی مفہوم نہیں سمجھ پایا۔شاید آپ سمجھ گئے ہوں۔ کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ جیسے ہم ابھی کہہ چکے ہیں اس کے نزدیک بھی یہ تو ہرگز مناسب نہ ہوگا کہ دماغ خراب ہونے کی صورت میں ہتھیاروں کی امانت کسی شخص کو واپس کی جائے۔لیکن اس سے بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ امانت واجب الادا ہوتی ہے۔

پولیمارکس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: تو اگر امانت رکھنے والے کا دماغ صحیح حالت میں نہ ہو تو مجھ پر امانت کا واپس کرنا واجب نہیں؟

پولیمارکس نے کہا: ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: کیا سیمونیڈس نے اپنی تعریف میں یہ مثال شامل نہیں کی تھی اور وہ جو قرض ادا کرنے کو عدل سے تعبیر کرتا ہے تو اُس کا مفہوم کچھ اور ہے؟

پولیمارکس نے کہا: بے شک اور ہے، کیونکہ اس کے نزدیک دوست کا فرض ہے کہ دوست کے ساتھ ہمیشہ نیکی کرے اور بدی سے باز رہے۔

میں نے کہا: تمھاری رائے میں اگر میرے پاس کسی دوست کے زر و جواہر امانت رکھے ہوں اور ان کی واپسی سے اُس دوست کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں اس امانت کا واپس کرنا ادائے قرض نہیں ہے۔غالباً آپ کے خیال میں سیمونیڈس کا یہی مطلب ہے؟

پولیمارکس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: پھر کیا دشمنوں کو ان کی واجب الادا چیز واپس دینی چاہیے یا نہیں؟

اس نے کہا: بے شک واپس کر دینی چاہیے۔لیکن میرے خیال میں دشمن کے لیے تو بُرائی ہی واجب للادا (یعنی مناسبِ حال) ہے۔

میں نے کہا: گویا سیمونیڈس نے شاعروں کی طرح عدل کی تعریف اور اس کی ہیئت صاف لفظوں میں بیان نہیں کی بلکہ اُسے ایک چیستاں اور مُعمّا بنا دیا۔ کیونکہ اس کا مطلب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے فریق کو وہ چیز دی جائے جو اس کے لیے مناسب ہے اور اس مناسب شے کا نام اس نے واجب الادا چیز یا قرض رکھا ہے۔

پولیمارکس نے کہا: غالباً اس کا مطلب یہی ہے جو آپ فرماتے ہیں۔

میں نے جواب دیا: لاریب۔ لیکن اگر اُس سے کوئی یہ پوچھتا کہ فنِ طب کون سی مناسب چیز دیتا ہے اور کسے دیتا ہے تو وہ کیا جواب دیتا؟

پولیمارکس نے کہا: اس کا جواب یقیناً یہ ہوتا کہ فنِ طب آدمی کے بدن کو دوائیں اور غذائیں دیتا ہے۔

میں نے کہا: اور فنِ طباخی کیا دیتا ہے اور کسے؟

اس نے کہا: کھانے کو مزہ۔

میں نے پوچھا: تو پھر عدل کیا دیتا ہے اور کسے دیتا ہے؟

اس نے کہا: اگر اسی تمثیل کے مطابق جواب دیا جائے تو عدل اس فن کا نام ہے جو دوستوں کو بھلائی (اور فائدہ) اور دشمنوں کو بُرائی (اور نقصان) دیتا ہے۔

میں نے پوچھا: اچھا تو عدل سے سیمونیڈس کا یہ مطلب ہے؟

اس نے کہا: میں تو یہی سمجھتا ہوں۔

میں نے کہا: بیماری کی حالت میں کون شخص دوستوں کو فائدہ اور دشمنوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے؟

اس نے کہا: طبیب۔

میں نے کہا: اور اگر سمندر کے سفر میں کسی خطرے کا سامنا ہو تو کون؟

اُس نے کہا: ناخُدا۔

میں نے کہا: ہاں تو اعمال کی وہ کون سی قسم ہے جس میں ایک عادل اور منصف شخص اپنے دشمنوں کو ضرر اور دوستوں کو فائدہ پہنچانے کے قابل ہوتا ہے۔

اس نے کہا: پہلے سے جنگ کرنے میں اور دوسرے سے دوستی کے رشتے قائم کرنے میں۔

میں نے کہا: اچھا ذرا یہ بھی بتا دیجیے کہ تندرستی میں تو طبیب کی ضرورت نہیں ہوتی؟

اس نے کہا: جی نہیں۔

میں نے کہا: اور اگر سمندر کا سفر درپیش نہ ہو تو ناخدا کی ضرورت نہیں پڑتی۔

اس نے کہا: نہیں۔

میں نے کہا: اسی طرح زمانہ امن میں عدل وانصاف کی کوئی ضرورت نہ ہوگی؟

اس نے کہا: میں تو ہرگز ایسا نہیں سمجھتا۔

میں نے کہا: تو کیا تمھاری رائے میں عدل اور انصاف، جنگ اور امن دونوں حالتوں میں یکساں کارآمد ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: جیسے امن کے زمانے میں غلہ فراہم کرنے کے لیے کھیتی کا کام؟

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: یا جُوتے فراہم کرنے کے لیے موچی کا کام۔

اس نے کہا: جی۔

میں نے کہا: اسی طرح یہ بتائیے کہ امن کے زمانے میں عدل کی ضرورت کس چیز کی فراہمی کے لیے پڑتی ہے؟

اس نے کہا: معاہدوں کی ترتیب اور تکمیل کے لیے۔

میں نے کہا: معاہدوں سے غالباً آپ کا مطلب کاروبار کی شراکت ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: لیکن فرض کیجیے شطرنج کھیلنے میں آپ کو کسی شریک کی ضرورت ہو تو اس کھیل کا ماہر آپ کے لیے زیادہ مفید ہوگا یا ایک عادل اور منصف شخص۔

اس نے کہا: یقیناً اس کھیل کا ماہر زیادہ مفید ہوگا۔

میں نے کہا: اور اگر مکان بنانے کے سلسلہ میں یہ ضرورت ہو تو معمار زیادہ کارآمد ہوگا یا ایک عادل اور منصف آدمی؟

اس نے کہا: معمار زیادہ مفید ہوگا۔

میں نے کہا: جیسے ان تمام معاملوں میں ان مختلف کاموں کا ماہر زیادہ مفید ہوتا ہے، ویسے ہی یہ فرمائیے کہ عادل شخص کی شرکت کس خاص معاملے میں زیادہ کارآمد اور مفید ثابت ہوگی؟

اس نے کہا: روپیہ اور مال کے لین دین کے معاملے میں۔

میں نے کہا: صحیح۔ لیکن جب روپے کو استعمال کرنے کا معاملہ ہو تو غالباً ایسے شخص کی شرکت کچھ ایسی

مفید نہیں ہوگی۔ کیونکہ مثلاً اگر ایک گھوڑے کی خریدنے یا بیچنے کا مسئلہ درپیش ہو تو ایسی صورت میں کس کا مشورہ زیادہ مفید ہوگا ایک عادل شخص کا یا ایک ایسے آدمی کا جو گھوڑوں کی پہچان میں اچھی مہارت رکھتا ہو؟ شاید اسی دوسرے آدمی کا ہوگا!

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور اگر کوئی جہاز خریدنا ہو تو غالباً ایک ملاح یا جہاز ران زیادہ مفید ہوگا۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: تو پھر سونے چاندی کا وہ کون سا استعمال ہے۔ جس میں ایک عادل شخص زیادہ مفید ثابت ہوگا۔

اس نے کہا: جب آپ کو اپنا روپیہ یا مال حفاظت کے ساتھ رکھوانا ہو۔

میں نے کہا: یعنی آپ کے خیال میں اس وقت جب روپیہ بے کار پڑا ہے اور کام میں نہ آئے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: ہاں تو یوں نہ کہیے کہ عدل اُس وقت کار آمد ہوتا ہے جب مال کو بے کار رکھنا ہو۔

اس نے کہا: اور کیا، نتیجہ تو یہی نکلتا ہے۔

میں نے کہا: اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر آپ ایک باغبانی کے کسی اوزار کو حفاظت سے مگر بے کار رکھوانا چاہتے ہیں، اس وقت تو عدل کی ضرورت ہوگی اور اگر اسے کام میں لانے کا خیال ہو تو ایسی حالت میں باغبانی کا فن زیادہ مفید اور کار آمد ہوگا۔

اس نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: اسی طرح اگر آپ ایک تلوار یا ایک رباب کو بے کار رکھنا چاہیں، اس وقت تو عدل مفید ہے ورنہ سپہ گری یا موسیقی کے فن۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: گویا عدل اس وقت مفید ہوتا ہے جب چیزیں بے کار ہوں اور اگر ان چیزوں کو کار آمد بنایا جائے تو یہ بے کار ہو جاتا ہے۔

اس نے کہا: اور کیا!

میں نے کہا: پھر عدل تو کچھ ایسی کار آمد اور مفید چیز نہ ہوئی، لیکن ہاں ایک اور بات سُنیے ۔اگر کوئی شخص مکا بازی کے مقابلے میں یا اور کسی لڑائی میں اپنے حریف پر اچھا وار کر سکتا ہے تو غالباً وہ وار بچانے کی قابلیت بھی اچھی طرح رکھتا ہوگا؟

اس نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: اور جو اشخاص بیماریوں سے محفوظ رہنے اور اُن کا علاج کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں وہی بیماریاں پھیلانے کی بھی پوری قابلیت رکھتے ہوں گے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: جو چوری چُھپے سے دشمن کے گھروں پر حملہ کر سکے وہ اپنے گھر کی بخوبی حفاظت بھی کر سکتا ہے۔

اس نے کہا: ہاں۔

میں نے کہا: یعنی کسی چیز کا اچھا محافظ اُس کا شاطر چور بھی ہوتا ہے!

اس نے کہا: جی ہاں اور کیا؟

میں نے کہا: یعنی جو شخص مال کا اچھا محافظ ہو سکتا ہے اُس میں مال چُرانے کی بھی صلاحیت ہوتی ہے۔

اس نے کہا: نتیجہ تو یہی نکلتا ہے۔

میں نے کہا: تو اس تمام گفتگو کا ماحصل یہ نکلا کہ عادل شخص ایک قسم کا چور ہوتا ہے! غالباً آپ نے یہ سبق ہومر (Homer) سے سیکھا ہے کہ وہ اپنے ایک ممدوح اوڈیسیس (Odysseus) کے نانا آٹولیکس (Autolycus) کی تعریف کرتے ہوئے فخریہ بیان کرتا ہے کہ:

''وہ چوری اور دروغ حلفی میں اپنے تمام ہم جنسوں میں بے مثل تھا''۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہومر اور سیمونیڈس کی طرح آپ کی رائے میں بھی عدل ایک طرح کا چوری کا فن ہے۔ البتہ اس کا مقصد آپ صاحبوں کے نزدیک دوستوں کو نفع اور دشمنوں کو ضرر پہنچانا ہے۔ کیوں آپ یہی تو کہہ رہے ہیں نا؟

پولیمارکس نے کہا: نہیں میرا ہرگز یہ مطلب نہیں۔ نہ معلوم باتوں باتوں میں میں کیا کہہ گیا۔

بہر حال میں ابھی تک اپنی پہلی تعریف پر قائم ہوں کہ دوست کی مدد کرنا اور دشمن کو ضرر پہنچانا عدل ہے۔

میں نے کہا: لیکن یہ تو فرمائیے کہ دوست اور دشمن آپ کسے کہتے ہیں؟ آیا وہ لوگ مقصود ہیں جو فی الحقیقت دوست یا دشمن ہیں یا وہ جو بظاہر ایسے لگتے ہیں؟

اس نے کہا: ایک انسان سے یقیناً یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان لوگوں سے مانوس ہو جو اس کے نزدیک نیک ہیں اور ان سے نفرت کرے جنھیں وہ بُرا سمجھتا ہے۔

میں نے کہا: لیکن کیا لوگ نیک اور بد کی تمیز میں اکثر غلطی نہیں کرتے؟ بہت سے آدمی جو حقیقتاً بُرے ہیں دیکھنے میں بہت اچھے لگتے ہیں اور اس کے برعکس اکثر اچھے لوگوں پر بدی کا گمان ہوتا ہے۔

اس نے کہا: اس میں کیا شک ہے؟

میں نے کہا: ایسی صورت میں اکثر ایسا ہوگا کہ نیک لوگ ایک شخص کے دشمن اور بد لوگ اس کے دوست ہوں۔

اس نے کہا: جی ہاں! درست ہے۔

میں نے کہا: کیا ایسی حالت میں بُرے لوگوں کے ساتھ نیکی اور نیک افراد سے بدی کرنا جائز ہے۔

پولیمارکس نے کہا: ہاں بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے۔

میں نے کہا: لیکن نیک لوگ تو عادل ہوتے ہیں اور کوئی غیر منصفانہ بات نہیں کرتے۔

پولیمارکس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: تو آپ کی رائے میں اُن لوگوں کو ضرر پہنچانا جائز ہے جو غلطی کے مرتکب نہیں ہوتے۔

پولیمارکس نے کہا: نہیں نہیں سقراط، یہ خیال تو اُصول اخلاق کے بالکل منافی ہے۔

میں نے کہا: شاید آپ کا مطلب یہ ہے کہ عادل کے ساتھ نیکی اور ظالم کے ساتھ بدی کی جائے۔

اس نے کہا: جی ہاں یہ زیادہ مناسب ہے۔

میں نے کہا: لیکن ذرا اس کے نتائج پر بھی غور کیجیے۔ اکثر لوگ انسانی فطرت سے ناواقفیت کے باعث ایسے آدمیوں کو دوست رکھتے ہیں جو حقیقت میں بُرے ہیں۔ کیا ایسی صورت میں ان لوگوں چاہیے کہ اپنے دوستوں کو ضرر پہنچائیں۔ اسی طرح اکثر نیک لوگوں سے دشمنی بھی ہوتی ہے تو کیا اُنھیں فائدہ پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیے؟ اگر آپ کا جواب اثبات میں ہے تو آپ گویا سیمونیڈس کی تعریف کی

مخالفت کرتے ہیں۔

پولیمارکس نے کہا: آپ صحیح فرماتے ہیں۔ لیکن گفتگو کی ابتدا میں ہم سے ایک غلطی دوست اور دشمن کے معنی بیان کرنے میں ہوگئی ہے۔ مناسب ہے کہ اُسے ٹھیک کرلیا جائے۔

میں نے کہا: غلطی کیا ہے، پولیمارکس؟

پولیمارکس نے کہا: ہم نے دوست سے مراد وہ شخص لیا تھا جو بظاہر ہمارے نزدیک نیک معلوم ہوتا ہو۔

میں نے کہا: اور اب آپ اس غلطی کو ٹھیک کس طرح کرنا چاہتے ہیں، پولیمارکس؟

پولیمارکس نے کہا: میرے خیال میں دوست وہ شخص ہے جو دیکھنے میں ہی نہیں بلکہ سچ مچ نیک ہو اور اگر وہ سچ مچ نیک نہیں تو وہ حقیقی نہیں بلکہ ظاہری دوست ہے اور دشمن کے بارے میں بھی یوں ہی قیاس کرلیجیے۔

میں نے کہا: گویا آپ کے نزدیک صرف نیک لوگ ہمارے دوست اور بد ہمارے دشمن ہیں۔

پولیمارکس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور اب آپ یہ فرمانے کے بجائے کہ عدل کے معنی دوستوں سے نیکی اور دشمنوں سے بدی کرنا ہیں، یہ ترمیم کرنا چاہتے ہیں کہ دوستوں کے ساتھ بشرطیکہ وہ نیک ہوں، بھلائی کی جائے اور دشمنوں سے، بشرطیکہ وہ بُرے ہوں، بُرائی۔

پولیمارکس نے کہا: جی ہاں۔ یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

میں نے کہا: کیا عادل شخص کسی کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے!

پولیمارکس نے کہا: بے شک۔ اس کا فرض ہے کہ ان دشمنوں کو جو سچ مچ بُرے ہیں ضرر پہنچائے۔

میں نے کہا: اچھا ایک بات اور بتایئے۔ اگر کوئی گھوڑا زخمی ہوجائے تو وہ ترقی کرے گا یا تنزل؟

پولیمارکس نے کہا: ظاہر ہے تنزل کرے گا۔

میں نے کہا: اپنی مخصوص صفتوں میں تنزل کرے گا یا کسی دوسرے اعتبار سے؟

پولیمارکس نے کہا: اپنی مخصوص صفتوں میں تنزل کرے گا۔

میں نے کہا: اسی طرح ایک کتا مجروح ہونے کے بعد اپنی خاص صفتوں میں تنزل کرے گا۔

پولیمارکس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اسی طرح اگر کوئی انسان مجروح ہو یا اُسے ضرر پہنچایا جائے تو وہ ان صفتوں میں تنزل کرے گا جو انسان کے ساتھ مخصوص ہیں۔

پولیمارکس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اور کیا انسان کی یہ خصوصی صفت عدل نہیں ہے؟

پولیمارکس نے کہا: یقیناً ہے۔

میں نے کہا: مگر یہ تو فرمائیے کہ کوئی موسیقی کا ماہر اپنے فن سے دوسرے لوگوں کی طبیعتوں کو غیر موزوں بنا سکتا ہے۔

پولیمارکس نے کہا: یہ کیسے ممکن ہے؟

میں نے کہا: اسی طرح ایک شہسوار دوسرے لوگوں کو بُرا اسوار نہیں بنا سکتا۔

پولیمارکس نے کہا: ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: پھر کیا ایک عادل شخص اپنے عدل کی وجہ سے دوسروں کو غیر منصف اور ظالم یا ایک نیک شخص اپنی نیکی کے ذریعے دوسروں کو بُرا بنا سکتا ہے؟

پولیمارکس نے کہا: یقیناً نہیں۔

میں نے کہا: اور کیا؟ میرے خیال میں تو یہ بات اتنی ہی ناممکن ہے جتنی یہ کہ گرمی سے سردی پیدا ہو۔

پولیمارکس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: یا خشکی سے تری۔

پولیمارکس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: تو یہ طے ہوا کہ نیک آدمی کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔

پولیمارکس نے کہا: ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: اور نیک آدمی عادل ہوتا ہے؟

پولیمارکس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: گویا درست ہو یا کوئی اور، عادل شخص کا یہ کام ہرگز نہیں کہ اُسے ضرر پہنچائے بلکہ اس

کے برعکس یہ تو ظالم اور بے ایمان آدمیوں کا کام ہے۔

پولیمارکس نے کہا: آپ کا خیال بالکل بجا ہے۔

میں نے کہا: اب غور کیجیے کہ ایک شخص کہتا ہے کہ عدل قرض یا واجب الادا چیزوں کے ادا کرنے کا نام ہے اور اس کے ساتھ یہ تشریح بھی کرتا ہے کہ دوستوں کے لیے واجب الادا چیز نیکی ہے اور دشمنوں کے لیے بدی، تو میں تو اسے کوئی دانشمندی کی بات نہیں مانتا اس لیے کہ یہ سچی بات نہیں ہے اور مجھے یہ اُمید ہے کہ آپ اس میں مجھ سے متفق ہوں گے کیونکہ ہماری گفتگو نے طے کر دیا ہے کہ کسی کو ضرر پہنچانا عدل کا کام نہیں ہو سکتا۔

پولیمارکس نے کہا: میں ضرور آپ سے متفق ہوں۔

میں نے کہا: تو اب اگر کوئی شخص اس نامعقول قول کو سیمونیڈس ، بیاس (Bias) یا پیٹاکس (Pittacus) کی طرف منسوب کرے یا مشاہیر میں سے کسی اور کی طرف، تو ہمیں اس کی مخالفت اور تردید کرنی چاہیے۔

پولیمارکس نے کہا: میں اس حقیقت کے انکشاف میں آپ سے بالکل متفق ہوں اور آپ کا ساتھ دینے پر بخوشی آمادہ۔

میں نے کہا: میں آپ کو بتاؤں کہ میرے نزدیک یہ کس کا قول ہے؟

پولیمارکس نے کہا: فرمائیے۔

میں نے کہا: میں سمجھتا ہوں کہ یہ کسی متمول اور باثروت آدمی کا قول ہے جسے اپنی جاہ و دولت پر بہت ناز تھا، مثلاً پیری اینڈر (Periander) یا پرڈیکاس (Perdiccas) یا زریکس (Xerxes) یا تھیبا کے اسمینیاس (Ismenias the Theban)۔

پولیمارکس نے کہا: آپ فرماتے تو سچ ہیں۔

میں نے کہا: اچھا یہ تعریف تو غلط ثابت ہوئی۔ اب کہیے عدل کی صحیح تعریف کیا ہے؟

اثنائے گفتگو میں تھریسی میکس بار بار ہماری بات کاٹ کر بولنا چاہتے تھے لیکن تمام حاضرینِ مجلس چونکہ ہماری گفتگو کا نتیجہ سُننا چاہتے تھے اس لیے اُنھیں دبا دیا جاتا تھا۔ لیکن جب ہمارا یہ سلسلۂ کلام ختم ہوا اور تھوڑی دیر خاموشی رہی تو تھریسی میکس چپ نہ رہ سکے اور اپنی تمام قوت مجتمع کر کے ہم پر حملہ شروع کر ہی دیا جیسے کوئی جنگلی درندہ ہمیں نگل جانے کے لیے جھپٹا مارے اور اس شد و مد سے کہ ہم تو سہم سے گئے۔

بہت زور سے چلا چلا کر فرمانے لگے: ''جناب والا سقراط، آپ سب پر آخر یہ کیا حماقت سوار ہوگئی ہے؟ مگر سچ تو یہ ہے کہ آپ لوگ ملی کشتی خوب لڑتے ہیں۔ اگر آپ کو واقعی عدل اور انصاف کی ماہیت دریافت کرنا منظور ہے تو صرف جرح پر اکتفا نہ کیجیے۔ خود بھی تو کچھ فرمائیے۔ کسی کی بات کو رد کر دینا بہت آسان ہے، لیکن خود کچھ کہنا مشکل۔ سوال ہر کوئی کر سکتا ہے، جواب دینا البتہ سہل نہیں۔ لیکن ہاں یہ پہلے ہی جتا دوں کہ کہیں عدل کی کوئی ایسی چلتی ہوئی تعریف نہ کر دیجیے گا کہ کسی کی غرض ہے یا ایک چیز ہے واجب یا کارآمد یا نافع یا مفید۔ میں ایسی گول باتوں کو نہیں مانتا۔ میں تو جچی تلی اور صاف بات چاہتا ہوں''۔

ان بزرگ نے کچھ ایسے زور سے تقریر کی کہ میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی اور اگر آنکھیں نیچی نہ کر لیتا تو شاید بالکل جواب نہ دے سکتا مگر دیکھا کہ اُن کا غصہ تو بڑھتا ہی جاتا ہے تو میں نے مناسب خیال کیا کہ کچھ عرض کروں۔

میں نے کہا: تھریسی میکس! اتنے ناراض نہ ہوں۔ ممکن ہے باتیں کرتے ہوئے مجھ سے یا پولیمارکس سے کوئی غلطی ہوگئی ہو، لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ غلطی جان کر نہیں کی گئی۔ سچ فرمائیے اگر ہم دونوں اس وقت ایک سونے کے ٹکڑے کی تلاش میں مصروف ہوتے تو شاید آپ کو ہمارے ملی کشتی لڑنے کا گمان نہ ہوتا۔ آپ غالباً کبھی یہ نہ خیال فرماتے کہ ایک دوسرے کی خاطر یہ لوگ اس قیمتی ٹکڑے کے حصول کے لیے دل و جان سے کوشاں نہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر آپ یہ شبہ کیوں کرتے ہیں کہ ہم حق کی تلاش اور عدل کی ماہیت کے معلوم کرنے میں ایک دوسرے کی مروت سے دب جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ چیز سونے کے بہت سے ٹکڑوں سے بھی کہیں زیادہ بیش بہا اور قیمتی ہے۔ برادرِ عزیز! آپ کا یہ خیال صحیح نہیں کہ ہم حق کی تلاش میں پوری محنت صرف نہیں کرتے۔ ہم تو سخت کوشش کرنے کو تیار ہیں لیکن کیا کریں اس گنج گراں مایہ کا کہیں پتا نہیں چلتا۔ ممکن ہے آپ اس سے واقف ہوں۔ لیکن پھر بھی ہماری لاعلمی پر خفا ہونے کی کیا وجہ۔ آپ کو تو ہم پر افسوس اور رحم کرنا چاہیے۔

تھریسی میکس نے حقارت آمیز تبسم کے ساتھ جواب دیا: آپ نے کس قدر ''سقراطیت'' فرمائی ہے۔ واہ واہ۔ یہی آپ کا مخصوص طرز طعن ہے۔ میں تو پہلے ہی سمجھتا تھا کہ یہ حضرت کسی سوال کا جواب نہ دیں گے۔ بلکہ طعن و تمسخر یا کسی اور تدبیر سے اُس کو ٹال جائیں گے۔

میں نے جواب دیا: آپ تو بڑے دانشمند آدمی ہیں، فلسفی بھی ہیں۔ آپ تو خوب سمجھ سکتے ہیں کہ

اگر ایک شخص سے پوچھا جائے کہ بارہ کا عدد کیا ظاہر کرتا ہے، اور ساتھ ہی اُسے منع کر دیا جائے کہ بھائی یہ نہ کہنا کہ بارہ چھ کا دوگنا، چار کا تین گنا، یا دو کا چھ گنا یا تین کا چوگنا ہے تو بے چارہ لامحالہ کچھ جواب نہ دے سکے گا اور وہ آپ سے پوچھ سکتا ہے کہ اگر آپ کے سوال کا جواب اُنہی میں سے ایک ہو تو پھر میں کیا کروں؟ کیا بجائے صحیح جواب کے کوئی غلط بات کہہ دوں؟ ایسی صورت میں آپ کیا فرمائیں گے؟

اس نے کہا: آپ تو ایسے پوچھ رہے ہیں گویا یہ دونوں صورتیں ایک سی ہیں۔

میں نے جواب دیا: کیا اس میں بھی کوئی شبہ ہے؟ اور اگر بفرضِ محال میں تسلیم بھی کر لوں کہ یہ یکسانیت حقیقی نہیں بلکہ صرف ظاہری ہے تو بھی کیا یہ بے جا بات نہیں کہ آپ ایک شخص کو اپنے اصلی خیالات کے اظہار سے منع کرتے ہیں۔

تھریسی میکس نے کہا: کہیے تو، آخر آپ کا ارادہ کیا ہے؟ شاید جناب ان ہی منع کیے ہوئے جوابات میں سے کوئی جواب دینا چاہتے ہیں!

میں نے کہا: کیا عجب ہے! ممکن ہے غور کرنے کے بعد میں ایسا ہی کروں۔

تھریسی میکس نے کہا: اور اگر میں ان سب سے بہتر جواب پیش کر دوں تو پھر آپ کی کیا سزا ہوگی؟

میں نے کہا: سزا؟ میری سزا یا جزا وہی ہوگی جو ہر جاہل بے علم آدمی کی ہوتی ہے یعنی عقل مندوں سے سبق لینا۔

تھریسی میکس نے کہا: خوب۔ اور کچھ جرمانہ نہ دلوایئے گا۔

میں نے کہا: اگر میرے پاس روپیہ ہوتا تو میں اس کے لیے بھی تیار تھا۔

گلوکون نے کہا، سقراط! آپ روپے پیسے کا خیال نہ کریں اور تھریسی میکس کو بھی روپے پیسے کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ سقراط کی طرف سے ہم لوگ روپے ادا کریں گے۔

تھریسی میکس نے جواب دیا: مگر صاحب، یہ حضرت تو وہی حرکت کریں گے جو ہمیشہ کیا کرتے ہیں، خود جواب دیں گے نہیں اور دوسرے کے جواب کو کسی نہ کسی طرح رد کر دیں گے۔

میں نے کہا: عزیزِ من! آپ کیا فرماتے ہیں؟ وہ غریب کیا جواب دے جو اوّل تو کچھ جانتا نہیں اور ساتھ ہی اپنے جہل کا احساس بھی رکھتا ہے اور فرض کیجیے وہ کچھ کہنا بھی چاہے تو آپ جیسا قابل شخص اُسے منع کرتا ہے۔ اس لیے مناسب تو یہی ہے کہ وہ شخص جواب دے جو اس معاملے میں علم کا مدعی ہے اور اپنا خیال

ظاہر کرنے میں آزاد بھی ہے۔ مجھ پر اور سب حاضرین پر آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ عدل کی کوئی تعریف پیش کریں۔

گلوکون اور دوسرے حاضرین نے بھی اس درخواست میں میری ہم نوائی کی۔ تھریسی میکس چونکہ بزعم خود بہت عمدہ تعریف پیش کرنے والے تھے اس لیے دراصل اظہارِ خیال کے لیے تیار ہی بیٹھے تھے لیکن ظاہر داری کے لیے تکلفاً مجھ سے اصرار کرتے رہے۔ لیکن بالآخر جواب دینے پر آمادہ ہوگئے۔ اس نے کہا حضرت سقراط کی عقلمندی تو ملاحظہ کیجیے کہ خود تو کچھ بتاتے نہیں، دوسروں ہی سے کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور پھر شکریہ تک ادا نہیں کرتے۔

میں نے جواب دیا: مجھے اس سے ہرگز انکار نہیں کہ میں ہمیشہ دوسروں سے کچھ نہ کچھ سیکھتا ہوں لیکن یہ سراسر غلط ہے کہ میں دوسروں کا احسان نہیں مانتا۔ ہاں چونکہ میرے پاس مال اور دولت نہیں ہے اس لیے صرف مدح اور تعریف اور اظہارِ تشکر پر بس کرتا ہوں اور دور کیوں جایئے میرے بیان کی تصدیق تو ابھی ہوئی جاتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ نہایت قابلیت کے ساتھ اپنا جواب پیش کرنے والے ہیں اور پھر دیکھ لیجیے گا کہ میں جس طرح ہر قابل شخص کی تعریف کرتا ہوں آپ کو داد دینے میں بھی ذرا کوتاہی نہ کروں گا۔

اس نے کہا: اچھا تو لیجیے، سنیے۔ عدل قوی فریق کے فائدے اور منافع اور اُس کے اغراض کی پابندی کا نام ہے۔ میرے نزدیک بس یہی عدل کی تعریف ہے.......... ہاں کچھ فرمایئے نا، اب داد دیجیے، تعریف کیجیے مگر آپ کیوں ایسا کرنے لگے۔

میں نے جواب دیا: ذرا ٹھہریے۔ میں پہلے سمجھ تو لوں۔ آخر آپ کا مفہوم کیا ہے۔ یہ معنی تو غالباً ہوں گے نہیں کہ چونکہ پنکراٹیا کا پولیڈیمس (Polydamas, the Pancratiast) ہم میں سب سے زیادہ مضبوط اور قوی ہے اور اپنی جسمانی قوت میں اضافے کے لیے گائے کا گوشت بکثرت کھاتا ہے اس لیے ہمارے لیے بھی گائے کا گوشت کھانا مناسب ہے۔

تھریسی میکس نے کہا: آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ الفاظ سے آپ ہمیشہ وہی معنی لیتے ہیں جس سے دوسرے فریق کی دلیل کمزور ہو جائے۔

میں نے کہا: آپ کا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ میں تو بس آپ کا اصلی مفہوم سمجھنا چاہتا ہوں۔ مہربانی فرما کر اپنا مطلب ذرا صاف لفظوں میں بیان کر دیجیے۔

تھریسی میکس نے کہا: بہت اچھا۔ آپ یہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ نظام حکومت کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں، کہیں شخصی حکومت ہوتی ہے کہیں طبقۂ امرا حکومت کرتا ہے اور کہیں جمہور کی حکمرانی ہوتی ہے۔

میں نے کہا: جی ہاں، میں جانتا ہوں۔

تھریسی میکس نے کہا: اور آپ غالباً یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ہر ریاست میں حکومت ہی قوی فریق اور بالا دست طاقت ہوتی ہے۔

میں نے کہا: یقیناً۔

تھریسی میکس نے کہا: حکومت کا یہی نظام خواہ شخصی ہو، امارتی ہو یا جمہوری اپنے مختلف اغراض کا خیال رکھ کر آئین و قوانین بناتا ہے اور ان ہی قوانین کے ذریعے جو ریاست کی اغراض کے پابند ہوتے ہیں اپنی رعایا میں عدل اور انصاف قائم رکھتا ہے۔ ان قوانین کی نافرمانی کرنے والوں کو غیر منصف یا ظالم تصور کر کے سزا دی جاتی ہے۔ چنانچہ تمام ریاستوں میں عدل کا ایک ہی اُصول ہے یعنی حکومت کی اغراض کا اتباع، اور چونکہ حکومت اور قوت میں چولی دامن کا ساتھ ہے اس لیے عدل کے معنی صرف قوی فریق کے اغراض کا پاس کرنا ہیں۔

میں نے کہا: میں آپ کا مفہوم سمجھ گیا ہوں اور اب دیکھنا یہ ہے کہ جناب کا ارشاد صحیح ہے یا غلط لیکن ہاں، یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ گفتگو کے شروع میں آپ نے مجھے منع فرمایا تھا کہ عدل کو کسی کی ''غرض'' سے تعبیر نہ کرنا اور اب آپ خود اُسے قوی فریق کے ''اغراض'' کے مرادف قرار دیتے ہیں۔

اس نے کہا: میں نے اس لفظ کے ساتھ جو اضافہ کیا ہے کیا وہ آپ کے نزدیک کچھ اہمیت نہیں رکھتا؟

میں نے کہا: خیر، اہم ہو یا غیر اہم۔ یہ تو محض بر سبیلِ تذکرہ تھا۔ اب تو سوال یہ ہے کہ جناب کا ارشاد صحیح ہے یا نہیں۔ آپ کے خیال میں عدل عبارت ہے قوی فریق کے اغراض کی پابندی سے، میں اس خیال کا موید نہیں ہوں۔ اس لیے آیئے ذرا تحقیق کریں۔

تھریسی میکس نے کہا: بہت اچھا، ضرور کیجیے۔

میں نے کہا: عدل و انصاف کا یہ تقاضا ہے یا نہیں کہ رعایا بالا دست حکام کی اطاعت کرے۔

تھریسی میکس نے کہا: بلا شبہ ہے۔

میں نے کہا: مگر کیا حکام بالکل معصوم ہوتے ہیں اور ان سے کسی غلطی کا ارتکاب ہو ہی نہیں سکتا؟

تھریسی میکس نے کہا: نہیں کیوں نہیں۔ یقیناً ان سے خطا کا احتمال ہے۔

میں نے کہا: تو قوانین کے نفاذ میں بھی ان سے کبھی نہ کبھی ضرور غلطی ہو گی۔

تھریسی میکس نے کہا: جی ہاں، اس میں کوئی شک نہیں۔

میں نے کہا: اگر حکومت نے ٹھیک قانون نافذ کیے تو وہ ضرور ان کے اغراض میں مدد دیں گے لیکن اگر اس میں غلطی ہوئی تو ان قوانین کا حکومت کے اغراض کے منافی ہونا بھی ممکن ہے۔

تھریسی میکس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور یہ آپ فرما ہی چکے ہیں کہ عدل کا تقاضا ہے کہ رعایا حکومت کے قوانین کی پابندی کرے۔

تھریسی میکس نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: یعنی عدل ہمیشہ قوی فریق کے اغراض کے مرادف نہیں بلکہ کبھی اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے؟

اس نے کہا: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

میرا خیال ہے کہ کیا رہا ہوں! آپ ہی کا کہا دُہرا رہا ہوں۔ ذرا پھر سوچ لیجیے کیا آپ نے یہ نہیں تسلیم کیا کہ بعض اوقات ممکن ہے کہ حکومت غلطی سے اپنے اغراض کے منافی قانون جاری کر دے اور آپ نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ عدل کا یہ تقاضا ہے کہ رعایا کو حکومت کے ہر حکم کی اطاعت کرنا لازم ہے۔ فرمایئے۔ یہ دونوں باتیں آپ تسلیم کرتے ہیں یا نہیں؟

تھریسی میکس نے کہا: جی ہاں کرتا ہوں۔

میں نے کہا: اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آپ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اگر قوانین کے نفاذ میں حکومت سے خطا ہو جائے تو ایسی حالت میں عدل قوی فریق کے اغراض کے منافی ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر جناب ہی کے ارشاد کے بموجب رعایا پر ریاست کے سب احکام کی پابندی لازمی ہے تو اس نتیجہ سے کوئی مفر نہیں۔ یہاں تو قوی فریق کمزور جماعت سے حکم دے کر وہ کام کراتا ہے جو خود اوّل الذکر کے مفاد کے خلاف ہیں۔

پولیمارکس نے کہا: بے شک۔ یہ بالکل صاف بات ہے۔

کلیٹوفون نے کہا: جی ہاں۔ کیوں نہیں۔ بس آپ ہی کے اعتراف اور شہادت کی ضرورت رہ گئی تھی!

پولیمارکس نے کہا: بھائی اس میں اعتراف یا شہادت کی کیا ضرورت ہے۔ تھریسی میکس نے تو خود تسلیم کیا ہے کہ بعض اوقات حکومت اپنی غرض کے خلاف قانون جاری کرتی ہے اور رعایا پر ان کی اطاعت بھی لازم ہے۔

کلیٹوفون نے کہا: نہیں۔ پولیمارکس، تھریسی میکس نے تو یہ کہا تھا کہ رعایا کے لیے حکام کی اطاعت کرنا عدل ہے۔

پولیمارکس نے کہا: میں نے مانا، لیکن انھوں نے یہ بھی تو کہا تھا کہ عدل طاقتور کے اغراض کا نام ہے اور ان دونوں باتوں کے ماننے کے بعد انھوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ بعض اوقات طاقتور حاکم غلطی سے اپنی کمزور رعایا کے لیے ایسے احکام بھی جاری کر سکتا ہے جو خود حاکم کے لیے مضر ہوں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر کبھی عدل طاقتور کے فائدے کا سبب ہوتا ہے تو کبھی اس کے نقصان کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔

کلیٹوفون نے کہا: لیکن قوی فریق کے اغراض سے تھریسی میکس کا مطلب ان اغراض سے تھا جنھیں یہ فریق خود اپنے لیے نفع کا موجب تصور کرے۔ کمزور پر ان اغراض کی پابندی لازمی ہے اور اسی کو اس نے عدل بتایا تھا۔

پولیمارکس نے کہا: تھریسی میکس کے الفاظ سے تو یہ مطلب نہیں نکلتا۔

میں نے جواب دیا: خیر یہ تو کوئی ایسی بات نہیں۔ اگر وہ اب بھی اپنی تعریف میں تبدیلی کرنا چاہیں تو میں اُسے قبول کرنے کو تیار ہوں (تھریسی میکس کو مخاطب کر کے) ہاں تو فرمایئے۔ کیا آپ کا مطلب یہی تھا کہ عدل سے مراد ان اغراض کی پابندی ہے جن میں طاقتور خود اپنا فائدہ سمجھے خواہ فی الحقیقت وہ فائدہ مند ہوں یا نہ ہوں۔

تھریسی میکس نے کہا: نہیں نہیں۔ آپ فرماتے کیا ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ طاقتور فریق سے غلطی ہو جانے کی صورت میں، میں اسے مخصوص اس غلطی کے اعتبار سے طاقتور سمجھ سکتا ہوں؟

میں نے کہا: میرے نزدیک تو آپ کا یہی خیال ہے۔ اس لیے کہ آپ نے خود ہی تھوڑی دیر پہلے فرمایا تھا کہ حکمران معصوم نہیں ہوتے اور ان سے غلطی ہونی ممکن ہے۔

تھریسی میکس نے کہا، سقراط! آپ تو خواہ مخواہ لفظی بحث کرتے ہیں۔ فرمایئے اگر ایک طبیب کسی

بیمار کے علاج میں غلطی کرے تو کیا باعتبار اس سہو یا غلطی کے آپ اُسے طبیب کہہ سکتے ہیں؟ یا اگر کوئی محاسب کسی سوال کے حل کرنے میں غلطی کرے تو کیا باعتبار اس غلطی کے اور اُس غلطی کے ارتکاب کے وقت آپ اُس شخص کو محاسب یا ریاضی دان کہہ سکتے ہیں؟ عام بول چال میں تو اس کو یوں بیان کرتے ہیں کہ فلاں طبیب یا محاسب نے غلطی کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی فن کا ماہر جب تک کہ وہ ماہر کے لقب کا مستحق ہے غلطی کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔ جہاں اس سے غلطی سرزد ہوئی وہ ماہر کہلانے کا اہل نہیں رہا۔ علاوہ بریں کوئی ماہر یا عقلمند شخص یا حاکم جب تک وہ ان لفظوں سے مخاطب کیا جاسکتا ہو غلطی نہیں کرسکتا۔ اور اگر آپ صحت کلام پر اتنے ہی مصر ہیں تو میں یہ عرض کرتا ہوں کہ حاکم، حاکم کی حیثیت سے سہو یا غلطی نہیں کرسکتا۔ اور اس لیے وہ کبھی اپنے اغراض کے منافی احکام اور آئین جاری نہیں کرسکتا بلکہ ہمیشہ ان احکام میں اپنی اغراض کا پاس رکھتا ہے اور ان احکام کی اطاعت رعایا پر لازمی ہے۔ چنانچہ میں عدل کی پہلی ہی تعریف پر قائم ہوں کہ یہ قوی تر جماعت کی احکام کی پابندی کا دوسرا نام ہے۔

میں نے کہا: تھریسی میکس! مجھے افسوس ہے کہ آپ کو میری گفتگو عجیب معلوم ہوتی ہے۔ کہیں آپ کا یہ خیال تو نہیں ہے کہ میں جو یہ سوال کرتا ہوں اس کا مقصد آپ کی دلیلوں کو کمزور کرنا ہے۔

تھریسی میکس نے جواب دیا: خیال؟ میرا تو یقین ہے۔ بہرحال خدا نے چاہا تو آپ اس طرح مجھے ہرانے میں کامیاب نہ ہوں گے۔

میں نے کہا: یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں۔ مگر اگلی بات چیت میں غلط فہمی سے بچنے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہ پوچھ لوں کہ آپ "حاکم" اور "قوی" کے الفاظ کو کن معنوں میں استعمال کرتے ہیں؟ عام رواجی معنی میں یا اپنے خاص بیان کیے ہوئے معنی ہیں۔

اس نے کہا: خود اپنے بیان کیے ہوئے معنی میں۔ اب چلیے کوئی اور دام پھیلایئے۔ دھوکا دیجیے میں آپ سے کوئی رعایت نہیں چاہتا۔ مگر آپ کامیاب نہ ہوں گے، ہرگز نہ ہوں گے۔

میں نے کہا: اگر آپ مجھے اتنا پاگل سمجھتے ہیں کہ میں ایک زندہ شیر کو پکڑ کر اس کی کھال اُتارنے لگوں تو خیر، آپ یہ بھی خیال کرسکتے ہیں کہ میں آپ کو دھوکا دینا چاہتا ہوں!

تھریسی میکس نے کہا: خوب۔ اور ابھی ابھی آپ مجھے اپنے فریب کے جال میں پھانس نہیں رہے تھے تو اور کیا کررہے تھے؟

میں نے کہا: خیر یہ فقرہ بازی برطرف۔ اب یہ بتائیے کہ آپ کے بیان کیے ہوئے معنی میں حقیقی طبیب کا کام مریضوں کو اچھا کرنا ہے یا روپیہ کمانا۔ لیکن ذرا اپنے بیان کیے ہوئے معنی کا خیال رہے۔

اس نے کہا: اس کا کام مریض کو اچھا کرنا ہے نہ کہ روپیہ کمانا۔

میں نے پوچھا: ذرا یہ بھی بتا دیجیے کہ حقیقی ناخُدا ملاحوں کا افسر یا حاکم ہوتا ہے یا خود ملاح کا مرتبہ رکھتا ہے؟

تھریسی میکس نے کہا: ملاحوں کا حاکم ہوتا ہے۔

میں نے کہا: اس بات کا چنداں خیال نہ کرنا چاہیے کہ وہ خود بھی اسی جہاز میں سفر کرتا ہے اور نہ اُسے اس وجہ سے ملاح کہنا چاہیے۔ کیونکہ وہ اس وجہ سے ناخدا نہیں کہلاتا کہ وہ جہاز میں سفر کرتا ہے بلکہ اپنے ہنر کے لحاظ سے کہ وہ ملاحوں پر نگرانی رکھتا اور ان کو احکام دیتا ہے۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: آپ کو یہ بھی ضرور معلوم ہوگا کہ ہر فن کسی خاص چیز سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی کوئی خاص غرض اور غایت ہوتی ہے۔

تھریسی میکس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور اس غرض کے پُورا کرنے کے لیے وسیلے اور ذریعے فراہم کرنا فن کا مقصد ہوتا ہے؟

تھریسی میکس نے کہا: بجا ہے۔

میں نے کہا: اور میرے خیال میں ہر فن کی غرض ہے کہ اپنے سے متعلق چیز کی تکمیل کرے۔

اس نے کہا: میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

میں نے کہا: اچھا۔ میں اپنا مفہوم ایک مثال سے واضح کیے دیتا ہوں:

اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ انسان کا جسم اپنی ذات میں کافی اور کامل ہے یا ''ناقص اور نامکمل'' تو میں جواب دوں گا کہ انسانی جسم ناقص اور حاجت مند ہے۔ ممکن ہے اسے کوئی مرض لاحق ہو جائے اور اُسے اس سے شفا کی ضرورت پڑے۔ اس کی کمزوریوں اور عیبوں کی تلافی طب کا فن کرتا ہے اور یہی اس فن کی غایت ہے۔ کہیے آپ کی کیا رائے ہے؟

اس نے جواب دیا: آپ کا خیال بالکل صحیح ہے۔

میں نے کہا: لیکن جس طرح کسی نقص یا عارضے کی وجہ سے آنکھ کو دھندلا دیکھنے کی شکایت ہو سکتی ہے، یا کان کو اونچا سننے کی، اسی طرح کیا طب کا فن یا دوسرے فن بھی ناقص ہو سکتے ہیں؟ اور کیا کسی فن کو اپنے اغراض کی نگہداشت اور اُن کے حصول کے لیے دوسرے فنون کی معاونت درکار ہے؟ یا ہر فن خالصاً اپنے اغراض سے متعلق ہوتا ہے اور چونکہ فن میں خود کسی نقص کی گنجایش نہیں اس لیے دوسرے فنون کی معاونت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جب تک ایک فن حقیقی اور آپ کے بیان کیے ہوئے معنی کے اعتبار سے فن ہے اُس وقت تک اس میں غلطی یا نقص کا امکان نہیں ہونا چاہیے۔

اس نے کہا: جی ہاں، ایسا ہی ہے۔

میں نے کہا: گویا فنِ طب کا مقصد خود اپنے (فنِ طب کے) اغراض کی نگہداشت نہیں بلکہ انسانی جسم کی اغراض کی نگرانی ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اسی طرح شہسواری کے فن کا مقصد خود اس فن کی نگہداشت نہیں بلکہ گھوڑوں کی اغراض کا پاس کرنا ہے اور اسی طرح دوسرے فن بھی خود اپنے وجود اور اپنی اغراض کے لیے فکر مند نہیں ہوتے کہ ان کو تو کوئی ضرورت ہوتی ہی نہیں، بلکہ ان چیزوں کی بہبودی کو سامنے رکھتے ہیں جو ان سے بحیثیت فن متعلق ہیں۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: لیکن غالباً آپ تھریسی میکس یہ ضرور تسلیم کریں گے کہ ہر فن اپنے مخصوص موضوع سے بالاتر اور اس کی نسبت حکم دینے والا ہوتا ہے۔

تھریسی میکس نے اسے مان تو لیا لیکن بہت ہی تکلف سے۔

میں نے کہا: اس گفتگو کا تمام تر نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی علم یا فن قوی فریق کی (یعنی خود اپنے) اغراض کا خیال نہیں رکھتا بلکہ کمزور فریق (یعنی اپنے موضوع کا)۔

تھریسی میکس نے تردید کی کچھ کوشش کی لیکن بالآخر مان گئے۔

میں نے کہا: مجھے امید ہے کہ آپ یہ بھی تسلیم کر لیں گے کہ ایک طبیب کا فرض بحیثیت حقیقی طبیب یہ ہے کہ مریض کی بھلائی کا خیال رکھے نہ کہ اپنے نفع کا۔ طبیب کی حیثیت بادشاہ کی سی ہے اور مریض کے جسم

کی حیثیت رعایا کی اور آپ تسلیم کر ہی چکے ہیں کہ حقیقی طبیب کو روپیہ کمانے سے کچھ سروکار نہیں۔

تھریسی میکس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اسی طرح ناخدا کا کام یہ ہے کہ ایسے حکم دے اور ایسے ذریعے فراہم کرے کہ ملاحوں کا فائدہ ہو نہ یہ کہ وہ خود اپنی اغراض کا بندہ بن جائے۔

تھریسی میکس نے اس پر کچھ بہت رُک رُک کر "ہاں" کہا۔

میں نے کہا: یعنی کوئی حاکم بحیثیت حقیقی حاکم کبھی اپنی ذاتی اغراض کا پاس نہیں کرتا بلکہ اپنے سے متعلق زبردست جماعت یعنی رعایا کا خیال رکھتا ہے۔ یہی اس کا مطمح نظر ہوتا ہے اور یہی خیال اس کے ہر کام اور ہر بات پر چھایا ہوتا ہے۔

جب گفتگو یہاں تک پہنچی اور ہر شخص پر ظاہر ہو چلا کہ عدل کی جو تعریف زیر بحث تھی وہ غلط ثابت ہو چکی تو تھریسی میکس بجائے میرے سوال کا جواب دینے کے کچھ عجیب بے ساختہ پن سے فرمانے لگے "اجی حضرت۔ آپ کی پرورش اور دیکھ بھال کے لیے کوئی دایہ بھی ہے"؟

میں نے کہا: میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے آپ ایسا بے ربط سا سوال کیوں کر بیٹھے؟

تھریسی میکس نے کہا: میں نے یہ اس لیے پوچھا کہ آپ کی دایہ نے شاید آپ کو ناک تک صاف کرنا نہیں سکھایا۔ آپ تو بھیڑ اور چرواہے میں بھی تمیز نہیں کر سکتے۔

میں نے پوچھا: آپ نے یہ نتیجہ کیسے نکالا؟

تھریسی میکس نے کہا: ایسے کہ آپ کے نزدیک چرواہا اپنی بھیڑوں کو کھلا کھلا کر اس لیے موٹا کرتا ہے کہ اُس میں بھیڑوں کا نفع ہے نہ کہ خود اُس کا اور شاید آپ کے خیال میں حاکم اور محکوم میں چرواہے اور بھیڑ کا سا تعلق نہیں ہے اور جناب کا تو یقین معلوم ہوتا ہے کہ حاکم دن رات صرف اپنی منفعت کے پھیر میں نہیں پڑے رہتے۔ یہی نہیں بلکہ آپ تو عدل اور ظلم، ایمانداری اور بے ایمانی کے متعلق اس درجہ غلط خیالات رکھتے ہیں کہ آپ کی رائے میں عدل میں حاکم کی غرض مخفی ہی نہیں اور نہ اس میں آپ کے نزدیک رعایا یعنی کمزور جماعت کا کوئی نقصان ہے۔ جناب عالی! بے ایمان ہمیشہ بھولے بھالے ایماندار آدمیوں کو دبائے رہتا ہے۔ وہ چونکہ قوی اور زبردست ہوتا ہے اس لیے اس کی زیردست وہی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جس میں اس کا فائدہ ہو اور بے چارے اپنی جگہ اُس کی تفریح و آرام کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ آپ صاف دیکھ سکتے ہیں کہ ایماندار

ہمیشہ بے ایمان کے مقابلے میں نقصان اُٹھاتا ہے، مثلاً سب سے پہلے ذاتی معاہدوں میں دیکھ لیجیے۔ جب کبھی ایک بے ایمان اور ایک ایماندار میں شراکت ہوگئی ہو تو معاہدہ ختم ہونے پر بے ایمان کو ہمیشہ ایماندار سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ ایسے ہی دوسرے معاملوں میں، مثلاً حکومت کے قوانین کی اطاعت میں بھی وہی نفع میں رہتا ہے، مثلاً آمدنی پر جو محصول لگتا ہے اس کو دیکھ لیجیے۔ مساوی آمدنی ہونے کی صورت میں ایک بے ایمان شخص کو ہمیشہ ایماندار سے کم محصول ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور جب کچھ ملنے والا ہوتا ہے تو بے چارہ ایماندار منھ ہی تکتا رہ جاتا ہے اور بے ایمان سب لے اُڑتا ہے۔ مختلف عہدوں پر مامور ہونے کی حالت میں بھی آپ دونوں کا مقابلہ کر لیجیے۔ ایماندار آدمی اپنے فرائضِ منصبی کو اچھی طرح پورا کرنے کے خیال سے اپنے خانگی معاملات کی طرف سے توجہ ہٹا لیتا ہے، نقصان اُٹھاتا ہے اور عام لوگوں سے کچھ وصول بھی نہیں کرتا۔ اس پر طرفہ یہ کہ اس کے تمام دوست احباب اور عزیز اس سے ناخوش رہتے ہیں کہ طرف داری کر کے اُنھیں فائدہ نہیں پہنچاتا۔ برخلاف اس کے بے ایمان آدمی کو اس قسم کی کوئی دِقت پیش نہیں آتی۔ ہاں یہ خیال رہے کہ میں اس بے ایمانی کا ذکر کر رہا ہوں جو بڑے پیمانے پر ہو اور جس میں جابر اور بے ایمان کا نفع بالکل کھلا ہوا ہو۔ میں آپ کو اس عظیم الشان ظلم اور ناانصافی کی مثال دیتا ہوں جسے حکومتِ شخصی کے نام سے موسوم کرتے ہیں، جس میں سب سے بڑا مجرم سب سے زیادہ خوش نصیب انسان ہوتا ہے اور مظلوموں کی حالت ناگفتہ بہ، جس میں جبر و تعدی، جعل و فریب سے دوسروں کی جائیدادیں رفتہ رفتہ نہیں بلکہ یک لخت ضبط کر لی جاتی ہیں۔ اور تمام چیزیں اچھی ہوں یا بری، پاک ہوں یا نجس، شخصی ملک ہوں یا جماعتی، سب کی سب ایک آدمی کے پاس پہنچ جاتی ہیں۔ اگر کوئی انسان ان افعال میں سے کسی ایک کا مرتکب ہو تو اس کو سخت سے سخت سزا دی جائے اور اس کو بہت ذلیل کیا جائے، لوگ اسے قزاق اور چور، بدمعاش اور جعل ساز کہیں۔ لیکن جب یہی شخص اپنی رعایا کے مال کو غصب کرنے کے علاوہ خود ان کی ذات کو اپنا غلام بنا لیتا ہے تو بجائے بُرا کہنے کے ہر شخص جو اس کا حال سُنتا ہے حتیٰ کہ خود اس کی مظلوم رعایا تک، اسے مبارک ترین انسان جانتی ہے اور یہ صرف اس لیے کہ اس نے ظلم اور بے ایمانی کو آخری حد تک پہنچا دیا ہے۔ لوگ جو بے ایمانی کی مذمت کرتے ہیں اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ خود اس سے محفوظ رہیں، نہ کہ اس وجہ سے کہ وہ اس کے ارتکاب سے پرہیز کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے غالباً یہ بات کافی حد تک واضح کر دی ہے کہ اگر بے ایمانی کافی بڑے پیمانے پر عمل میں لائی جائے تو وہ عدل سے زیادہ فائدہ مند، زوردار اور شاندار چیز ہے۔ چنانچہ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا، عدل قوی جماعت کی اغراض کا

نام ہے اور بے انصافی اپنے ذاتی فائدے اور منافع کے مرادف۔

الفاظ کی اس طوفانی رو کے بعد تھریسی میکس نے چل دینے کا ارادہ کیا مگر حاضرین نے جانے نہ دیا اور اصرار کیا کہ ذرا ٹھہر کر اپنے دعوے کا ثبوت دیتے جائیں۔ میں بھی بہت مصر ہوا اور ان سے عرض کی کہ ''آپ نے اس تقریر میں نہ معلوم کس کس جانب اشارہ کر دیا اور اب یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ آپ بلا اپنے دعوے کا ثبوت دیے یا اس کی تردید سنے بغیر یہاں سے تشریف لے جائیں۔ کیا آپ انسانی زندگی کے دستور العمل کی ترتیب کو اتنا غیر اہم کام خیال کرتے ہیں؟

اس نے کہا: میں کب اس کی اہمیت سے انکار کرتا ہوں۔

میں نے جواب دیا: یا پھر آپ کو ہم لوگوں کا کچھ خیال نہیں۔ تھریسی میکس آپ کو خود اپنے قول کے مطابق ایک ایسی چیز کا علم ہے جس کا علم یا جس سے جہل ہماری زندگی کے بننے یا بگڑنے کا باعث ہو سکتا ہے۔ لیکن آپ غالباً اس کی چنداں پروا نہیں کرتے۔ خدارا اس علم میں اتنے بخل سے کام نہ لیجیے۔ یہاں اس وقت حاضرین کی ایک خاصی تعداد ہے، اگر اس جماعت کو آپ کی ذات سے کچھ فائدہ پہنچ جائے تو آپ کی محنت ٹھکانے لگ جائے گی۔ بہر حال میں ذاتی رائے کا اظہار مناسب سمجھتا ہوں کہ میں نہ اس بات پر عقیدہ رکھتا ہوں، نہ میں اس وقت جناب کی تقریر سے قائل ہوا ہوں کہ باوجود انتہائی آزادی کے بھی بے ایمانی میں عدل سے زیادہ فائدے ہیں۔ اگر کوئی شخص دھوکا بازی یا اپنی طاقت کی وجہ سے پوری بے ایمانی اور کامل جبر کرنے پر قدرت رکھتا ہے اُس حالت میں بھی ظلم کو عدل سے زیادہ فائدہ مند اور نفع بخش ماننے پر تیار نہیں اور میرا گمان ہے کہ اکثر لوگ اس رائے میں میرے ہم نوا ہیں۔ بہت ممکن ہے ہمارا خیال غلط ہو اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ غلط ہے تو براہِ کرم عدل پر ظلم و ناانصافی کی فضیلت ثابت کیجیے۔

تھریسی میکس نے کہا: اگر میری پچھلی تقریر آپ کو قائل نہیں کر سکی تو اب میں اور کیا کہہ سکتا ہوں؟ میں کچھ آپ کو ثبوت گھول کر پلا تو دوں گا نہیں۔

میں نے کہا: خدانخواستہ میرا یہ مطلب نہیں۔ میں صرف اتنی درخواست کرتا ہو کہ آپ ذرا اپنی باتوں پر قائم رہیں اور اگر بدلیں تو کھلے کھلے بدلیں تاکہ دوسرے ناحق غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب آپ نے طبیب کی تعریف کی تھی تو اس کے ایک خاص معنی مقرر کیے تھے۔ لیکن چرواہے کے معاملے میں آپ اس معنی پر قائم نہ رہے۔ اب آپ کے نزدیک ایک حقیقی چرواہا بھیڑوں کے فائدے کے لیے اُن کی

پرورش نہیں کرتا بلکہ اُنھیں کسی چٹورے آدمی کا لقمۂ تر بننے کے لیے پالتا ہے، یا ایک تاجر کی حیثیت سے اُنھیں بازار میں بیچنے کے لیے موٹا کرتا ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ چرواہے کا کام بحیثیت چرواہے صرف اپنے گلّے کی فلاح و بہبود ہے۔ اس کا فرض گلّے کی ضروریات کو پوری طرح فراہم کر دینا ہے اور اگر وہ یہ تمام ضرورتیں فراہم کر دے تو یہی اس کے فن کے کمال کی علامت ہے۔ بعینہٖ یہی بات میں حاکموں کے متعلق کہہ رہا تھا۔ میرے نزدیک حاکم کا اصلی فرض بحیثیت حاکم یہ ہے کہ اپنی رعایا کی فلاح کے تمام وسیلے بہم پہنچائے لیکن اس کے خلاف جناب کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ حاکم اس وجہ سے حاکم بنتے اور حاکم رہنا پسند کرتے ہیں کہ ان کو حکومت اور اختیار حاصل ہو۔

تھریسی میکس نے کہا: رائے! جناب میرا تو یہ عقیدہ ہے۔

میں نے کہا: اچھا تو یہ فرمائیے کہ بادشاہ سے نیچے حکومت کے جتنے عہدے ہیں، اُن پر لوگ خوشی اور رغبت سے بلا کسی معاوضے کے رہنا کیوں پسند نہیں کرتے؟ شاید اُن کے خیال میں حکومت کرنے میں ان کا فائدہ نہیں بلکہ دوسروں کا فائدہ ہے۔ خیر۔ ذرا میرے اس سوال کا جواب دیجیے کہ کیا فنون ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتے، بااعتبار اس کے کہ ان میں سے ہر ایک کا کام الگ الگ ہوتا ہے۔ مہربانی فرما کر اس بارے میں اپنا حقیقی خیال ظاہر فرمائیے تاکہ ہماری تحقیق کچھ آگے بڑھے۔

اس نے جواب دیا: ہاں "ہاں" بے شک یہ فرق ہے۔

میں نے کہا: اور ہر فن سے ایک مخصوص نفع ہوتا ہے، مثلاً طب کے فن سے جسم کی صحت اور تندرستی اور جہاز رانی کے فن سے سمندر کے سفر میں امن اور حفاظت وغیرہ۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے پوچھا: اسی طرح ایک فن روپیہ یا تنخواہ حاصل کرنے کا بھی ہوتا ہے لیکن اگر کسی ناخدا کی جسمانی صحت سمندری سفر سے اچھی ہو جائے تو اس کی وجہ سے جہاز رانی کے فن کو طب کے فن سے گڈمڈ تھوڑے ہی کریں گے۔ بعینہٖ اسی طرح اس تنخواہ حاصل کرنے کے فن کو دوسرے فنون سے نہیں ملانا چاہیے۔

تھریسی میکس نے کہا: ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: مثلاً اگر ایک آدمی کو کچھ تنخواہ ملتی ہے اور اس کی صحت بھی اچھی ہے تو اس لیے آپ تنخواہ حاصل کرنے کے فن کو کہیں طب کے فن سے تو نہ ملا دیں گے؟

اس نے کہا: نہیں۔ ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: یا اگر ایک شخص علاج کرتا ہے اور معاوضے میں اُجرت لیتا ہے تو اس سے طب کا فن اور اُجرت حاصل کرنے کا فن ایک تو نہ ہو جائے گا۔

اُس نے کہا: ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: اچھا ہم یہ تو تسلیم کر ہی چکے ہیں کہ کسی فن کا نفع اس کا اپنا مخصوص نفع ہوتا ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اس لیے اگر کوئی نفع تمام فنون کے ماہرین میں مشترک ہو تو اس کی وجہ تو کوئی ایسا فن یا کوئی ایسی چیز ہوگی جسے وہ سب کے سب استعمال کرتے ہیں۔

اس نے جواب دیا: جی ہاں ٹھیک ہے۔

میں نے کہا: یعنی اگر کسی ماہر فن کو کچھ اُجرت یا معاوضہ ملتا ہے تو یہ خاص اُس فن کے استعمال کی وجہ سے نہیں ہوتا جس کا وہ ماہر ہے بلکہ اس کے علاوہ وہ اجرت حاصل کرنے کے فن کا بھی استعمال کرتا ہے۔

تھریسی میکس نے کچھ رُک رُک کر اس کو تسلیم کرلیا۔

میں نے کہا: گویا اُجرت ماہرین کو اپنے مخصوص فن کی وجہ سے نہیں ملتی بلکہ جس طرح طب کے فن کا نتیجہ جسمانی صحت اور تعمیر کے فن کا نتیجہ مکان کی تیاری ہے، اسی طرح اُجرت حاصل کرنے کے فن کا نتیجہ اُجرت کا ملنا ہے۔ ہر فن اپنا اپنا کام کرتا ہے اور جس موضوع سے متعلق ہے اسے فائدہ پہنچاتا ہے لیکن اگر کوئی ماہر اپنے فن کا استعمال کر رہا ہو لیکن اسے کچھ معاوضہ نہ ملے تو اس ماہر کا اس میں کیا کچھ فائدہ ہے؟

تھریسی میکس نے کہا: ظاہر ہے کہ نہیں۔

میں نے کہا: لیکن کیا اُجرت یا معاوضہ نہ ملنے کی صورت میں وہ اپنے فن کے استعمال سے دوسروں کو بھی فائدہ نہیں پہنچاتا؟

تھریسی میکس نے کہا: کیوں نہیں ضرور پہنچاتا ہے۔

میں نے کہا: تو پھر ''تھریسی میکس'' اس بات میں شبہ کی ذرا گنجایش نہیں کہ حکومت یا فنون کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی اغراض کو پورا کرلیں بلکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ان کا کام اپنے ماتحت کی ضروریات فراہم کرنا ہے۔ ان کا منشا کمزور کی حفاظت ہے نہ کہ قوی کی طرف داری۔ اور یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص حکومت کے کام

کو از خود ہاتھ میں لینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ کسے غرض پڑی ہے کہ بلا معاوضہ ان برائیوں کی اصلاح کے لیے اُٹھ کھڑا ہو جن سے اُسے کوئی سروکار نہیں۔ کیونکہ حکومت کا فرض انجام دینے میں اسے اپنی ذاتی اغراض کو نہیں بلکہ رعایا کے فوائد کو سامنے رکھنا ہوگا۔ چنانچہ حکومت کرنے کی ترغیب دینے کے لیے اُجرت یا معاوضے کے تین طریقے رکھے گئے ہیں۔ اوّل ''مال وزر'' دوسرا ''عزت'' اور تیسرا ''انکار کی صورت میں سزا''۔

گلوکون نے کہا: سقراط! آپ کا کیا مطلب ہے؟ میں اوّل دو طریقوں کو تو سمجھ گیا لیکن یہ تیسرا طریقہ کیا ہے؟ سزا کس طرح معاوضے کا کام دے سکتی ہے؟

میں نے کہا: آپ تو اُسی چیز کو نہ سمجھے جو بہترین آدمیوں کو حکومت کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ ان لوگوں کے لیے حرص اور لالچ باعث ننگ ہے؟

گلوکون نے کہا: بالکل ٹھیک۔

میں نے کہا: اسی وجہ سے مال وزر یا عزت کی خاطر تو یہ لوگ اس طرف متوجہ ہوتے نہیں۔ نہ مزدوروں کی طرح یہ روپے کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور نہ خزانہ عامرہ سے خفیہ طور پر متمتع ہو کر خائن بننا پسند کرتے ہیں اور نہ اُنھیں عزت کی کچھ زیادہ پروا ہے۔ اس لیے ان کو حکومت کے کام پر لگانے کے لیے بس ایک ہی ذریعہ ہے وہ یہ کہ اس سے گریز کرنے کی صورت میں اُنھیں سزا کا خوف ہو۔ اور اس سے زیادہ سخت اور کیا سزا ہو سکتی ہے کہ اگر تم خود حکومت نہیں کرتے تو اپنے سے بُرے اور نالائق آدمیوں کے محکوم بنو۔ یہی خوف ان قابل لوگوں کو حکومت کے عہدے قبول کرنے پر مجبور کرتا ہے یعنی ہمیں ضرورت مجبور کرتی ہے نہ کہ فائدے اور نفع کی خواہش۔ اس بات کو باور کرنے کی کافی وجوہ ہیں کہ اگر کسی ملک یا شہر میں سب کے سب لوگ نیک اور ایماندار ہوں تو وہاں سرکاری عہدوں سے الگ رہنے کے لیے اتنا ہی مقابلہ ہو جتنا کہ اس وقت ان کے حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ہم صاف طور پر یہ دیکھ لیں کہ حاکم اپنے نفع کے لیے نہیں بلکہ اپنی رعایا کی بہبودی کے لیے حکومت کرتا ہے۔ ان وجود کی بنا پر میں تھریسی میکس کی تعریف کو غلط سمجھتا ہوں۔ لیکن خیر۔ اب اس بحث کو تو جانے دیجیے۔ ان حضرات نے ابھی ابھی جو بے ایمانی اور ظلم کی زندگی کو ایمانداری اور عدل کی زندگی سے زیادہ فائدہ مند بتایا تھا اس پر غور کرنا بہت ضروری ہے۔ فرمایئے اس معاملے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ گلوکون! آپ کس زندگی کو بہتر سمجھتے ہیں؟

گلوکون نے کہا: میرے نزدیک تو عدل وانصاف کی زندگی ہی زیادہ فائدہ بخش ہے۔

میں نے کہا: کیوں۔ کیا آپ نے وہ فائدے نہیں سُنے جو تھریسی میکس نے ناانصافی اور بے ایمانی سے منسوب کیے ہیں؟

گلوکون نے جواب دیا: ہاں، میں نے سُنے ضرور، لیکن میں ان کا قائل نہیں ہوا۔

میں نے کہا: تو پھر ہمارا فرض ہے کہ ہم تھریسی میکس کو غلطی کا یقین دلا کر انھیں قائل کر دیں۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: لیکن اس کی کیا صورت ہو؟ اگر وہ ایک طولانی تقریر کریں اور میں بھی اس کا ایک لمبا چوڑا جواب دوں تو یہ لازمی ہوگا کہ فریقین اپنے اپنے جو فوائد اور منافع پیش کریں اُن کا شمار کیا جائے اور اس کے لیے ایک ''حکم'' کی ضرورت پڑے گی۔ لیکن اگر ہم پہلے کی طرح باتوں باتوں میں ایک دوسرے کو قائل کرتے چلیں تو وکیل اور ''حکم'' دونوں کا کام ہم خود انجام دے سکتے ہیں۔

اس نے کہا: بہت خوب۔

میں نے کہا: آپ کس طریقے کو زیادہ پسند کرتے ہیں؟

گلوکون نے کہا: جو آپ مناسب سمجھیں۔

میں نے تھریسی میکس سے کہا: اچھا تو شروع سے چلیں، میں سوال کرتا ہوں آپ جواب دیجیے۔ کیا آپ کے خیال میں کامل ظلم اور ناانصافی پورے عدل اور انصاف سے زیادہ سود بخش ہے؟

تھریسی میکس نے کہا: جی ہاں۔ میرا تو یہی خیال ہے اور میں آپ سے اس کے وجوہ بھی عرض کر چکا ہوں۔

میں نے کہا: اور ان دونوں میں سے ایک خیر ہے اور دوسرا شر۔

تھریسی میکس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: یعنی عدل و انصاف خیر ہے اور ظلم و ناانصافی شر؟

تھریسی میکس نے کہا: کس قدر صحیح اندازہ فرمایا ہے، آپ نے اس شخص کے خیال کا، جو کہتا ہے کہ بے انصافی میں نفع ہی نفع ہے اور عدل میں کچھ نہیں دھرا! واہ، کیا کہنا ہے آپ کا!

میں نے کہا: کیوں، تو کیا میرا قیاس غلط ہے؟ کیا آپ عدل کو شر سمجھتے ہیں؟

تھریسی میکس نے کہا: نہیں۔ میں اسے انتہائی بھولا پن اور حماقت خیال کرتا ہوں۔

میں نے کہا: تو ظلم اور ناانصافی کو شاید آپ کمینگی اور چالاکی کہیں گے۔

اس نے کہا: نہیں مصلحت اندیشی۔

میں نے کہا: گویا آپ کی رائے میں غیر منصف اور ظالم لوگ نیک اور عقل مند ہوتے ہیں؟

اس نے کہا: جی ہاں کم سے کم وہ تو ضرور ہی ہوتے ہیں جن میں کامل بے ایمانی اور ظلم کی صلاحیت ہے یعنی جو ریاستوں اور قوموں کو مطیع کر سکتے ہیں۔ آپ شاید یہ سمجھے کہ میں اُچکوں یا گرہ کٹوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ بے شک اگر پکڑے جانے کا اندیشہ نہ ہو تو اس کام میں بھی خاصے فائدے ہیں۔ مگر پھر بھی اس کا اُس ناانصافی اور ظلم سے کیا مقابلہ جس کا ذکر میں نے کیا ہے۔

میں نے تھریسی میکس سے کہا کہ میں نے آپ کا مطلب تو سمجھ لیا، لیکن مجھے سخت تعجب اور حیرت ہے کہ آپ ظلم کو عقل مندی اور نیکی سمجھتے ہیں اور عدل کو اس کے برعکس۔

اس نے کہا: ہاں، کیا کیا جائے۔ میرا تو یہی خیال ہے۔

میں نے کہا: اب تو آپ کی دلیلوں کی بنیاد بہت زیادہ پکی ہو گئی اور ان کا جواب دینا تقریباً محال ہو گیا۔ کیونکہ ظلم و ناانصافی کو زیادہ سود مند سمجھنے کے ساتھ ساتھ اگر آپ اسے بدی اور شر بھی خیال کرتے تو مسلمہ اُصولوں کی رو سے آپ کو آسانی سے جواب دیا جا سکتا تھا۔ لیکن اب تو آپ ظالم کو قوی اور زور آور اور عزت کے قابل بھی سمجھتے ہیں اور جن صفتوں سے ہم آج تک ایک عادل اور منصف شخص کو متصف کرتے آئے تھے آپ ان سب کو غالباً ظالم کے ساتھ منسوب کریں گے اور یہ بھلا کیا ہے جب آپ ظلم اور ناانصافی کو عقل مندی اور نیکی کہنے ہی سے نہ جھجکے!

اس نے کہا: آپ کا خیال صحیح ہے۔ میرے یہی خیالات ہیں۔

میں نے کہا: مجھے اس وقت تک اطمینان نہ ہو گا جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ آپ اپنے اصلی خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ امید تو ہے کہ آپ اپنی صحیح رائے ہی ظاہر کرتے ہوں گے۔ مگر پھر بھی کہیں ہمارا مذاق اُڑانا تو منظور نہیں؟

اس نے کہا: میں صحیح اظہار خیال کر رہا ہوں یا غلط آپ کو اس سے کیا سروکار، آپ تو میری دلیل کو رد کیجیے۔

میں نے کہا: خیر یہی سہی۔ مگر ذرا ایک سوال کا جواب دیجیے۔ کیا ایک عادل شخص کسی دوسرے عادل

شخص کے مقابلے میں خود فائدہ اُٹھالینا چاہتا ہے؟

اس نے کہا: خوب! اگر وہ ایسا کرے تو بے چارے کی حماقت اور ابلہی کہاں باقی رہی!

میں نے کہا: اور کیا وہ کسی منصفانہ طریق عمل سے الگ ہو کر اس کی خلاف ورزی کر سکتا ہے؟

اس نے کہا: نہیں۔

میں نے کہا: لیکن اگر غیر منصف اور ظالم شخص کے خلاف فائدہ حاصل کرنے کی کوشش ہو تو اس کے متعلق ایک عادل شخص کا کیا خیال ہوگا۔ وہ اس فعل کو منصفانہ سمجھے گا یا نہیں۔

اس نے کہا: اس کے نزدیک یہ بات انصاف پر مبنی تو ضرور ہوگی اور ممکن ہے وہ خود اس قسم کا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرے لیکن بے چارہ اس میں کامیاب نہیں ہوگا۔

میں نے کہا: کامیابی ناکامی کا تو سوال ہی نہیں۔ میں تو صرف یہ پوچھتا ہوں کہ جیسے ایک عادل شخص دوسرے عادل شخص کے مقابلے میں مسابقت سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتا اسی طرح کیا وہ ایک ظالم اور بے انصاف شخص کے مقابلے میں بھی فائدہ نہ اُٹھانا چاہے گا؟

اس نے کہا: کیوں نہیں، ضرور چاہے گا!

میں نے کہا: اس کے برخلاف ظالم شخص کا کیا طرزِ عمل ہوگا؟ وہ تو غالباً عادل آدمی کے مقابلے میں فائدہ بھی اُٹھانا چاہے گا اور منصفانہ اعمال کی خلاف ورزی پر بھی آمادہ ہوگا؟

اس نے کہا: بے شک غیر منصف تو ہر ایک سے سبقت لے جانے اور زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

میں نے کہا: بات کا حاصل یہ ہوا کہ عادل شخص اپنے مماثل دوسرے عادل شخص سے زیادہ حاصل نہیں کرنا چاہتا لیکن اپنے غیر مثل یعنی غیر منصف شخص سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ لیکن ظالم اور غیر منصف اپنے مثل اور غیر مثل دونوں سے زیادہ حاصل کرنے کی فکر کرتا ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور بقول آپ کے ظالم اور غیر منصف ہی عقل مند اور نیک ہوتا ہے اور عادل اس کے برعکس۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: یعنی ظالم اور غیر منصف مماثل ہے دانشمند اور نیک کا اور عادل اس کا غیر مثل ہے؟

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے پوچھا: اچھا تو آیئے اب فنون سے ایک مثال لیں۔ مثلاً ایک شخص فنِ موسیقی کا ماہر ہے اور ایک اس سے بالکل نابلد۔

اس نے کہا: اچھا۔

میں نے کہا: ان میں سے کون دانشمند ہے اور کون نہیں؟

اس نے کہا: موسیقی کا ماہر دانشمند ہے اور دوسرا نہیں۔

میں نے کہا: اور ماہر، علم اور دانشمندی کے لحاظ سے نیک ہے اور دوسرا باعتبار جہل، بد؟

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اور غالباً یہی رائے آپ ایک طبیب کے متعلق رکھتے ہوں گے؟

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اچھا تو اب یہ بتایئے کہ جب موسیقی کا ایک ماہر اپنے ستار کے تار کستا ہے تو کیا ایسی صورت میں وہ کسی دوسرے ماہرِ موسیقی کے بالکل خلاف چلنے کی کوشش یا دعویٰ کرتا ہے؟

اس نے کہا: نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتا۔

میں نے کہا: مگر وہ ایسے شخص کے خلاف تو چل سکتا ہے جو خود موسیقی کا ماہر نہیں ہے؟

اس نے کہا: بے شک، وہ کر سکتا ہے۔

میں نے کہا: اسی طرح ایک ماہر طبیب دوا یا غذا کی تجویز میں دوسرے ماہر طبیب کے مخالف نہیں ہو سکتا اور نہ طب کے فن کی مخالفت کر سکتا ہے۔

تھریسی میکس: جی ہاں، ہرگز مخالف نہیں ہو سکتا۔

میں نے کہا: لیکن وہ ایسے شخص کی مخالفت تو کر سکتا ہے جو خود طبیب نہیں؟

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اسی طرح عمومی حیثیت سے علم اور جہل کے متعلق غور کیجیے۔ ایک حقیقی عالم غالباً کبھی دوسرے عالم سے قول اور فعل میں اختلاف نہ کرے گا۔ وہ ہمیشہ اپنے مثل سے متفق ہوگا۔

اس نے کہا: اس سے کون انکار کرسکتا ہے؟

میں نے کہا: ہاں۔ اور جاہل کیا کرے گا؟ وہ تو عالم اور جاہل دونوں کی ایک سی مخالفت کرے گا۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اور عالم دانشمند ہوتا ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور دانشمند نیک ہوتا ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: گویا دانشمند اور نیک آدمی کبھی اپنے مثل سے آگے بڑھنے یا اس کی مخالفت کرنے کی آرزو نہیں کرتا۔ ہاں اپنے مخالف اور غیر مثل سے بڑھنے کی کوشش ضرور کرے گا۔

اس نے کہا: جی ہاں میرا یہی خیال ہے۔

میں نے کہا: لیکن بد اور جاہل شخص تو بلا امتیاز مثل اور غیر مثل دونوں سے آگے بڑھنے اور زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: آپ کو شاید اپنا اقرار یاد ہے کہ ظالم اور غیر منصف شخص اپنے مثل اور غیر مثل دونوں کی مخالفت کرسکتا ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔ میں نے یہ اقرار کیا ہے۔

میں نے کہا: آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ عادل شخص اپنے مثل کا مخالف نہیں ہوسکتا البتہ غیر مثل کی مخالفت کرسکتا ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: یعنی عادل تو دانشمند اور نیک کا مثل ہے اور ظالم جاہل اور بد کا۔

اس نے کہا: بے شک نتیجہ تو یہی نکلتا ہے۔

میں نے کہا: اس طرح عادل نیک اور عاقل ثابت ہوا اور ظالم بد اور جاہل۔

یہ تمام باتیں اس قدر آسانی سے تسلیم نہیں کی گئی تھیں جیسے میں کہہ رہا ہوں۔ تھریسی میکس بڑی

حجت اور تکرار کے بعد کوئی بات مانتے تھے۔ گرمی کے دن تھے اور ان کا تمام بدن پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ کیا عجب کہ یہ ندامت کا پسینہ ہو کیونکہ اس سے پہلے میں نے کبھی انھیں نادم ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ اس مسئلے کے طے ہو جانے کے بعد کہ عدل خیر ہے اور ظلم "شر"، میں آگے بڑھا۔

میں نے کہا: اچھا یہ مسئلہ تو طے ہوا۔ لیکن آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے "ظلم اور قوت" کو باہم وابستہ بتایا تھا۔

تھریسی میکس نے کہا: جی ہاں۔ یاد ہے۔ آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ میں آپ کی تمام باتیں مان گیا اور میرے پاس کوئی معقول جواب نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اگر میں جواب دیتا ہوں تو آپ فرماتے ہیں کہ تم تو تقریریں کرنے لگے۔ اس لیے یا تو مجھے پوری بات کہنے دیجیے اور نہ بس آپ سوال کرتے رہیے اور میں ہاں میں ہاں ملاتا جاتا ہوں۔ بوڑھیاں جب کہانی کہتی ہیں تو بچے ہونکاری بھرتے جاتے ہیں۔ اسی طرح میں بھی ہاں اور نہیں کہتا رہوں گا۔

میں نے کہا: لیکن ذرا اپنی اصلی رائے کا پاس رہے!

تھریسی میکس نے کہا: جی نہیں۔ آپ چلیے بھی۔ میں آپ کی خوشنودی کے لیے جواب دیتا رہوں گا۔ آپ اور کیا چاہتے ہیں؟

میں نے کہا: میں اور کیا چاہوں گا! آپ کی اگر یہی رائے ہے تو میں سوال کرتا ہوں آپ جواب دیتے جائیے۔

تھریسی میکس نے کہا: بہت اچھا شروع کیجیے۔

میں نے کہا: عدل اور ظلم کی اعتباری ماہیت معلوم کرنے کے لیے میں پھر وہی سوال کرتا ہوں جو پہلے کیا تھا۔ آپ نے یہ فرمایا تھا کہ ظلم میں عدل کی بہ نسبت زیاد قوت ہوتی ہے مگر چونکہ اب عدل دانشمندی اور خیر کے مرادف ثابت ہو چکا اس لیے یہ بھی طے شدہ ہے کہ عدل میں ظلم سے زیادہ قوت ہے کیونکہ ظلم عبارت ہے جہل اور لاعلمی سے۔ لیکن نہیں، میں اس مسئلے پر دوسری حیثیت سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔ فرض کیجیے۔ ایک ظالم ریاست ہے۔ کیا ممکن نہیں کہ یہ دوسری ریاستوں کو مطیع کر رہی ہو اور بعض کو مطیع کر چکی ہو۔

تھریسی میکس نے جواب دیا: ہاں کیوں نہیں۔ اور جو ریاست ظلم میں کامل تر ہوگی وہی اس کو بہت اچھی طرح کرے گی بھی۔

میں نے کہا: میں آپ کے اس خیال کو تو بخوبی سمجھ گیا ہوں لیکن یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس فاتح ریاست میں جو قوت ہے۔ اُس کے لیے عدل کی ضرورت ہے یا یہ بلا عدل کے ممکن ہے۔

تھریسی میکس نے کہا: اگر آپ کا خیال صحیح ہے کہ عدل دانشمندی ہے تو پھر اس قوت کے لیے عدل ضروری ہے اور اگر میرا خیال ٹھیک ہے تو عدل کے بغیر ہی یہ قوت ہو سکتی ہے ورنہ نہیں۔

میں نے کہا: بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ محض ''ہاں'' اور ''نہیں'' پر اکتفا نہیں کر رہے ہیں بلکہ نہایت معقول جواب ارشاد فرماتے ہیں۔

تھریسی میکس نے کہا: مجھے تو صرف آپ کی خاطر منظور ہے۔

میں نے کہا: یہ آپ کی نوازش ہے۔ براہِ کرم یہ تو فرمایئے کہ اگر کسی ریاست یا فوج یا قزاقوں کے ایک گروہ کے مختلف ارکان باہم غیر منصفانہ برتاؤ کرنے لگیں اور ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے لگیں تو پھر ان کی جماعت میں کسی قوتِ عمل کا وجود رہ سکتا ہے؟

تھریسی میکس نے کہا: ہرگز نہیں رہ سکتا۔

میں نے کہا: ہاں۔ اگر وہ ایک دوسرے کو ضرر نہ پہنچائیں اور آپس میں منصفانہ رویہ رکھیں تو باہم مل کر اپنا کام اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں۔

تھریسی میکس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ ناانصافی اور بے ایمانی آپس میں پھوٹ اور تفرقہ، نفرت اور جنگ وجدال پیدا کر دیتی ہے اور عدل سے باہمی یگانگت اور اُلفت پیدا ہوتی ہے۔

تھریسی میکس نے کہا: اب میں آپ سے کیا جھگڑوں، مانے لیتا ہوں۔

میں نے کہا: یہ آپ کی بڑی عنایت ہے۔ لیکن یہ تو فرمایئے کہ جب ناانصافی ہر جماعت میں باہمی نفرت پیدا کر دیتی ہے، چاہے وہ جماعت غلاموں کی ہو، چاہے آزاد لوگوں کی، تو کیا یہ نفرت ان میں نفاق پیدا کر کے انھیں ایسا نہیں بنا دے گی کہ وہ مل کر کام میں نہ کر سکیں گے۔

تھریسی میکس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور اگر یہ ناانصافی بجائے ایک گروہ کے دو اشخاص میں پائی جائے تو کیا وہ باہم لڑتے نہ رہیں گے اور ایک دوسرے کے، نیز عادل شخص، کے دشمن نہیں ہوں گے؟

تھریسی میکس نے کہا: ضرور ہوں گے۔

میں نے کہا: اور اگر یہی ناانصافی کسی ایک فرد میں پائی جائے تو اس فطری قوت میں کمی ہوگی یا زیادتی!

اُس نے کہا: فرض کیجیے کہ اُس کی یہ قوت برقرار رہتی ہے۔

میں نے کہا: لیکن کیا ناانصافی کی طاقت ایسی مؤثر نہیں ہے کہ چاہے وہ کسی شہر میں پائی جائے یا کسی فوج میں، کسی خاندان میں ہو یا کسی دوسری جماعت میں، کہیں ہو، پراگندگی اور پریشانی پیدا کر کے متحدہ عمل کی گنجائش باقی نہ رہنے دے گی اور اس طرح جہاں انصاف اور دوسری نیک چیزوں کی مخالف ہوگی، وہاں خود اپنی بھی دشمن ثابت ہوگی۔

تھریسی میکس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اور اگر یہ کسی اکیلے میں پائی جائے تو کیا وہاں بھی اس کا وجود اتنا ہی مہلک ثابت نہ ہوگا۔ اوّل تو یہ خود اس غریب کی ذات کی وحدت کو مٹا کر اسے عمل کے قابل نہ رکھے گی اور دوسرے یہ کہ اُسے ہر عادل شخص کا اور خود اپنا دشمن بنا دے گی۔ کیوں کیا یہ سچ نہیں ہے؟

تھریسی میکس نے کہا: بالکل صحیح ہے۔

میں نے کہا: میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے نزدیک دیوتا تو یقیناً عادل ہوتے ہوں گے۔

تھریسی میکس نے کہا: اچھا، فرض کیجیے کہ ہوتے ہیں۔

میں نے کہا: اگر ایسا ہے تو عادل لوگ دیوتاؤں کے دوست ہوں گے اور ظالم ان کے دشمن؟

تھریسی میکس نے کہا: میں آپ کی ذرا بھی مخالفت نہیں کروں گا کہ کہیں حاضرین کی ناخوشی کا باعث نہ ہو۔ آپ دلیل کے دسترخوان پر خوب لمبے لمبے ہاتھ ماریئے!

میں نے کہا: بہت اچھا تو ذرا جواب دیتے جایئے تاکہ ہم خوب اچھی طرح سیر ہو لیں۔ یہ تو ظاہر ہو چکا ہے کہ عادل شخص ظالم کے مقابلے میں بہتر، عاقل تر اور قوی تر ہوتا ہے۔ ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ ظالم اور غیر منصف لوگوں میں اشتراکِ عمل کی قوت مفقود ہو جاتی ہے۔ بلکہ میرے نزدیک تو یہ بھی ممکن نہیں کہ کچھ بُرے لوگ مل کر متحدہ طریقہ سے کوئی بُرائی بھی کریں۔ کیونکہ اگر وہ اپنی بدی میں کامل ہوتے تو آپس میں ایک دوسرے پر ہاتھ صاف کرنے لگتے۔ یہ تو شاید ان میں عدل کا کچھ شائبہ باقی تھا جس نے انھیں متحد کر دیا کہ اگر

بے ایمانی میں کامل ہوتے تو عمل کے قابل ہی نہ رہتے۔ میرے خیال میں یہی حقیقت بھی ہے۔ ہاں، یہ البتہ دوسرا سوال ہے کہ غیر منصف اور ظالم کی بہ نسبت ایک عادل شخص کی زندگی بہتر اور خوشتر ہوتی ہے یا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو اسباب میں بیان کر چکا ہوں ان سے یہ بات معلوم ہو گئی ہو گی کہ عادل شخص ہی کی زندگی خوشتر بھی ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی اس کی مزید تحقیق ضروری ہے کہ زیر غور مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں۔ یہ تو انسانی زندگی کا دستور العمل مرتب کرتا ہے۔

تھریسی میکس نے کہا: اچھا تو آگے چلیے۔

میں نے کہا: میں آپ سے ایک چھوٹا سا سوال پوچھتا ہوں۔ آپ کی رائے میں گھوڑے کا کوئی خاص کام یا وظیفہ ہے؟

تھریسی میکس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور یہ وظیفہ ایسا ہو گا کہ اُسے یا تو دوسری چیزیں بالکل انجام نہ دے سکیں اور یا کم سے کم اس درجہ خوبی اور آسانی سے نہ کر سکیں۔

تھریسی میکس نے کہا: میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

میں نے کہا: میں اس کی وضاحت کرتا ہوں۔ کیا آپ آنکھوں کے سوا کسی اور چیز سے دیکھ سکتے ہیں؟

تھریسی میکس: جی نہیں۔

میں نے کہا: یا کانوں کے سوا کسی اور چیز سے سُن سکتے ہیں؟

اس نے کہا: ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: تو پھر یہی ان اعضا کا کام یا وظیفہ ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: لیکن اگر آپ کو ایک انگور کی ٹہنیاں تراشنی ہوں تو آپ یہ کام ایک خنجر سے یا ایک چھینی سے یا اور بہت سے آلے ہیں جن سے نکال سکتے ہیں۔

تھریسی میکس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: مگر کوئی آلہ اس خوبی سے شاخ کو نہیں تراش سکتا ہے جیسے وہ قینچی جو خاص اس کام کے

لیے بنائی جاتی ہے۔

تھریسی میکس: بے شک۔

میں نے کہا: تو یہی اس قینچی کا کام یا وظیفہ ہوا۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اب غالباً آپ کو اس کے سمجھنے میں چنداں دقت نہ ہوگی کہ کسی چیز کا وظیفہ وہ کام ہے جو دوسری چیز یا تو کر ہی نہ سکے یا اتنی خوبی سے نہ کر پائے۔

تھریسی میکس نے کہا: میں سمجھ گیا، آپ صحیح فرماتے ہیں۔

میں نے کہا: ہر چیز جس کا کوئی کام ہوتا ہے اس میں کوئی مخصوص خوبی بھی ہوتی ہے۔ مثلاً آنکھ کا ایک کام ہے۔

تھریسی میکس نے کہا: جی ہاں، ہے۔

میں نے کہا: اور اس میں ایک مخصوص خوبی بھی ہے۔

اس نے کہا: ہاں۔

میں نے کہا: اسی طرح کان کا ایک کام ہے اور اس میں ایک مخصوص خوبی بھی ہے۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اور اسی طرح تمام چیزوں کا کوئی کام ہوتا ہے اور ہر ایک میں کوئی مخصوص خوبی ہوتی ہے۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: لیکن کیا آنکھیں اپنا کام پورا کر سکتی ہیں اگر ان میں مخصوص خوبی کے بجائے کوئی نقص ہو؟

اس نے کہا: ہرگز نہیں۔ اگر ان میں بصارت ہی نہ ہو تو کس طرح اپنا کام پورا کریں۔

میں نے کہا: آپ کا مطلب یہ ہے کہ اگر ان کی مخصوص خوبی یعنی بصارت جاتی رہے تو وہ اپنا کام پورا نہیں کر سکتیں۔ اب میں اس سوال کو ذرا زیادہ پھیلا کر پوچھتا ہوں۔ وہ یہ کہ جو چیزیں اپنے کام کی تکمیل کرتی ہیں وہ اپنی اسی مخصوص خوبی کی وجہ سے کرتی ہیں یا نہیں۔ اور اگر کام میں ناکام رہتی ہیں تو اُسی خوبی کے نہ

ہونے کی وجہ ہی سے ہوتی ہیں یا کسی اور وجہ سے؟

تھریسی میکس: بے شک۔

میں نے کہا: یہی اُصول کانوں پر صادق آتا ہے۔ اگر ان کی مخصوص خوبی جاتی رہے تو ان کا مقصد فوت ہو جائے۔

تھریسی میکس نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: اور یہی اُصول اور چیزوں پر بھی لاگو ہوتا ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: ہاں تو کیا روح کا کوئی خاص کام اور وظیفہ نہیں ہوتا جسے کوئی اور چیز پورا نہیں کرسکتی مثلاً احکام دینا، غور کرنا، اور اعمال کی نگرانی کرنا، کیا یہ روح کا مخصوص فرض نہیں اور کیا انھیں کسی دوسری چیز سے منسوب کیا جاسکتا ہے؟

اس نے کہا: نہیں، یہ کسی اور سے متعلق نہیں کیے جاسکتے۔

میں نے کہا: اور کیا خود زندگی اور حیات روح کا کام نہیں؟

تھریسی میکس نے کہا: بلاشبہ ہے۔

میں نے کہا: مگر کیا روح میں کوئی مخصوص خوبی نہیں ہوتی؟

اس نے کہا: ضرور ہوتی ہے۔

میں نے کہا: کیا اس خوبی سے محروم رہ کر وہ اپنے مقاصد کو پورا کرسکتی ہے؟

اس نے کہا: ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: تو فطری طور پر ایک بُری روح بُری حکمران ہوگی اور ایک صالح روح اچھی حکمران۔

اس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: اور ہم یہ اقرار کر ہی چکے ہیں کہ عدل روح کی خوبی ہے اور ظلم اس کا نقص!

اس نے کہا: ہاں ہم یہ مان چکے ہیں۔

میں نے کہا: تو ایک صالح روح اچھی زندگی بسر کرے گی اور ایک بُری روح بُری زندگی۔

اس نے کہا: آپ کے دلائل سے تو یہی ثابت ہوتا ہے۔

میں نے کہا: اور جس کی زندگی اچھی ہے۔ وہی خوش وخرم ہے اور جس کی زندگی بُری ہے وہ اُس کے برعکس۔

تھریسی میکس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: تو عادل اس طرح خوش قسمت اور مسرور ٹھہرا اور ظالم بدنصیب اور مغموم۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور مسرت ہی سود بخش ہوتی ہے نہ کہ غم۔

اس نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: تو پھر تھریسی میکس، میرے بھائی، ظلم کبھی عدل سے زیادہ سودمند ثابت نہیں ہوسکتا۔

تھریسی میکس نے کہا: بہت اچھا۔ آپ سمجھ لیجیے کہ اس جشن کے موقع پر یہ سب باتیں تسلیم کرکے میں نے آپ کی ضیافت کی ہے۔

میں نے کہا: میں آپ کا بہت مشکور ہوں۔ آپ نے خدا کا شکر ہے کہ اب ذرا نرم طریقہ اختیار کیا اور مجھے بُرا بھلا کہنا چھوڑ دیا مگر سچ پوچھیے تو میری ضیافت پوری نہ ہوئی اور یہ خود میری غلطی تھی۔ جس طرح ایک چٹورا آدمی اپنے سامنے کی ہر رکابی سے تھوڑا تھوڑا کھاتا ہے اور کسی ایک چیز سے پورے طور پر لُطف اندوز نہیں ہوتا، بس وہی حالت میری تھی کہ میں اپنی تحقیق کے اصلی مقصد یعنی عدل کی ماہیت دریافت کرنے کے بجائے ایک مضمون سے دوسرے مضمون پر پہنچ جاتا تھا۔ میں نے تحقیق کی اصلی شاہراہ چھوڑ کر اس پر غور کرنا شروع کردیا کہ عدل وانصاف خیر ہے یا شر، دانشمندی ہے یا بے وقوفی۔ اور اس کے بعد جب عدل وظلم کے فوائد کا مقابلہ آن پڑا تو میں چُپ نہ رہ سکا۔ چنانچہ اس تمام مباحثے کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں کچھ بھی تو نہیں جانتا۔ جب مجھے یہی نہیں معلوم کہ عدل ہے کیا چیز تو میں اس کے خیر وشر ہونے کا یا عادل کے مسرور یا مغموم ہونے کا صحیح اندازہ بھلا کیسے کرسکتا ہوں؟

☆☆☆

دوسری کتاب

میرا گمان تھا کہ اتنی گفتگو کے بعد میں نے بحث کو ختم کر دیا ہے، لیکن یہ انتہا دراصل ابتدا ہی ثابت ہوئی۔ گلوکون جو ہمیشہ لڑنے پر تلے رہتے ہیں، تھریسی میکس کی پسپائی سے کچھ مطمئن نہ تھے اور ان کی دلی خواہش تھی کہ معرکہ فیصلہ کن ہو، یا ادھر یا ادھر۔ چنانچہ مجھ سے کہنے لگے "جناب سقراط! آخر اس ساری گفتگو سے آپ کا مقصد کیا تھا؟ کیا آپ ہمیں صرف ظاہراً قائل کرنا چاہتے تھے یا سچ مچ ہم پر اس حقیقت کا انکشاف منظور تھا کہ عادل اور منصف شخص ہمیشہ غیر منصف اور ظالم سے بہتر ہوتا ہے"۔

میں نے جواب دیا: میری خواہش تو یہی تھی کہ اگر ہو سکے تو آپ لوگوں کو اصل حقیقت اچھی طرح منوا دوں۔

گلوکون نے کہا: اگر آپ کا مقصد یہ تھا تو میں بتاؤں کہ آپ ابھی تک اس میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ خوبیوں کو کس طرح اصناف اور اقسام میں تقسیم کریں گے۔ میرے خیال میں بعض خوبیاں تو ایسی ہوتی ہیں جنھیں ہم ان کی ذاتی اچھائی کی وجہ سے پسند کرتے ہیں بلالحاظ ان نتائج اور فوائد کے جو ان سے بعد میں حاصل ہوں۔ مثال کے طور بے ضرر خوشیوں اور تفریحات کو لے لیجیے کہ ان سے ایک وقتی سرور حاصل ہوتا ہے اور بس، ان کا کوئی اور نتیجہ نہیں ہوتا ہے۔

میں نے جواب دیا: جی ہاں۔ میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں کہ خوبیوں کی ایک قسم یہ بھی ہے۔

گلوکون نے کہا: ایک اور دوسری قسم بھی ہے مثلاً علم، بصارت، تندرستی وغیرہ جو نہ صرف اپنی ذات سے پسند کے قابل ہیں بلکہ اپنے نتائج کی خاطر بھی پسند کی جاتی ہیں۔

میں نے کہا: بے شک آپ کا یہ خیال بھی صحیح ہے۔

گلوکون نے کہا: اور غالباً آپ ایک تیسری قسم کے وجود کا بھی اقرار کریں گے، مثلاً طب اور تشریح، اور جسمانی ورزش، یا بیماروں کی خبر گیری وغیرہ، نیز دولت کمانے کے مختلف طریقے، کہ یہ بذات خود ہر شخص

کو غیر مرغوب ہیں اور کوئی بھی، بلا لحاظ ان فوائد کے جو ان سے حاصل ہوتے ہیں ان میں مشغول نہیں ہونا چاہتا۔

میں نے کہا: جی ہاں۔ یہ تیسری قسم بھی ہے۔ لیکن آپ یہ سوال آخر پوچھ کیوں رہے ہیں؟

گلوکون نے کہا: میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ عدل کو آپ ان میں سے کس قسم میں رکھتے ہیں؟

میں نے جواب دیا: میرے نزدیک عدل ان میں سے افضل ترین قسم میں شامل ہے یعنی وہ ایک ایسی خوبی ہے جسے مسرت و اطمینانِ قلب کا ہر طالب اس کی ذاتی خوبی اور نیز اس کے نتائج کی وجہ سے پسند کرتا ہے۔

گلوکون نے کہا: لیکن عام لوگ اس رائے میں آپ کے مخالف ہیں۔ ان کے نزدیک تو عدل خوبیوں کی اس تکلیف دہ قسم میں شامل ہے جسے لوگ فائدوں کے خیال سے یا شہرت اور اعزاز کی خاطر اختیار کرتے ہیں لیکن جو فی نفسہٖ ناگوار بلکہ قابلِ احتراز ہے۔

میں نے کہا: میں عام لوگوں کے اس خیال سے بے خبر نہیں ہوں اور اسی دعوے کی بنیاد پر تو تھریسی میکس ابھی ابھی عدل کی ہجو اور ناانصافی کی مدح سرائی کر رہے تھے لیکن کم سے کم میں تو اس سے قائل ہوا نہیں۔

گلوکون نے کہا: آپ نے جس طرح تھریسی میکس سے اتنی دیر گفتگو فرمائی مجھے امید ہے کہ آپ تھوڑی دیر کے لیے میری بات بھی سنیں گے اور مجھے توقع ہے کہ میں آپ کو اپنا ہم خیال بنا لوں گا۔ تھریسی میکس تو آپ کی صدائے ہوش رُبا سے کچھ قبل از وقت مسحور ہو گئے۔ جیسے سانپ بین کی آواز سن کر بے خود ہو جاتا ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اب تک عدل اور انصاف اور ظلم اور ناانصافی کی اصلیت معلوم نہیں ہو سکی۔ نتائج اور فائدوں سے قطع نظر کر کے میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ عدل اور ناانصافی کی حقیقی ماہیت کیا ہے۔ اور وہ انسانی روح میں کس طرح خاموشی کے ساتھ اپنا عمل کرتے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں ازسرِنو تھریسی میکس کی طرف سے بات کا سلسلہ شروع کروں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے میں عدل کی حقیقت اور اس کی ابتدا اور اصلیت کے متعلق عام لوگوں کے خیال کا اظہار مناسب سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد میں یہ حقیقت روشن کروں گا کہ جو لوگ عدل پر کاربند ہوتے ہیں اس کی وجہ خود اس طرزِ عمل کی خوبی نہیں ہوتی بلکہ ضرورت ہوتی ہے جو ان کی خواہش کے خلاف ان سے ایسا کراتی ہے۔ تیسرے میں اس خیال کی معقولیت ثابت کروں گا کہ ناانصافی

اور ظلم کی زندگی ہر حال میں مجموعی حیثیت سے عدل وانصاف کی زندگی سے بہتر ہے۔ یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ میرے ذاتی خیالات کی ترجمانی ہے۔ لیکن کیا کروں، جب بار بار تھریسی میکس اور اس کے دوست ہمنواؤں کی تقریریں سنتا ہوں تو بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ خصوصاً اس لیے اور بھی کہ میں نے آج تک نہیں سنا کہ کسی نے ان کا اطمینان بخش جواب دیا ہو اور ظلم کے مقابلے میں عدل کی فضیلت صاف طور پر ثابت کر دی ہو۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ عدل میں اپنی ذات سے جو خوبیاں ہوں صرف وہ بیان کی جائیں اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ ہی اس کام کو اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں۔ اس لیے پہلے میں ناانصافی اور ظلم کی تمام ممکن خوبیاں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کے جواب میں اور اسی انداز سے عدل کی اچھائی اور ناانصافی کی برائی بیان فرمائیں۔ کہیے، آپ کو میری یہ تجویز پسند ہے نا؟

میں نے کہا: بلاشبہ۔ بھلا اس سے بہتر اور کون سا موضوع ہو سکتا ہے جس پر ایک معقول شخص خود بات کرنا اور دوسروں کی باتیں سننا پسند کرے۔

گلوکون نے جواب دیا: بالکل درست۔ تو پھر میں پہلے عدل کی ماہیت اور اصلیت کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں۔

لوگوں کا خیال ہے کہ ظلم اور ناانصافی کرنا اپنی ذات سے تو اچھی چیز ہے لیکن آپ ان کا سہنا برا ہے۔ اور چونکہ یہ برائی اچھائی سے بدرجہا زیادہ شدید ہے، اس لیے جب آدمیوں کو ناانصافی کرنے کی قوت کا ملنا مشکل اور اس سے بچنے کی توقع تقریباً ناممکن نظر آئی تو انھوں نے یہی فیصلہ مناسب سمجھا کہ ناانصافی کی جائے، نہ سہی جائے۔ چنانچہ معاہدے ہوئے اور قانون بنے، اور ان قوانین کی بجا آوری کا نام عدل اور انصاف رکھا گیا۔ ان کے نزدیک تو انصاف کی ابتدا یوں ہوئی۔ بقول ان کے انصاف و عدل ایک بیچ کی چیز ہے، ایک طرف بہترین حالت یعنی ظلم اور ناانصافی کرنے اور سزا سے محفوظ رہنے اور دوسری طرف بدترین کیفیت یعنی ظلم اور ناانصافی سہنے اور بدلے کی قوت نہ رکھنے کے بین بین ایک راستہ یا ایک درمیانی سمجھوتا۔ اس کی قدر اس وجہ سے نہیں کی جاتی کہ یہ بجائے خود کوئی اچھی چیز ہے بلکہ دو برائیوں میں کم درجے کی برائی ہے، جسے اس وجہ سے اچھا سمجھا جاتا ہے کہ عام لوگ ظلم کرنے کی قوت اور صلاحیت نہیں رکھتے، البتہ اس سے بچنے اور بدلہ لے سکنے کی طاقت ہو تو کوئی انسان جو انسان کہلانے کا مستحق ہے اس سمجھوتے کو نہیں مان سکتا اور اگر ایسی حالت میں بھی وہ اسے مانے تو وہ غریب پاگل ہے۔ تو سقراط جناب عالی، عوام کے نزدیک تو آپ کے

عدل اور انصاف کی اصلیت اور ماہیت یہ ہے۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ عادل و منصف لوگ اپنے ارادے سے عدل پر کارفرما نہیں ہوتے بلکہ ناانصافی کی طاقت اور قابلیت نہیں رکھتے، اس لیے مجبور ہوتے ہیں۔ اس بیان کی صحت کا اندازہ کرنے کے لیے فرض کیجیے کہ دو اشخاص ہیں، ایک منصف اور ایک غیر منصف۔ اور دونوں کو کامل آزادی اور اختیار حاصل ہے کہ جو چاہیں کریں۔ پھر دیکھیے ان کی خواہشیں انھیں کدھر لے جاتی ہیں۔ آپ دیکھ لیں گے کہ دونوں سرتاسر ایک راستے پر چلتے ہیں یعنی اپنی اغراض کی پابندی کرتے ہیں کہ ہر ایک اسی میں اپنا بھلا خیال کرتا ہے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ بس قوانین کے زور سے لوگ عدل کے راستے پر چلتے ہیں۔ یہ مفروضہ آزادی اور اختیار ان لوگوں کو ایسی حالت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ انھیں بھی وہی چیز نصیب ہو جو مشہور افسانے میں جائجیس (Gyges) کو میسر تھی جو کہ لیڈیا کے کروئیسس (Croesus the Lydian) کا جد امجد تھا۔ روایت ہے کہ جائجیس شاہ لیڈیا (Lydia) کی سرکار میں ایک چرواہا تھا۔ ایک دن سخت طوفان اور زلزلہ آیا جس جگہ یہ اپنی بھیڑیں چرا رہا تھا وہاں زمین شق ہوئی اور ایک بڑا غار ہو گیا۔ تحیر اور تعجب کے عالم میں یہ اس غار میں اترا من جملہ، اور عجائبات کے، اسے ایک پیتل کا گھوڑا دکھائی دیا جس میں جابجا روزن بنے تھے۔ ان روزنوں میں سے جھانکا تو ایک لاش دیکھی جو قد میں معمولی انسانوں سے لمبی تھی۔ لاش بالکل ننگی تھی البتہ ایک انگلی میں سونے کی انگوٹھی پہنے تھی۔ چرواہے نے یہ انگوٹھی اتار لی اور غار سے باہر نکل آیا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ کچھ روز بعد تمام شاہی چرواہے بدستور سابق ایک جگہ جمع ہوئے تاکہ بادشاہ کی خدمت میں گلے کے متعلق ماہانہ اطلاع پیش کریں۔ اس مجمع میں یہ چرواہا بھی وہی انگوٹھی پہنے ہوئے آیا۔ یونہی بیٹھے بیٹھے اس نے انگوٹھی کا نگ جو اندر کی طرف پھیرا تو وہ یکا یک عام مجمع کی نظر سے اوجھل ہو گیا۔ سب اہل مجلس اسے غائب سمجھنے لگے۔ یہ چرواہا خود سخت متعجب تھا کہ اس نے جوں ہی انگوٹھی کا نگ باہر کی طرف پھیرا، پھر سب کو دکھائی دینے لگا۔ چنانچہ اس نے کئی بار تجربہ کیا اور ہمیشہ یہی نتیجہ نکلا۔ اب کیا تھا کوشش کر کے یہ ان پیامبروں میں شامل ہو گیا جو دربار میں جانے کے لیے منتخب کیے جاتے تھے۔ دربار میں گزر ہونا تھا کہ اس نے ملکہ کو بہکا لیا اور اس کی مدد سے بادشاہ کے خلاف سازش کی اور بالآخر اسے قتل کر کے سلطنت کا مالک بن بیٹھا۔

فرض کیجیے اسی قسم کی دو انگوٹھیاں آج ہمیں مل جائیں اور ہم ایک کسی منصف شخص کو اور دوسری ایک غیر منصف شخص کو پہنا دیں۔ میرے خیال میں تو شاید ہی کوئی اتنی پکی طبیعت کا آدمی ہو کہ ایسی حالت میں بھی

عدل وانصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ کون ہوگا جو ایسی صورت میں بازار سے گزرتے ہوئے ایسی مختلف چیزوں پر ہاتھ صاف نہ کردے جو اسے پسند ہیں، لیکن اس کی مِلک نہیں۔ یہ گھروں اور خلوت خانوں میں گھس کر جس سے چاہے گا روابط اختلاط پیدا کرے گا جسے چاہے گا مار ڈالے گا اور جسے چاہے گا قید خانے سے چھڑا لائے گا۔ اس کی حیثیت انسانوں میں ایک دیوتا کی سی ہو جائے گی۔ اور اس صورت میں منصف اور غیر منصف کے اعمال بالکل ایک سے ہو جائیں گے۔ میری رائے میں یہ بات اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ کوئی شخص بھی خوشی سے اس لیے منصف نہیں بنتا کہ وہ اسے اپنی ذات کے لیے مفید سمجھتا ہے بلکہ ناچاری اور ضرورت اسے منصف بننے پر مجبور کرتی ہے۔ کیونکہ جب کوئی شخص آسانی سے بے خوف ناانصافی کرسکتا ہے تو وہ کبھی اس سے نہیں چوکتا اور ہر شخص اپنے دل میں یہ یقین رکھتا ہے کہ ظلم اور ناانصافی کرنا عدل اور انصاف کے بہ نسبت اس کی ذات کے لیے کہیں زیادہ سود مند ہے اور سچ یہ ہے کہ ان کا یہ خیال غلط نہیں۔ اگر آپ کے لیے کسی ایسے وجود کا تخیل ممکن ہے جس میں نظر سے اوجھل ہو جانے کی طاقت ہو اور اس کے باوجود وہ کوئی برا کام نہ کرے نہ کسی غیر کی چیز چھوئے، تو یقین مانیے کہ عام لوگ تو ایسے آدمی کو انتہائی احمق خیال کریں گے۔ ہاں یہ ضرور ممکن ہے کہ ریاکاری سے یہ لوگ ایک دوسرے کے سامنے اس شخص کی تعریف ہی کریں لیکن یہ صرف اس غرض سے ہوگا کہ کہیں خود ان کے ساتھ ناانصافی روا نہ رکھی جائے۔

اچھا اب اس قصے کو ختم کریں اور آیئے ایک عادل اور منصف اور ایک ظالم وغیر منصف شخص کی زندگی کی اچھائی اور برائی کا صحیح اندازہ لگائیں۔ اس غرض کے لیے ان دونوں کو الگ الگ لیجیے۔ غیر منصف شخص پورا پورا ظالم اور بے ایمان ہو اور عادل شخص کامل طور پر منصف اور ایمان دار۔ دونوں کو اپنا اپنا الگ زندگی کا مقصد حاصل کرنے میں کامل آزادی دیجیے۔ یہ بھی التزام ہو کہ غیر منصف شخص دوسرے فنون کے ماہروں کی طرح اپنے کمال کی قوتوں اور نیز اس کی حدود سے اچھی طرح واقف ہو۔ اور اگر کہیں غلطی ہو جائے تو اس کی تلافی کرسکے۔ یہ سب اس لیے ضروری ہے کہ وہ تمام بے ایمانیاں آسانی سے کرے اور انھیں پوشیدہ بھی رکھ سکے کیونکہ پکڑا گیا تو پھر بات ہی کیا ہوئی۔ ناانصافی اور بے ایمانی کا کمال تو یہی ہے کہ اس کا کرنے والا ایمان دار سمجھا جائے۔ اور ہم چونکہ ناانصافی کا کامل ترین نمونہ مقابلے کے لیے لینا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہی شخص مناسب ہے جو باوجود انتہائی بے ایمانیوں کے بہت زیادہ ایماندار مشہور ہو۔ ساتھ ہی اچھا جادو بیان مقرر بھی ہو کہ اگر کوئی راز فاش ہو جائے تو اپنی سحر بیانی سے لوگوں کو چپ کرادے۔ نیز ضرورت کے وقت اپنی

قوت اور جرأت، دولت اور دوستوں سے بھی کام لے سکے۔ اس شخص کے مقابلے میں بیچارے عادل اور ایماندار شخص کو لیجیے جس کا آدرش ایسکلس (Aeschylus) کے لفظوں میں یہ ہے کہ نیکی کرے لیکن بظاہر نیک نہ معلوم ہو۔ اسے ظاہراً مطلق ایمان دار نہ ہونا چاہیے کیونکہ اگر ایسا ہوا تو لوگ اس کی عزت اور احترام کریں گے اور اس طرح بات صاف نہ ہو سکے گی کہ آیا وہ عدل کو فی نفسہٖ اچھا سمجھتا ہے یا محض عزت کے لالچ سے منصف بنا ہوا ہے۔ اس کا تو اوڑھنا بچھونا عدل و انصاف ہونا چاہیے اور بس۔ اور پورا امتحان بھی اسی حالت میں ممکن ہے کہ وہ دراصل لوگوں میں بہترین ہو لیکن ان کے نزدیک بدترین انسان سمجھا جائے۔ اسی سلسلے میں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ بدنامی اور اس کے نتائج کا کوئی اثر اس پر ہوتا ہے یا نہیں۔ اس حقیقی ایمان دار لیکن بظاہر بے ایمان شخص کی یہی حالت آخر دم تک رہنے دیجیے اور جب عادل اور ظالم دونوں اپنی اپنی جگہ اپنے عدل اور بے ایمانی کی انتہا کو پہنچ جائیں تو اس وقت یہ فیصلہ کیا جائے کہ کون زیادہ خوش رہا، کس کی زندگی مسرت اور انبساط سے پر تھی اور کس کی غم اور تکلیف سے۔

میں نے کہا: بھائی گلوکون تم نے تو کمال کر دیا۔ اس خوبی سے دونوں کیفیتوں کو بیان کر دیا کہ آنکھوں کے سامنے تصویر سی پھر گئی۔

اس نے کہا: جی، اپنے بس بھر تو کوشش کی۔ خیر۔ یہ تو معلوم ہو گیا کہ یہ دونوں فریق کیسے ہوتے ہیں۔ اب یہ سمجھنے میں کچھ زیادہ دشواری نہ ہوگی کہ وہ کس قسم کی زندگی بسر کریں گے۔ میں اب اس زندگی کی تصویر پیش کرتا ہوں لیکن چونکہ ممکن ہے کہ میرا بیان کچھ رکیک معلوم ہو اس لیے چند لمحوں کے لیے فرض کر لیجیے کہ یہ میرے لفظ نہیں بلکہ ظلم و ناانصافی کے کسی مداح اور قصیدہ خواں کی زبان سے نکل رہے ہیں۔ اس مداح کے خیال میں تو حقیقی ایمان دار لیکن بظاہر بے ایمان شخص سخت مصیبت میں مبتلا رہے گا، اس کو کوڑے مارے جائیں گے، درے بھی پڑیں گے، قید کیا جائے گا، آنکھیں نکالی جائیں گی اور بالآخر یہ تمام مصائب و آلام برداشت کرنے کے بعد وہ بیچارہ سولی پر چڑھا دیا جائے گا۔ تب جا کر اس غریب کو خبر ہوگی کہ کام دراصل ایمان دار ہونے سے نہیں چلتا بلکہ ظاہر میں ایمان دار معلوم ہونے سے نکلتا ہے۔ ایسکلس کے لفظ سچ پوچھو تو ایمان دار سے زیادہ بے ایمان پر چسپاں ہوتے ہیں۔ کیونکہ ظالم اور غیر منصف ایک حقیقت اور اصلیت کا پیرو ہے وہ صرف ظاہر پرست تو ہے نہیں۔ اس کا مقصد تو واقعی بے ایمان بننا ہے نہ کہ صرف دکھاوے کے لیے (بقول شاعر):

''اس کے ذہن کی زمین گہری ہوتی ہے اور زرخیز جس سے فہم و دانش کی باتیں اُبھرتی ہیں''۔

اب اس کی حالت سنیے۔ اوّل تو لوگ اسے ایمان دار سمجھیں گے اور اس طرح وہ حاکم شہر بن جائے گا جس عورت کو چاہے گا بیوی بنائے گا، جس مرد سے چاہے گا اپنی لڑکیوں کا عقد کرائے گا۔ ہر جگہ تجارت اور کاروبار کر سکے گا۔ اور چونکہ کوئی اسے بے ایمان تو سمجھتا ہے نہیں اس لیے ہمیشہ فائدے ہی میں رہے گا۔ ہر مقابلے میں، چاہے نجی ہو چاہے عمومی، اپنے حریف کو نیچا دکھائے گا۔ دوسروں کی دولت سے مال دار بنے گا اور اس مال کو اپنے دوستوں کے فائدے اور دشمنوں کے نقصان کے لیے کام میں لائے گا۔ اس کے علاوہ قربانیاں کر سکے گا اور دل کھول کر دیوتاؤں پر نذریں چڑھائے گا۔ اگر کسی انسان یا دیوتا کی عزت اور توقیر بڑھانا چاہے گا تو ایک ایمان دار شخص کے مقابلے میں زیادہ آسانی اور خوبی سے ایسا کر سکے گا۔ اور ان وجوہ سے دیوتاؤں کی نظر میں بھی عادل شخص کی بہ نسبت زیادہ عزیز ہوگا۔ ان حالات میں انسان اور دیوتا مل کر اس کی زندگی کو ایک ایمان دار شخص کی زندگی سے زیادہ خوش گوار بنا دیں گے''۔

میں گلوکون کے جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اس کا بھائی ایڈیمنٹس بیچ میں بول اُٹھا ''کیا جناب کا خیال ہے کہ اس تعریف میں کچھ اور اضافے کی گنجائش نہیں''؟

میں نے جواب دیا: کیوں۔ کیا کچھ اور بھی باقی ہے!

ایڈیمنٹس نے کہا: ابھی سب سے زیادہ ضروری بات کا تو ذکر ہی نہیں ہوا۔

میں نے کہا: سچ ہے، بھائی بھائی کی مدد کرتا ہے۔ اگر گلوکون سے کوئی بات رہ گئی ہے تو آپ اس کو پورا کر دیجیے۔ اگرچہ حقیقت تو یہ ہے کہ گلوکون ہی نے مجھے کافی پچھاڑ دیا ہے اور عدل کی حمایت کرنے کی طاقت بہت کچھ مجھ سے چھین لی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: آپ کا یہ ارشاد تو صحیح نہیں ہے۔ تاہم میں کچھ عرض ضرور کروں گا۔ گلوکون نے عدل کی جو مدح اور ظلم کی جو مذمت کی ہے اس کا ایک پہلو اور بھی ہے اور میرے نزدیک گلوکون کا مفہوم سمجھنے کے لیے اس پہلو کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ ماں باپ اور استاد ہمیشہ اپنی اولاد اور شاگردوں کو ایمان دار اور منصف مزاج بننے کی تاکید کرتے ہیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کیوں؟ اس کی وجہ انصاف کی ذاتی خوبی نہیں بلکہ عزت اور

شہرت ہے جو اس سے وابستہ ہوتی ہے۔ اور اس تلقین سے مقصد یہ ہے کہ اس شہرت کی وجہ سے ان کی اولاد یا ان کے شاگرد، نوکری، شادی بیاہ اور دوسری باتوں میں فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ ظاہر پرست طبقہ اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ دیوتاؤں کی توجہ اور مہربانی کا لالچ بھی دیتا ہے۔ آپ ان لوگوں سے کبھی ذرا بات کیجیے۔ ایک لمبی فہرست ان آسمانی برکتوں کی پیش کر دیں گے جو نیک اور منصف لوگوں پر نازل ہوتی ہیں۔ ہزیوڈ (Hesiod) اور ہومر جیسے شاعروں کے کلام سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ ہزیوڈ کے نزدیک دیوتا عادل لوگوں کو:

> ''شاہ بلوط کا درخت بنا کر چوٹی پر پھل لا دیتے ہیں اور بیچ میں شہد کے چھتے لگا دیتے ہیں اور ان کی بھیڑیں اُون کے بوجھ سے دبی جاتی ہیں''۔

اور ایسی ہی اور بہت سی نعمتیں ان کے لیے فراہم کی جاتی ہیں۔

ہومر کا بھی کچھ یہی انداز ہے۔ وہ کسی کی شہرت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

> ''اس بے داغ بے عیب بادشاہ کی سی شہرت جو دیوتا جیسا ہے، عدل قائم رکھتا ہے، کالی مٹی اس کے سامنے گیہوں اور جَو اُگلتی ہے، اور اس کے درخت پھلوں کے بوجھ سے جھکے جاتے ہیں، اس کی بھیڑیں پے در پے بیاہتی ہیں اور سمندر اسے بکثرت مچھلیاں دیتا ہے''۔

میوسائیس (Musaeus) اور اس کا بیٹا تو دونوں اس سے کہیں زیادہ شاندار چیزوں کی توقع دلاتے ہیں۔ ان کے خیال میں نیک اور منصف شخص کو مرنے کے بعد جب عالم بالا میں لے جاتے ہیں تو وہ ایک دعوت میں شریک کیا جاتا ہے جہاں بڑے بڑے برگزیدہ لوگ مسندوں پر لیٹے ہوتے ہیں۔ پھولوں کے تاج سر پر ہیں اور شراب کا دور برابر چل رہا ہے۔ گویا ان کے نزدیک تمام نیکیوں کا صلہ شُربِ دوام اور ابدی سرمستی ہے!

پھر بعض تو اس اجر کی امید کو عادل شخص کی ذات سے بھی آگے لے جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ منصف آدمی کی نسل چار پانچ پشت تک ضرور چلتی ہے۔ غرض نت نئی شکلوں سے لوگ عدل اور انصاف کی مدح میں رطب اللسان ہوتے ہیں۔

لیکن بُرے افراد کے لیے بالکل دوسری شے ہے۔ یہ بے چارے دوزخ کے غار میں ڈال دیے جائیں گے۔ ان کی دائمی مشقت یہ ہوگی کہ چھلنی میں پانی بھر کر لائیں۔ جیتے جی بھی ان کی ہر طرح رسوائی ہوگی

اور ان غریبوں کو وہ سب سزائیں ملیں گی جو گلوکون نے ابھی ابھی اس منصف شخص سے منسوب کی ہیں جو بے ایمان مشہور ہو۔

اس کے علاوہ سقراط عدل اور ناانصافی کے متعلق ایک اور انداز بیان بھی ہے اور یہ عوام اور شعرا دونوں میں یکساں رائج ہے۔ سب کے سب اس پر یک زبان ہیں کہ نیک اور منصف ہونا بڑی قابل تحسین بات ہے، لیکن ساتھ ہی سخت دشوار بھی ہے۔ برخلاف اس کے ناانصافی اور بے ایمانی بذات خود نہایت دلکش اور سہل الحصول ہیں لیکن صرف جمہور کی رائے اور قوانین کی وجہ سے بری سمجھی جاتی ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک عدل اور انصاف میں ظلم اور ناانصافی کے مقابلے میں بہت کم فائدے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ شریر اور فتنہ پرور لوگوں کو خوش نصیب اور مبارک بتانے، نیز خلوت اور جلوت میں ان کی عزت اور توقیر کرنے سے ذرا نہیں شرماتے۔ ہاں یہ شرط ہے کہ ان کے پاس دولت ہو اور جاہ و ثروت کے اور سب اسباب بھی موجود ہوں۔ نہ یہ شمہ برابر اس نیک شخص کی ہجو اور مذمت کرنے سے شرماتے ہیں جو تنگی اور افلاس کی کڑیاں جھیل رہا ہے۔ چاہے خود انھیں اس کی خوبی اور نیکی کا دلی اعتراف ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن ان تمام باتوں سے زیادہ حیرت انگیز تو وہ بیانات ہیں جو خود دیوتاؤں کے متعلق اور نیکی اور خوبی کے متعلق اکثر دیے جاتے ہیں۔ ان تمام بیانات کا ماحصل یہ ہے کہ دیوتا بھی اکثر نیک لوگوں کی زندگی میں دکھ اور بُرے لوگوں کو سکھ پہنچاتے ہیں۔ ہر جگہ ایسے پیش گوئی کرنے والے بھک منگے موجود ہیں جو امیروں کے دروازوں پر چکر لگاتے ہیں اور اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ اگر قربانیاں کی جائیں، کھانے کھلائے جائیں، تو ان کے پاس ایسی طاقت ہے کہ وہ دیوتاؤں سے ہر گناہ بخشوا سکتے ہیں چاہے وہ خود ان سے سرزد ہوا ہو یا ان کے باپ دادا اس کے مرتکب ہوئے ہوں۔ تھوڑے سے خرچ میں، نیک و بد کا لحاظ کیے بغیر، یہ لوگ ہر مخالف کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ بعض ایسے منتر، اور ورد، وظیفے جانتے ہیں جن کی تاثیر سے دیوتا ان کے قابو میں آجائیں گے اور ان کے کہے پر چلیں گے۔ اور ان سب دعوؤں کی تصدیق میں شاعروں کا کلام پیش کیا جاتا ہے ہزیوڈ کے نزدیک:

> "اگر شر اور بدی کی تلاش ہے تو وہ ہر جگہ بآسانی مل سکتی ہے کہ اس کی منزل بہت قریب ہے اور اس کی راہ نہایت آرام دہ ہے۔ لیکن اگر نیکی کی تلاش ہو تو اس کے متعلق تو فرمودۂ آسمانی ہے کہ پیشانی کا پسینہ ایڑی کو آئے تب کہیں یہ نصیب ہو، کہ اس راہ میں ہر طرح کی مصیبتیں اور صعوبتیں ہیں"۔

کہیں اس خیال کی تائید میں، کہ دیوتا اپنے ارادے سے ہٹائے جاسکتے ہیں، ہومر کی شہادت پیش کی جاتی ہے کہ:

"لجاجت اورزاری تو ایسی چیز ہے کہ دیوتا تک اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب کبھی انسان سے کسی گناہ یا نافرمانی کا ارتکاب ہوجاتا ہے تو وہ غم وحسرت سے بھری ہوئی دعائیں مانگتا ہے اور قربانیاں چڑھاتا ہے۔ خوشبودار بخور دیتا اور گھی کے چراغ جلا کر عجز وانکساری سے منتیں کرتا ہے اور بالآخر دیوتاؤں کا عتاب رحم میں بدل جاتا ہے"۔

اس کے علاوہ میوسائیس اور آرفیس (orpheus) کی تصانیف کا ایک انبار ہے جو پیش کیا جاتا ہے۔ ان کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ یہ چاند (Moon) اور میوز (Muses) کی اولاد ہیں۔ چنانچہ ان کا کلام اکثر تقریبوں اور عام تہواروں کے موقع پر پڑھایا جاتا ہے اور اس طرح نہ صرف افراد کو بلکہ پورے پورے شہروں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ کچھ قربانیاں کر کے اور عیش وطرب کی محفلیں رچا کر جیتے جی بھی اور مرنے کے بعد بھی تمام گناہوں کی تلافی ممکن ہے۔ ان کے عقیدے کے مطابق ان رسموں کا ادا کرنا، جنھیں "اسرار" کہتے ہیں، انسان کو آخرت میں سزا اور جزا سے آزاد کر دیتا ہے اور ان سے غفلت کی جائے تو جانے کیا پیش آئے۔

جب اس قسم کے خیالات یوں پھیلائے جاتے ہیں اور طرح طرح سے عام لوگوں کے سامنے انھیں بار بار دوہرایا جاتا ہے تو اس کا نتیجہ ان نوخیز دماغوں پر کیا ہوگا جو، شہد کی مکھیوں کی طرح کہ ہر پھول پر ٹھہرتی ہیں، ہر چیز کو سطحی طور پر سن کر اس سے نتیجے نکال لیتے ہیں، ان کے پیش نظر بہترین زندگی کی کیا تصویر ہوتی ہوگی اور راہِ خیر وبرکت کا کیسا نقشہ سامنے آتا ہوگا جن پر چل کر وہ فلاح حاصل کرسکیں! ایسا نوجوان تو بقول پنڈر کہتا ہوگا کہ:

"عدل وانصاف مجھے اس بلند مینار تک پہنچا سکتا ہے یا فریب ودغا، جہاں میں اپنی ساری عمر یوں محفوظ گزاروں جیسے ایک مضبوط قلعے میں؟"

کیونکہ آپ ہی غور فرمائیے، میں لاکھ نیک سہی لیکن اگر مجھے ایمان دار مانا نہیں جاتا تو میری ساری نیکی اور منصف مزاجی بے کار ہے بلکہ نقصان دہ ہے۔ لیکن اگر باوجود ظلم وناانصافی کے میں کسی طرح نیک اور ایمان دار مشہور ہوجاؤں تو پھر کیا کہنا! اسی دنیا میں جنت ہوگی۔ جب، بقول حکما، ظاہر، باطن پر غالب آتا ہے تو میں کیوں نہ ظاہر ہی کی پابندی کروں۔ مکان کے ہر چار طرف تقدس اور نیکی، عدل اور انصاف کی فضائے

جاں نواز ہو لیکن مکین ظلم اور بے ایمانی میں فرد۔ ایک تصویر سے اپنے چہرے کو خوش نما بنالوں لیکن پیچھے وہی مکار لومڑی کی دم ہو جس کا ذکر اس حکیم اعظم آرکی لوکس (Archilochus) نے کیا ہے۔ ممکن ہے آپ فرمائیں کہ برائی کا پوشیدہ رکھنا کچھ سہل کام نہیں۔ بے شک یہ صحیح ہے، لیکن دنیا میں کوئی بڑا کام سہل نہیں ہوتا۔ یہ بات قطعی ہے کہ اگر دنیا میں آرام اور آسایش، مسرت اور اطمینان کے آرزو مند ہو تو بس اسی راہ کو اختیار کرو۔ رہا راز کا پوشیدہ رکھنا، اس کے لیے خفیہ انجمنیں بناؤ، سیاسی جماعتیں قائم کرو۔ اور یہ کیوں؟ فنِ خطابت کے ماہروں سے عدالتوں اور مجمعوں کو اپنی بات باور کرانا سیکھو اور اس طرح کچھ تو ترغیب تلبیس اور کچھ جبر و تعدی سے سزا کے خوف کے بغیر اپنی بے ایمانی کے پھل حاصل کرو۔ یہاں ممکن ہے کوئی کہے کہ دیوتاؤں کو کس طرح دھوکا دو گے۔ انھیں کس طرح ترغیب و تلبیس سے قائل کر سکو گے؟ تو اس کا جواب دو حال سے خالی نہیں۔ اول یہ کہ یا تو دیوتاؤں کا وجود ہی نہیں، اگر ایسا ہے تو پھر کیا کہنا۔ معاملہ صاف ہے۔ یا یہ کہ دیوتا انسانی اعمال سے بے خبر اور ان سے بے تعلق ہیں۔ اگر یہ ہے تو بھی تلبیس کی چنداں ضرورت نہیں۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ دیوتاؤں کا وجود ہے اور وہ انسانی اعمال کی خبر گیری بھی کرتے ہیں۔ ہم نے اسے تسلیم کیا۔ لیکن ہم کو دیوتاؤں کے متعلق جو کچھ بھی علم ہے اس کا ذریعہ یا تو پچھلی روایات ہیں یا شاعروں کا کلام۔ اور ان لوگوں کے کہے کے مطابق تو دیوتاؤں پر بھی اثر ڈالا جا سکتا ہے اور یہ ممکن ہے کہ دعاؤں، قربانیوں اور منتوں کے ذریعے انھیں اپنے ارادے سے ہٹا دیا جائے۔ پھر یا تو ان راوتیوں کو اور شاعروں کے کلام کو پورا سچ مانو یا بالکل جھوٹ سمجھو۔ اگر ان لوگوں کا کہنا سچ ہے، تو پھر کیا ہے، بے ایمان ہونا ہی سراسر بہتر ہے۔ کھلے بندوں بے ایمانی کرو، البتہ اس بے ایمانی کی کمائی میں سے کچھ قربانیوں اور منتوں میں صرف کر دو۔ کیونکہ آخر ایمان داری میں رکھا ہی کیا ہے۔ یہی نا کہ غالباً عذاب الٰہی سے محفوظ ہو گے، لیکن ظلم اور ناانصافی کے فائدوں سے تو بہرہ اندوز نہ ہو پاؤ گے۔ برخلاف اس کے بے ایمانی میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ ہر طرح کے جائز اور ناجائز فائدے حاصل کرو اور پھر دعاؤں اور قربانیوں کے ذریعے عذاب الٰہی سے بھی بچ جاؤ۔ رہا آخرت کا ڈر، سو اس کے لیے بھی مختلف رسمی مناجاتیں اور شفاعت کرنے والے دیوتا موجود ہیں کم سے کم بڑے بڑے شہروں میں تو یہی عقیدہ عام ہے، پھر شاعر اور پیغمبر بھی، جو ان دیوتاؤں کی اولاد مانے جاتے ہیں، اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔

اب آپ ہی فرمائیے کہ بھلا کس وجہ سے کوئی عدل اور انصاف کو کامل ظلم اور بے ایمانی پر ترجیح دے۔ بے ایمانی کے ساتھ تھوڑی سی ظاہری ایمان داری اور چاہیے اور بس۔ انسان اپنی زندگی کو جیتے جی اور

مرنے کے بعد دیوتاؤں اور آدمیوں دونوں کے نزدیک نہایت آرام و آسایش سے گزار سکتا ہے۔ اگر کسی شخص کو ذرا سا بھی دماغی یا جسمانی امتیاز یا دولت اور مرتبے میں تھوڑی سی بھی برتری حاصل ہے تو وہ کیوں ایمان داری پر عمل کرنے لگا۔ اس کے سامنے اگر عدل کی تعریف و توصیف کی گئی تو وہ تو ہنسے گا۔

میں جانتا ہوں کہ دنیا میں ایسے لوگ ہوں گے جو میری ان دلیلوں کو نہ مانیں گے۔ اور عدل کو ظلم پر ترجیح دیں گے۔ لیکن خوب یاد رکھیے، یہ لوگ بھی بے ایمان کو قابلِ معافی ضرور سمجھتے ہوں گے، کیونکہ انھیں یقین ہے کہ کوئی شخص خوشی سے ایمان دار اور عادل نہیں ہوتا سوائے ان لوگوں کے جن کے دلوں کو خدا نے ظلم و ناانصافی سے فطرتاً نفور کر دیا ہے اور جن کے سامنے حقیقت بے نقاب ہو چکی ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے آدمی تو صرف اس وجہ سے ظلم اور بے ایمانی کو برا سمجھتے ہیں کہ وہ خود عمر کی زیادتی، کمزوری، یا کم ہمتی کی وجہ سے اس کا ارتکاب نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اس کا معمولی ثبوت یہ ہے کہ جب انھیں کچھ قوت اور قدرت حاصل ہو جاتی ہے تو یہ بھی اپنی بساط اور استعداد کے مطابق بے ایمانی اور ظلم شروع کر دیتے ہیں۔

سقراط اس صورت حال کی وجہ ہم دونوں بھائیوں نے گفتگو کے شروع میں عرض کی تھی یعنی یہ کہ پرانے وقتوں سے لے کر ہمارے زمانے تک جتنے لوگ بھی عدل و انصاف کے مدح سرا ہوئے ہیں، وہ سب کے سب ناانصافی کی مذمت اور عدل کی تعریف کرتے ہیں تو یہ بات سامنے رکھتے ہیں کہ عدل ہی سے عزت فائدہ اور شہرت حاصل ہوتی ہے۔ نظم و نثر کے دفتر کے دفتر الٹ ڈالیے، آپ کہیں نہ پائیں گے کہ کسی شخص نے بھی ان صفات کی حقیقی ماہیت پر بحث کی ہو یا یہ بتایا ہو کہ انسانی اور خدائی نگاہ سے پوشیدہ رہ کر بھی یہ صفات انسانی روح پر کیا کیا اثر پیدا کرتی ہیں۔ یا یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہو کہ عدل روح کی تمام داخلی صفات میں سب سے بڑی خوبی اور ظلم سب سے بڑا عیب ہے۔ اگر ہمیں بچپن سے یہی سکھایا جاتا تو آج بجائے اس کے کہ ہم ایک دوسرے کی نگرانی رکھتے کہ کوئی ظلم نہ کر پائے ہم خود اپنے نگران ہوتے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری روح میں یہ ارذل ترین برائی جگہ پا جائے۔ یہ جو کچھ میں نے عرض کیا سب تھریسی میکس اور ان کے ساتھیوں کے خیالات کی ترجمانی تھی۔ بلکہ ممکن ہے وہ اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ میں اپنا مفہوم ادا کرتے۔ لیکن میں نے جو یہ سب کچھ عرض کیا اس کا مقصد یہ ہے کہ آپ بھی فریق مخالف کے خیالات اسی انداز سے ظاہر فرمائیں۔ صرف ظلم پر عدل کی فوقیت ظاہر کرنے پر بس نہ کیجیے بلکہ یہ بھی فرمائیے کہ ان صفات میں وہ کونسا اثر ہے جو منصف کو نیک یا بد بنا دیتا ہے۔ البتہ گلوکون کی درخواست کا ذرا خیال رہے کہ شہرت اور عزت کا ذکر بھی نہ

آنے پائے بلکہ میں تو یہاں تک عرض کروں گا کہ جب تک آپ حقیقتِ امر کے بالکل برعکس صفات سے متصف ہونے کی شہرت فرض نہ کرلیں اس وقت تک یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آپ حقیقتاً عدل ہی کی تعریف کررہے ہیں۔ اور اگر ہم یہ سمجھیں تو چنداں بے جانہ ہوگا کہ آپ صرف مصلحتاً ہم لوگوں کو ظلم اور ناانصافی سے محترز رہنے کی تلقین فرمارہے ہیں اور فی الحقیقت آپ کے نزدیک بھی تھریسی میکس ہی کی رائے صحیح ہے کہ انصاف اور عدل قوی فریق کی اغراض کی بجاآوری کا نام ہے اور ظلم اور ناانصافی میں صرف کمزور کا نقصان ہے اور زبردست کا سراسر فائدہ۔

آپ اس بات کا اقرار تو کرہی چکے ہیں کہ عدل خوبیوں کی اس اعلیٰ قسم میں سے ہے جس کی پابندی صرف اچھے نتیجوں کی امید پر نہیں بلکہ اس کی ذاتی خوبی کی وجہ سے بھی کرنا ضروری ہے۔ یعنی اس کی حیثیت بھی وہی ہے جو دوسری ایسی حقیقی (نہ کہ رسمی) خوبیوں کی ہے جیسے باصرہ، سامعہ، علم، تندرستی وغیرہ۔

آپ جو عدل کی خوبیاں بیان فرمائیں تو اس میں براہ ' کرم ذرا ایک بات کا خیال رکھیں، یعنی یہ کہ وہ کیا خوبی یا برائی ہے جو اس پر کاربند ہونے یا نہ ہونے سے آپ ہی آپ رونما ہوجاتی ہے۔ کیونکہ دوسرے لوگ اگر عدل کی تعریف میں اس کے بعض لوازم، مثلاً عزت اور شہرت سے استدلال کریں تو میں اسے چنداں قابل اعتراض نہ سمجھوں۔ لیکن آپ سے تو مجھے زیادہ بلند اور ارفع باتیں سننے کی توقع ہے، کہ آپ نے تمام عمر اسی اہم مسئلے پر غور وفکر میں صرف فرمائی ہے۔ مجھے امید ہے کہ میری توقعات کا خیال کرکے آپ صرف عدل کی فضیلت بیان کرنے پر اکتفانہ کریں گے بلکہ اس بات پر پوری پوری روشنی ڈالیں گے کہ یہ صفت اپنی ذات سے بلا لحاظ اس امر کے کہ کوئی دیکھتا اور جانتا ہے یا نہیں، متصف کی روحانی حالت کو کیسا بنادیتی ہے۔

یوں تو میں ہمیشہ گلوکون اور ایڈیمنٹس کی ذہانت کا معترف تھا، مگر اس گفتگو کو سن کر تو میرا جی بہت ہی خوش ہوا اور میں نے کہا:

> ''سچ ہے تم بڑے باپ کے بیٹے ہو اور گلوکون کے مداح شاعر نے تم دونوں کی شان میں معرکۂ میگارا کی نام آوری کے بعد جو کہا تھا: ''ارسٹن کے سپوت، ایک نامی بطل کی دیوتاؤں جیسی اولاد''۔

تو بالکل درست کہا تھا۔ یقیناً تم پر یہ خدا کا خاص فضل ہے کہ اگرچہ تم نے ابھی ابھی عدل کے خلاف ظلم کی طرف سے اتنی اچھی وکالت کی، تاہم تم خود اس چیز کو دل سے برا جانتے ہو۔ تم ہی بتاؤ کہ اگر کوئی شخص

تمھارے عمل اور تمھارے اصلی خیالات سے ناواقف ہو اور پھر تمھاری یہ تقریر سنے تو اسے کس قدر غلط فہمی ہو۔ لیکن جتنا پکا یقین مجھے تمھارے سچے عقیدے کا ہے اتنا ہی اعتراف مجھے اپنی دقتوں کا ہے۔ میں اپنے آپ کو دوہری مشکل میں مبتلا پاتا ہوں۔ ایک طرف تو اپنی بے بضاعتی کا احساس اور یہ اس وجہ سے اور بھی زیادہ ہو گیا ہے کہ آپ لوگ ان دلیلوں سے مطمئن نہیں ہوئے جو میں نے تھریسی میکس کے جواب میں پیش کی تھیں۔ حالانکہ میں نے تو اپنے نزدیک انصاف اور عدل کی فضیلت کا کامل ثبوت دے دیا تھا۔ دوسری طرف اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ممکن نہیں کہ خاموش رہوں کہ جب تک سینے میں سانس آتا ہے اور زبان میں بولنے کی سکت ہے اس وقت تک یہ محال ہے کہ عدل اور انصاف کے خلاف کچھ سنوں اور اپنے بس بھر اس کی تردید نہ کروں۔ چنانچہ اپنی بساط کے موافق اس وقت بھی عدل کی کچھ نہ کچھ حمایت ضرور کروں گا۔

گلوکون اور دوسرے لوگوں نے بھی اصرار کیا کہ سلسلۂ کلام کو ختم نہ ہونے دوں اور خواہش ظاہر کی کہ کامل غور و خوض کے بعد عدل اور ظلم کی اصلی ماہیت دریافت کی جائے اور پھر ان کے مختلف فائدے اور مضرتیں معلوم کی جائیں۔ چنانچہ میں نے بات کا سلسلہ اس طرح شروع کیا۔ "ہم جس مسئلے پر اب غور کرنا چاہتے ہیں وہ کوئی معمولی اور سہل مسئلہ نہیں بلکہ اس کے لیے بہت گہری نظر درکار ہے۔ اور چونکہ اپنی نا قابلیت سے ڈرتا ہوں اس لیے مناسب ہے کہ تحقیق کا وہ طریقہ اختیار کیا جائے جسے میں ایک مثال دے کر سمجھاتا ہوں۔ فرض کیجیے ایک آدمی کی نگاہ کمزور ہے اور آپ اس سے ایک باریک خط کی تحریر فاصلے سے پڑھوانا چاہتے ہیں۔ لیکن ہمارے کسی ساتھی کے علم میں وہی تحریر جلی قلم میں لکھی ہوئی موجود ہے تو یہ اس شخص کی خوش قسمتی ہوگی کہ وہ پہلے اس جلی قلم عبارت کو پڑھ لے اور پھر اس باریک تحریر کو دیکھے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: اس میں کیا شک ہے لیکن آخر اس مثال کا ہماری اس تحقیق سے کیا تعلق ہے؟

میں نے کہا: میں ابھی بتاتا ہوں۔ دیکھیے۔ جس طرح عدل اور انصاف کو افراد سے منسوب کیا جاتا ہے اسی طرح ریاستوں اور حکومتوں سے بھی تو اسے متعلق کرتے ہیں؟ کیوں ٹھیک ہے نا؟

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور ریاست ایک فرد سے بڑی ہوتی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: تو ممکن ہے اس بڑی چیز میں عدل کی صفت بھی زیادہ مقدار میں پائی جاتی ہو اور اس

لیے امکان ہے کہ یہاں آسانی سے اس کا پتا چل جائے۔ لہٰذا اگر آپ مناسب سمجھیں تو پہلے نظامِ حکومت میں اس کی تلاش کریں اور پھر اسی تحقیق کو افراد پر لاگو کر دیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: تجویز ہے تو بہت مناسب۔

میں نے کہا: میرے خیال میں اگر ہم ایک شہر یا ریاست کی تدریجی نشوونما کا خاکہ اپنے ذہن میں کھینچیں تو اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں عدل اور ظلم کی تدریجی افتاد کا بھی پتا چلتا جائے گا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: غالباً۔

میں نے کہا: اس طرح ممکن ہے کہ جس مسئلے کی تحقیق منظور ہے اس کے حل میں آسانی ہو جائے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: تو پھر آپ کی رائے میں یہ تحقیق شروع کی جائے؟...... کام سہل نہیں ہے اس لیے پہلے ہی اچھی طرح سوچ سمجھ لیجیے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میں خوب سوچ چکا ہوں۔ ضرور شروع کیجیے۔

میں نے کہا: اچھا تو سنیے۔ میرے خیال میں شہروں اور بستیوں کے قیام کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ہر فرد کی بہت سی ضرورتیں ہوتی ہیں اور انھیں پورا کرنے کے لیے وہ دوسرے افراد کا محتاج ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے۔ یہی وجہ ہے یا کچھ اور؟

ایڈیمنٹس نے کہا: نہیں۔ اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

میں نے کہا: گویا ضرورتوں کی کثرت اور ان کو پورا کرنے کے لیے دوسروں سے مدد کی احتیاج، انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ہر کام میں کوئی شریک یا مددگار تلاش کرے۔ اور جب یہ تمام شریک اور مددگار کسی ایک جگہ جمع ہو کر رہنا سہنا اختیار کر لیتے ہیں تو اسی کا نام شہر یا ریاست ہو جاتا ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: سچ ہے۔

میں نے کہا: اور یہ لوگ جو ایک دوسرے سے چیزوں کا مبادلہ کرتے ہیں تو اس میں ہر فریق کو یقین ہوتا ہے کہ میرا فائدہ ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ہاں اور کیا۔

میں نے کہا: اچھا تو اب شہر یا ریاست کی ایک ذہنی تصویر تیار کریں۔ یہ تو معلوم ہی ہو گیا کہ اس کی

اصل اور ابتدائی وجہ ہماری فطری ضروریات اور احتیاجات ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ زندگی کو قائم رکھنے اور ہلاکت سے محفوظ رہنے کے لیے پہلی احتیاج غذا کی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: پھر رہنے کے لیے مکان کی، پہننے کے لیے کپڑے کی، اسی طرح اور۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: اب غور کیجیے کہ اس شہر میں ان ضروریات کی فراہمی کس طرح ہوگی؟ شروع شروع میں ایک کاشتکار ہونا چاہیے اور ایک معمار۔ پھر ایک جُلاہے کی بھی ضرورت ہوگی۔ کہیے تو ایک موچی یا اور کسی ایسے شخص کا اضافہ بھی کر لیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: آپ صحیح فرماتے ہیں۔ ان لوگوں کا ہونا ازبس ضروری ہے۔

میں نے کہا: گویا چھوٹے سے چھوٹے شہر میں چار پانچ آدمی تو ضرور ہوں گے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: اور یہ تو فرمائیے۔ یہ لوگ کام کس طرح کریں گے؟ کیا اپنی اپنی محنت کی پیداوار ایک مقام پر جمع کر دیا کریں گے، مثلاً کیا کاشت کار چاروں آدمیوں کے لیے غلہ پیدا کرے گا اور اپنی ذات کے لیے غلہ پیدا کرنے میں جتنی محنت کرنی پڑتی ہے اس سے چوگنی محنت کرے گا یا اسے دوسروں سے مطلق سروکار نہ ہوگا اور صرف اپنے لیے چوتھائی وقت میں اور چوتھائی محنت سے غلہ پیدا کرے گا اور باقی وقت میں اپنے لیے مکان تعمیر کرے گا، کپڑے بنائے گا، جُوتا سیے گا۔ تاکہ خود ہی اپنی تمام ضرورتوں کو دوسروں کی مدد کے بغیر پورا کر لے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میری رائے میں تو غالباً یہ اچھا ہوگا کہ وہ اپنے ذمے صرف کھیتی کا کام لے لے اور باقی چیزوں کی تیاری سے سروکار نہ رکھے۔

میں نے جواب دیا: ہاں غالباً یہی طریقہ بہتر ہے۔ تمہارے کہنے سے مجھے بھی خیال ہوا کہ کوئی دو آدمی ایک سے نہیں ہوتے، کوئی کسی کام کے لیے موزوں ہوتا ہے کوئی کسی کے لیے۔ کیوں آپ کا کیا

خیال ہے؟

اس نے کہا: میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔

میں نے کہا: کام کی اچھائی کے خیال سے کون سی صورت زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے؟ آیا ایک آدمی ایک ہی کام کرے یا سب کام؟

اس نے کہا: اگر ایک ہی کام کیا جائے تو کام بہتر ہوگا۔

میں نے کہا: اور یہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ ہر کام کے لیے ایک مناسب وقت ہوتا ہے۔ اگر اسے ہاتھ سے جانے دیا تو پھر وہ واپس نہیں آتا۔

اس نے کہا: جی ہاں۔ اس میں کیا کلام ہے۔

میں نے کہا: ہاں۔ اس لیے کہ کام تو وقت اور کرنے والے کی فرصت یا عدیم الفرصتی کا خیال نہیں کرتا۔ کام کرنے والے کو بس اس کے پیچھے پڑا رہنا چاہیے تاکہ صحیح وقت پر کام ہو جائے۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: ان باتوں سے یہ ثابت ہوا کہ کام کی سہولت، اس کی مقدار اور عمدگی، غرض ہر اعتبار سے، یہی بہتر ہے کہ ایک شخص مناسب اوقات میں ایک ہی کام کرے اور دوسرے مشاغل کو ترک کر دے۔ اور یہ ایک کام وہی ہو جس کے لیے وہ فطرتاً موزوں بنایا گیا ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: یوں تو پھر ہمارے شہر کے لیے چار سے زیادہ آدمیوں کی ضرورت پڑے گی، ہل یا اور ضروری زراعت کے آلات کسان خود تو تیار کرے گا نہیں، نہ معمار اپنے اوزار خود بنا سکے گا، نہ جولاہا، نہ موچی۔

اس نے کہا: اور کیا؟

میں نے کہا: گویا بڑھئی اور لوہار اور بہت سے دوسرے کاریگر بھی ہماری چھوٹی سی خیالی ریاست کے رُکن ہوں گے۔ اچھا تو ہے کہ ہمارا شہر رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اس میں اگر چرواہوں اور دوسرے مویشی پالنے والوں کا بھی اضافہ کر دیا جائے تو کیا

برائی ہے۔ ہماری ریاست کچھ ایسی زیادہ تو بڑھ نہ جائے گی اور کسانوں کے لیے اچھے بیل اور مکان بنانے والوں کے لیے بار برداری کے جانور مل جائیں گے۔ نیز جلاہوں کو اُون اور موچیوں کو چمڑا آسانی سے مل جایا کرے گا۔

اس نے کہا: آپ صحیح فرماتے ہیں۔ ان تمام افراد کی یکجائی کے باوجود اس میں شک نہیں کہ ہماری ریاست بہت بڑی تو نہ ہوگی۔ لیکن ہاں اب اسے بہت چھوٹا بھی نہیں کہہ سکتے۔

میں نے کہا: ہاں ایک بات تو رہ ہی گئی۔ شہر کے لیے کوئی موقع تو تلاش کرو۔ ایسی جگہ ملنا تو تقریباً ناممکن ہے جہاں ہر چیز مہیا ہو اور کسی چیز کی درآمد کی ضرورت نہ پڑے۔

اس نے کہا: محال ہے یہ تو!

میں نے پوچھا: اس لیے ہمارے شہر کے باشندوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہونا چاہیے جو دوسرے شہر سے ضرورت کی چیزیں لایا کرے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: لازمی بات ہے۔

میں نے کہا: لیکن اگر یہ لوگ خالی ہاتھ گئے اور اپنے ساتھ وہ چیزیں نہ لے گئے جن کی ضرورت اس دوسرے شہر کے باشندوں کو ہو تو لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ خالی ہاتھ ہی لوٹیں گے بھی۔

اس نے کہا: یہ تو یقینی ہے۔

میں نے کہا: اس لیے ہمارے شہر کی تیار کی ہوئی چیزیں صرف ہماری ہی ضرورتوں کے لیے کافی نہ ہونی چاہئیں بلکہ مقدار اور عمدگی دونوں کے اعتبار سے لازم ہے کہ وہ دوسرے شہر میں بھی قابل قبول ہوں۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اس کے معنی ہیں کہ کچھ اور کسانوں اور کاریگروں کی ضرورت ہوگی۔

اس نے کہا: اور کیا؟

میں نے کہا: نیز درآمد و برآمد کا کام کرنے والوں کی بھی ضرورت پڑے گی یعنی تاجروں کی۔

اس نے کہا: اور اگر تجارت کا سامان سمندر پار لے جانا ہوا تو ایک بڑی تعداد ہوشیار ملاحوں کی درکار ہوگی۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: آپ کو یاد ہوگا کہ ان تمام لوگوں کو یکجا کرنے اور ریاست کی ترتیب دینے کا مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ باہم اپنی اپنی چیزوں کا مبادلہ کر سکیں۔ یہ مقصد آپ اپنے خیالی شہر میں کس طرح حاصل کریں گے؟

اس نے کہا: ظاہر ہے خرید و فروخت کے ذریعے سے۔

میں نے کہا: اس کے لیے ایک جائے مبادلہ یعنی بازار اور ایک ذریعۂ مبادلہ یعنی سکہ کی ضرورت پڑے گی۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: فرض کیجیے کہ ایک کسان مبادلے کے لیے کوئی چیز لے کر بازار میں آیا لیکن اتفاق سے کوئی شخص اس وقت بازار میں ایسا موجود نہیں جو اس سے مبادلہ کر سکے۔ ایسی صورت میں کیا یہ اپنا تمام کام دھندا چھوڑ کر بازار میں بے کار پڑا انتظار کرتا رہے گا؟

ایڈیمنٹس نے کہا: ہرگز نہیں۔ بازار میں ایسے لوگ موجود ہوں گے جو لوگوں کی ضرورتوں سے واقف ہوتے ہیں اور خرید و فروخت کا کام اپنے ذمے لے لیتے ہیں۔ اچھی ریاستوں میں یہ کام عموماً ان لوگوں کے سپرد ہوتا ہے جو جسمانی حیثیت سے بہت کمزور اور کسی دوسرے کام کے لائق نہیں ہوتے۔ ان کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ بازار میں موجود رہیں۔ اگر کوئی بیچنے والا آئے تو جنس لے کر اسے نقد دے دیں اور اگر خریدنے والا آئے تو نقد لے کر جنس فراہم کر دیں۔

میں نے کہا: یعنی ہماری ریاست میں ایک طبقہ ان چھوٹے دکان داروں کا بھی ہوگا۔ اسی قسم کے دکان داروں کو جن کا تمام تر کاروبار اپنے ہی شہر میں محدود ہو غالباً ''خردہ فروش'' کہنا مناسب ہوگا۔ ان لوگوں کے مقابلے میں جو مختلف ملکوں اور شہروں میں خرید و فروخت کرتے ہیں اور جنھیں ہم نے تاجر کا نام دیا ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔ درست ہے۔

میں نے کہا: اس کے علاوہ ایک ایسا طبقہ بھی تو ہوتا ہے جس کے افراد دماغی قوتوں کے اعتبار سے دوسرے لوگوں کی ہمسری نہیں کر سکتے لیکن جسمانی حیثیت سے بہت مضبوط اور توانا ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی محنت بیچتے ہیں اور اجرت لے کر دوسروں کا کام کرتے ہیں۔ اس معاوضے کو ''مزدوری'' کہتے ہیں۔

ایڈیمنٹس: جی ہاں۔

میں نے کہا: ان مزدوری کرنے والے لوگوں سے بھی ہماری ریاست کی آبادی میں اضافہ ہوگا؟

ایڈیمنٹس: بے شک۔

میں نے کہا: یہ سب تو ہو چکا۔ اب آپ کی رائے میں ہماری ریاست مکمل ہو گئی یا نہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میرے خیال میں تو ہو گئی ہے۔

میں نے کہا: لیکن اس میں عدل اور ناانصافی کہاں ہیں؟ آخر یہ چیزیں بھی پیدا ہوں گی یا نہیں؟

ایڈیمنٹس نے کہا: یہ صفات باشندوں کے آپس کے لین دین اور کاروباری تعلقات کے سلسلے میں پیدا ہوں گی۔ بھلا اور کہاں پیدا ہو سکتی ہیں؟

میں نے کہا: بے شک، آپ کا خیال صحیح ہے۔ تو پھر آیئے دیکھیں اور تحقیقات کو جاری رکھیں۔ ہم نے شہر تو قائم کر ہی لیا۔ اب سب سے پہلے یہ پتا لگانا چاہیے کہ باشندوں کا رہن سہن کیسا ہوگا۔ یہ لوگ غلہ پیدا کریں گے۔ شراب بنائیں گے۔ جوتے اور کپڑے سیئیں گے۔ اور رہنے کو گھر بھی بنائیں گے۔ جب یہ سب سامان ہو جائے گا تو دوسرے کاموں میں لگیں گے، محنت مشقت کریں گے۔ گرمیوں میں عموماً برہنہ تن اور ننگے پاؤں رہیں گے، سردی میں کپڑوں جوتوں کا معقول انتظام کریں گے۔ جَو اور گیہوں کا آٹا گوندھ کر اچھی اچھی روٹیاں پکائیں گے۔ چٹائی یا صاف پتوں کا دسترخوان بنا کر اس پر یہ چیزیں چنیں گے اور بال بچوں کو ساتھ لے کر ان نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔ اپنی خانہ ساز شراب پئیں گے۔ سروں پر پھولوں کے گجرے پہنیں گے اور اپنے دیوتاؤں کی تعریف میں گیت گائیں گے اور اس طرح خوش خوش اپنی زندگی گزار دیں گے۔ اس بات کا بھی خیال رکھیں گے کہ خاندان میں آدمیوں کی تعداد گزر کے سامان سے بڑھ نہ جائے تاکہ جنگ اور فلاکت کی دستبرد سے بچے رہیں۔

گلوکون نے بات کاٹ کر کہا: بھائی صاحب۔ غذا میں ذرا زبان کے چٹخارے کا تو خیال رکھا ہوتا۔

میں نے کہا: سچ ہے، میں بھول گیا۔ زبان کے مزے کے لیے نمک، زیتون کا تیل اور پنیر وغیرہ کافی ہیں۔ یہ لوگ اپنے دیہاتیوں کی طرح ساگ اور ترکاریاں ابال لیا کریں گے۔ انجیر، سیمیں اور مٹر، پھلوں کا کام دیں گے۔ کبھی کبھی اس چیز کی گٹھلیاں بھون لیا کریں گے۔ اور شراب ذرا اعتدال سے پئیں گے۔ اس قسم کی غذا استعمال کر کے میں سمجھتا ہوں کہ یہ لوگ تندرستی اور آرام کے ساتھ بڑھاپے کی عمر تک پہنچیں گے اور اپنی اولاد کے لیے بھی اپنی جیسی زندگی ترکے میں چھوڑ جائیں گے۔

گلوکون نے کہا: خوب، جناب خوب، اگر آپ جانوروں کے ایک شہر کا انتظام کرتے تو غالباً وہ بھی ایسا ہی ہوتا۔ حیوانوں کو بھی تو اس سے بری غذا نہیں دی جاتی۔

میں نے کہا: تو پھر آپ ہی اپنی رائے فرمایئے۔

گلوکون نے کہا: رائے کیا۔ کم از کم ان غریبوں کے لیے دنیاوی زندگی کی معمولی آسایشیں تو مہیا ہونی چاہئیں۔ اگر ان کے آرام کا کچھ بھی خیال ہے تو ان کے اٹھنے بیٹھنے کے لیے آرام کرسیاں، کھانا کھانے کے لیے میزیں وغیرہ درکار ہیں۔ غذا میں انھیں نئی قسم کی چٹنیاں، اچار اور مٹھائیاں ملنی چاہئیں۔

میں نے کہا میں اب سمجھا۔ آپ کی رائے میں ہمارے پیش نظر محض ایک ریاست کا نہیں بلکہ ایک آرام طلب اور عیش پسند ریاست کی نشو ونما کا سوال ہے۔ میرا تو اس میں کچھ ایسا نقصان نہیں۔ کیونکہ غالباً اس دوسری قسم کی ریاست میں یہ زیادہ آسانی سے معلوم ہو سکے گا کہ عدل اور ظلم کیونکہ رونما ہوتے ہیں۔ میں نے تو اپنے خیال کے مطابق ایک ریاست کا صحیح اور اچھا نظام مرتب کر دیا تھا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اکثر لوگ اس سادہ طرز کی زندگی کو پسند نہیں کرتے اور ان کی رائے میں بھی میز، کرسی اور دوسرے سامان آسایش و آرایش کی ضرورت ہوگی۔ اور جب یہی ٹھہرا تو مختلف قسم کے روغنوں اور عطروں کی بھی ضرورت پڑے گی اور ہمیں محض ضروریات زندگی (مثلاً گھر، کپڑا، کھانا) سے بہت آگے بڑھنا پڑے گا۔ مصوری اور سوزن کاری کے فنون سے کام لینا پڑے گا اور سونے، چاندی اور ہاتھی دانت کے زیوروں کی فراہمی کا بھی انتظام کرنا ہوگا۔

گلوکون نے جواب دیا: بے شک۔

میں نے کہا: تو پھر تو ہمیں اپنی ریاست کی حدود اور بڑھانی ہوں گی۔ پہلے والا رقبہ تو ان ضرورتوں کے لیے کافی نہ ہوگا۔ اور ہمیں اپنے شہر کو ایسے پیشہ وروں سے بھرنا پڑے گا جن کی ضرورت کسی فطری احتیاج کی وجہ سے نہیں ہوتی، مثلاً ایک قبیلے کا قبیلہ شکاریوں کا، ایک ٹولی ناٹک والوں کی، جن کا کام زیادہ تر رنگ روپ بھرنا ہوگا، کچھ گانے والے، بجانے والے ہوں گے اور کچھ شاعر، اور ان کے دم چھلے، قوال، بھاٹ، ناچنے والے اور نقال۔ مختلف چیزوں کی تیاری کے لیے اور خصوصاً عورتوں کے لباس وغیرہ کے لیے بھی کاریگروں کی ضرورت پڑے گی۔ یہی نہیں اس کے علاوہ ملازموں کی بھی ضرورت ہوگی، مثلاً اتالیق، اناکیں، کھلائیاں، حجام، حلوائی، اور باورچی وغیرہ، سؤروں کے لیے گلہ بانوں کی الگ ضرورت ہوگی جن کی ہماری پہلی ریاست میں حاجت نہ تھی اور اس لیے پچھلے دستور العمل میں انھیں جگہ نہیں دی گئی تھی اور یہ کیا اگر لوگ گوشت

کھانے لگے تو اور بہت سے جانوروں کے پالنے کا اہتمام بھی کرنا پڑے گا۔

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: اس طرز زندگی میں غالباً پہلے کی بہ نسبت طبیبوں کی بہت زیادہ ضرورت پڑے گی۔

گلوکون نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: جو رقبہ زمین کا پہلے باشندوں کے لیے کافی تھا اب چھوٹا پڑے گا۔

گلوکون نے کہا: اس میں کیا شک ہے۔

میں نے کہا: تو ہمیں اپنے ہمسائے کی زمین میں سے چراگاہوں اور جوتنے بونے کے لیے تھوڑا بہت ٹکڑا ضرور دبانا پڑے گا۔ اور اگر ہمارے ہمسائے بھی ہماری طرح فطری احتیاج کی حدود سے تجاوز کر کے مال و دولت کی ہوس میں گرفتار ہو گئے تو وہ بھی اسی طرح ہماری زمین دبانے کی فکر کریں گے۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔ اس سے تو کوئی مفر نہیں۔

میں نے کہا: تو کیوں، بھائی گلوکون، اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ ہمیں جنگ بھی کرنی پڑے گی۔

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: قطع نظر اس کے کہ جنگ فی نفسہٖ سودمند ہے یا ضرررساں، ہم نے یہ معلوم کر لیا کہ جنگ کے اسباب بھی وہی ہیں جن سے ریاست کی دوسری برائیاں خواہ شخصی ہوں یا اجتماعی، پیدا ہوتی ہیں۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اس مرتبہ بھی ہمیں اپنی ریاست کی مزید توسیع کرنی ہوگی اور اس بار تو ایک پوری فوج کا اضافہ ضروری ہوگا جو باہر جا کر حملہ آور کا مقابلہ کر سکے اور ہمیں اور ہماری ملکیت کو ان کی دستبرد سے محفوظ رکھے۔

گلوکون نے کہا: کیوں کیا ہم لوگ خود اپنی حفاظت نہ کر سکیں گے؟

میں نے کہا: ہاں، اگر وہ اصول جسے ہم نے اپنی ریاست کے دستور کی ترتیب کے وقت تسلیم کیا تھا صحیح ہے تو بے شک ایسا ممکن نہیں۔ تمھیں یاد ہوگا کہ وہ اصول یہ تھا کہ ایک آدمی بہت سے فنون میں کامیابی کے ساتھ نہیں لگ سکتا۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: تو کیا جنگ کرنا آپ کی رائے میں کوئی فن نہیں؟

اس نے کہا: یقیناً ہے۔

میں نے پوچھا: پھر کیا اس میں اتنی توجہ درکار نہیں ہوتی جتنی جوتا گانٹھنے میں؟

اس نے کہا: خوب! کیوں نہیں، ضرور ہوتی ہے۔

میں نے کہا: ہم نے موچی کو کاشت کاری یا معماری کے کام کی اجازت محض اس لیے نہیں دی تھی کہ ہمارے جوتے اچھے تیار ہوں۔ اور اس پر کیا موقوف ہے ہر شخص کو صرف وہ ایک کام دیا گیا تھا جس کے لیے وہ فطرتاً خاص طور پر موزوں ہو، یہی کام اسے عمر بھر انجام دینا چاہیے کہ اس کے ہاتھ سے ترقی کرنے کے مواقع نہ نکل جائیں اور وہ اپنے فن میں ماہر ہو جائے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ ہمارے لیے اس سے زیادہ اور کون سی بات ضروری ہوگی کہ سپاہی کا کام خوبی کے ساتھ انجام دیا جائے۔ پھر یہ بھی معلوم ہے کہ جنگ کوئی آسان فن نہیں کہ آدمی دوسرے کاموں مثلاً کاشتکاری وغیرہ میں بھی مصروف رہے اور سپاہی کا کام بھی انجام دیتا رہے۔ یوں تفریح ہی تفریح میں تو آدمی تاش اور شطرنج تک کا ماہر نہیں بن سکتا۔ مہارت کے لیے ضروری ہے کہ آدمی شروع عمر ہی سے ایک کام میں لگا رہے اور کسی دوسری طرف توجہ نہ کرے۔ جس طرح خالی اوزار آدمی کو کاریگر نہیں بنا سکتے اسی طرح صرف ہتھیاروں سے آدمی سپہ گری کے قابل نہیں ہو جاتا جب تک اچھی طرح ان کا استعمال کرنا نہ جانتا ہو، محض آلات حرب سے مسلح ہو کر اور ہاتھ میں ایک سپر لے کر ایک ہی دن میں آدمی سورما سپاہی تو نہیں بن سکتا۔

گلوکون نے کہا: بے شک، ایسے ہتھیار تو ملتے نہیں کہ آدمی خود بخود ان کا استعمال سیکھ لے۔

میں نے کہا: چنانچہ ہمارے محافظوں کے فرائض جس قدر اہم ہوں گے اسی قدر ان کے لیے زیادہ وقت اور مہارت، توجہ اور محنت، کی ضرورت ہوگی۔

اس نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: ہاں، اور اس کام کے لیے فطری مناسبت ضروری ہے۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: یعنی ہمیں انتخاب سے کام لینا ہوگا کہ کون سی طبیعتیں شہر کی حفاظت کے لیے موزوں ہیں اور کون سی نہیں۔

اس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: یہ انتخاب کچھ آسان نہیں۔ لیکن خیر ہمیں ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔

اس نے کہا: ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: حفاظت اور نگرانی کرنے کے معاملے میں کیا ایک جوانِ صالح کی مثال نسلی کتے کی سی نہیں ہوتی۔

اس نے کہا: میں آپ کا مطلب بالکل نہیں سمجھ سکا۔

میں نے کہا: میرا مطلب یہ ہے کہ حفاظت کرنے والا جوان بھی کتے کی طرح نگاہ کا تیز ہو اور جب دشمن کو دیکھ لے تو حملہ کرنے میں چستی سے کام لے۔ نیز مضبوط بھی ہو کہ اگر دشمن کو پکڑ لے اور اس سے لڑنا پڑے تو اس پر غالب آ جائے۔

گلوکون نے کہا: بے شک یہ سب صفات نہایت ضروری ہیں۔

میں نے کہا: اور جنگ کرنے کے لیے بہادری کا ہونا بھی لازمی ہے۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: لیکن کیا کوئی جانور، گھوڑا ہو یا کتا بغیر جرأت کے بہادر ہو سکتا ہے۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ جرأت پر کسی کو فتح حاصل نہیں ہوتی اور اس کے ہونے سے روح مضبوط ہو جاتی ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اب ہمیں ٹھیک اندازہ ہو گیا کہ محافظوں میں کیا کیا جسمانی صفات ہونی چاہئیں۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور دماغی صفات کے متعلق بھی یہ اندازہ ہو گیا کہ جرأت کا ہونا ضروری ہے۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: لیکن یہ بھی تو احتمال ہے کہ کہیں جری لوگ آپس میں اور دوسروں سے وحشیانہ برتاؤ نہ کرنے لگیں۔

اس نے کہا: بلاشبہ یہ عیب تو بڑی مشکل سے دور ہو سکتا ہے۔

میں نے کہا: حالانکہ چاہیے کہ یہ لوگ دشمنوں سے سختی اور دوستوں سے نرمی کا برتاؤ کریں ورنہ یوں تو

قبل اس کے کہ کوئی دشمن ان کی تباہی کا باعث ہو یہ خود اپنے آپ کو برباد کر لیں گے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: لیکن آخر اس کا علاج کیا ہے۔ ہمیں ایسے آدمی کہاں ملیں گے جو خوش طبع اور حلیم بھی ہوں اور ساتھ ہی جرأت بھی رکھتے ہوں، کیونکہ یہ دونوں صفات تو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

اس نے کہا: ہاں، ایسا تو ہے۔

میں نے کہا: مگر بڑی مشکل تو یہ ہے کہ جہاں ان صفات میں سے ایک کی بھی کمی ہوئی تو وہ آدمی اچھا محافظ ہو ہی نہیں سکتا۔ اور ان صفات کا یکجا ہونا ناممکن سا معلوم ہوتا ہے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں یہ معنی ہوئے کہ اچھے محافظ کا ملنا محال ہے۔

گلوکون نے کہا: آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں مجھے بھی یہی اندیشہ ہے۔

اس گفتگو سے میں کچھ پریشان سا ہو گیا اور مجھے پچھلی گفتگو پر تھوڑا سا غور کرنا پڑا۔

میں نے کہا: مہربانِ من، ہماری پریشانی بالکل ناگزیر تھی اور مجھے اس پر ذرا تعجب نہیں۔ ہم نے خود ہی اس شکل کو بالکل بھلا دیا جو شروع میں ہمارے سامنے تھی۔

گلوکون نے کہا: وہ کیا؟

میں نے کہا: میرا مطلب یہ ہے کہ ایسی طبیعتیں بھی تو ہوتی ہیں جن میں یہ متضاد صفات یکجا پائی جاتی ہیں۔

گلوکون نے کہا: مثلاً۔

میں نے کہا: اکثر جانوروں میں آپ کو اس کی مثالیں ملیں گی۔ چنانچہ خود کتا بہت اچھی مثال ہے۔ آپ یہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ اچھی نسل کے کتے ہمیشہ جانے پہچانے لوگوں سے اچھی طرح پیش آتے ہیں اور اجنبیوں سے بری طرح۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: تو پھر ایسے محافظین کا ملنا بھی ناممکن یا قوانینِ قدرت کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ جن میں یہ دونوں صفات موجود ہوں۔

گلوکون نے کہا: ٹھیک ہے۔

میں نے کہا: گویا جو لوگ حفاظت کے کام کے لیے موزوں ہوں ان میں جرأت کے علاوہ ایک فلسفی کی سی صفات بھی ہونی چاہئیں۔

گلوکون نے کہا: میں جناب کا مطلب بالکل نہیں سمجھا۔

میں نے کہا: میں جس صفت کی طرف اشارہ کر رہا ہوں وہ کتے میں بھی پائی جاتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ایک جانور میں اس کا ہونا بڑی عجب سی بات ہے۔

گلوکون نے کہا: آخر وہ صفت ہے کیا؟ میں تو اب بھی نہیں سمجھا۔

میں نے کہا: بھائی اس میں کون سی دشواری ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ جب کبھی کتا کسی اجنبی شخص کو دیکھتا ہے تو غصہ کرتا ہے اور جب کسی جان پہچان والے کو دیکھتا ہے تو خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ حالانکہ نہ پہلے شخص سے اسے کبھی کوئی نقصان پہنچا ہے اور نہ دوسرے سے کوئی فائدہ۔ تم نے اس عجیب وغریب صفت پر شاید کبھی غور نہیں کیا؟

اس نے کہا: ہاں تعجب ہے مجھے اس سے پہلے کبھی اس کا خیال نہیں ہوا البتہ اب محسوس کرتا ہوں کہ آپ کا فرمانا بالکل صحیح ہے۔

میں نے کہا: سوچو تو سہی کتے کا یہ قدرتی وصف کس قدر عجیب ہے۔ کتا گویا ایک حقیقی فلسفی ہے!

اس نے کہا: یہ کیونکر؟

میں نے کہا: چونکہ اس کے نزدیک دوست اور دشمن کے درمیان وجہ امتیاز علم اور جہل ہے اور وہ جانور علم کا کیسا شیدائی ہوگا جو جہل کے مقابلے میں علم کو اپنی پسند کا معیار مقرر کرے۔

اس نے کہا: بجا ارشاد ہے۔

میں نے کہا: اور علم کی محبت اور عقل اور حکمت کی الفت دونوں مرادف ہیں اور اسی کو دوسرے الفاظ میں فلسفہ کہتے ہیں۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: تو پھر کیا ہم یقین کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ انسانوں میں بھی وہی شخص دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرے گا جو بالطبع عقل اور علم سے محبت رکھتا ہو۔

اس نے کہا: کیوں نہیں، ہم یقیناً یہ دعویٰ کر سکتے ہیں۔

میں نے کہا: لہٰذا ریاست کا بہترین محافظ ہونے کے لیے جہاں جرأت اور دلیری، طاقت اور چستی کی ضرورت تھی وہاں فلسفی ہونا بھی لازمی قرار پایا۔

گلوکون نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: ہمیں اس بات کا پتا تو چل گیا کہ محافظوں کے لیے کس قسم کی طبیعت ضروری ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت کا کیا انتظام کیا جائے۔ میرا گمان ہے کہ اس مسئلے پر غور کرنے سے ہماری تحقیق کے اصلی مقصد پر بھی کافی روشنی پڑے گی۔ یعنی یہ کہ ریاست میں عدل اور ظلم کس طرح پیدا ہو کر نشو و نما پاتے ہیں۔ اگر ایسا ہو تو اس سوال پر غور کیا جائے ورنہ بات کو یونہی لمبا کرنے سے کیا حاصل۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میرے خیال میں اس مسئلے کی تحقیق سے بہت مفید نتائج نکلنے کی امید ہے۔

میں نے کہا: اگر یہ بات ہے تو میری رائے میں طوالت کے خوف کے باوجود اس سلسلے کو ختم نہیں کرنا چاہیے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: تو آؤ سمجھ لیں کہ کچھ وقت ایک خیالی افسانہ گوئی میں ہی صرف ہوا، جس کا عنوان ہے "اپنے محافظوں کی تعلیم و تربیت"۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ضرور۔

میں نے کہا: پھر کہیے انھیں کیسی تعلیم دینی چاہیے؟ میرے نزدیک تو رسماً جو تقسیم کی جاتی ہے وہ بالکل ٹھیک ہے یعنی جسم کے لیے ورزش اور روح اور دماغ کے لیے موسیقی۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اور اس میں کیا کچھ حرج ہے کہ ہم تعلیم موسیقی سے شروع کریں اور پھر بعد میں جسمانی ورزش سکھائیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: کوئی حرج نہیں۔

میں نے کہا: اور موسیقی میں تو علم ادب بھی شامل ہوگا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اور ادب میں سچ بھی ہوتا ہے اور جھوٹ بھی۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: ان دونوں قسموں کی تعلیم دینی ہوگی اور میری رائے میں ابتدا جھوٹے ادب سے ہونی چاہیے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یہ کیسے؟ میں سمجھا نہیں۔

میں نے کہا: کیوں۔ آپ تو یہ جانتے ہوں گے کہ بچوں کو جو قصے کہانیاں سنائی جاتی ہیں وہ اگرچہ حقیقت سے بالکل مبرا نہ سہی تاہم اکثر و بیشتر محض افسانہ ہی افسانہ ہوتی ہیں۔ یہ کہانیاں اس وقت سنائی جاتی ہیں جب بچہ جسمانی ورزش کے لائق نہیں ہوتا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: جسمانی ورزش سے پہلے موسیقی کی تعلیم دینے کا یہ مطلب تھا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بجا ہے۔

میں نے کہا: اور آپ یہ بھی خوب اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ ہر کام کا آغاز ہی اس کا سب سے اہم حصہ ہوتا ہے۔ خصوصاً بچوں اور دوسری نازک چیزوں کے معاملے میں کہ اسی زمانے میں سیرت بنتی ہے۔ اور جو اثر ڈالنے ہوں، بہت آسانی سے ڈالے جاسکتے ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بالکل درست۔

میں نے کہا: تو کیا ہم اپنے بچوں کو ہر کس و ناکس کے تصنیف کیے ہوئے قصے سننے دیں گے اور کیا یہ بات جائز ہے کہ ہم ان کے دماغوں کو بڑے ہونے پر جن خیالات و جذبات کی جولانگاہ دیکھنا چاہتے ہیں بچپن میں اس کے بالکل مخالف خیالات ان کے ذہن نشین ہونے دیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: اس لیے سب سے پہلی ضرورت تو یہ ہے کہ افسانہ نگاروں کی نگرانی کے لیے ایک محکمۂ نظارت قائم کیا جائے۔ ناظر اچھے قصوں کو منظور کرلیں اور بروں کو خارج کر دیا کریں۔ پھر ماؤں اور دائیوں کو یہ حکم دے دیا جائے کہ بچوں کو صرف منظور شدہ قصے سنائیں اور جس طرح وہ اب اپنے ہاتھوں سے بچوں کے جسم کو سنوارتی ہیں اس سے زیادہ پیار کے ساتھ ان کہانیوں کے ذریعے ان کے دماغوں کو روشن کریں۔ اس

مقصد کو سامنے رکھ کر اکثر رائج الوقت کہانیاں خارج کر دینی چاہئیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: آپ کا اشارہ کن کہانیوں کی طرف ہے؟

میں نے کہا: آپ کے بڑے بڑے اور مشہور افسانے دراصل ان جھوٹی کہانیوں ہی کا نمونہ ہیں کیونکہ یہ سب ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں اور سب میں خیالات کی یکسانیت پائی جاتی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بہت ممکن ہے کہ ایسا ہو لیکن میں ابھی تک نہیں سمجھا کہ آپ کن قصوں کو مشہور مانتے ہیں۔

میں نے کہا: میرا مطلب ہومر، ہزیوڈ اور ان شاعروں کے بیان کیے ہوئے قصوں سے ہے جو نوع انسانی کے بہت بڑے افسانہ گو گزرے ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: لیکن آخر ان لوگوں کے کون سے قصوں کی طرف آپ کا اشارہ ہے۔ اور ان میں کیا عیب پاتے ہیں؟

میں نے کہا: سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ ان میں جھوٹی باتیں ہوتی ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ جھوٹ بھی بُرے قسم کا جھوٹ۔

ایڈیمنٹس نے کہا: مثلاً۔

میں نے کہا: ان کی مثال وہ غلط بیانیاں ہیں جو دیوتاؤں اور مشاہیر کے متعلق ان قصوں میں کی جاتی ہیں جیسے کوئی مصور ایک تصویر بنائے جو اصل سے ذرا نہ ملتی ہو۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک۔ یہ بات تو ضرور ملامت کے لائق ہے لیکن ایسا کوئی قصہ تو بتایئے۔

میں نے کہا: سب سے پہلے تو وہ بڑی اور بری دروغ گوئی ہے جو شاعر نے یورنیس (Uranus) کے متعلق کی ہے۔ میرا اشارہ ان بیانات کی طرف ہے جو ہزیوڈ نے یورنیس کے اعمال اور کرونس (Cronus) کے انتقام کے متعلق کیے ہیں۔ پھر خود کرونس کے اعمال اور ان کے بدلے میں اس کے بیٹے نے جو جو اذیتیں اپنے باپ کو دیں اگر سب سچ بھی ہوں تو بھی بلا سوچے سمجھے کم عمر بچوں کے سامنے ان کا بیان کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ اور میری رائے میں تو بہتر یہ ہے کہ ان افسانوں کو ہمیشہ کے لیے خاموشی کی خندق میں ڈال دیا جائے۔ لیکن اگر ان باتوں کا بیان کیا جانا ایسا ہی ضروری ہے تو کسی قربانی کے موقع پر گنتی کے خاص آدمیوں کے سامنے خفیہ طور پر ایسا کیا جا سکتا ہے اور اس موقع کے لیے بجائے ایک معمولی سؤر کی قربانی کے کسی بہت

بڑے اور مشکل سے ملنے والے جانور کی قربانی فرض قرار دینی چاہیے تاکہ سننے والوں کی تعداد جہاں تک ہو سکے کم ہو۔

ایڈیمنٹس نے کہا: آپ صحیح فرماتے ہیں۔ یہ قصے بہت ہی قابل اعتراض ہیں۔

میں نے کہا: تو پھر ہم اس قسم کے تمام قصوں کو اپنی ریاست میں ممنوع قرار دیں گے۔ کیونکہ کمسن نوجوانوں کے دل میں ہرگز یہ خیال نہیں پیدا ہونا چاہیے کہ سخت سے سخت جرم کے ارتکاب میں بھی کچھ ایسی زیادہ برائی نہیں ہے اور وہ اپنے باپ تک کو ہر طریقے سے سزا دینے اور اذیت پہنچانے میں بس ایک بہت بڑے دیوتا کی مثال پر چل رہے ہیں!

ایڈیمنٹس نے کہا: میں آپ سے بالکل متفق ہوں اور میری رائے میں بھی ان قصوں کی اشاعت فوراً بند کر دینی چاہیے۔

میں نے کہا: اس کے علاوہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے محافظ آپس میں لڑنے جھگڑنے کو بدترین عادت مانیں تو ہمارا فرض ہے کہ انھیں آسمانی جنگوں کے متعلق ایک حرف بھی نہ سننے دیں، نہ ان سازشوں اور باہمی جھگڑوں کا ذرا بھی ذکر ان سے کرنا چاہیے جو دیوتاؤں کے درمیان بتائے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ تمام کی تمام روایتیں سراسر غلط اور بے بنیاد ہیں۔ نہ ہم کو ان روایتوں کا ذکر کرنا چاہیے جن میں دیوتاؤں کی آپس کی معرکہ آرائیوں کے حال بیان کیے جاتے ہیں اور نہ کپڑوں پر ان معرکوں کے کشیدے کاڑھنے کی اجازت دینی چاہیے۔ پھر ان دوسرے بے شمار جھگڑوں کے متعلق بھی ہمیں خاموشی اختیار کرنی چاہیے جو دیوتاؤں اور سورماؤں یا ان کے دوستوں اور عزیزوں میں ہوئے۔ اگر یہ لوگ باور کر لیں تو ہم تو یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہیں کہ جنگ و جدال سخت ناپاک کام ہے اور آج تک اچھے شہریوں میں کبھی جھگڑا فساد نہیں ہوا۔ بچپن ہی سے ان بچوں کے سامنے بوڑھوں اور بوڑھیوں کو ان باتوں کو زور دینا چاہیے اور اس کے بعد جب یہ ذرا بڑے ہو جائیں تو شاعروں کو ایسے خیالات نظم کر کے ان کے سامنے پیش کرنے چاہئیں۔ مگر اس قسم کے بیانات کہ ہیفا یٹس (Hephaestus) نے اپنی ماں ہیری (Here) کو باندھ کر ڈال دیا، یا دوسرے موقع پر زیوس نے اسے اس قصور پر نکال دیا تھا کہ اس نے مار پڑتے وقت اپنی ماں کی طرفداری کی تھی، ہم ہرگز اپنی ریاست میں روا نہ رکھیں گے خواہ شاعر نے انھیں تمثیل اور استعارے کے طور پر ہی کیوں نہ استعمال کیا ہو۔ کیونکہ ایک کمسن آدمی یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ اس سے لفظی معنی مراد ہیں یا محض تمثیل۔ اور اس عمر میں ذہن کی حالت کچھ ایسی ہوتی

ہے کہ جس چیز کا اثر پڑ جاتا ہے پتھر کی لکیر بن جاتا ہے۔ اور اسی لیے یہ بات اور بھی ضروری ہے کہ بچپن میں جو قصے کہانیاں سنائی جائیں وہ پاک خیالات کا نمونہ ہوں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جناب کا یہ فرمانا تو بالکل درست ہے لیکن یہ کہیے کہ اگر کوئی آپ سے پوچھ بیٹھے کہ اس قسم کی کہانیاں ملیں گی کہاں سے، تو آپ کے پاس کیا جواب ہے؟

میں نے کہا: برادر عزیز۔ تم اور میں اس وقت ایک شاعر کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ہم تو ایک ریاست کا اساسی نظام مرتب کر رہے ہیں۔ اور ریاست کے بانیوں کا کام بس اتنا ہے کہ شاعروں کو وہ طرز بتادیں جس پر قصے لکھنا چاہئیں نیز انھیں ان کی حدود سے آگاہ کر دیں۔ ان کے ذمے یہ کام ہرگز نہیں آتا کہ وہ خود ہی یہ قصے کہانیاں بنا بھی ڈالیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: درست۔ لیکن آخر یہ طرز کیا ہونی چاہیے؟

میں نے کہا: شاعروں کو ہر قسم کی نظم میں اس امر کا خاص التزام رکھنا چاہیے کہ خدا کو بالکل حقیقت کے مطابق ظاہر کریں۔ اس میں مثنوی، غزل یا مرثیے کی کوئی قید نہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: خوب۔

میں نے کہا: اور خدا فی الحقیقت خیر و برکت ہے۔ اس کے اچھے ہونے سے کسے انکار ہو سکتا ہے، اس لیے نظم میں بھی اس کی یہی حقیقت پیش کرنی چاہیے۔

ایڈیمنٹس: بے شک۔

میں نے کہا: اور یہ بات ظاہر ہے کہ اچھی چیز نقصان دہ نہیں ہوتی۔

ایڈیمنٹس: بلاشبہ۔

میں نے کہا: اور نقصان دہ نہ ہونے کے یہی معنی تو ہیں کہ کسی کو اس سے ضرر نہیں پہنچتا۔

اس نے کہا: اور کیا۔

میں نے کہا: اور جس چیز سے کوئی ضرر یا نقصان نہیں پہنچتا وہ بُرائی کا سبب کیوں کر ہو سکتی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ناممکن!

میں نے کہا: اور آپ غالباً یہ بھی تسلیم کر لیں گے کہ اچھی چیز فائدہ رساں ہوتی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اس تمام تقریر کا نتیجہ یہ ہوا کہ خیر اور اچھائی صرف خیر کا سبب ہو سکتی ہے۔ اسے آپ ہر چیز کی وجہ نہیں قرار دے سکتے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: گویا عوام کے خیال کے خلاف ہماری رائے یہ ہے کہ خدا، اگر وہ خیر و برکت سے عبارت ہے، تو وہ ہر چیز کا خالق نہیں ہو سکتا۔ وہ صرف چند چیزوں کی تخلیق کا تو سبب ضرور ہے لیکن اکثر کا نہیں۔ اس لیے کہ انسانی زندگی میں اچھائیاں کم ہیں اور برائیوں سے تو وہ بھری پڑی ہے۔ ان برائیوں کی تخلیق کا سبب کہیں اور تلاش کرنا چاہیے کیونکہ خدا کے ساتھ تو صرف خیر و برکت کی تخلیق منسوب کی جا سکتی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میری رائے میں بھی جناب کا یہ خیال بالکل درست ہے۔

میں نے کہا: لہٰذا ہم ہومر اور دوسرے شاعروں کے سب ایسے بیانات کو باور کرنے سے انکار کریں گے کہ:

''بارگاہ زیوس کی چوکھٹ پر دو ظرف رکھے ہیں۔ ایک میں اچھی تقدیریں ہیں، دوسرے میں بری''۔

جس آدمی کو زیوس ان دونوں میں سے کچھ کچھ حصہ دیتا ہے:

''وہ کبھی آرام و مسرت سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں اور کبھی آلام و مصائب میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں''۔

لیکن جن غریبوں کو صرف بری تقدیر والے ظرف سے حصہ ملتا ہے وہ:

''تمام عمر دنیا کی ساری لذتوں سے محروم، ابدی بھوک اور فلاکت کی زندگی گزارتے ہیں''۔

مزید برآں نہ ہم تسلیم کریں گے کہ:

''زیوس ہر خیر و شر کا حاکم ہے''۔

یا اگر کوئی شخص اس دروغ حلفی اور عہد شکنی کو جو فی الواقع پنڈارس (Pandarus) کی کارستانی تھی اتھینی (Athene) اور زیوس کی طرف منسوب کرے تو ہم ہرگز اسے نہیں مانیں گے۔ نہ ہمارے نزدیک یہ بات قابل قبول ہے کہ تھیمس (Themis) اور زیوس نے دیوتاؤں کو جنگ و جدال پر آمادہ کیا۔ اسی طرح ہم

اپنے نوجوان طبقے کو ایسکلس کے اس قسم کے اقوال بھی نہیں سنائیں گے کہ:

''جب خدا کسی خاندان کو تباہ و برباد کرنا چاہتا ہے تو اس میں معصیت اور جرم کا بیج بو دیتا ہے''۔

یا اگر کوئی شاعر نیوبی (Niobe) کے مصائب یا خاندان پیلاپس (Pelops) کی تکالیف یا ٹروجن جنگ کے حالات نظم کرے تو اسے اس بات کی اجازت نہیں ہونی چاہیے کہ ان واقعات کو ذاتِ باری کی طرف منسوب کرے اور اگر اس نسبت پر اصرار ہی ہو تو اس کی کوئی نہ کوئی تاویل ضرور ہونی چاہیے، مثلاً یہ کہ خدا نے یہ سب کچھ حق اور انصاف کی حمایت میں کیا تھا اور اس کا اصلی مقصد بدکاروں کی تادیب و اصلاح تھا۔ یہ ہرگز نہیں کہنا چاہیے کہ یہ سزا ان کی تخریب کے سبب ہوئی۔ ہاں شاعر یہ لکھ سکتا ہے کہ بُرے لوگ تکلیف اور مصیبت میں اس لیے مبتلا رہتے ہیں کہ وہ اپنی برائی کی وجہ سے سزا کے مستحق ہیں۔ اس سزا سے ان کی اصلاح ہو جاتی ہے اور یوں انہی کا فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن ایک صحیح اصولوں پر بنی ہوئی ریاست میں کوئی مصنف نظم یا نثر میں یہ کہنے کا مجاز نہیں ہوگا کہ خدا لوگوں کے ساتھ برائی کرتا ہے۔ کیونکہ اس قسم کے بیان سخت ناپاک، ضرر رساں ،اور مہلک ثابت ہوتے ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں اور اس قانون کی تائید کے لیے تیار ہوں۔

میں نے کہا: گویا ہمارا ایک اصول یا ہمارے قانون کی ایک دفعہ یہ قرار پائی کہ خدا ہر چیز کا پیدا کرنے والا نہیں بلکہ صرف خیر اور نیکی کا خالق ہے۔ اس دفعہ کی پابندی تمام شاعروں اور متکلموں پر لازم ہوگی۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ضرور۔

میں نے کہا: اور ایک دوسرے اصول کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟ کیا آپ کے نزدیک خدا ایک جادوگر ساتمثی ہے کہ کبھی ایک شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور کبھی دوسرے روپ میں۔ کیا وہ ہر گھڑی اپنی صورت تبدیل کرتا رہتا ہے اور اس تبدیلی سے ہمیں دھوکا دیتا ہے یا کہ وہ اپنی مخصوص شکل میں ازل سے ابد تک بلا تغیر و تبدل دائم و قائم ہے!

ایڈیمنٹس نے کہا: میں بلا غور کیے ہوئے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔

میں نے کہا: لیکن آپ یہ تو بتا سکتے ہیں کہ اگر کسی چیز میں کوئی تغیر و تبدل پیدا ہو تو یا تو اس تبدیلی کی

وجہ خود اس شے کا ذاتی فعل ہوتا ہے یا پھر کسی خارجی سبب سے یہ تبدیلی رونما ہوتی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔ دونوں میں سے ایک صورت ضرور ہے۔

میں نے کہا: اور غالباً یہ بھی تسلیم کریں گے کہ کوئی چیز جب اپنی بہترین حالت میں ہو تو اس میں تغیر کا بہت کم احتمال ہوتا ہے۔ مثلاً کامل تندرستی اور صحت کے زمانے میں انسانی جسم کھانے پینے سے بہت کم متغیر ہوتا ہے یا اگر کوئی پودا خوب سرسبز و شاداب ہو تو آندھیوں اور دھوپ سے مقابلتاً بہت کم متاثر ہوتا ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: اسی طرح عقلمند اور بہادر روحیں خارجی اسباب سے بہت کم پریشان اور پراگندہ خاطر ہوتی ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: یہی اصول میری رائے میں دوسری مرکب چیزوں مثلاً فرنیچر، مکان، لباس وغیرہ پر بھی عائد ہوتا ہے کہ یہ چیزیں جس قدر عمدہ اور اچھی بنی ہوں گی اسی قدر امتدادِ زمانہ اور دوسرے اسباب سے کم متاثر ہوں گی۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: گویا ہر چیز جس قدر اچھی ہوگی اسی قدر اس میں باہر سے تغیر کا امکان کم ہوگا، خواہ یہ چیز انسانی دستکاری کا نتیجہ ہو، قدرت کی بنائی ہوئی ہو یا دونوں کی ملی جلی کوشش کا حاصل۔

اس نے کہا: سچ ہے۔

میں نے کہا: لیکن خدا اور اس کی متعلقہ صفات تو ہر حیثیت سے بہترین اور کامل ترین ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: لہٰذا خارجی اثرات تو اسے شکل تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔

اس نے کہا: ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: البتہ یہ ممکن ہے کہ وہ خود اپنی ذات میں یہ تغیرات پیدا کرتا ہو۔

اس نے کہا: جی ہاں اگر یہ مان لیا جائے کہ اس کی شکل میں تبدیلی ہوتی ہے تو پھر اس کی صرف یہی

ایک صورت ہے۔

میں نے کہا: بہت مناسب۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ اگر وہ اپنی شکل تبدیل کرتا ہے تو پہلے سے بہتر اور زیادہ خوبصورت شکل اختیار کرتا ہے یا بری اور بدنما۔

اس نے کہا: اگر شکل کا تبدیل ہونا تسلیم کر ہی لیا جائے تو صرف یہی ایک صورت ممکن ہے کہ وہ پہلے سے بری شکل اختیار کرے۔ کیونکہ صورت وسیرت کے اعتبار سے اس میں کوئی عیب یا کمی تو ہے نہیں کہ اسے رفع کر کے بہتر حالت میں رونما ہو سکے۔

میں نے کہا: اس میں آدمی یا خدا کی کچھ تخصیص نہیں کوئی بھی تو اپنے آپ کو بدشکل نہیں بنانا چاہتا۔

اس نے کہا: ہاں۔ ہر گز نہیں۔

میں نے کہا: تو پھر یہ ناممکن ہے کہ خدا اپنی شکل متغیر کرے۔ اس سے بہتر اور خوب تر شکل کا خیال تک فہم وادراک سے باہر ہے اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ خدا اپنی اصلی شکل پر ہمیشہ قائم رہتا ہے۔

اس نے کہا: بے شک یہ تو لازمی بات ہے۔

میں نے کہا: لہٰذا کسی شاعر کو اس بات کی اجازت نہیں ہونی چاہیے کہ دیوتاؤں پر اس قسم کے الزام لگائے کہ "وہ اجنبی باشندوں کا بھیس بدل کر ہمارے شہروں میں ادھر ادھر مارے مارے پھرتے ہیں"۔ نہ پروٹیس اور تھیٹس (Thetis) پر جھوٹے بہتان لگانے کی اجازت ہونی چاہیے۔ نہ ہمارے لیے اس طرح کے قصوں کی اشاعت جائز ہے کہ ہیری ایک پجارن کا لباس پہن کر دریائے آرگوس (Argos) کی بیٹی آئناکس (Inachus) کے لیے دربدر بھیک مانگتی پھرتی تھی۔ اس قسم کے تمام جھوٹے بیانات کو یک قلم مسترد کر دینا چاہیے۔ ہاں۔ یہ بات اچھی نظر سے نہیں دیکھی جا سکتی ہے کہ مائیں شاعروں کے اس قسم کے کلام کو باور کر کے اپنے بچوں کو ڈرائیں کہ رات کے وقت دیوتا مختلف شکلوں میں گھومتے پھرتے ہیں، کیونکہ اس سے ایک تو دیوتاؤں کی تحقیر ہوتی ہے اور دوسرے خود بچوں کے دل چھوٹے ہو جاتے ہیں۔

اس نے کہا: نہیں۔ اس قسم کی روایتیں تو سراسر ناجائز ہیں۔

میں نے کہا: اچھا اب یہ تو طے ہو گیا کہ خدا تغیر پذیر نہیں لیکن یہ تو ممکن ہے کہ وہ خود جادو ٹونے سے ایسا اثر ڈالے کہ ہمیں اس کی شکلیں مختلف نظر آئیں۔

اس نے کہا: جی ہاں۔ یہ تو ممکن ہے۔

میں نے کہا: لیکن کیا تم یہ گمان کر سکتے ہو کہ خدا لفظاً یا عملاً جھوٹ بول سکتا ہے؟

اس نے کہا: میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔

میں نے پوچھا: آخر آپ تو یہ جانتے ہی ہوں گے کہ حقیقی جھوٹ سے خدا کیا انسان تک نفرت کرتا ہے۔

اس نے کہا: آپ کا مطلب کیا ہے؟ میں نہیں سمجھا۔

میں نے پوچھا: میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی انسان جان بوجھ کر یہ گوارا نہیں کرتا کہ اپنے وجود کے اعلیٰ ترین جزو کو اہم ترین معاملے کے متعلق دھوکے میں رکھے۔

اس نے کہا: میں اب بھی آپ کا مفہوم نہیں سمجھا۔

میں نے کہا: نہ سمجھنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے خیال میں، مَیں کوئی باریک بات کہہ رہا ہوں۔ حالانکہ میرا مطلب تو بالکل صاف ہے۔ دیکھیے انسان کا اہم ترین جزو کیا ہے؟ اس کی روح اور اس کو اہم ترین حقائق سے ناواقف یا ان کے متعلق دھوکے میں رکھنا کوئی انسان گوارا نہیں کرتا، بلکہ ہر شخص اس سے سخت نفرت کرتا ہے۔

اس نے کہا: بے شک اس سے زیادہ نفرت کے قابل بات اور کیا ہو سکتی ہے؟

میں نے کہا: اور اسی روح کو دھوکا دینے اور جہل میں رکھنے کو میں نے حقیقی جھوٹ سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ ظاہر لفظوں میں جو جھوٹ بولا جاتا ہے وہ در حقیقت اسی روحانی خرابی کا ایک عکس ہوتا ہے۔

اس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: چنانچہ حقیقی جھوٹ سے ہر ایک نفرت کرتا ہے، کیا دیوتا، کیا انسان۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: البتہ لفظی جھوٹ بعض اوقات یہی نہیں کہ قابل نفرت ہوتا بلکہ مفید ثابت ہوتا ہے، مثلاً دشمنوں کے مقابلے میں یا فرض کرو کہ اپنا کوئی دوست جنون کے دورے میں مبتلا ہے اور اس حالت میں کوئی نقصان کرنا چاہتا ہے تو اس وقت جھوٹ کو دوا کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ یا جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ جب ہم اگلے وقتوں کے متعلق افسانے بنائیں اس وقت اس جھوٹ کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیونکہ اس زمانے کے حقیقی حالات تو معلوم ہوتے نہیں۔ اس لیے جھوٹے واقعات گھڑ کر جہاں تک بنتا ہے حقیقت سے نزدیکی حاصل کرتے اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بہت درست۔

میں نے کہا: مگر کیا اس قسم کی کوئی ضرورت خدا کو بھی پڑ سکتی ہے؟ کیا وہ بھی پرانی باتوں سے ناواقف ہے اور اس لیے مجبوراً جھوٹ بولتا ہے؟

ایڈیمنٹس نے کہا: کس قدر تمسخر انگیز خیال ہے یہ!

میں نے کہا: یعنی اس شاعرانہ جھوٹ کی تو خدا کو ضرورت نہیں پڑتی۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ہرگز نہیں۔

مین نے کہا: اور کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے دشمنوں سے ڈر کر جھوٹ بولتا ہو؟

اس نے کہا: یہ بھی کوئی خیال میں آنے کی بات ہے؟

میں نے کہا: اچھا تو اس کے شاید کچھ پاگل یا دیوانے دوست ہوں اور ان کے علاج کی خاطر جھوٹ بولنا پڑتا ہو؟

اس نے کہا: پاگل بھی کہیں خدا کے دوست ہو سکتے ہیں؟

میں نے کہا: تو پھر اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ خدا جھوٹ بولے۔

اس نے کہا: ہاں، کوئی وجہ نہیں۔

میں نے کہا: یعنی خدا جھوٹ سے قطعی مبرا ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: تو گویا ہم نے یہ ثابت کر دیا کہ خدا سادگی اور صداقت کا ایک کامل نمونہ ہے، اپنے قول اور اپنے فعل میں بالکل سچا ہے۔ مطلق تغیر پذیر نہیں اور اپنے کسی قول یا علامت سے سوتے جاگتے کبھی کسی کو دھوکا اور فریب نہیں دیتا۔

اس نے کہا: میں آپ کی رائے سے حرف بحرف متفق ہوں۔

میں نے کہا: یعنی آپ مجھ سے اتفاق کرتے ہیں کہ تقریر و تحریر کے متعلق دوسرا اصول یہ ہونا چاہیے کہ دیوتاؤں کو جادوگر اور بہروپیا نہ بتایا جائے۔ نہ ان پر تغیر پذیر ہونے یا انسان کو دھوکا دینے کا الزام لگایا جائے۔

اس نے کہا: مجھے یہ اصول منظور ہے۔

میں نے کہا: اس لیے اگرچہ ہم ہومر کے مداحوں میں سہی پھر بھی ہم اس جھوٹے خواب کو ہرگز اچھی

نظر سے نہیں دیکھ سکتے جو ہومر کے بیان کے مطابق زیوس نے آگا میمنون (Agamemnon) کو دکھایا۔ نہ ہم ایسکلس کے ان اشعار کی تعریف کر سکتے ہیں جن میں تھیٹس کا یہ بیان نقل ہے کہ:

''اپالو نے میری شادی کے موقع پر میری اولاد کی تعریف و تبریک میں گانا گایا تھا۔ اور وعدہ کیا تھا کہ میری نسل عرصے تک قائم اور تمام بیماریوں سے محفوظ رہے گی۔ اور ہر حیثیت سے مجھے خوش نصیب بتا کر ایک فاتحانہ انداز میں میری روح کو تسلی دی تھی چونکہ یہ لفظ ایک دیوتا کی زبان سے نکلے ہیں اس لیے یہ پیشین گوئی ہرگز غلط ثابت نہیں ہو سکتی۔ لیکن ستم ظریفی تو دیکھو کہ اسی دیوتا نے جس نے اس دعوت کے موقع پر یہ سب کچھ کہا تھا اسی نے آج میرے بیٹے کو قتل کر ڈالا''۔

دیوتاؤں کے متعلق ہم جب کبھی اس قسم کی باتیں سنیں تو ہمیں غصے اور ناراضی کا اظہار کرنا چاہیے۔ یہ اہتمام کرنا چاہیے کہ ایسے اشعار کبھی عام شاہراہوں پر نہ پڑھے جائیں۔ استادوں کو منع کرنا چاہیے کہ ایسے قصوں کو بچوں کی تعلیم میں استعمال نہ کریں۔ اور یہ سب اس لیے کہ ہمارا اصلی مقصد یہ ہے کہ ہمارے محافظ جہاں تک ممکن ہو دیوتاؤں کے سچے پرستار اور ان کے مشابہ اور مماثل ہوں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میں ان اصولوں سے پورا اتفاق کرتا ہوں اور قانون کے طور پر انھیں تسلیم کرنے کو تیار ہوں۔

☆☆☆

تیسری کتاب

میں نے سلسلۂ کلام یوں شروع کیا "دینیات کے اصول تو ہم گویا طے کر چکے یعنی یہ کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے شاگرد دیوتاؤں اور ماں باپ کی عظمت اور عزت کریں اور آپس میں صلح، محبت، اور دوستی کی قدر کریں تو اس کے لیے لازم ہے کہ بچپن ہی سے انھیں ایک خاص قسم کے قصے کہانیاں سنائی جائیں اور ان کے علاوہ دوسری قسم کے قصوں کی بھنک بھی ان کے کانوں تک نہ پہنچنے پائے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔ ان اصولوں کی صحت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے؟

میں نے کہا: لیکن بس اتنا تو کافی نہیں۔ اگر ان لوگوں کو دلیر اور باہمت بنانا مقصود ہے تو اس کے علاوہ اور چیزوں کی تعلیم بھی تو ضروری ہوگی۔ اور یہ تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ ان کے دل سے موت کا ڈر بالکل نکل جائے کیونکہ جو شخص موت سے ڈرتا ہو وہ بلند ہمت کیسے ہو سکتا ہے؟

ایڈیمنٹس نے کہا: ہرگز نہیں ہو سکتا۔

میں نے کہا: لیکن وہ آدمی موت کے خوف سے کیونکر بری ہو سکتا اور شکست اور غلامی پر موت کو کیسے ترجیح دے سکتا ہے، جو عالم زیریں کو حقیقی اور اصلی مانتا ہو اور اسے سخت ہیبت ناک جانتا ہو؟

ایڈیمنٹس نے کہا: ناممکن۔

میں نے کہا: تو ہمیں اس قسم کے قصوں پر بھی ایک محکمۂ نظارت قائم کرنا ہوگا اور ان کے راویوں سے درخواست کرنی ہوگی کہ اس عالم کی بس برائی ہی برائی نہ بیان کریں بلکہ اس کی تعریف کریں کیونکہ ان کے بیانات ایک تو جھوٹ ہیں اور دوسرے آگے چل کر ہمارے سپاہی بننے والے نوجوانوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بلاشبہ ہم پر یہ فرض عائد ہوگا۔

میں نے کہا: چنانچہ اس قسم کے بہت سے ضرر رساں ٹکڑے ہمیں اپنے ادب سے یک قلم خارج

کرنے پڑیں گے، مثلاً وہ قطعہ جس کے شروع میں ہے کہ:

''میں ایک غریب اور مفلس آدمی کی زمین پر غلامی کا کام کرلوں، اسے ترجیح دیتا ہوں اس پر کہ مُردوں پر بادشاہت کروں''۔

ہمیں وہ اشعار بھی قلم انداز کرنے ہوں گے جن میں پلیوٹو (Pluto) کے اس خطرے کا ذکر ہے کہ:

''کہیں عالم زیریں کے وہ خوفناک قصر اور غلیظ اور گندے ایوان جن سے دیوتا تک نفور ہیں دوسری فانی یا غیر فانی ہستیوں کی نگاہوں کو بھی نہ دیکھنا پڑیں''۔

نیز یہ الفاظ کہ:

''یا للعجب! اس عالم میں روحیں بھی ہیں اور طرح طرح کے بھوتوں جیسی شکلیں بھی لیکن ذہن اور عقل کا کہیں پتا نہیں''۔

یا ٹیریسیاس (Tiresias) کے متعلق یہ الفاظ کہ:

''اسے تو موت کے بعد بھی پرسی فون (Persephone) نے دماغ عطا کیا تاکہ بس ایک وہ عقلمند ہو ورنہ یوں تو تمام روحیں بس ایک سائے کی حیثیت رکھتی ہیں جو ادھر سے ادھر تھر کتا پھرتا ہے''۔

یا یہ الفاظ کہ:

''جسدِ عنصری سے جدا ہو کر روح اپنی قسمت پر گریہ کناں اور مردانگی اور شباب کو الوداع کہتی ہوئی عالم زیریں کی طرف پرواز کر گئی''۔

یا یہ کہ:

''روح ایک دلخراش چیخ مار کر دھوئیں کی شکل میں زمین کے نیچے روپوش ہو گئی''۔

یا پھر یہ کہ:

''روحیں ادھر ادھر حرکت کرتے وقت اس طرح چلا رہی تھیں جیسے کسی تیرہ و تار غار میں جب چمگادڑ کے پنجوں سے اپنی پکڑ چھوٹ جاتی ہے تو وہ چیخ مار کر ادھر ادھر اڑتا ہے اور دوسرے چمگادڑوں کا جسم پکڑ کر لٹک جاتا ہے''۔

ہمیں یقین ہے کہ ان ٹکڑوں کو نکال دینے پر ہومر اور دوسرے شاعروں کی ناخوشی کی کوئی وجہ نہیں۔

کیونکہ اس نکالنے کا سبب یہ تو ہے نہیں کہ یہ ٹکڑے شعریت سے معرا رہیں یا عوام کے لیے ان میں کشش نہیں ہے، بلکہ بحیثیت شعر ان میں جتنی خوبی ہے اتنا ہی ان سے ہمارے نوجوانوں کو زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے کہ ہم انھیں آزاد انسان بنانا چاہتے ہیں جو غلامی سے زیادہ ڈرتے ہوں اور موت سے کم۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: یہی نہیں۔ ہمیں تو ان تمام مہیب ناموں کو بھی نکال پھینکنا ہوگا جن سے عالم زیریں کو موسوم کیا جاتا ہے۔ یا کاکیٹس (Cocytus) اور سٹائیکس (Styx) بھوتوں پریتوں کا ذکر جن کے نام ہی سے آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں ان سے انکار نہیں کرتا کہ ممکن ہے اس قسم کے قصوں سے کوئی مفید نتیجہ بھی مرتب ہو سکے لیکن ساتھ ہی یہ خوف ہے کہ ہمارے محافظوں کی طبیعتوں میں ان سے ڈر اور نسائیت کے جذبات زیادہ پیدا ہو جائیں گے۔

اس نے کہا: ہاں یہ اندیشہ تو ہے۔

میں نے کہا: تو پھر کیا ان تمام چیزوں کو یک قلم خارج کر دینا چاہیے؟

اس نے کہا: اور کیا؟ یقیناً۔

میں نے کہا: اور ان کے بجائے زیادہ مفید اور حوصلہ افزا ترانے تصنیف کرنے اور ان لوگوں کو سنانے چاہئیں۔

اس نے کہا: ضرور۔

میں نے کہا: ان نظموں میں جو بڑے بڑے سورماؤں کے رونے پیٹنے اور واویلا کرنے کا ذکر ہے کیا اسے بھی نکال دیا جائے؟

اس نے کہا: بے شک۔ جو حشر دوسری لغویات کا ہوا ہے وہی ان کا ہونا چاہیے۔

میں نے کہا: لیکن کیا ہم ایسا کرنے میں حق بجانب ہوں گے؟ خوب سوچ سمجھ لو۔ ہمارا خیال تو یہی ہے، کہ ایک نیک آدمی کو چاہیے کہ اپنے کسی نیک ہمراہی کی موت کو کوئی بڑی مصیبت نہ سمجھے۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: چنانچہ اس دوست سے دائمی جدائی پر اظہار رنج و افسوس بھی نہیں کرنا چاہیے جیسا کہ مصیبت کے وقت کیا جاتا ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ہاں۔ ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔

میں نے کہا: اس کے علاوہ ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ نیک آدمی اپنی ذات اور اپنی خوشی کے لیے خود کافی ہے اور اس وجہ سے دوسروں کے سہارے کا بہت کم محتاج ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: چنانچہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں اسے کسی بھائی، بیٹے کی موت یا کسی قیمتی دنیاوی متاع کے تلف ہو جانے کا بہت کم افسوس ہوگا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اس لیے وہ ان واقعات پر کبھی رونا دھونا بھی نہ کرے گا۔ اور اس قسم کی جو مصیبتیں بھی پیش آئیں گی انھیں کشادہ پیشانی سے برداشت کرے گا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: اور لوگوں کی بہ نسبت اس پر ان چیزوں کا بہت کم اثر ہوگا۔

میں نے کہا: تو پھر یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشہور اور برگزیدہ لوگوں کے متعلق جہاں کہیں رونے پیٹنے اور چیخنے چلانے کی روایتیں ہوں انھیں خارج کر دیں اور ان حرکتوں کو عورتوں یا بری قسم کے مردوں کے ساتھ منسوب کریں تا کہ ملک کی حفاظت کی تعلیم حاصل کرنے والے اس قسم کی باتوں کو ذلت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بالکل درست۔

میں نے کہا: گویا ہمیں ایک بار پھر ہومر اور دوسرے شاعروں سے درخواست کرنی ہوگی کہ وہ ایک دیوی کے بیٹے یعنی اکیلس (Achilles) کے متعلق یہ نہ بیان کریں کہ وہ کبھی بے قراری سے زمین پر لوٹتا، مضطربانہ کروٹیں بدلتا تھا اور کبھی سمندر کے کنارے دوڑا دوڑا پھرتا تھا یا دونوں مٹھیوں میں راکھ بھر بھر کر سر پر ڈالتا تھا۔ نہ دیوتاؤں کے ایک عزیز پریام (Priam) کی نسبت یہ روایت کریں:

> ''کہ وہ خاک پر لوٹ لوٹ کر اور حاضرین کا نام زور زور سے پکار کر دعائیں اور التجائیں کرتا اور دادرسی کا طالب ہوتا تھا''۔

ہم ہومر سے نہایت خلوص کے ساتھ یہ التجا بھی کریں گے کہ اپنے کلام میں دیوتاؤں کو تو شکوہ و شکایت کرتا ہوا ظاہر نہ کرے اور اگر دیوتاؤں کا ذکر کرنا ایسا ہی ضروری ہو تو کم سے کم سب سے بڑے دیوتا کو تو

ایسی سخت غلط بیانی سے معاف رکھے کہ اس کی طرف یہ لفظ منسوب کیے جائیں۔

''الامان الامان میں اپنی ہی آنکھوں سے دیکھتا ہوں کہ میرے ایک دوست کا پیچھا کر کے اسے شہر کے چاروں طرف دوڑایا جا رہا ہے۔ اور میرا دل غم واندوہ سے بھرا ہوا ہے''۔

یا یہ کہ:

''حیف صد حیف کہ میری قسمت میں یہ دیکھنا لکھا تھا کہ سارپی ڈون(Sarpedon) جو میرے لیے انسانوں میں سب سے عزیز انسان ہے، مینوٹیس (Menoetius) کے بیٹے پیٹروکلس(Patroclus) کے ہاتھوں نیچا دیکھے''۔

کیونکہ عزیز من! اگر نوجوان لوگ دیوتاؤں کے متعلق اس قسم کی روایتیں سنیں گے تو بجائے اس کے کہ ان کی حماقت پر ہنسیں ان پر بالکل دوسرا اثر مرتب ہوگا۔ وہ سمجھیں گے کہ جب دیوتاؤں کا یہ حال ہے تو پھر انسان کے لیے یہ حرکات کیسے باعثِ ذلت ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ اگر گریہ وبکا کرنے کی کوئی تحریک ان کی طبیعت میں ہوگی تو وہ ہرگز اسے دبانے کی کوشش نہیں کریں گے اور بجائے اس کے کہ شرم سے کام لیں اور اپنی طبیعت پر قابو حاصل کریں وہ ہر ذرا ذرا سی بات پر ہمیشہ روتے پیٹتے پھرا کریں گے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔ یہ تو بالکل سچ ہے۔

میں نے کہا: لیکن جیسا کہ پچھلی دلیلوں نے ثابت کر دیا ہے ایسا تو ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ اور جب تک ہماری دلیلیں غلط ثابت ہو جائیں ہمیں ان کے نتائج پر قائم رہنا ضروری ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اس کے علاوہ میری رائے میں محافظوں کو بہت ہنسنے کا بھی عادی نہیں ہونا چاہیے کیونکہ زور سے قہقہہ لگانے کے بعد تقریباً ہمیشہ ردعمل کے طور پر ایک پژمردگی سی طاری ہو جاتی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میرا بھی خیال یہی ہے۔

میں نے کہا: چنانچہ کسی معزز آدمی کی نسبت ہرگز یہ نہیں بیان کرنا چاہیے کہ وہ مارے ہنسی کے بے قابو ہو گیا۔ اور پھر جب آدمی کے متعلق یہ احتیاط لازمی ہے تو دیوتاؤں کی نسبت تو اس کا اور بھی زیادہ اہتمام ہونا چاہیے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یقیناً۔ دیوتاؤں کے متعلق تو بقول آپ کے اور بھی احتیاط درکار ہے۔

میں نے کہا: تو ہم دیوتاؤں کے متعلق ہرگز اس قسم کے بیانات روا نہیں رکھیں گے جیسے کہ ہومر نے کہے ہیں کہ ''ہیفائیسٹس کو مکان کے گرد گھبراہٹ میں چکر لگاتے دیکھ کر دیوتاؤں کی مبارک محفل میں ایک ایسا قہقہہ پڑا کہ ختم ہی نہ ہوتا تھا''۔ آپ کے خیال میں ایسی باتوں کو تو جائز نہیں رکھنا چاہیے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میرے خیال میں! اگر آپ اپنے خیال کو میری طرف ہی منسوب کرنا چاہتے ہیں تو ہرگز ایسے بیانات کو جائز نہیں رکھنا چاہیے۔

میں نے کہا: خیر بھائی۔ ان خیالوں کی ذمہ داری میرے ہی سر سہی۔ بہرحال اس میں ذرا شک نہیں کہ اس قسم کے بیان ہرگز قابل پذیرائی نہیں۔ (خیر اسے جانے دیجیے) اس کے علاوہ اور اہم باتیں بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ راست بازی اور سچ کی بہت زیادہ وقعت ہونی چاہیے۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں اگر جھوٹ دیوتاؤ ں کے لیے بالکل بے کار اور انسان کے لیے صرف دوا کے طور پر مفید ہوتا ہے تو پھر اس دوا کے استعمال کو صرف طبیبوں تک محدود رکھنا چاہیے، عوام کو اس سے کوئی سروکار نہ ہو۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔

میں نے کہا: تو اگر کسی کو جھوٹ بولنے کا منصب حاصل ہو سکتا ہے تو صرف ریاست کے حکمرانوں کو۔ انھیں تو اجازت ہونی چاہیے کہ عام فلاح کے لیے دشمنوں سے یا خود اپنے شہریوں سے جھوٹ بول سکیں۔ لیکن ان کے علاوہ کسی اور شخص کو ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ یہ اختیار بس حکام تک محدود ہے اور کوئی دوسرا شخص جواب میں ان حکام سے جھوٹ بولے تو اس کے جرم کی مثال بالکل ایسی، بلکہ اس سے بھی زیادہ بُری ہوگی کہ ایک مریض اپنی جسمانی حالت کے متعلق طبیب سے سچ نہ بولے یا یہ کہ ملاح جہاز کی حقیقی کیفیت سے ناخدا کو آگاہ نہ کرے اور مسافروں یا دوسرے ملاحوں کی حالت سے اسے بالکل بے خبر رکھے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بجا فرماتے ہیں آپ۔

میں نے کہا: تو اگر کوئی حاکم کسی دوسرے شخص کو:

''خواہ وہ پجاری ہو یا حکیم، بڑھئی ہو یا اہل حرفہ میں سے کوئی اور''۔

حدود ریاست میں جھوٹ بولتے ہوئے پکڑ لے تو اسے چاہیے کہ اس شخص کو سزا دے کیونکہ اس کی یہ حرکت حکومت کی کشتی کو ڈبونے کی ایسی ہی صلاحیت رکھتی ہے جیسی کہ ابھی دی ہوئی مثال۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک ایسا ہی کیا جائے گا بشرطیکہ ہمارے مرتب کردہ نظام پر کبھی عمل ہو اور ہمارے الفاظ حقیقت کا جامہ پہن سکیں۔

میں نے کہا: خیر۔ دوسری بات یہ ضروری ہے کہ ہمارے نوجوان پاکباز ہوں اور نفس پر قابو رکھتے ہوں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اور پاکبازی اور ضبطِ نفس کے دو ہی خاص جزو ہیں یعنی حاکموں کی اطاعت اور جسمانی لذتوں کے بارے میں اپنی طبیعت پر قابو۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: تو ہمیں ان کلمات کی تحسین کرنی چاہیے جو ہومر نے ڈیومیڈی (Diomede) کی زبان سے ادا کیے ہیں کہ:

"میرے دوست! خاموش بیٹھو اور میرے احکام کی اطاعت کرو"۔

یا اس کے بعد والے جملے کی:

"وہ یونانی جن کے ہر سانس کے ساتھ بہادری اور شجاعت نکلتی تھی! اپنے قائدوں کے پیچھے پیچھے چلے جاتے تھے، باادب، مطیع، خاموش"۔

اور اسی قسم کے دوسرے خیالات کی بھی تعریف کرنی چاہیے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ضرور۔

میں نے کہا: اور اس بیان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے کہ حکام کو یوں پکارا جائے کہ:

"اے نشہ ٔ مے میں سرمست، کتے کی سی آنکھیں اور ہرن کا سا دل رکھنے والے"۔

یا اس کے بعد والے الفاظ۔ کیا یہ یا اسی قسم کی گستاخیوں کا ذکر جو نثر یا نظم میں اس طرح ہو جیسے معمولی آدمیوں نے حکام کے ساتھ یہ بدکلامی کی ہو تو یہ آپ کی رائے میں مناسب ہوگا یا نہیں؟

ایڈیمنٹس نے کہا: یقیناً نامناسب ہے۔

میں نے کہا: ممکن ہے یہ شعر تفنن طبع کا سامان بہم پہنچاتے ہوں لیکن اس میں کلام نہیں کہ یہ باتیں عفت اور ضبطِ نفس کے تو بالکل منافی ہیں اور اس لیے ہمارے نوجوانوں کو ان سے نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔

غالباً آپ کو مجھ سے اتفاق ہوگا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اور معزز آدمیوں کی زبان سے یہ الفاظ روایت کیے جائیں کہ:

''دنیا میں اس سے زیادہ شاندار چیز اور کیا ہوگی کہ دستر خوان پر طرح طرح کھانے چنے ہوں۔ ساقی مینا سے ساغر میں شراب انڈیلتا ہو اور پھر اس کا دور چلے''۔

یا یہ کہ:

''اس عالم میں سب سے زیادہ بدنصیب وہ آدمی ہے جو بھوک سے جان دے''۔

تو اس کا اثر سننے والوں پر بلحاظ پاکبازی اور ضبطِ نفس کے کیا ہوگا؟ اور یہی نہیں زیوس ہی کا قصہ لیجیے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ تمام عالم محوِ خواب اور صرف زیوس بیدار تھا اور طرح طرح کی تدبیروں پر غور کر رہا تھا کہ ہیرؔی نظر آئی اور وہ شہوت کے غلبے میں اپنی ساری تدبیریں بھول گیا حتیٰ کہ ہیرؔی کو اپنے جھونپڑے کے اندر تک نہ لے گیا اور وہیں زمین پر اس سے مباشرت کرنا چاہی اور اس سے کہا کہ ہم تم جب پہلی مرتبہ:

''اپنے والدین کی لاعلمی میں''

ملے تھے اس وقت بھی تو مجھ پر ایسی کیفیت طاری نہ ہوئی تھی۔ یا وہ دوسرا افسانہ جس میں بیان کیا جاتا ہے کہ اسی قسم کے اعمال کی وجہ سے ہیفاءیسٹس نے آریس (Ares) اور افروڈائٹ (Aphrodite) کو زنجیر سے جکڑ دیا تھا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میری رائے میں تو اس قسم کا بھی کوئی قصہ بیان نہیں کرنا چاہیے۔

میں نے کہا: لیکن اگر کسی مشہور شخص سے استقلال اور پامردی کے کام انجام پائے ہیں یا ہمت کے کلمات اس کی زبان سے نکلے ہیں تو یہ باتیں تو ضرور نوجوانوں کو سنانی چاہئیں۔ مثلاً یہ جملے کہ:

''اس نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا اور اپنے دل کو ملامت کر کے کہا کہ اے دل تو نے تو اس سے سخت سخت باتیں برداشت کی ہیں۔ اسے بھی برداشت کر''۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک۔ یہ باتیں تو انھیں سنانی چاہئیں۔

میں نے کہا: اس کے بعد ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ یہ لوگ نذریں اور تحفے تحائف بھی قبول نہ کریں اور ان میں دولت کی ذرا محبت نہ ہو۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: چنانچہ ہمیں ان کے سامنے کبھی یہ نہیں کہنا چاہیے کہ:

''نذروں سے بڑے بڑے دیوتا، اور واجب الاحترام بادشاہ تک ہر کام کے کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں''۔

نہ ہمیں اکیلس کے استاد فونیکس (Phoenix) کی تحسین کرنی چاہیے کہ اس نے اپنے شاگردوں کو یہ نصیحت کی کہ یونانیوں کی نذر قبول کر کے ان کی امداد پر تیار ہو جائے لیکن جب تک نذر نہ ملے اپنے غصے کو ہرگز کم نہ کرے اور نہ ہمیں یہ باور کرنا چاہیے کہ خود اکیلس اتنا لالچی تھا کہ اس نے آگامیمنون کی نذر قبول کر لی اور جب روپیہ مل گیا تو باوجود اس کے کہ پہلے انکار کر چکا تھا ہیکٹر (Hector) کی نعش واپس کر دی۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک۔ اس قسم کے جذبات اور ان کے بیان کو ہرگز پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے۔

میں نے کہا: سچ پوچھو تو مجھے ہومر سے ایک طرح کا انس سا ہے۔ لیکن جہاں اس نے اکیلس سے اس قسم کی بری صفتوں کو منسوب کیا ہے، یا یہ یقین ظاہر کیا ہے کہ یہ صفات فی الحقیقت اس کے ساتھ منسوب کی جا سکتی ہیں، تو میرے خیال میں وہ ایک سخت گناہ کا مرتکب ہوا ہے۔ اسی طرح میں ہرگز اس بیان کو بھی قابل پذیرائی نہیں سمجھتا جو بارگاہ اپالو میں اکیلس کے گستاخانہ کلام کے متعلق ہومر نے اس طرح نظم کیا ہے کہ:

''اے دیوتاؤں میں سب سے زیادہ قابل نفرت دیوتا! اے دراز دست اور دور انداز!
تو نے میرے ساتھ دغا کی، میرے بس میں ہوتا تو یہ حساب چکا کر تجھے دکھاتا''۔

نہ میرے نزدیک یہ بات قابل یقین ہے کہ اکیلس نے دریائی دیوتا سے سرکشی کی اور اس کی خدائی تک پر دست درازی کا ارادہ کیا۔ یا یہ کہ اس نے اپنے بالوں کی نذر پیٹروکلس (Pétroclus) کی نعش پر چڑھائی حالانکہ پہلے سے انھیں دریائی دیوتا اسپرکیئس (Spercheius) کے نام پر وقف کر چکا تھا۔

یا یہ روایت کہ اس نے پیٹروکلس کی قبر کے گرد ہیکٹر کو گھسیٹا اور قیدیوں کو چتا پر زندہ جلا دیا۔ میں تو ان باتوں پر ہرگز یقین نہیں کر سکتا اور نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ ہمارے شہری یہ باور کریں کہ شیران (Cheiron) جیسے فرزانہ حکیم کا شاگرد اور ایک دیوی کا بیٹا جس کا باپ پیلیئس (Peleus) اشرف الناس اور زیوس کی تیسری پشت میں تھا اس قدر مخبوط الحواس ہو گیا ہے کہ ایک ہی وقت میں اس پر دو بظاہر مخالف جذبات حاوی ہوں یعنی

ایک طرف لالچ اور طمع میں لتھڑا ہوا کمینہ پن اور دوسری طرف دیوتاؤں اور انسانوں کی ایسی انتہائی تحقیر۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔

میں نے کہا: اسی طرح ہم پوسیڈان کے بیٹے تھیسی اس (Theseus) یا زیوس کے بیٹے پیری تھاؤس (Peirithous) کے متعلق ارتکاب زنا کی روایات کو ہرگز سچ نہیں مانیں گے اور نہ ہم اجازت دے سکتے ہیں کہ اس قسم کے قصے ہماری ریاست میں بیان کیے جائیں۔ مشاہیر عہد اور دیوتاؤں کے ساتھ ہرگز اس قسم کے ناپاک اور نفرت انگیز افعال کو منسوب نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ ہم شاعروں کو ہدایت کریں گے کہ یا تو وہ افعال قبیحہ کو ان لوگوں سے منسوب نہ کریں یا پھر انھیں دیوتاؤں کی اولاد نہ بتائیں۔ کیونکہ یہ دونوں باتیں تو ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں۔ اس کے علاوہ ہم شاعروں کو اس عقیدے کی تلقین کی اجازت بھی نہیں دے سکتے کہ دیوتا ہی برائیوں کے خالق بھی ہوتے ہیں یا سورماؤں اور معمولی انسانوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ خیالات نہ تو مفید ہیں اور نہ صحیح۔ اور یہ ہم پہلے ہی ثابت کر چکے ہیں کہ دیوتا برائی کا سبب نہیں ہوسکتے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بلاشبہ۔ ہرگز نہیں ہوسکتے۔

میں نے کہا: اس کے علاوہ سننے والوں پر ان قصوں کا کیسا برا اثر پڑے گا کیونکہ ہر شخص برائی کرنے کے بعد یہ بہانہ پیش کرسکتا ہے کہ ایسے کام تو:

"دیوتاؤں کی اولاد اور زیوس کے عزیزوں تک سے سرزد ہوئے ہیں جن کی آبائی قربان گاہ جبل ایدا کی مرتفع چوٹی پر آسمان سے باتیں کرتی ہے"۔

اور

"جن کی رگوں میں اب تک دیوتاؤں کا خون رواں ہے!"۔

اس لیے مناسب یہی ہے کہ ان قصوں کا سرے سے خاتمہ کر دیا جائے کہ کہیں یہ ہمارے نوجوانوں کے بگاڑ کا سبب نہ بنیں۔

اس نے جواب دیا: ضرور۔ ہر حال میں ایسا ہونا چاہیے۔

میں نے کہا: ہم چونکہ اس وقت اس مسئلے پر غور کر رہے ہیں کہ کس قسم کے موضوعات کے بیان کی اجازت دی جائے اور کون کون سے ممنوع قرار دیے جائیں اس لیے ذرا پھر سوچ لیجیے کہ کوئی موضوع رہ تو نہیں گیا۔ دیوتا اور ان کی اولاد، سورماؤں اور عالم زیریں کے متعلق تو ہم طے کر چکے ہیں۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: غالباً اب اس مسئلے کا صرف ایک حصہ باقی رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ انسانوں کے متعلق کس قسم کی باتوں کی اجازت دینی چاہیے؟

ایڈیمنٹس نے کہا: اور کیا، بظاہر تو یہی بات باقی ہے۔

میں نے کہا: لیکن غالباً ہم لوگ فی الحال تو اس کا جواب دینے کے اہل نہیں ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یہ کیوں؟

میں نے کہا: اس لیے کہ اس ضمن میں ہمیں لامحالہ یہ کہنا ہوگا کہ شاعروں اور افسانہ نگاروں نے انسان کے متعلق انتہائی غلط بیانی سے کام لیا ہے، مثلاً یہ کہ شریر لوگ راحت اور آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں اور نیک لوگوں کو ہمیشہ مصائب اور آلام سے دست وگریبان ہونا پڑتا ہے۔ یا یہ کہ اگر باز پرس نہ ہو تو جبر اور ناانصافی میں بہت فائدہ ہے اور عدل اور انصاف میں چاہے دوسروں کا فائدہ ہو لیکن اپنی ذات کا نقصان ہی ہے۔ اور ہم لوگ اپنے خیال کے مطابق انھیں یقیناً ایسے بیانات سے منع کریں گے بلکہ اس کے برعکس بیان کرنے کا حکم دیں گے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: اور یہی کرنا بھی چاہیے۔

میں نے کہا: یہ تو درست ہے۔ لیکن اگر آپ اس کو تسلیم کیے لیتے ہیں تو گویا آپ نے اس اصول کو بالواسطہ قبول کر لیا جس پر ہم شروع سے بحث کر رہے ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ہاں۔ بے شک آپ کا یہ ارشاد تو بالکل بجا ہے۔

میں نے کہا: لہٰذا ہم اس وقت تک اس سوال کا کوئی قطعی جواب نہیں دے سکتے جب تک کہ عدل کی حقیقی ماہیت معلوم نہ ہو جائے اور یہ ظاہر نہ ہو لے کہ عادل شخص کو عدل سے فی نفسہٖ کیا فائدے حاصل ہوتے ہیں چاہے وہ بظاہر عادل معلوم ہو یا نہ ہو۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بالکل صحیح۔

میں نے کہا: اچھا۔ شاعری کے نفسِ مضمون کے متعلق تو کافی بحث ہو چکی۔ آؤ، اب ذرا طرزِ ادا کے متعلق کچھ گفتگو کریں تاکہ اس مسئلے کے دونوں حصوں کی تحقیق مکمل ہو جائے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میں صحیح طور پر آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

میں نے کہا: اچھا تو میں سمجھاتا ہوں۔ آپ غالباً اس طرح سمجھ لیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ تمام کی تمام شاعری اور افسانہ نگاری چند واقعات کے بیان سے عبارت ہے جو ماضی، حال یا مستقبل میں سے کسی نہ کسی زمانے سے متعلق ہوتے ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اچھا۔ اور بیان کی کئی قسمیں ہوسکتی ہیں۔ یعنی یا تو خالص واقعہ نگاری ہو یا نقالی یا ان دونوں کا مرکب۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میں پھر آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

میں نے کہا: تم جی میں ہنستے ہوں گے کہ یہ کیسے استاد سے سابقہ پڑا ہے جو اپنا مطلب بھی ٹھیک واضح نہیں کر پاتا۔ اس لیے ایک بڑے مقرر کی طرح میں پورے مضمون پر بحث کرنے سے احتراز کرتا ہوں اور اپنے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے بطور تمثیل اس کے ایک حصے کو علیحدہ کیے لیتا ہوں۔ اچھا تو سنو۔ تم نے غالباً ایلیاڈ (Iliad) کے شروع کے شعر تو پڑھے ہوں گے جن میں کرائی سس (Chryses) نے اپنی بیٹی کی رہائی کے لیے آگا میمنون سے درخواست کی اور آگا میمنون غضب ناک ہو کر اس سے بگڑ گیا۔ چنانچہ جب کرائی سس اپنے مقصد میں ناکام ہوا تو اس نے دیوتا سے اہل اخے (Achaeans) پر عذاب نازل کرنے کی دعا مانگی ہے۔ ہاں تو اس جملے تک کہ:

> ''اس نے تمام یونانیوں سے عام طور پر اور ایٹریس (Atreus) کے دونوں بیٹوں سے
> جو قوم کے سردار تھے خاص طور سے درخواست کی''۔

شاعر خود اپنی طرف سے واقعہ بیان کر رہا ہے اور کسی دوسری شخصیت میں روپوش نہیں ہونا چاہتا۔ لیکن اس کے بعد وہ کرائی سس کی زبان اختیار کرتا ہے اور یہ یقین دلانا چاہتا ہے کہ مقرر ہومر نہیں بلکہ وہ خود معمر پجاری ہے۔ چنانچہ ٹرائے (Troy) اور اتھاکا (Ithaca) کے واقعات اور اڈویسی (Odyssey) میں ایک سرے سے دوسرے تک واقعات کے بیان کو ان ہی دو طریقوں میں ڈھالا ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے پوچھا: دونوں صورتوں میں یعنی خواہ شاعر اپنی طرف سے واقعہ بیان کرے یا وقتاً فوقتاً کسی دوسرے کی تقریر دہرائے نظم کو واقعہ نگاری سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: لیکن جب شاعر دوسرے شخص کا بھیس اختیار کرتا ہے تو لازمی طور پر اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس کا طرز بیان جہاں تک ہوسکے اس شخص سے مل جائے جس کی زبان سے تقریر کرائی جارہی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: اور کیا۔

میں نے کہا: اور اپنی شخصیت کو دوسرے شخص میں اس طرح جذب کر دینے کو ہی، خواہ یہ باعتبار آواز ہو یا بلحاظ حرکات وسکنات، شخص مذکور کی نقل کہتے ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: شاعر جب یہ تدبیر اختیار کرتا ہے تو اسے نقالی یا محاکات کہتے ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: لیکن اگر شاعر ہر جگہ خود ہی ظاہر رہے اور اپنے آپ کو چھپانے کی کہیں کوشش نہ کرے تو وہ نظم، تذکرہ یا خالص بیان ہو جاتی ہے۔ اپنے موضوع کو اور زیادہ واضح کرنے کے لیے تاکہ آپ پھر یہ نہ کہیں کہ "میں نہیں سمجھا" میں ان دونوں قسموں میں تفریق کر کے بتاتا ہوں۔

دیکھیے۔ اگر ہومر یہ کہتا کہ کرائی سس اپنے ہاتھ میں زرفدیہ لیے ہوئے آیا اور تمام اہل اِخنے سے عموماً اور ان کے سرداروں سے خصوصاً اپنی لڑکی کی رہائی کی درخواست نہایت لجاجت کے ساتھ کرنے لگا" اور اس کے بعد اگر شاعر کرائی سس کی زبان سے تقریر کرانے کے بجائے خود ہی بیان کو جاری رکھتا تو پھر یہ نقل کلام نہ ہوتی بلکہ اسے تذکرہ یا خالص بیان کہتے اور نظم کی صورت حسب ذیل ہوتی (چونکہ میں شاعر نہیں ہوں اس لیے وزن وعروض کو بالائے طاق رکھتا ہوں) پجاری آیا اور اس نے یونانیوں کی طرف سے دیوتاؤں کی بارگاہ میں ان کی فتح اور کامرانی کی دعا مانگی تا کہ وہ ٹرائے پر قابض ہو کر صحیح سلامت اپنے گھروں کو واپس پہنچ جائیں لیکن ساتھ ہی یہ درخواست بھی کی کہ زرفدیہ قبول کر کے اس کی لڑکی کو رہا کر دیا جائے اور دیوتا کی تعظیم وتکریم کی جائے۔ اس کلام کو سن کر دوسرے یونانیوں نے تو پجاری کی عزت کی اور اس کی درخواست پر اظہارِ قبولیت کیا لیکن آگا میمنون کو اس پر غصہ آیا اور اس نے اس پجاری کو حکم دیا کہ نکل جائے اور پھر کبھی وہاں نہ آئے ورنہ اس کا عصا اور جبہ ودستار کچھ کام نہیں آئے گا آگا میمنون نے یہ حکم بھی صادر کیا کہ کرائی سس کی

لڑکی کو رہا نہ کیا جائے بلکہ آرگوس میں اس کے ساتھ رہ کر اپنی عمر گزارے۔ اس کے بعد بے چارے پجاری کو پھر حکم دیا کہ اگر صحیح سلامت واپس جانا چاہتا ہو تو زیادہ غصہ نہ دلائے اور فوراً چلا جائے۔ بے چارہ پجاری مارے خوف کے خاموش وہاں سے چلا آیا۔ پھر اس نے لشکر سے باہر نکل کر اپالو کو مختلف ناموں سے پکارا اور اپنے تمام وہ نیک عمل یاد دلائے جو اس کی خوشنودی کے لیے اس نے کیے تھے، مثلاً قربانیاں، مندروں کی تعمیر وغیرہ۔ اور اس سے اب ان اعمال کا اجر چاہا اور التجا کی کہ اس کے آنسوؤں کا بدلہ آگامیمنون پر آسمانی تیر برسا کر لیا جائے"۔ وقس علیٰ ہذا۔ اس طرح نظم خالص بیانیہ انداز اختیار کر لیتی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میں اب سمجھ گیا۔

میں نے کہا: اب اس کے بالکل خلاف تصور کرو۔ یعنی یہ کہ تمام درمیانی اشعار کو نکال دو اور صرف مکالمہ رہنے دو۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ہاں، میں سمجھا۔ جیسے المیہ ناٹک میں ہوتا ہے۔

میں نے کہا: تم میرا مطلب بالکل ٹھیک سمجھے۔ اور میرا خیال ہے کہ جو بات پہلے تمھاری سمجھ میں نہیں آئی تھی وہ اب بالکل واضح ہو گئی ہوگی۔ یعنی شاعری اور دیومالا میں کبھی تو بالکل نقل بیان ہوتی ہے، مثلاً ناٹک میں، وہ المیہ ہو کہ طربیہ، یا پھر اس کے بالکل برعکس یعنی جب شاعر تمام واقعات خود ہی بیان کرتا ہے جس کی بہترین مثال وہ پُر جوش و مستانہ شاعری ہے جسے ڈی تھریمب (Dithyramb) کہتے ہیں یا پھر ان دونوں قسموں کی آمیزش ہوتی ہے مثلاً رزمیہ شاعری اور کئی دوسری اصناف سخن میں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک۔ اب جا کر میں آپ کا مفہوم سمجھا۔

میں نے کہا: ہاں ذرا اس کا خیال رہے کہ ہم لوگ شاعری کے نفسِ مضمون کے متعلق فیصلہ کر چکے ہیں۔ اس وقت صرف طرزِ بیان کا مسئلہ سامنے ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں، مجھے اس کا خیال ہے۔

میں نے کہا: یاد دہانی سے میرا مطلب یہ تھا کہ ہمیں نقالی کے فن سے متعلق تصفیہ کرنا ہے کہ آیا شاعروں کو قصوں کے بیان کرنے میں نقل سے کام لینے کی اجازت ہونی چاہیے یا اس کو مطلق ممنوع قرار دینا چاہیے اور اگر اجازت دی جائے تو پوری آزادی ہو یا صرف جزوی۔ اور پھر اگر جزوی طور پر اجازت ہو تو کن اجزا کی تخصیص کی جائے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: آپ شاید یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہماری ریاست میں ناٹک کی دونوں قسموں یعنی المیہ اور طربیہ دونوں کی اجازت ہونی چاہیے یا نہیں؟

میں نے کہا: ہاں میں یہی پوچھنا چاہتا ہوں۔ لیکن ممکن ہے کوئی اور بات بھی اس سوال سے پیدا ہو جائے جس کا مجھے مطلق علم نہیں۔ ہم تو دلیل کے ساتھ ساتھ ہیں، جہاں لے چلے گی وہیں جائیں گے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: البتہ، جائیں گے۔

میں نے کہا: تو پھر بتایئے کہ ہمارے محافظوں کو نقال ہونا چاہیے یا نہیں؟ لیکن ہاں ہم تو اس بات کا فیصلہ اپنی گفتگو کی ابتدا ہی میں کر چکے ہیں جب ہم نے یہ طے کیا تھا کہ ایک آدمی صرف ایک کام کر سکتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص بہت سے کام کرنا چاہے گا تو وہ کسی میں بھی شہرت اور امتیاز حاصل نہیں کر سکتا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے پوچھا: یہی اصول نقالی پر لاگو ہوتا ہے۔ ایک آدمی ایک ہی چیز کی نقل اچھی طرح کر سکتا ہے۔ بہت سی چیزوں کی نہیں کر سکتا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔ ہرگز نہیں کر سکتا۔

میں نے کہا: تو اے ایڈیمنٹس! جب کوئی شخص نقالی کی دونوں قسموں یعنی المیہ اور طربیہ میں جو فنی لحاظ سے ایک دوسرے سے قریب ہیں ایک ساتھ مہارت نہیں پیدا کر سکتا تو پھر تم ہی فیصلہ کرو کہ یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ وہی شخص زندگی کے اہم مسئلوں کو بھی طے کرے اور وہی مختلف دوسری چیزوں کا نقال بھی ہو۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک ایک آدمی تو نقالی کی دونوں قسموں پر عبور نہیں رکھ سکتا۔

میں نے کہا: جیسے ایک ہی آدمی رجز خواں اور اچھا مسخرہ دونوں نہیں ہو سکتا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اے عزیز ایڈیمنٹس۔ انسانی فطرت کے سکے تو اس سے بھی چھوٹے ٹکڑوں سے بنائے گئے ہیں۔ اور جس طرح ایک آدمی بہت سے کام اچھی طرح انجام نہیں دے سکتا اسی طرح بہت سی چیزوں کی نقل بھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ نقل کیا ہے؟ ان حقیقی افعال کا ہی تو عکس ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اگر ہم اب تک اپنے ابتدائی خیال پر قائم ہیں کہ محافظوں کا کام بس یہ ہے کہ تمام امور

سے قطع تعلق کر کے ریاست میں آزادی کے قیام کو اپنا واحد مقصد قرار دیں، اسی کو اپنا ہنر بنائیں۔ اور کسی ایسے شغل میں نہ پڑیں جو اس مقصد کے حصول میں مددگار نہ ہو تو یہ نتیجہ بالکل بدیہی ہے کہ انھیں کسی دوسری چیز کی نقالی نہیں کرنی چاہیے۔ اور اگر وہ کسی کی نقل کریں بھی تو ایسے لوگوں کی جن کے مکارمِ اخلاق ان کے مقصد زندگی کے لیے موزوں اور اس کے شایانِ شان ہوں، مثلاً شجاع، متقی، مقدس اور حریت پسند افراد کی۔ اور انھیں کبھی بھی کسی بخیل یا کمینے آدمی کی نقل میں ماہر نہیں ہونا چاہیے کہ کہیں نقل کرتے کرتے وہ مطابق بہ اصل نہ ہو جائیں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ اگر کوئی شخص زندگی میں شروع سے کسی چیز کی نقل کرنا شروع کر دیتا ہے اور عرصے تک اسے جاری رکھتا ہے تو اسے اس کی عادت سی پڑ جاتی ہے اور یہ فطرتِ ثانیہ بن کر جوارح، آواز، دماغ، سب کو متاثر کر دیتی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: ہمارا فرض ہے کہ ان لوگوں کو، جو ہمارے زیرِ تربیت ہیں اور جنھیں نیک انسان بنانا ہمارا مقصد ہے، ہرگز کسی عورت کی نقل نہیں کرنے دیں جو اپنے شوہر سے جھگڑتی ہو یا اپنی خوشحالی اور آرام و آسائش کے گھمنڈ پر دیوتاؤں تک سے مقابلہ کرنے اور ان کے روبرو تفاخر پر آمادہ ہو، یا کسی مصیبت میں روتی پیٹتی ہو اور خاص کر ایسی حالت میں جب کہ وہ بیمار ہو، زچہ ہو یا کسی پر عاشق ہو گئی ہو!

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک۔ ہرگز اس کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔

میں نے کہا: نہ ان لوگوں کو لونڈیوں، غلاموں کا روپ دھارنا چاہیے اور نہ کسی قسم کے غلامانہ فعل کرنے چاہئیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: اور یقیناً انھیں بزدل اور ایسے بدکردار آدمیوں کی نقل بھی نہیں کرنی چاہیے جو ہماری تلقین کے خلاف عامل ہوں یعنی جو نشے میں مدہوش ہو کر یا ہوش و حواس میں رہ کر ایک دوسرے کی ہنسی اڑائیں، یا کوسیں اور گالیاں دیں، یا جو خود اپنی ذلت یا اپنے ہمسایوں کے خلاف اپنے قول یا فعل سے گناہ کے مرتکب ہوتے ہوں۔ اسی طرح محافظوں کو ایسے مردوں اور عورتوں کے قول و فعل کی نقل کرنا نہیں سکھانا چاہیے جو جنون میں مبتلا ہوں، کیونکہ بدی اور شر کی طرح جنون بھی جاننے پہچاننے کی چیز ہے عمل پیرا ہونے اور نقل کرنے کی چیز نہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: نہ انھیں سناروں، لوہاروں، ملاحوں یا دوسرے اہل حرفہ کی نقل کرنی چاہیے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ہاں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ان فنون کی طرف توجہ کرنے کی تو انھیں اجازت ہی نہیں ہے۔

میں نے کہا: اور اسی طرح گھوڑوں کے ہنہنانے، بیلوں کے ڈکارنے، دریا کے بہنے کی دھیمی آواز، اور سمندری موجوں کے تھپیڑوں کے ڈراؤنے شور یا بجلی کی کڑک یا اسی قسم کی اور چیزوں کی نقل بھی ان لوگوں کو نہیں کرنی چاہیے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یہ تو مجنونوں کے کام ہیں اور اگر جنون اور پاگل پن منع ہے تو یہ بھی منع ہونے چاہئیں۔

میں نے کہا: اگر میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں تو غالباً آپ کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کے کہنے میں ایک اچھا شخص بس ایک ہی طرز بیان اختیار کر سکتا ہے، اور اس کے علاوہ دوسری طرز صرف وہی لوگ روا رکھیں گے جو اس نیک شخص کی باعتبار تعلیم و تربیت بالکل ضد ہوں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یہ دو طرز کون سی ہیں؟

میں نے کہا: فرض کرو کہ ایک نیک اور عادل آدمی کوئی چیز بیان کرتے کرتے کسی دوسرے نیک انسان کے عمل یا قول پر پہنچا، تو میرا گمان ہے کہ وہ اس کا روپ اختیار کرنا چاہے گا اور اس نقل سے ذرا نہیں شرمائے گا، مثلاً جب یہ دوسرا شخص مضبوطی اور دانش مندی سے کوئی کام کر رہا ہے تو یہ قائل نہایت خوشی سے اس کی قائم مقامی کرنا چاہے گا۔ لیکن اگر یہ نیک شخص بیمار ہے یا عشق میں مبتلا ہے، یا نشے میں چور ہے، تو یہ قائل ذرا مشکل سے ہی اس کی نقالی پر آمادہ ہوگا، اور اگر کہیں کسی ایسے اخلاق کا ذکر ہے جو اس کے شایان شان نہیں، تو اسے تو وہ دیکھنے تک کا روادار نہ ہوگا۔ ایسے شخص کو حقارت کی نظر سے دیکھے گا اور اگر کبھی اس کی نقل کرے بھی تو صرف ان لمحوں کی جب اس سے کوئی نیک کام انجام پا رہا ہو۔ ورنہ ان افعال کی نقل سے تو وہ سخت شرمندہ ہوگا، جو اس سے کبھی سرزد نہیں ہوئے۔ نہ وہ نیچے قسم کے لوگوں کی سی سج دھج اختیار کرے گا کہ ان تدابیر کے استعمال سے (سوائے مزاح کے) وہ اپنے کو بہت بلند پاتا ہے اور اس کا دماغ ان سے آپ ہی آپ نفرت کرتا ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔

میں نے کہا: گویا وہ ایسا طرز بیان اختیار کرے گا جیسا کہ ہومر کے کلام سے ہم نے مثال کے طور پر پیش کیا تھا۔ یعنی اس کے طریقۂ ادا میں خالص بیان اور نقل دونوں کی ملاوٹ ہوگی، پہلا زیادہ ہوگا اور دوسرا کم۔ کیوں، آپ متفق ہیں؟

ایڈیمنٹس نے جواب دیا: یقیناً۔ یہی نمونہ تو ہے جو ایسے مقرر کو اختیار کرنا چاہیے۔

میں نے کہا: لیکن ایک اور قسم کے لوگ بھی تو ہوتے ہیں جو ہر طرح کی چیز بیان کر سکتے ہیں۔ یہ جتنے برے ہوتے ہیں اتنے ہی بے جھجک اور بے لگام بھی ہوتے ہیں۔ ان کے لیے سب کچھ اچھا ہوتا ہے۔ یہ ہر چیز کی نقل کے لیے تیار رہتے ہیں اور خالی ہنسی میں نہیں بلکہ صدق دل سے، اور اس پر طرہ یہ کہ بڑے سے بڑے مجمع کے سامنے۔ میں نے جیسے پہلے ذکر کیا تھا، اس قسم کا آدمی بجلی کی طرح کڑکنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ طوفان آب و باد کا شور، پہیوں اور چرخیوں کی گھڑ گھڑاہٹ، اور ڈھول، بانسری یا کسی اور آلۂ موسیقی کی ترنم ریزی، غرض کہ ان سب کی نقالی کی کوشش اس سے ممکن ہے، وہ کتے کی طرح بھونک سکتا ہے، بھیڑ کی طرح ممیا سکتا ہے اور مرغ کی طرح بانگ دے سکتا ہے۔ اس کا تمام تر ہنر آواز اور اشاروں کی نقالی میں صرف ہوتا ہے، اور اس کے طرزِ ادا میں خالص بیان کو بہت کم جگہ ملتی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک ایسے لوگوں کا تو یہی طریقہ ہوگا۔

میں نے کہا: تو گویا دو قسم کے طرز بیان یہ ہوئے؟

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور تم مجھ سے اتفاق کرو گے کہ ان طرزوں میں ایک سادہ ہے جس میں بہت اُتار چڑھاؤ نہیں ہوتا۔ اور اگر وزن اور بحر بھی اسی سادگی کا لحاظ کر کے اختیار کی جائیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر بولنے والا صحیح طور پر اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھے تو اس کے طرز بیان میں کم و بیش یکسانیت قائم رہے گی۔ وہ ایک ہی وزن قائم رکھے گا (کیونکہ تبدیلیوں کی ضرورت ہی نہیں) اور غالباً بحر بھی شروع سے آخر تک ایک ہی استعمال کرے گا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بالکل درست۔

میں نے کہا: لیکن دوسرے طرز بیان میں طرح طرح کے اوزان اور مختلف قسم کی بحروں کی ضرورت پڑے گی۔ طریقہ بیان میں چونکہ ہر طرح کی تبدیلی ہوتی رہے گی اس لیے اگر موسیقی اور طرز بیان میں مطابقت

رکھی ہو تو وزن اور بحر کا بدلنا بھی لازمی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یہ بھی بجا ارشاد ہے۔

میں نے کہا: اور کیا یہ دو طرز بیان یا ان کی باہمی آمیزش ہر قسم کے شعر اور لفظوں کے ذریعے اظہار خیال کی تمام شکلوں پر حاوی نہیں؟ جب کبھی بھی کوئی شخص کچھ کہتا ہے تو یا تو ان دو طریقوں میں سے کوئی ایک اختیار کرتا ہے یا پھر دونوں کو ملا کر اپنا کام نکالتا ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک، یہ سب پر حاوی ہیں۔

میں نے کہا: تو پھر ہم اپنی ریاست میں یہ تینوں طریقے رائج کر لیں یا دو بے میل طریقوں میں سے صرف ایک کو چن لیں یا اس کے ساتھ ملاوٹ والے کو بھی شامل کر لیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میں تو صرف اچھائی اور خوبی کی نقالی کو جگہ دینا چاہتا ہوں۔

میں نے پوچھا: ہاں، لیکن باہمی آمیزش سے جو طرز پیدا ہوتی ہے وہ بھی تو نہایت دل پذیر ہے۔ اور یوں تو وہ طرز بچوں، ان کے کھلانے والوں، بلکہ عام طور پر تمام دنیا میں سب سے زیادہ مقبول ہے جو تمھاری منتخب کی ہوئی طرز کی ضد ہے اور جس میں منہ سے کچھ کہے بغیر اشاروں اور حرکتوں سے اپنا مطلب ظاہر کیا جاتا ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میں اس سے انکار نہیں کرتا۔

میں نے کہا: لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ تم یہ دلیل دو گے کہ یہ طرز ہماری ریاست کے لیے موزوں نہیں۔ کیونکہ اس ریاست میں تو فطرت انسانی دو رخی یا چند رخی ہوتی ہی نہیں، یہاں تو ایک آدمی بس ایک ہی کام کرتا ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔ اسی لیے تو یہ طرز، نہایت ہی غیر موزوں ہے۔

میں نے کہا: اور یہی وجہ ہے کہ ہماری ریاست میں، اور صرف ہماری ہی ریاست میں، تم چمار کو چمار ہی پاؤ گے، ناخدائی کرتے نہ دیکھو گے۔ کسان کو کسان کے کام میں ہی مشغول دیکھو گے، منصف کا فرض ادا کرتے نہ پاؤ گے۔ سپاہی بس سپاہی ہوگا، ساتھ ساتھ تاجر بھی نہیں ہوا گا۔ وقس علی ہذا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: سچ ہے۔

میں نے کہا: چنانچہ اگر کبھی ان لوگوں میں سے جو ہر چیز کی نقالی کمال ہنرمندی کے ساتھ کرتے

ہیں، کوئی صاحب ہماری ریاست میں آجائیں اور اپنی شاعری اور ہنرمندی کی نمائش کرنا چاہیں تو ہم بے شک ان کی بڑی تعظیم کریں گے اور بحیثیت ایک دلکش، مقدس، اور حیرت انگیز ہستی کے ان کی پرستش تک کر ڈالیں گے۔ لیکن ساتھ ہی انھیں یہ بھی جتا دیں گے کہ ہماری ریاست میں ان جیسے لوگوں کا رہنا منع ہے اور قانون ان کے یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ان کے جسم پر خوشبودار ابٹن مل کر اور ان کے سر پر اُون کا ایک ہار پہنا کر ہم ان بزرگ کو کسی دوسرے شہر کو چلتا کر دیں گے۔ کیونکہ اپنی روح کی صحت کے لیے ہم زیادہ سخت اور کھرے سے شاعر اور افسانہ گو چاہتے ہیں جو صرف نیک لوگوں کی نقل کریں اور صرف انھی نمونوں کی پیروی کریں جن کا ذکر ہم سپاہیوں کی تعلیم کے سلسلہ میں کر چکے ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: قدرت شرط ہے۔ خدا نے چاہا تو ضرور ایسا کریں گے۔

میں نے کہا: عزیز من، اب سمجھو کہ موسیقی یا ادبی تعلیم کا وہ حصہ جو قصوں اور افسانہ گوئی سے متعلق ہے وہ تو ختم ہوا۔ کیونکہ ان کے موضوع اور طرز بیان دونوں پر ہم بحث کر چکے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔

میں نے کہا: اس کے بعد نغمے اور راگ کا نمبر آتا ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: اگر ہم اپنی پچھلی باتوں کے پابند ہوں تو ہر کوئی بتا سکتا ہے کہ اس بارے میں ہم کیا کہیں گے۔

گلوکون ہنس کر بولے کہ اس آپ کے "ہر کوئی" میں تو میں مشکل ہی سے آتا ہوں۔ کیونکہ میں تو آپ کو فوراً بے سوچے سمجھے نہیں بتا سکتا کہ ان کے متعلق کیا فیصلہ ہونا چاہیے۔ ہاں کچھ یونہی انکل سے کام لے سکتا ہوں۔

میں نے کہا: خیر۔ آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ گیت یا ترنم میں تین حصے ہوتے ہیں، بول، آہنگ، اور وزن۔ یہ تو میں فرض کیے لیتا ہوں کہ آپ اتنا جانتے ہیں۔

گلوکون نے کہا: ہاں۔ اتنا علم تو آپ فرض کر سکتے ہیں۔

میں نے کہا: جہاں تک لفظوں کا تعلق ہے تو اس بارے میں تو ان بولوں میں جو موسیقی کے لیے لکھے جائیں اور ان میں جو موسیقی کے لیے نہ ہوں یقیناً کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔ دونوں ایک ہی قانون کے تابع

ہوں گے اور یہ قانون پہلے ہی مقرر کیے جا چکے ہیں۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: رہے آہنگ اور وزن، تو ان کا انحصار لفظوں پر ہے۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: شعر کے مطالب اور موضوع پر بحث کرتے ہوئے ہم نے کہا تھا کہ ہمیں نوحوں اور غم کے ترانوں کی ضرورت نہیں ہے۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: ہاں تو وہ کون سے آہنگ ہیں جن سے غم ظاہر ہوتا ہے۔ آپ موسیقی سے واقف ہیں اس لیے بتا سکتے ہیں۔

گلوکون نے کہا: آپ کا اشارہ جن آہنگوں کی طرف ہے وہ مخلوط لیڈیائی یا کامل لیڈیائی یا ان ہی جیسے آہنگ ہیں۔

میں نے کہا: تو پھر انھیں اپنے یہاں سے خارج کرنا چاہیے۔ کیونکہ مردوں کا تو ذکر ہی کیا، یہ آہنگ تو ان عورتوں کے لیے بھی بے کار ہیں جو اپنی سیرت کی خوبیوں کو برقرار رکھنا چاہتی ہیں۔

گلوکون نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: اس کے علاوہ بدمستی، نزاکت، یاسستی اور کاہلی بھی ہمارے محافظوں کے اخلاق کے شایاں نہیں۔

گلوکون نے کہا: بالکل شایاں نہیں۔

میں نے کہا: اور نزاکت اور بدمستی کے آہنگ کون سے ہیں؟

گلوکون نے جواب دیا: آیونی (Ionian) اور لیڈیائی آہنگ انھیں ''ڈھیلے'' آہنگ بھی کہتے ہیں۔

میں نے کہا: کیا ان کا کوئی فوجی استعمال نہیں ہو سکتا؟

گلوکون نے کہا: جی نہیں۔ یہ تو اس مقصد کے بالکل برعکس ہیں۔ ان آہنگوں کو خارج کر دینے کے بعد بس اب ڈوری (Dorian) اور فرائجی (Phrygian) آہنگ باقی رہ گئے۔

میں نے جواب دیا کہ: میں تو ان آہنگوں سے بالکل واقف نہیں۔ لیکن ہاں میں ایک جنگی آہنگ

ضرور چاہتا ہوں، جو اس انداز اور لہجے کی ترجمانی کر سکے جو ایک بہادر انسان سے خطرے کی حالت میں مضبوط عزم کرتے وقت ظاہر ہوتا ہے یا اس وقت جب اس کا مقصد فوت ہو رہا ہو اور ناکامی کے آثار نمایاں ہوں، اس کے جسم پر پے در پے کاری زخم لگ رہے ہوں، موت کا سامنا ہو، یا کوئی اور سخت مصیبت درپیش، اور وہ حوادث کی طوفانی موجوں کے ہر تھپیڑے کو پامردی اور استقلال کے ساتھ برداشت کرنا چاہے۔ اس کے علاوہ ایک اور آہنگ بھی مجھے درکار ہے جو آزادی اور امن کے وقت آدمی کے کام آ سکے، جب ضرورت اور احتیاج کا دباؤ نہ ہو اور وہ اپنے خدا کو دعا سے راضی کر رہا ہو یا انسانوں کو ترغیب اور ترہیب سے یا اس کے برعکس جب ترغیب اور ترہیب کی وجہ سے وہ خود کسی بات کے ماننے پر آمادگی ظاہر کرتا ہو۔ یا ایسا آہنگ جو اس حالت کی ترجمانی کر سکے جب ایک شخص دانش مندی سے اپنا مقصد حاصل کر لیتا ہے اور اپنی کامیابی پر آپے سے باہر نہیں ہو جاتا بلکہ اسے برداشت کر کے اعتدال و دانش مندی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ بس آپ سے مجھے یہی دو آہنگ درکار ہیں۔ یعنی ضرورت کی اور آزادی کی لَے، خوش قسمتی کی لَے اور بدنصیبی کی، ہمت و شجاعت کی لَے اور عفت و اعتدال کی۔ بس یہ میرے لیے چھوڑ دیجیے، باقی مجھے درکار نہیں۔

اس نے جواب دیا: اور یہ دو بس وہی ڈوری اور فرائجی آہنگ ہیں جن کا میں نے ذکر کیا۔

میں نے کہا: تو ہمارے نغموں میں بس یہی دو آہنگ استعمال ہوں گے۔ لہٰذا ہمیں نہ بہت سے مختلف آہنگوں کی ضرورت پڑے گی نہ چند آہنگی سرگم کی۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں میں سمجھتا ہوں نہ ہوگی۔

میں نے کہا: گویا ہمیں اس پیچیدہ تکونے بربط بنانے والوں کی ضرورت نہ پڑے گی اور نہ ہمیں کئی تاروالے عجیب وغریب آلاتِ موسیقی کے بنانے والے درکار ہوں گے۔

گلوکون نے کہا: جی نہیں۔

میں نے کہا: اور بانسری یا نَے بنانے اور بجانے والوں کے متعلق کیا رائے ہے؟ مختلف مقاماتِ موسیقی کی باہم آمیزش کے اعتبار سے تو نَے ایک طرف اور تمام تاروالے آلے ایک طرف۔ چند آہنگی موسیقی بھی اسی کی نقالی ہے۔ پھر کیا اسے ریاست میں آنے دیا جائے؟

اس نے جواب دیا: ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: اس طرح شہر والوں کے لیے بس بربط اور ستار رہ جاتے ہیں۔ گانوں میں چرواہے

بانسری رکھ سکتے ہیں۔

گلوکون نے کہا: اس دلیل سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے۔

میں نے کہا: بہر حال اگر اپالو اور اس کے آلاتِ موسیقی کو مارسیاس (Marsias) اور اس کے آلات پر ترجیح دی گئی تو کوئی اچنبھے کی بات تو نہیں۔

گلوکون نے کہا: ہاں اس میں بھلا کیا تعجب!

میں نے کہا: کلب مصری (ابوالہول) کی قسم تھوڑی دیر پہلے جس ریاست کو عیش طلب اور آرام پسند کہا تھا اب تک تو بلا ارادہ ہم اسے پاک صاف ہی کرتے چلے گئے۔

اس نے جواب دیا: جی ہاں۔ ہم نے بہت ٹھیک کیا۔

میں نے کہا: تو آؤ اس صفائی کو پورا ہی کر دیں۔ آہنگوں کے بعد قدرتاً وزن کا سوال آتا ہے۔ میری رائے میں تو یہ بھی انہی قاعدوں کے پابند ہوں تو ٹھیک ہوگا کیونکہ ہر قسم کے مخلوط اوزان کی تلاش تو بے سود ہے۔ ہمیں وہ وزن دریافت کر لینے چاہئیں جو ایک متوازن اور شجاع زندگی کی ترجمانی کر سکیں اور جب یہ معلوم ہو گئے تو پھر تال اور سُر تو بولوں سے مطابق کیے جائیں گے نہ کہ بول تال اور سُر کے۔ یہ اوزان کون کون سے ہوں یہ آپ بتائیے۔ آہنگوں کی طرح ان کا سبق بھی آپ ہی کو دینا ہوگا۔

اس نے جواب دیا: لیکن سچ یہ ہے کہ میں تو کچھ نہیں بتا سکتا۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ جیسے چار پردوں سے سب آہنگ بن جاتے ہیں، اسی طرح وزن کے بھی تین اصول ہیں جن سے تمام بحریں بنائی جاتی ہیں۔ میرا علم بس اس قدر ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ کس قسم کی زندگی کی نقل ہیں سو اس کا جواب دینے سے بندہ قاصر ہے۔

میں نے کہا: اچھا تو آؤ ڈیمون (Damon) کو اپنے مشورے میں شریک کر لیں۔ اس سے پتا چل جائے گا کہ کون سے اوزان کم ظرفی، گستاخی، غصے یا دوسرے عیبوں کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے خلاف محاسن کے اظہار کے لیے کون سی بحریں مناسب ہیں۔ مجھے کچھ یونہی سا یاد پڑتا ہے کہ اس نے ایک پیچیدہ کریٹی (Cretic) بحر کا ذکر کیا ہے اور ایک بہادری کی بحر کا۔ اور ان کو اس نے کچھ خاص ترتیب سے رکھا تھا جو میں نہیں سمجھ سکا۔ بحر کو مصرع کے ٹکڑوں کے اتار چڑھاؤ کے اعتبار سے مساوی کر دیا تھا جس میں طویل کے بعد قصیر اور قصیر کے بعد طویل رکن آتا تھا۔ اور اگر میں غلطی نہیں کرتا ہوں تو اس نے ایک ایامبی (Iambic) اور

ایک تروشائی (Trochic) بحر کا بھی ذکر کیا تھا اور ان میں صغیر وطویل کا تعین کر دیا تھا۔ اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ اگر بعض جگہ اس نے پوری بحر کی تعریف یا تنقیص کی تھی تو کہیں مختلف ارکان کی روانی کو بھی اس کا مورد قرار دیا تھا۔ بہر حال بہتر ہے کہ یہ سب باتیں ڈیموں ہی پر چھوڑ دی جائیں۔ کیونکہ خود ہمارے لیے تو اس موضوع کا تجزیہ بہت ہی دشوار ہے۔

اس نے کہا: ہاں، ہے تو۔

میں نے کہا: لیکن اس بات کے سمجھنے میں تو کوئی دشواری نہیں کہ حسن وخوبی کا وجود یا عدم اچھی یا بری بحر کا لازمی نتیجہ ہے۔

گلوکون نے کہا: اس میں کیا شبہ ہے۔

میں نے کہا: اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ اچھے اوزان، اچھے اندازِ بیان کے ساتھ کھپتے ہیں اور برے، برے انداز کے ساتھ۔ اسی طرح وزن اور آہنگ موسیقی کے حسن وقبح کے بھی تابع ہیں۔ کیونکہ ہم نے یہ تو اصولاً مان ہی لیا ہے کہ وزن اور آہنگ بولوں کے پابند ہیں نہ کہ بول ان کے۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔ انھیں لفظوں کا پابند ہونا چاہیے۔

میں نے کہا: اور کیا لفظوں اور اندازِ بیان کا انحصار روح کی کیفیت پر نہ ہوگا؟

گلوکون نے جواب دیا: یقیناً ہوگا۔

میں نے کہا: اور باقی تمام چیزیں اندازِ بیان پر منحصر ہوں گی؟

گلوکون نے جواب دیا: جی ہاں۔

میں نے کہا: گویا اندازِ بیان اور آہنگِ نغمہ، حسنِ کلام اور خوبیٔ اوزان سب کے سب سادگی پر مبنی ہیں۔ سادگی سے میرا مطلب ایک صحیح طور پر مرتب دماغ اور اخلاق کی حقیقی سادگی سے ہے نہ اس سادگی سے جو بے وقوفی کا دوسرا نام ہے۔

گلوکون نے کہا: سچ ہے۔

میں نے کہا: اگر ہمارے نوجوانوں کو اپنی زندگی کا حقیقی مقصد پورا کرنا ہے تو کیا انھیں ہمیشہ اس حسن اور تناسب کو اپنا مقصد نہ قرار دینا چاہیے؟

گلوکون نے کہا: بلا شبہ چاہیے۔

میں نے کہا: اور سچ تو یہ ہے کہ فن مصوری بلکہ سب دوسرے تخلیقی فن اس سے لبریز ہیں، مثلاً فن تعمیر پارچہ بافی، سوزن کاری اور دوسری تمام چیزوں کی تیاری۔ یہی نہیں بلکہ قدرت کی تمام حیوانی یا نباتی کائنات میں یہ حسن یا اس کا عدم پایا جاتا ہے اور بدصورتی اور عدم تناسب یا حرکات غیر مرتبہ، برے لفظ اور بری فطرت سے اسی طرح وابستہ ہیں جیسے حسن اور تناسب، نیکی اور خوبی کی دو بہنیں ہیں اور ان سے مشابہ۔

گلوکون نے جواب دیا: بالکل سچ ہے۔

میں نے کہا: اچھا کیا ہماری نگرانی بس یہاں ختم ہو جائے؟ اور کیا ہمارا یہ مطالبہ صرف شاعروں سے ہوگا کہ وہ اپنے کلام میں صرف نیکی اور خیر کا جلوہ دکھائیں، نہیں تو ہم انھیں ریاست سے خارج کر دیں گے! یا اس نگرانی کو دوسرے فن کاروں پر بھی عائد کیا جائے گا اور کیا ان کے لیے بھی سنگ تراشی، تعمیر، یا دوسرے تخلیقی فنون میں خیر و نیکی کی ضد شر، بے اعتدالی، عدم عفت، کم ظرفی اور بدقماشی کے اظہار کو ممنوع قرار دیا جائے گا؟ اور اگر انھوں نے اس قاعدے کی پابندی نہ کی تو ہم انھیں اپنی ریاست میں کام نہیں کرنے دیں گے کہ کہیں ہمارے شہریوں کا مذاق آلودہ نہ ہو جائے؟ ہم ہرگز اخلاقی عیبوں کی فضا میں اپنے محافظوں کی نشو و نما کے روادار نہیں ہو سکتے کہ اس کی مثال تو ایسی ہی ہوگی کہ ہم نے ان جانداروں کو ایسی زہریلی چراگاہ میں چھوڑ دیا ہے جہاں وہ روزانہ کچھ نہ کچھ مضر اور زہریلی بوٹیاں کھاتے رہیں اور رفتہ رفتہ اپنی روح کی آلودگی کے لیے گندگی کا کافی مؤثر ذخیرہ فراہم کر لیں۔ ہمارے فن کار تو وہ لوگ ہونے چاہئیں جو حسن و جمال کی اصلی حقیقت کو دیکھ سکیں اور یہ صورت اسی وقت ممکن ہوگی کہ ہمارے نوجوان صحت اور تندرستی کی زمین پر آباد ہوں، دیکھیں تو جمال کا نظارہ کریں۔ اور سنیں تو کانوں تک حسن کا ہی ترانہ آئے۔ وہ ہر چیز کی خوبی سے متمتع ہوں اور حسن و جمال کی فراوانی ان کے سامعہ و باصرہ کو اس طرح متاثر کرے کہ گویا کسی پاک تر عالم سے صحت افزا نسیم کے جھونکے آ رہے ہیں تاکہ ابتدائی عمر سے ہی ایک غیر محسوس طور پر ان کی روح میں جمال عقل کے ساتھ مماثلت اور ہم نوائی پیدا ہو جائے۔

گلوکون نے کہا: اس سے بہتر اور کون سی تعلیم ہو سکتی ہے؟

میں نے کہا: یہی وجہ تو ہے، گلوکون کہ موسیقی کی تعلیم دوسری تمام تعلیموں سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے، کیونکہ آپ کے یہ وزن اور آہنگ، یہ توازن اور تناسب روح کے اندر تک اپنی راہ نکال لیتے ہیں اور مؤثر طور سے اس پر اپنا تصرف کر لیتے ہیں۔ پھر جس کی تعلیم صحیح ہوتی ہے اس کی روح کو حسن و جمال کا تحفہ دیتے ہیں،

اور جو روح بری تعلیم پاتی ہے، بدہیئت اور کریہہ بن جاتی ہے۔اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ جس شخص نے وجود داخلی (روح) کو صحیح تعلیم نصیب ہوئی ہو وہ نہایت ذکاوت کے ساتھ کارخانۂ قدرت یا فنون کی غلطیوں اور فروگزاشتوں کو محسوس کرے گا۔اور جہاں ایک طرف اپنے صحیح ذوق کے باعث اپنی روح کو محاسن و مکارم سے بہرہ یاب کر کے اس کی تعریف اور توصیف کرے گا اور اس سے لطف اندوز ہوگا تو اس کے ساتھ ساتھ دوسری طرف معائب اور مخارب کی مذمت بھی کرے گا اور ان سے نفور ہوگا۔اور یہ سب کچھ ایسی کم سنی کے عالم میں کہ وہ اس تعریف یا مذمت کے وجوہ تک نہ بیان کر سکے گا لیکن جب اسے عقل و شعور آئے گا تو اپنے اس دیرینہ دوست کو پہچان کر اس کا خیر مقدم کرے گا جس سے اس کی تعلیم نے اسے عرصے سے مانوس کر رکھا تھا۔

اس نے کہا: میں آپ سے اس بارے میں پورا اتفاق کرتا ہوں کہ ہمارے نوجوانوں کو موسیقی کی تعلیم دینی چاہیے اور ان ہی اصول پر جو آپ نے بیان فرمائے۔

میں نے کہا: جب ہم کسی زبان کی عبارت پڑھنا سیکھتے ہیں تو ہمیں اطمینان اسی وقت ہوتا ہے کہ اس کے تمام حروف تہجی سے (جو تھوڑے ہی ہوتے ہیں) واقف ہو جائیں۔البتہ اس طرح کہ ان کی تمام ممکن شکلوں سے خواہ بڑی ہوں یا چھوٹی اور ان کی تمام مختلف ترتیبوں سے آشنا ہو جائیں۔اور خواہ یہ حروف کم جگہ گھیریں یا زیادہ، ہم انھیں بے اعتنائی سے نہ دیکھیں بلکہ ہر موقع پر ان کو پہچاننے کی کوشش کریں اور عبارت پڑھنے میں اس وقت تک اپنے کو پورا ماہر تصور نہ کریں جب تک کہ ان حروف کو ہر جگہ بآسانی نہ پہچان لیا کریں۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔بالکل ٹھیک۔

میں نے کہا: یا جس طرح ہم پانی یا آئینہ میں حرف کے عکس کو اسی وقت پہچان سکتے ہیں جب پہلے خود حروف سے آشنا ہوں کیونکہ ایک ہی فن اور ایک ہی مطالعے سے ان دونوں کا علم ممکن ہے۔

گلوکون نے کہا: جی۔درست۔

میں نے کہا: اسی طرح میرا خیال ہے کہ ان محافظوں کی طبیعتوں میں جن کی تعلیم ہمارے سپرد ہے کبھی موسیقی اور تناسب پیدا نہیں ہو سکتا جب تک وہ عفت اور اعتدال، شجاعت، جود و سخا، شان و شوکت وغیرہ اور ان کی اضداد کی ضروری شکلوں سے واقف نہ ہوں۔اور ان کے پرتو کو ہر جگہ اور ہر ترتیب میں پہچان نہ سکیں۔اور خواہ یہ بڑی چیزوں میں رونما ہوں یا چھوٹی میں، ہم ان کی طرف سے بے اعتنائی نہ کریں بلکہ انھیں

ایک ہی فن اور علم کا موضوع بحث خیال کریں۔

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نہ کہا: اور جب ایک جمیل روح کی مناسبت ایک حسین جسم کے ساتھ پیدا ہو جائے اور دونوں ایک ہی قالب میں ڈھال دیے جائیں تو صاحب بصیرت کے لیے یہ سب سے زیادہ نظر فریب نظارہ ہوگا۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔ اس سے زیادہ حسین اور کیا چیز ہوگی۔

میں نے کہا: اور جو حسین تر ہے وہی محبوب تر بھی ہوگا۔

گلوکون نے کہا: بے شک آپ یہ فرض کر سکتے ہیں۔

میں نے کہا: اور جس شخص کے اندر روح کا تناسب موجود ہے وہ تو محبوب تر چیز سے ہی سب سے زیادہ محبت کرے گا۔ ایک غیر مرتب وغیر متناسب روح کو تو وہ ہرگز عزیز نہیں رکھ سکتا۔

گلوکون نے کہا: یہ سچ ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ نقص روح میں پایا جائے ورنہ اگر صرف کوئی جسمانی عیب ہے تو اسے یہ گوارا کرلے گا اور اس کے باوجود اسے محبوب رکھ سکتا ہے۔

میں نے کہا: میں سمجھا۔ آپ کو شاید اس قسم کا تجربہ ہے۔ اور میں آپ سے متفق ہوں۔ لیکن میں ذرا ایک سوال اور کرلوں یعنی کیا مسرت وحظ کی زیادتی کو عفت اور اعتدال سے کوئی تعلق ومناسبت ہے؟

گلوکون نے کہا: یہ کیسے ممکن ہے؟ مسرت اور شادمانی اسی طرح انسان کو اپنی صلاحیتوں کے استعمال سے قاصر کر دیتی ہے جس طرح غم اور کرب۔

میں نے کہا: اور کیا اسے عام طور پر نیکی سے کوئی مناسبت ہو سکتی ہے؟

گلوکون نے کہا: کچھ نہیں۔

میں نے کہا: اور کوئی مناسبت اسے بے اعتدالی اور سفاہت سے ہے؟

گلوکون نے کہا: بے شک۔ بہت زیادہ۔

میں نے کہا: کیا شہوانی محبت سے زیادہ قوی کوئی اور حظ یا مسرت ہے؟

گلوکون نے کہا: نہیں۔ نہ اس سے زیادہ مجنونانہ۔

میں نے کہا: حالانکہ حقیقی محبت تو حسن اور نظام کی محبت ہے جس میں اعتدال پسندی اور عفت بھی ہو اور باہمی تناسب بھی۔

گلوکون نے کہا: بالکل صحیح۔

میں نے کہا: لہٰذا حقیقی محبت کے پاس تو بے عفتی اور جنون کو پھٹکنا بھی نہیں چاہیے۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: چنانچہ عاشق اور معشوق دونوں کو جنون اور بے عفتی سے کچھ سروکار نہ ہونا چاہیے۔ اگر ان کی محبت صحیح قسم کی محبت ہے تو طرفین میں سے کسی کو ان جذبات سے کوئی واسطہ نہیں ہوسکتا۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔ ان جذبات کو تو ان کے پاس بھی نہیں آنا چاہیے۔

میں نے کہا: لہٰذا ہم جس شہر کی بنیاد رکھ رہے ہیں تم اس کے لیے یہ قانون مقرر کردو گے کہ ایک دوست اپنے محبوب کے ساتھ بس اتنی ہی بے تکلفی برتے جیسی اپنے بیٹے سے برتتا ہے اور یہ بھی نیک نیتی کے ساتھ اور اس کی اجازت سے۔ تمام شخصی تعلقات میں اسے اس قاعدے کا پابند ہونا چاہیے اور کبھی اس سے آگے قدم نہیں بڑھانا چاہیے۔ اور اگر وہ کبھی اس سے تجاوز کرے تو بدمذاقی اور ناشائستگی کے جرم کا مرتکب متصور ہو۔

گلوکون نے جواب دیا: میں آپ سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں۔

میں نے پوچھا: بس۔ موسیقی کے متعلق تو اتنا کافی ہے۔ اس بحث کا خاتمہ بھی خوب ہوا۔ کیونکہ موسیقی کا اصلی مقصد اگر حسن و جمال کی محبت نہ ہو تو اور کیا ہو؟

گلوکون نے جواب دیا: میں اس سے متفق ہوں۔

میں نے کہا: موسیقی کے بعد جسمانی ورزش کا نمبر آتا ہے کہ بچوں کو اب یہ سکھانی ہے۔

گلوکون نے جواب دیا: جی ہاں۔

میں نے کہا: موسیقی کی طرح ورزش کی تعلیم بھی اوائل عمر ہی میں شروع ہونی چاہیے۔ اس کی تعلیم پر بہت توجہ کی ضرورت ہے اور اسے تمام عمر جاری رکھنا ہے۔ میرا تو عقیدہ ہے، اور میں اس بارے میں آپ سے اپنی رائے کی تصدیق چاہتا ہوں، لیکن بہرحال میرا عقیدہ ہے کہ جسم اپنی خوبی سے روح کو ترقی نہیں دیتا بلکہ اس کے برعکس ایک صالح روح اپنی خوبی سے حتی الامکان جسم کی ترقی کا باعث ہوتی ہے۔ کیوں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

گلوکون نے جواب دیا: جی ہاں۔ میں بھی آپ کا ہم خیال ہوں۔

میں نے کہا: اگر دماغ کی کافی تربیت ہو جائے تو ہم جائز طور پر جسم کی نگہداشت کا کام اس پر چھوڑ سکتے ہیں، چنانچہ غیر ضروری تفصیل سے بچنے کے لیے میں اب یہاں اس موضوع پر ایک اجمالی سا خاکہ پیش کرتا ہوں۔

گلوکون نے کہا: بہت خوب۔

میں نے کہا: یہ تو ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ ان لوگوں کو نشے کی چیزوں سے پرہیز کرنا ہوگا۔ اور ایک محافظ کے لیے از بس ضروری ہے کہ وہ کبھی نشے میں مدہوش اور دنیا اور مافیہا سے بے خبر نہ ہو جائے۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔ اور کیا۔ اگر خود محافظ کے لیے ایک اور نگران اور محافظ کی ضرورت ہو تو عجب ہنسی کی بات ہوگی۔

میں نے کہا: پھر ان کی غذا کی بابت کیا کہتے ہو؟ یہ خیال رہے کہ یہ لوگ بہت بڑے معرکے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ کیوں، ہے نا؟

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: کیا ہمارے معمولی ورزش کرنے والوں کی سی جسمانی حالت ان لوگوں کے لیے بھی ٹھیک ہوگی۔

گلوکون نے کہا: ہاں۔ کیوں نہیں۔

میں نے کہا: میرے خیال میں تو ان لوگوں کی جسمانی کیفیت اونگھتی، سوتی، اور غالباً صحت کے لیے مضر ہوتی ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ کسرتی لوگ ساری عمر بس سوتے سوتے ہی گنوا دیتے ہیں اور جہاں ذرا اپنے معمول سے ادھر ادھر ہٹے کہ شدید بیماری سے دست و گریبان ہونا پڑتا ہے۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔ یہ تو ضرور سچ ہے۔

میں نے کہا: اس لیے میری رائے میں ہمیں اپنے جنگجو ورزشی لوگوں کے لیے اس سے بہتر تربیت کا انتظام کرنا ہوگا۔ ان لوگوں کی حالت تو پاسبان کتوں کی سی ہونی چاہیے جن کے کان اور آنکھیں بہت تیز ہوں۔ جنگ کے دنوں میں آب و ہوا کی تبدیلی یا غذا کے تغیر کا ان پر کچھ اثر نہ ہو اور نہ گرمی کی سخت تپش، نہ سرما کی شدید سردی سے ان کی تندرستی کو کوئی گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

گلوکون نے کہا: میرا بھی یہی خیال ہے۔

میں نے کہا: واقعی اچھی جسمانی ورزش سچ پوچھو تو سادہ موسیقی کی جڑواں بہن ہے جس کا بیان ہم نے ابھی ابھی کیا تھا۔

گلوکون نے پوچھا: یہ کیسے؟

میں نے جواب دیا: یہ اس طرح کہ میرے نزدیک اس موسیقی کی طرح ورزش کی بھی ایک قسم ہے جو نہایت اچھی اور سادہ ہے۔ خصوصاً فوجی ورزش کی۔

گلوکون نے پوچھا: آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں نے کہا: تمہیں میرے مفہوم کا پتا ہومر سے چل جائے گا۔ دوران جنگ میں وہ اپنے سورماؤں کو دعوتوں تک میں سپاہیانہ کھانے کھلاتا ہے۔ مثلاً یہ لوگ ہیلسپونٹ (Hellespont) کے کنارے پر ہیں لیکن ان کے دستر خوان پر مچھلی ندارد، انھیں ابلا گوشت تک تو ملتا نہیں، بس آگ پر ذرا سینک کر کھا لیتے ہیں۔ اس لیے کہ سپاہیوں کے لیے یہی زیادہ ٹھیک ہے۔ ذرا سی آگ جلائی اور کام چلا لیا۔ دیگچی اور کڑھائی کا کھڑاگ ساتھ لیے پھرنے کی کچھ ضرورت نہیں۔

گلوکون نے کہا: سچ ہے۔

میں نے کہا: اور غالباً یہ کہنے میں مَیں غلطی نہیں کرتا کہ میٹھی چٹنیوں کا تو ہومر کے کلام میں کہیں ذکر ہی نہیں۔ لیکن انھیں ممنوع قرار دینے میں ہومر کچھ اکیلا نہیں ہے، یہ تو تمام پیشہ ور پہلوان خوب جانتے ہیں کہ اگر آدمی اچھی حالت میں رہنا چاہے تو ان چیزوں سے پرہیز لازمی ہے۔

گلوکون نے پوچھا: یہ جانتے ہیں تو پھر بالکل ٹھیک کرتے ہیں کہ ان چیزوں کا استعمال نہیں کرتے۔

میں نے کہا: بالفاظ دیگر آپ سیراکوز کی (Syracusan) دعوتوں اور سسلی کے (Scilian) لطیف اور مزیدار کھانوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔

گلوکون نے پوچھا: جی ہاں میری تو یہی رائے ہے۔

میں نے کہا: اور اگر یہ عمدہ جسمانی حالت قائم رکھنی ہے تو غالباً آپ یہ اجازت بھی نہیں دیں گے کہ یہ کارنتھی (Corinthian) کی کسی حسین دوشیزہ کو اپنا دوست بنائیں۔

گلوکون نے کہا: ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: اور نہ آپ غالباً ایتھنز کے حلوائیوں کی نفیس مٹھائیوں کو ہی پسند کریں گے۔

گلوکون نے کہا: کبھی نہیں۔

میں نے کہا: ان غذاؤں اور اس رہن سہن کے طریقے کی صحیح مثال اس نغمے کی سی ہے جو طرح طرح کے آہنگوں اور نہایت مختلف بحروں میں مرتب کیا گیا ہو۔

گلوکون نے کہا: بالکل۔

میں نے کہا: موسیقی میں تو اس پیچیدگی اور الجھاؤ سے بے راہ روی اور بد مذاقی پیدا ہوتی ہے، لیکن ورزش میں بیماری پیدا ہوگی۔ اور جس طرح موسیقی کی سادگی سے روح میں عفت اور اعتدال کے محاسن پیدا ہوتے ہیں، ورزش میں یہ صحتِ جسمانی کا باعث ہوتی ہے۔

گلوکون نے کہا: بجا ہے۔

میں نے کہا: لیکن جب کسی ریاست میں بے عفتی اور بے اعتدالی اور جسمانی بیماریوں کی کثرت ہو تو ہمیشہ طب اور انصاف کے بڑے بڑے ایوان تعمیر ہوتے ہیں اور طبیب اور مقنن خوب بڑھا چڑھا کر اپنے پیشوں کی تعریف کرتے ہیں کہ اب تو غلام ہی نہیں بلکہ آزاد شہری بھی ان میں گہری دلچسپی لینے لگے۔

گلوکون نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے جواب دیا: لیکن تم ہی بتاؤ کہ تعلیمی حالت کے برے اور شرم ناک ہونے کا اس سے قوی اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ صرف معمولی کاریگروں اور نیچ قسم کے لوگوں کو ہی نہیں بلکہ ان لوگوں کو بھی جو تعلیم یافتہ ہونے کے مدعی ہیں اچھے طبیبوں اور قانون دانوں کا دست نگر ہونا پڑے۔ کیا یہ اچھی تربیت اور صحیح پرورش کے فقدان کی روشن دلیل اور ایک نہایت شرمناک بات نہیں کہ اسے قانونی یا طبی مشورے کے لیے باہر جانا پڑے کہ خود اس کے ملک میں یہ چیز نایاب ہے اور اس طرح وہ اپنے آپ کو دوسروں کے ہاتھ میں دے دے اور انھیں اپنے معاملات میں حکم اور اپنے اوپر قادر تسلیم کر لے۔

اس نے کہا: بے شک۔ یہ تو سب سے زیادہ ذلت کی بات ہے۔

میں نے کہا: کیا واقعی "سب سے زیادہ" ذرا سوچو۔ کیا خرابی کی ایک اور منزل اس کے آگے نہیں ہے جس میں یہی نہیں کہ ساری عمر مقدمہ بازی کرتا رہے اور کبھی مدعی اور کبھی مدعا علیہ کی حیثیت سے تمام دن عدالتوں میں گنوائے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنی بدمذاقی کی وجہ سے اس حرکت پر فخر بھی کرتا ہو۔ ایسا آدمی سمجھتا ہے کہ وہ بے ایمانی کے فن کا امام ہے۔ برے سے برے طریقے اختیار کرنے میں اسے ذرا عار نہیں،

ہر جگہ نکل پیٹھ کر سکتا ہے اور سانپ کے سے بل کھا کر ہر بل سے نکل سکتا ہے اور اپنے آپ کو عدالت کی مار سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اور یہ سب کچھ آخر کیوں؟ ایسی چھوٹی چھوٹی اور ذلیل باتوں کے لیے جو قابلِ اظہار بھی نہیں ہوتیں۔ یہ غریب نہیں جانتا کہ اپنی زندگی اس طرح گزارنی بہت زیادہ ارفع اور اعلیٰ ہے کہ آدمی اونگھتے ہوئے منصفوں کی خدمات سے بالکل مستغنی ہو۔ تم ہی کہو کہ اس شخص کی حالت کیا اور بھی ذلیل نہیں؟

اس نے کہا: بے شک۔ یہ تو اور بھی شرمناک ہے۔

میں نے کہا: اور یہ کون سی کم شرمناک بات ہے کہ لوگ طب کی اعانت کے طلب گار ہوں۔ اور یہ نہ صرف کسی زخم کے اندمال کی خاطر یا کسی دماغی مرض کے موقع پر بلکہ محض اس لیے کہ خود اپنی کاہلی اور سستی سے اور اس طریقۂ زندگی کے سبب سے جس کا ابھی ذکر کر رہے تھے یہ لوگ اپنے جسم کو رطوبتوں اور ریاح سے بھر کر ایک دلدل سا بنا لیتے ہیں۔ اور اسکلی پیئس کے ہوشیار بیٹوں کو اس بات کا موقع دیتے ہیں کہ نفخ، نزلہ، زکام وغیرہ بیماریوں کے نت نئے نام تراشیں۔

اس نے کہا: جی ہاں۔ یہ لوگ بیماریوں کے کچھ عجیب نئے نئے نام رکھتے ہیں۔

میں نے جواب دیا: مجھے تو یقین نہیں کہ اسکلی پیئس (Asclepius) کے زمانے میں بھی یہ ساری بیماریاں موجود تھیں۔ اور یہ نتیجہ میں نے اس سے نکالا کہ ہومر کے کلام میں ذکر ہے کہ جب یوری پائیلس (Eurypylus) زخمی ہوا تو اس نے پرامنی (Pramnian) شراب کا ایک قدح کا قدح لیا۔ جَو کے ستو اور پنیر کا بورا اس پر خوب سا چھڑکا اور چڑھا گیا حالانکہ یہ چیزیں سوزش اور ورم پیدا کرتی ہیں۔ لیکن جنگ ٹروجن میں اسکلی پیئس کے جو بیٹے موجود تھے ان میں سے کسی نے نہ اس خاتون کو برا بھلا کہا جو شراب کا پیالہ لائی تھی نہ پیٹروکلس کو جو اس کا علاج کر رہا تھا!

اس نے کہا: خوب۔ ایسی حالت میں کسی شخص کو یہ پلانا تو عجیب سی بات ہے۔

میں نے جواب دیا: کچھ ایسی تعجب کی بات نہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ پہلے پہل یعنی زمانہ ہیروڈیکس (Herodicus) سے قبل اسکلی پیئس کا یہ جتھا موجودہ طبی طریقوں پر عمل پیرا نہ تھا۔ کیونکہ سچ پوچھو تو یہ تو مرض کی اور پرورش کرتا ہے لیکن ہیروڈیکس پہلوانی کا استاد تو تھا لیکن کچھ یوں ہی بیمار سا آدمی تھا۔ چنانچہ ریاضت اور علاج معالجے کی باہم آمیزش سے اس نے پہلے تو خود اپنے آپ کو مصیبت میں مبتلا کرنے کا طریقہ ایجاد کیا اور پھر ساری دنیا کو اس میں گرفتار کر دیا۔

اس نے کہا: یہ کیسے؟

میں نے کہا: سسک سسک کر مرنے کا طریقہ ایجاد کر کے! وہ ایک مہلک مرض میں مبتلا تھا اور ہمیشہ اسے پالتا ہی رہتا تھا۔ اس مرض سے نجات کا امکان تو تھا نہیں، بس ساری زندگی سدا روگی کی طرح گزار دی۔ یہی ایک کام تھا کہ اپنی پاسبانی کیا کرے، غذا وغیرہ میں ذرا معمول سے تجاوز کیا اور تکلیف میں مبتلا ہوا۔ غرض اپنے علم کے ذریعے یونہی مر مر کر زندہ رہا اور جیسے تیسے بڑھاپے تک پہنچ گیا۔

گلوکون نے کہا: فن میں مہارت کا اچھا انعام ملا

میں نے کہا: ہاں۔ یہ انعام اسی آدمی کا حق تھا جو یہ بھی نہ سمجھ سکا کہ اگر اسکلی پیئس نے اپنے جانشینوں کو جسم کی خدمت گزاری کا یہ فن نہیں سکھایا تو یہ فروگزاشت طب کے اس شعبے سے ناواقفیت یا ناتجربہ کاری کی بنا پر نہ تھی بلکہ اس لیے تھی کہ وہ جانتا تھا کہ ایک منظم ریاست میں ہر فرد کے لیے ایک کام ہوتا ہے جس کا انجام دینا اس کے لیے ضروری ہے۔ بھلا اسے یہ فرصت کہاں نصیب کہ برابر بیمار رہ سکے۔ ہم معمولی کاریگروں کے بارے میں تو اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہیں، لیکن عجیب بات ہے کہ جہاں ذرا مالدار آدمیوں کا معاملہ ہوتا ہے تو اس سے چشم پوشی کرنے لگتے ہیں۔

اس نے کہا: یہ کیسے؟ آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں نے کہا: میرا مطلب یہ ہے کہ جب ایک بڑھئی بیمار پڑ جاتا ہے تو وہ طبیب سے کوئی تیز اور زود اثر دوا مانگتا ہے۔ اس کا علاج تو بس یہی ہے کہ جلاب لے لیا یا فصد کھلوائی۔ بدن پر داغ دلوا دیا، یا عمل جراحی کرا لیا۔ اور کوئی صاحب اس کے لیے غذا کا ایک پورا نظام تجویز کریں اور ہدایت کریں کہ اپنے سر کو یوں لپیٹا باندھا کرو یا اسی قسم کی اور باتیں بتائیں تو وہ صاف کہہ دیتا ہے کہ مجھے بیمار پڑے رہنے کی مہلت نہیں اور ایسی زندگی سے کیا حاصل جو اپنے معمولی کام پر صرف ہونے کے بجائے اپنے مرض کو پالنے میں گزرے۔ وہ ایسے طبیب کو خیرباد کہتا ہے اور اپنے معمول پر کاربند ہوتا ہے۔ اور یا تو جھٹ پٹ اچھا ہو کر اپنا کام کرنے لگتا ہے، یا اگر جسم جواب دے چکا ہے تو مر کر اپنی تمام مصیبتوں کو ختم کر دیتا ہے۔

گلوکون نے کہا: اس شخص کے سے حالات میں تو اسی حد تک طب کی مدد لینی چاہیے۔

میں نے کہا: ہاں۔ دنیا میں اس کا ایک کام اور مقصد ہے۔ اور جب اپنے کام ہی سے محروم رہا تو پھر ایسی زندگی سے کیا حاصل!

گلوکون نے کہا: درست۔

میں نے کہا: لیکن مالدار آدمیوں کا حال بالکل دوسرا ہے۔ ہم ان کے متعلق گمان ہی نہیں کرتے کہ انھیں زندہ رہ کر دنیا میں کوئی خاص کام بھی انجام دینا ہے!

گلوکون نے کہا: ہاں۔ یہ تو عموماً بے کار سمجھے جاتے ہیں۔

میں نے کہا: تو شاید تم نے فوسائی لیڈس (Phocylides) کا یہ مقولہ نہیں سنا کہ جب آدمی اپنی معاش کی طرف سے مطمئن ہو جائے تو اس کو طلب خیر میں مشغول ہو جانا چاہیے۔

گلوکون نے کہا: جی نہیں، میں نے نہیں سنا۔ میری رائے میں تو یہ مشغلہ ذرا اور پہلے شروع ہو تو بہتر ہے۔

میں نے کہا: خیر۔ اس بات پر مناظرہ بے سود ہے۔ ہمارے سامنے اب یہ سوال ہے کہ آیا مالدار آدمی کے لیے نیکی اور خیر پر عمل پیرا ہونا لازمی ہے یا وہ اس کے بغیر بھی اپنی زندگی گزار سکتا ہے؟ اور اگر لازمی ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کھانے پینے کی یہ بے عنوانیاں جو نجاری یا دیگر دستکاریوں میں دماغ کے صحیح طور پر کام کرنے میں حارج تھیں کیا اسی طرح فوسائی لیڈس کے خیال کی تکمیل میں حائل نہ ہوں گی؟

گلوکون نے جواب دیا: اس میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ جسم پر توجہ کی اس درجہ زیادتی، جب وہ جسمانی ورزش کے قواعد سے متجاوز ہو جائے، یقیناً نیک عملی پر بہت برا اثر رکھتی ہے۔

میں نے کہا: ہاں اسی طرح یہ بے عنوانیاں، امورِ خانہ داری، فوجی انتظام اور ریاست کے کسی عہدے یا منصب کے ساتھ بھی نہیں نبھ سکتیں۔ اور ان سب سے بڑھ کر مطالعہ، فکر و تدبر، اور خود شناسی کے ساتھ تو یہ بالکل ہی نہیں کھپتیں۔ لوگ ہمیشہ اس گمان میں گرفتار رہتے ہیں کہ درد یا دوران سر فلسفے کے مطالعے سے منسوب ہو سکتا ہے۔ اور اس طرح اعلیٰ معنوں میں خیر پر عمل پیرا ہونا یا اس کی آزمایش کرنا مطلقاً مسدود ہو جاتا ہے۔ آدمی کو ہر دم یہ خیال لگا رہتا ہے کہ میں بیمار ہوں۔ چنانچہ ہمیشہ اپنے جسم کے متعلق ہی فکر اور تردد میں رہتا ہے۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔ یہ امر بہت قرین قیاس ہے۔

میں نے کہا: چنانچہ میرا خیال ہے کہ دانشمند اسکلی پیئس تو اپنے ہنر کا اثر بس ان لوگوں پر ظاہر کرتا تھا جو معمولاً تندرست ہوں اور جن کی عادتیں بھی اچھی ہوں، بس اتفاق سے انھیں کوئی خاص بیماری ہو گئی ہو۔ اس

قسم کی بیماریوں کو وہ جلاب یا جراحی کے عمل سے رفع کر کے انھیں حسب معمول زندگی بسر کرنے کا مشورہ دیتا تھا۔ اور اس میں اس کے پیش نظر ریاست کی فلاح و بہبود رہتی تھی۔ لیکن وہ کبھی ایسے آدمیوں کا علاج نہ کرتا ہوگا جن کے جسم میں مرض بالکل گھس گیا ہے کہ انھیں لے اور ذرا سا فاسد مادہ ادھر سے نکالے، ذرا سی دوا ادھر سے پہنچائے اور اس تدریجی عمل سے انھیں تندرست بنانے کی لاحاصل کوشش کرے۔ وہ ہماری ناکارہ اور بے سود زندگیوں کو طول دینا نہیں چاہتا تھا۔ نہ وہ اس میں مدد دینا چاہتا تھا کہ کمزور ماں باپ اپنے سے بھی کمزور اولاد پیدا کریں۔ اگر ایک شخص معمولی طریقے سے زندہ نہیں رہ سکتا تو اس کا تندرست کرنا لاحاصل ہے کہ یہ شفا نہ اس کے لیے مفید ہو سکتی ہے نہ ریاست کے لیے۔

گلوکون نے کہا: معلوم ہوتا ہے کہ آپ اسکلی پیئس کو بڑا مدبر مانتے ہیں۔

میں نے کہا: یقیناً اور اس کی خوبیوں کی وضاحت اس کے بیٹوں نے کی۔ یہ لوگ پرانے وقتوں کے مشاہیر میں تھے۔ انھوں نے ٹرائے کے محاصرے میں ان دواؤں کا استعمال کرایا تھا جن کا میں نے ذکر کیا۔ تمھیں یاد ہوگا کہ جب پنڈارس (Pandarus) نے مینلاس (Menelaus) کو زخمی کیا ہے تو ان لوگوں نے:

"زخم میں سے خون چوس لیا اور اس پر مسکن دوائیں لگا دیں"

لیکن انھوں نے مینلاس یا یوری پائلس کسی کے لیے کھانے پینے کا کوئی ضابطہ تجویز نہیں کیا۔ ان کے خیال میں ایک ایسے انسان کے لیے جو مجروح ہونے سے قبل تندرست تھا اور منضبط عادات رکھتا تھا بس یہی دوائیں کافی تھیں چنانچہ گو مریض نے پرامنی شراب کا ایک جام بھی پی لیا تھا، پھر بھی اچھا ہو گیا۔ ہاں، انھیں سدا کے روگی اور بے احتیاط لوگوں سے مطلق سروکار نہ تھا۔ کیونکہ ان کی زندگیاں نہ خود ان کے لیے مفید تھیں نہ اوروں کے لیے۔ طب کا فن ایسے لوگوں کے فائدے کے لیے مرتب نہیں کیا گیا تھا اور چاہے یہ لوگ مال اور دولت میں میڈاس (Midas) کے ہمسر ہوتے اسکلی پیئس کے بیٹے تو ان کے علاج سے صاف انکار کر دیتے۔

گلوکون نے کہا: بڑے دانشمند تھے یہ لوگ۔ واہ، واہ رے اسکلی پیئس کے بیٹو!

میں نے کہا: ظاہر ہے لیکن پھر بھی یہ ناٹک لکھنے والے کہاں مانتے ہیں! حتیٰ کہ پنڈر نے اگرچہ اسکلی پیئس کو اپالو کا بیٹا تسلیم کیا ہے تاہم اس کے متعلق یہ بھی لکھ دیا ہے کہ رشوت دے کر ایک مرتبہ اسے اس بات پر آمادہ کر لیا گیا تھا کہ ایک قریب المرگ مالدار شخص کا علاج کر کے اسے اچھا کر دے۔ چنانچہ اس کی

پاداش میں اس پر بجلی گری لیکن ہم پہلے جو اصول بیان کر چکے ہیں اس کے مطابق ہم تو ان لوگوں کے یہ دونوں متضاد بیان تسلیم نہیں کر سکتے۔ اگر اسقلی پیس مقدس دیوتا کی اولاد تھا تو اتنا لالچی اور حریص نہ ہوگا اور اگر اتنا لالچی تھا تو دیوتا کا بیٹا نہیں ہو سکتا۔

گلوکون نے کہا: سقراط، یہ سب کچھ درست و بجا، لیکن میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں یعنی کیا ریاست میں اچھے طبیب درکار نہیں ہوتے؟ اور کیا بہترین طبیب وہ نہیں ہوتے جنھوں نے اچھی بری دونوں حالتوں کے زیادہ سے زیادہ مریضوں کا علاج کیا ہو؟ اسی طرح کیا بہترین منصف وہی لوگ نہیں ہوتے جو ہر قسم کی اخلاقی طبیعتوں سے آشنا ہوں؟

میں نے کہا: بے شک مجھے اچھے طبیب اور منصف درکار ہیں۔ لیکن یہ بھی جانتے ہو کہ میں کس کو اچھا سمجھتا ہوں؟

گلوکون نے کہا: فرمایئے۔

میں نے کہا: ہاں۔ اگر بن پڑا تو سمجھاتا ہوں۔ لیکن یہ بتا دوں کہ آپ نے اس سوال میں دو ایسی چیزیں یکجا کر دی ہیں جو ایک سی نہیں۔

گلوکون نے کہا: یہ کیسے؟

میں نے کہا: یہ ایسے کہ آپ نے طبیبوں اور منصفوں کو ملا دیا ہے......۔ بہترین اور ماہر طبیب تو وہ لوگ ہیں جنھیں جوانی کے زمانے سے لے کر برابر اپنے فن کو جاننے کے ساتھ ساتھ بیماریوں کا زیادہ سے زیادہ تجربہ بھی ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ خود ان کی تندرستی بہت اچھی نہ ہو اور خود ان کے بدن میں طرح طرح کے مرض جاگزیں ہوں۔ کیونکہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں بدن کی اصلاح کے لیے ان کا آلہ خود ان کا بدن نہیں ہوتا، ورنہ اگر ایسا ہوتا تو ہم کبھی یہ روا نہ رکھتے کہ یہ بیمار ہوں یا بیمار رہ چکے ہوں۔ لیکن یہ تو بدن کا علاج دماغ سے کرتے ہیں، البتہ اگر دماغ بیمار ہو چکا ہے تو پھر وہ کسی چیز کی اصلاح نہیں کر سکتا۔

گلوکون نے کہا: بالکل درست۔

میں نے کہا: لیکن منصف کا حال بالکل اس سے الگ ہے۔ یہ دماغ کا علاج دماغ سے کرتا ہے، اس لیے اس کی تربیت ہرگز برے اور شریر دماغوں کے ساتھ نہیں ہونی چاہیے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ جوانی کے زمانے سے لے کر وہ آئندہ برابر ایسے برے لوگوں سے ملتا رہا ہو اور جرائم کی پوری فہرست سے بھی

اس لیے واقفیت پیدا کرے کہ بآسانی دوسروں کے جرم کا پتا لگا لے جس طرح طبیب خود اپنے ذاتی احساس سے دوسروں کے جسمانی عارضوں کا آسانی سے پتا چلا سکتا ہے۔ صحیح فیصلے اور محاکے کے لیے جس اعلیٰ درجے کے دماغ کی ضرورت ہے اسے چاہیے کہ جوانی میں کبھی نہ تو جرم کا تجربہ ہوا ہو اور نہ وہ خود جرائم میں آلودہ رہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جوانی میں اکثر نیک لوگ بھولے بھالے معلوم ہوتے ہیں اور بے ایمان لوگوں کو انھیں تختۂ مشق بنانے کا اسی لیے موقع مل جاتا ہے کہ خود ان کی روح میں شر اور برائی کی کوئی مثال موجود نہیں ہوتی۔

اس نے کہا: جی ہاں۔ ان لوگوں کو نہایت آسانی سے فریب دیا جا سکتا ہے۔

میں نے کہا: اسی وجہ سے تو منصف کو جوان نہیں ہونا چاہیے۔ منصف کو شر کی پہچان آ جانی چاہیے، لیکن خود اپنی ذات اور روح سے نہیں بلکہ دوسروں میں کثرت سے اس کی ماہیت کا مشاہدہ کر کے۔ اس کا رہنما علم ہو نہ کہ ذاتی تجربہ۔

اس نے کہا: بے شک۔ منصف کی بہترین شکل تو یہی ہے۔

میں نے کہا: (اور آپ نے پوچھا تھا کہ میں کسے اچھا سمجھتا ہوں، تو عزیز من) میں تو ایسے آدمی کو اچھا مانتا ہوں۔ اس لیے کہ اچھا وہی ہے جس کی روح اچھی ہے لیکن وہ مکار اور شبہ کرنے والی طبیعت کا آدمی جس کا ذکر تم نے ابھی کیا تھا، جس سے خود متعدد جرائم کا ارتکاب ہو چکا ہے اور جو اپنے آپ کو شرارت کا اُستاد تصور کرتا ہے، اس کا تو یہ حال ہے کہ جب کبھی اپنے ہم جنسوں کی مجلس میں ہوگا، تو اس کی احتیاط اور اس کی چالا کی حیرت انگیز ہوگی کیونکہ یہ تو سب کو اپنے معیار سے جانچتا ہے۔ لیکن جب یہ شخص معمر اور تجربہ کار نیک آدمیوں کی صحبت میں جاتا ہے تو پھر اپنے بے جا شبہات کے باعث بیوقوف سا معلوم ہوتا ہے۔ یہ غریب ایمان دار آدمی کو پہچان ہی نہیں سکتا کہ خود اس کی ذات میں ایمانداری کا کوئی نمونہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ لیکن چونکہ دنیا میں بُرے افراد کی تعداد اچھے لوگوں سے زیادہ ہے اور اسے اکثر بُرے لوگوں سے ہی سروکار رہتا ہے اس لیے وہ خود اور نیز دوسرے لوگ اسے عقلمند ہی سمجھتے ہیں کوئی اسے بیوقوف نہیں جانتا۔

اس نے کہا: آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔

میں نے کہا: الغرض ایسا شخص اس دانشمند اور نیک منصف کا کام نہیں دے سکتا جس کی ہمیں تلاش ہے۔ برائی کبھی اچھائی کو نہیں پہچان سکتی۔ البتہ ایک صالح طبیعت، جسے زمانے نے تعلیم دی ہو، نیکی اور بدی

دونوں کا علم حاصل کر سکتی ہے۔ میری رائے میں عقل اور عرفان نیک لوگوں کا حصہ ہے، بُرے افراد کا نہیں۔

گلوکون نے کہا: میری بھی یہی رائے ہے۔

میں نے کہا: لہٰذا آپ جس قانون یا جس طب کی اجازت اپنی ریاست میں دیں گے وہ یہ ہے۔ یہ فنون اچھے انسانوں کی خدمت کریں گے اور روحانی اور جسمانی صحت کی فراہمی ان کا کام ہوگا۔ لیکن جن لوگوں کے جسم روگی ہیں یہ انھیں چھوڑ دیں گے کہ آپ ہی آپ مر جائیں اور ناپاک اور ناقابل اصلاح روحوں کو یہ ختم کر دیں گے۔

گلوکون نے کہا: مریض اور ریاست دونوں کے لیے یہی بہتر صورت ہے۔

میں نے کہا: چنانچہ ہمارے نوجوان جن کی تعلیم ایسی موسیقی کے ذریعے ہوئی ہے جو پاکبازی اور اعتدال پیدا کرتی ہے، قانونی چارہ جوئی کرنے میں بہت پس و پیش کریں گے۔

گلوکون نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: اسی طرح موسیقی دان جو اسی راستے پر چل کر معمولی اور نہایت سادہ جسمانی ورزش کرے گا اسے بھی سوائے بعض اشد ضروری حالتوں کے طب سے کچھ سروکار نہ ہوگا۔

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: یہ موسیقی دان جو ورزش کرے گا اس کا مقصد اپنی طبیعت کے عنصر شجاع کو تحریک دینا ہوگا نہ کہ طاقت بڑھانا۔ وہ عام پہلوانوں کی طرح ورزش اور غذا کو محض اپنے رگ و پٹھے درست کرنے کا ذریعہ نہیں بنائے گا۔

اور پھر اس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: اور جیسا کہ لوگ اکثر سمجھتے ہیں موسیقی اور جسمانی ورزش کے دو فنون کی غایت الگ الگ روح کی تربیت اور جسم کی تربیت نہیں ہے۔

اس نے کہا: پھر آخر ان کی اصلی غرض کیا ہے؟

میں نے کہا: میں تو سمجھتا ہوں کہ دونوں فنون کے سکھانے والوں کو پیش نظر روح ہی کی تربیت ہوتی ہے۔

اس نے کہا: یہ کیسے؟

میں نے کہا: کیا آپ نے کبھی نہیں دیکھا کہ صرف جسمانی ورزش پر ساری توجہ صرف کرنے سے دماغ پر کیسا اثر پڑتا ہے یا محض موسیقی پر توجہ کرنے سے جسم پر؟

اس نے کہا: یہ اثر بھلا کیسے ظاہر ہوتا ہے؟

میں نے کہا: اس طرح کہ ایک سے طبیعت میں سختی اور درشتی پیدا ہوتی ہے اور دوسرے سے نرمی اور نسائیت۔

اس نے کہا: جی ہاں۔ میں اتنا تو جانتا ہوں کہ محض ورزش کرنے والا پہلوان بہت وحشی ہو جاتا ہے اور صرف موسیقی پر توجہ کرنے والا نرمی اور رقتِ قلب میں جائز حد سے آگے چلا جاتا ہے۔

میں نے کہا: لیکن دراصل یہ درشتی اور وحشت طبیعت کی اس کیفیت سے پیدا ہوتی ہے جس کی اگر صحیح تربیت ہو تو شجاعت اور جرأت پیدا ہوں۔ لیکن جب اس پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا ہے تو یہی سختی اور وحشت پیدا کرتی ہے۔

اس نے کہا: میں سمجھتا ہوں۔

میں نے کہا: اس کے برعکس فلسفی میں نرمی کی صفت ہوگی۔ لیکن اس میں بھی اگر غلو ہو گیا تو یہی نرمی ضرورت سے زیادہ بڑھ جائے گی اور اگر صحیح تعلیم ہو تو اعتدال کی صورت پیدا ہوگی۔

اس نے کہا: بجا۔

میں نے کہا: اور ہماری رائے میں محافظوں میں یہ دونوں صفات ہونی چاہئیں؟

اس نے کہا: لازماً۔

میں نے کہا: اور ان دونوں میں ایک تناسب بھی ضروری ہے؟

اس نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: اسی متناسب اور مرتب روح میں عفت اور اعتدال بھی ہوں گے اور جرأت اور شجاعت بھی؟

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: برخلاف اس کے غیر متناسب روح میں بزدلی اور بناوٹ ہوگی۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اور اسی طرح جب انسان اپنے آپ کو موسیقی سے متاثر ہونے اور کانوں کے راستے اپنی روح میں ان میٹھے اور نرم یا المناک ترانوں کو داخل ہونے دے، جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں اور جب اس کی ساری زندگی نغمہ سرائی اور انبساط و موسیقی میں صرف ہو تو اس عمل کے ابتدائی درجوں میں تو اس کی طبیعت میں لوہے کا سا لوچ پیدا ہو جائے گا اور بجائے زود شکن اور بیکار ہونے کے وہ نہایت مفید اور کارآمد بن جائے گا لیکن اگر نرم کرنے کا یہ عمل ذرا زیادہ جاری رہا تو پھر دوسری منزل گلنے اور ضائع ہونے کی ہے، حتیٰ کہ یہ سارا جذبہ فنا اور روح کی ساری قوت زائل ہو کر وہ جنگ آزمائی کے معیار سے نہایت کمزور انسان رہ جائے گا۔

گلوکون نے کہا: بالکل درست۔

میں نے کہا: یہ جذبہ اگر اس میں فطرتاً کمزور ہے تو یہ تبدیلی جلد ظاہر ہو جاتی ہے اور اگر قوی ہے تو موسیقی کی قوت اسے کمزور کر کے اس کی طبیعت کو چڑچڑا بنا دیتی ہے۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتا ہے اور پھر فوراً ٹھنڈا بھی پڑ جاتا ہے۔ اس جذبے کے بجائے وہ اب نہایت ذکی الحس اور مغلوب الغضب ہو جاتا ہے اور قوتِ عمل اس سے بالکل چھن جاتی ہے۔

اس نے کہا: بجا۔

میں نے کہا: یہی حال جسمانی ورزش کا ہے۔ اگر کوئی شخص سخت ورزش کرے اور بہت کھانے والا بھی ہو، یعنی موسیقی اور فلسفے کے دلدادہ کی بالکل ضد، تو اس کے جسم کی خوبی پہلے اس میں کچھ فخر اور کچھ جذبۂ جرأت پیدا کرتی ہے اور وہ اپنے آپ میں پہلے سے دو چند مردانگی محسوس کرنے لگتا ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: لیکن پھر کیا ہوتا ہے؟ اگر وہ یہی کرتا رہے اور کسی دوسری طرف توجہ نہ کرے، علمی مشاغل سے کوئی سروکار نہ رکھے تو تعلیم، تحقیق، تخیل، تہذیب سے کوئی لگاؤ نہ ہونے کے باعث جو تھوڑی بہت ذہانت اور ذکاوت اس میں ہے بھی، وہ کمزور، کند اور دھندلی پڑ جاتی ہے۔ اس کا دماغ نہ کبھی بیدار ہونے پاتا ہے نہ نشو و نما حاصل کرتا ہے اور نہ اس کے حواس کے اوپر کا گرد و غبار ہی صاف ہونے پاتا ہے۔

اس نے کہا: سچ ہے۔

میں نے کہا: بالآخر وہ غیر مہذب اور فلسفے سے نفرت کرنے والا بن جاتا ہے۔ ترغیب کا آلہ تو کبھی

استعمال ہی نہیں کرتا۔ اس کی حالت ایک وحشی درندے کی سی ہوتی ہے، ہمہ تن تشدد و خونخواری، کہ اسے معاملے کا کوئی دوسرا طریقہ آتا ہی نہیں۔ سلیقہ مندی اور حسن عمل سے یکسر نابلد، کامل جہالت اور برائی میں اپنی زندگی گزارتا ہے۔

گلوکون نے کہا: بالکل درست۔

میں نے کہا: اور چونکہ انسانی فطرت دو اصولوں سے مرکب ہے، یعنی جری اور فلسفیانہ، اس لیے میں تو کہوں گا کہ کسی دیوتا نے ان دونوں اصولوں کے مقابل (اور بالواسطہ روح اور جسم کی مطابقت سے) انسان کو دو فن عطا کیے ہیں تا کہ ان دو اصولوں کو آلات موسیقی کے تاروں کی طرح ڈھیلا کر کے اور کس کر ضروری تناسب پیدا کرلے۔

گلوکون نے کہا: ہاں معلوم تو یہی ہوتا ہے۔

میں نے کہا: تو جو شخص موسیقی اور جسمانی ورزش کو بہترین تناسب کے ساتھ ملاتا اور بہترین طریقے سے روح کے ساتھ ان کی مطابقت کرتا ہے وہ دراصل تار سے نغمہ نکالنے والوں کی بہ نسبت زیادہ صحیح معنوں میں ماہر موسیقی کہلانے کا مستحق ہے۔

گلوکون نے کہا: آپ کا ارشاد بالکل بجا ہے۔

میں نے کہا: اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری ریاست کی حکومت ہمیشہ قائم رہے تو سرداری کے لیے ایک ایسے غیر معمولی شخص کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔ اس کا وجود تو از بس ناگزیر ہے۔

میں نے کہا: اچھا تو جسمانی تربیت اور تعلیم (ذہنی) کے لیے ہمارے اصول یہ ہیں۔ اب شہریوں کے رقص، سیر اور شکار، ورزش اور گھوڑ دوڑ، اور کسرتی مقابلوں کے متعلق زیادہ تفصیلی بحث کرنے سے کیا حاصل؟ یہ سب تو عام اصول کے پابند ہیں اور جب یہ اصول معلوم ہو گیا تو ان کا فیصلہ کرنے میں کچھ ایسی دشواری نہیں۔

گلوکون نے کہا: یقیناً اس میں کوئی مشکل نہ ہوگی۔

میں نے کہا: اب اور کون سا سوال باقی رہا؟ اب یہ دریافت کرنا چاہیے کہ کون حاکم ہوگا اور کون محکوم۔

گلوکون: بے شک۔

میں نے کہا: اس میں تو کچھ شبہ کی گنجایش نہیں کہ زیادہ عمر والے کم عمر والوں پر حکومت کریں۔

گلوکون: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: اور ان میں سے بھی وہی حکومت کریں جو بہترین ہوں۔

گلوکون: یہ بات بھی بالکل صاف ہے۔

میں نے کہا: اچھا اب بتاؤ کہ بہترین کاشتکار تو وہی ہوتا ہے جو کاشتکاری میں سب سے زیادہ منہمک رہے۔

گلوکون: جی ہاں۔

میں نے جواب دیا: اور چونکہ ہمیں اپنے شہر کے لیے بہترین محافظ درکار ہیں تو کیا یہ وہی لوگ نہ ہوں گے جن میں محافظ بننے کے صفات سب سے زیادہ موجود ہیں۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اس غرض کے لیے ضروری ہے کہ وہ دانش منداور مستعد ہوں اور ریاست کا خاص خیال رکھیں۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اور انسان اسی چیز کا سب سے زیادہ خیال رکھے گا جس سے اسے محبت ہو۔

اس نے جواب دیا: یقیناً۔

میں نے کہا: اور غالباً اسی چیز سے محبت زیادہ ہوگی جس کے اغراض و مقاصد خود اس کے سے ہوں اور اس کے خیال میں جس چیز کی اچھائی یا برائی سے خود اس کے اوپر سب سے زیادہ اثر پڑتا ہو۔

گلوکون نے کہا: بالکل درست۔

میں نے کہا: چنانچہ اس کے لیے انتخاب ضروری ہے۔ ہم محافظوں میں سے ان لوگوں کو دیکھیں جنھوں نے اپنی ساری زندگی میں ملک کی بہبود کے لیے سب سے زیادہ اشتیاق ظاہر کیا ہے اور ملکی اغراض کے خلاف کوئی کام کرنے سے جنھیں ہمیشہ سب سے زیادہ نفرت رہی ہے۔

گلوکون نے جواب دیا: ہاں یہی ٹھیک آدمی ہوں گے۔

میں نے کہا پھر ہر عمر میں ان پر نظر رکھنی ہوگی تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے عزم پر قائم بھی رہے ہیں یا نہیں۔ اور کہیں بھی اور کبھی بھی جبر و تشدد یا ترغیب اور نظر فریبی سے یہ ریاست کے متعلق اپنے فرض کے احساس کو بھول تو نہیں جاتے یا پس پشت تو نہیں ڈال دیتے۔

اس نے پوچھا: پس پشت ڈالنا! کیسے؟

میں نے کہا: میں سمجھاتا ہوں۔ آدمی کے دماغ سے کسی عزم کے نکل جانے کی دو صورتیں ہیں۔ یا تو یہ خود اس کے ارادے سے ہو یا ارادے کے خلاف۔ خود اپنے ارادے سے تو اس وقت جب وہ کسی جھوٹ سے نجات پاتا اور بہتر علم حاصل کرتا ہے اور ارادے کے خلاف اس وقت جب وہ کسی صداقت سے محروم ہوتا ہے۔

اس نے کہا: عزم کا بغیر ارادے نکل جانا تو میں سمجھ گیا لیکن ارادے کے باوجود نکل جانے کا صحیح مفہوم سمجھنا ابھی باقی ہے۔

میں نے کہا: کیوں۔ کیا آپ یہ نہیں سمجھتے کہ انسان اچھائی اور خیر سے تو خلاف ارادہ محروم کیا جاتا ہے اور برائی اور شر سے بخوشی؟ کیا کسی صداقت کو کھو دینا برا اور کسی صداقت کا حاصل کر لینا اچھا نہیں؟ اور آپ غالباً مجھ سے اتفاق کریں گے کہ چیزوں کو اسی طرح جاننا جیسی کہ وہ ہیں صداقت کا حاصل کرنا ہے؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔ میں اس پر متفق ہوں کہ انسان حق اور صداقت سے مرضی کے خلاف ہی محروم کیا جاتا ہے۔

میں نے کہا: اور بغیر ارادے محرومی کیا چوری یا جبر یا دھوکے سے عمل میں نہیں لائی جاتی؟

گلوکون نے کہا: میں ابھی تک آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

میں نے کہا: مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں میں المیہ ناٹک لکھنے والوں کی طرح گنجلک اور مبہم گفتگو تو نہیں کر رہا ہوں۔ میرا مطلب بس اتنا ہے کہ بعض لوگوں میں ترغیب سے تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور بعض میں بھول سے۔ اول الذکر کے عقائد کو دلیل چرا لیتی ہے اور مؤخر الذکر کے عقائد کو زمانہ۔ چنانچہ ان دونوں حالتوں کو میں نے چوری سے تعبیر کیا ہے۔ اب تو آپ سمجھے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: رہا جبر۔ تو جبر سے ان لوگوں میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے جنھیں کسی دکھ یا رنج کی شدت اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور کرے۔

اس نے کہا: میں اب سمجھ گیا۔ آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں۔ سقراط۔

میں نے کہا: اور دھوکا انھیں ہوتا ہے جن کے خیالات عیش کے نرم یا خوف کے سخت اثر سے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ آپ غالباً اسے بھی تسلیم کریں گے؟

گلوکون نے کہا: بے شک۔ جس چیز سے دھوکا ہوا سے فریب نظر کہہ سکتے ہیں۔

میں نے کہا: اس لیے جیسا کہ میں ابھی ابھی کہہ رہا تھا ہمیں ان لوگوں کو ڈھونڈنا چاہیے جو خود اپنے اس عقیدے کے بہترین محافظ ہوں کہ جو کچھ ان کے نزدیک ریاست کی اغراض کے مطابق ہے وہی ان کی زندگی کا طرز عمل ہوگا۔ ہمیں جوانی کے زمانے سے برابر ان پر نظر رکھنی چاہیے اور ان سے ایسے کام کرانے چاہئیں جن میں اس عقیدے کو بھول جانے یا اس میں دھوکا کھا جانے کا بہت احتمال ہو۔ اور جو پھر بھی اسے نہ بھولے نہ دھوکا کھائے اسے چن لینا چاہیے، اور جو اس آزمائش میں ناکام رہیں انھیں خارج کر دینا چاہیے۔ کیوں یہی بہترین طریقہ ہے نا؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: ان لوگوں کے لیے کچھ محنت اور مشقت، کچھ تکلیف اور مقابلے بھی تجویز کرنے چاہئیں تا کہ یہ اپنی ان صفات کا مزید ثبوت دے سکیں۔

گلوکون نے کہا: بہت صحیح۔

میں نے کہا: اس کے بعد انھیں نظر فریبی سے آزمانا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ اس امتحان میں ان کا کیا حال رہتا ہے۔ یہ گویا تیسری آزمائش ہے۔ جس طرح لوگ بچھیروں کو شور اور گڑبڑ میں لے جاتے ہیں کہ کہیں بھڑکتے تو نہیں، اسی طرح ہمیں بھی ان نوجوانوں کو مختلف قسم کے خطروں سے گزارنا چاہیے، اس کے بعد مسرتوں سے جیسے بھٹی میں سونے کی جانچ ہوتی ہے اس سے بھی زیادہ پوری پوری ہمیں ان کی جانچ پرکھ کرنی چاہیے تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ آیا یہ تمام نظر فریبیوں کے خلاف مسلح، ہمیشہ نیک کردار اور خود اپنے اور اس موسیقی کے جو انھوں نے حاصل کی ہے اچھے محافظ ہیں یا نہیں۔ اور آیا طرح طرح کے حالات میں ایسی متوازن اور متناسب طبیعت قائم رکھ سکتے ہیں یا نہیں جو فرد اور ریاست دونوں کے لیے مفید اور کارآمد ہو جو شخص لڑکپن،

جوانی اور بڑی عمر کو پہنچنے کے بعد الغرض ہر عمر میں اس آزمائش سے کامیاب اور کھرا نکلا ہو، اسے ریاست کا حکمران اور محافظ مقرر کرنا چاہیے۔ جیتے جی اس کی عزت ہو اور مرنے کے بعد بھی۔ اس کے لیے مقبرہ بنے اور بڑی سے بڑی اعزازی یادگاریں تعمیر ہوں۔ مگر جو اس امتحان میں ناکام رہیں انھیں ضرور خارج کر دینا چاہیے۔ میری رائے میں تو محافظوں اور حاکموں کے انتخاب و تقرر کا یہ طریقہ ہے۔ میں نے جو کچھ کہا یہ ایک عام بیان ہے اور میں اس کے پوری طرح صحیح ہونے کا مدعی نہیں ہوں۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔ اس عام بیان سے میں بھی متفق ہوں۔

میں نے کہا: اور غالباً صحیح معنوں میں لفظ "محافظ" کا اطلاق اسی اعلیٰ طبقے کے لوگوں پر ہونا چاہیے جو ہمیں خارجی دشمنوں سے بچائیں اور شہریوں میں داخلی امن برقرار رکھیں، تاکہ ان میں ہمیں نقصان پہنچانے کی خواہش اور ان میں نقصان پہنچانے کی قوت نہ رہے۔ جن نوجوانوں کو ہم نے پہلے محافظ کا لقب دیا تھا مناسب ہے کہ انھیں اب ان حکام کے اصولوں کا مددگار و معاون کہا جائے۔

اس نے کہا: میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔

میں نے کہا: تو پھر ہم کس طرح وہ دروغِ مصلحت آمیز تراشیں جس کا ہم ابھی تھوڑی دیر ہوئی ذکر کر رہے تھے، یعنی وہ شاندار جھوٹ جو ممکن ہو تو حکام کو بھی دھوکا دے سکے یا کم سے کم باقی تمام شہر کو تو دے ہی لے!

اس نے کہا: یہ جھوٹ کیسا؟

میں نے کہا: نہیں، کوئی نئی بات نہیں۔ بس ایک قدیمی فونیقی افسانہ چاہیے جس میں ایسی چیزوں کا ذکر ہو جو کسی دوسری جگہ اور ہمارے زمانے سے بہت پہلے واقع ہوئی ہیں (جیسے شاعر اکثر کہتے اور لوگوں کو باور کرا دیتے ہیں)۔ نہ معلوم پھر کبھی ایسا ہونا ممکن ہو یا نہیں اور اگر ایسا واقع بھی ہو تو قابل یقین سمجھا جائے یا نہیں۔

اس نے کہا: کیوں، کیوں، آپ کے الفاظ منھ سے نکلتے نکلتے رکتے کیوں ہیں؟

میں نے کہا: آپ جب میرا مافی الضمیر سن لیں گے تو غالباً اس جھجک پر متعجب نہ ہوں گے۔

اس نے کہا: تو ڈر کس بات کا ہے۔ فرمایئے۔

میں نے کہا: اچھا۔ بتاتا ہوں۔ اگرچہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ سے کس طرح آنکھیں چار کروں اور کن لفظوں میں اس بے جھجک جھوٹ کا اظہار کروں جسے میں رفتہ رفتہ پہلے حکام تک، اس کے بعد سپاہیوں

تک اور سب سے آخر میں عام لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہوں، سنیے، ان سے کہا جائے گا کہ ان کی جوانی ایک خواب تھا اور جو تعلیم اور تربیت انھوں نے ہم سے حاصل کی محض ایک ظاہری شکلِ نمود تھی۔ دراصل اس زمانے میں مادرِ ارض کے رحم کے اندر ان کی تشکیل اور ان کا تغذیہ ہو رہا تھا۔ وہیں یہ خود بھی بنائے گئے اور ان کے آلات اور اسلحہ بھی۔ جب ان سب کی تکمیل ہو چکی تو ان کی ماں، زمین، نے انھیں اوپر بھیجا۔ چنانچہ ان کا ملک ان کی ماں بھی ہے اور ان کی دائی بھی۔ اس کی بھلائی چاہنا ان کا فرض اور اسے حملوں سے بچانا ان پر لازم ہے۔ انھیں چاہیے کہ اس کے شہریوں کو اسی بھومی کے بچے اور اپنا بھائی جانیں۔

گلوکون نے کہا: سچ ہے، اس جھوٹ کے اظہار میں آپ کا تذبذب بجا تھا۔

میں نے کہا: جی۔ ابھی تو اور باقی ہے۔ میں نے ابھی تو آدھی بات کہی ہے۔ ہم اس قصے میں کہیں گے کہ اے شہریو! تم آپس میں بھائی بھائی ہو، لیکن خدا نے تمھیں الگ الگ ڈھب سے بنایا ہے۔ تم میں سے بعض میں حکمرانی کی قوت ہے اور ان کے اجزائے ترکیبی میں خدا نے سونے کی آمیزش کی ہے۔ اسی وجہ سے ان کی عزت بھی سب سے زیادہ ہے۔ بعض دوسرے چاندی سے بنے ہیں اور یہ مددگار ہیں۔ جنھیں کسان اور کاریگر بننا ہے ان کی ترکیب میں پیتل اور لوہا ملایا ہے۔ اور یہ خصائصِ نوعی عموماً ان کی اولاد میں بھی قائم رہیں گے۔ مگر چونکہ اصل سب کی ایک ہے، اس لیے کبھی کبھی ایسا بھی ہوگا کہ سونے والے والدین کے ''سیمیں'' بچہ ہو یا ''سیمیں'' والدین کے ''زریں'' اولاد ہو۔ خدا تمام حکام کے سامنے بحیثیت اصولِ اول اس کا اعلان کرتا ہے کہ دوسری تمام چیزوں کے مقابلے میں انھیں نجابتِ نسل کی سب سے زیادہ حفاظت کرنی چاہیے۔ ہمیشہ انھیں اس بات پر نظر رکھنی چاہیے کہ اولاد میں کن اجزا کی آمیزش ہوتی ہے، کیونکہ اگر زریں یا سیمیں طبقے کی اولاد میں پیتل یا لوہے کا میل ہو تو قدرت کا قانون مرتبے کو بدلنے کا طالب ہوتا ہے۔ حاکم کو اس بات پر ذرا ترس نہیں آنا چاہیے کہ اس کا بچہ تنزل کر کے کسان یا دستکار ہو رہا ہے۔ اسی طرح اگر دستکاروں کی اولاد میں سونے یا چاندی کی آمیزش ہو تو ان کا اعزاز بڑھتا ہے اور وہ محافظِ شہر یا مددگاروں کے زمرے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کاہن کا قول ہے کہ جس ریاست کا محافظ پیتل یا لوہے والا آدمی ہو وہ تباہ ہو جائے گی۔ تو جنابِ من، سنا آپ نے، وہ قصہ یہ ہے۔ کیوں اس افسانے کو باور کرانے کا بھی کچھ امکان ہے؟

گلوکون نے کہا: ایک پشت میں تو ممکن نہیں۔ موجودہ نسل کو یہ باور کرانے کی تو کوئی تدبیر میری سمجھ میں نہیں آتی۔ البتہ ان لوگوں کی اولاد یا ان لوگوں کی اولاد کو یہ افسانہ باور کرایا جا سکتا ہے۔ اور اسی طرح

اور آگے۔

میں نے کہا: ہاں۔ میں اس وقت کو خود محسوس کرتا ہوں۔ تاہم اس قسم کا عقیدہ ان لوگوں کو شہر کے اور نیز باہم ایک دوسرے کے متعلق فکر کرنے پر آمادہ کرے گا۔ خیر افسانے کے متعلق بس اس قدر کافی ہے۔ اب یہ خود بخود افواہ کے پروں پر اڑ کر تمام میں پھیلتا رہے گا۔ آؤ۔ ہم اپنے گیتی نژاد سورماؤں کو مسلح کریں اور انھیں حکام کے زیر سیادت آگے بڑھائیں۔ یہ لوگ ادھر ادھر دیکھ بھال کر ایک ایسی جگہ تلاش کر لیں کہ اگر ملک کے اندر کوئی شورش برپا ہو تو یہ اس بغاوت کو بآسانی دبا سکیں اور ان دشمنوں سے بھی اپنے آپ کو امن میں رکھ سکیں جو بھیڑیوں کی طرح باہر سے گلے پر چھاپہ مارتے ہیں۔ جگہ کا انتخاب کر کے یہ لوگ وہاں اپنے ڈیرے ڈال دیں، متعلقہ دیوتاؤں پر قربانی چڑھائیں اور اپنی قیام گاہ کی تعمیر میں مصروف ہو جائیں۔

گلوکون نے کہا: بالکل درست۔

میں نے کہا: یہ قیام گاہ ایسی ہونی چاہیے کہ گرمیوں میں گرمی اور سردیوں میں سردی سے ان کی حفاظت کر سکے۔

گلوکون نے کہا: آپ کا مطلب غالباً ان کے مکانوں سے ہے۔

میں نے کہا: جی۔ لیکن سپاہیوں کے سے مکان ہوں دکانداروں کے نہیں۔

گلوکون نے کہا: کیوں۔ ان میں کیا فرق ہے؟

میں نے کہا: میں ابھی بتاتا ہوں۔ سنیے، اگر کوئی گڈریا ایسے محافظ کتے پالے جو عدم تربیت، بھوک، یا کسی بری عادت کی وجہ سے بھیڑوں پر منہ ڈالیں اور انھیں تنگ کریں اور حفاظت کے بجائے خود بھیڑیے کا کام دیں تو یہ کیسی لغو اور بری بات ہوگی۔

گلوکون نے کہا: بے شک، بہت بری بات ہوگی۔

میں نے کہا: چنانچہ ہمیں بھی ہر ممکن اہتمام کرنا چاہیے کہ ہمارے مددگار محافظ جو عام شہریوں سے زیادہ قوی ہوں گے، کہیں ضرورت سے زیادہ قوی نہ ہو جائیں اور بجائے یار و مددگار کے ایک وحشی ظالم کا کام نہ کریں۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔ اس بارے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

میں نے کہا: اور کیا حقیقی معنوں میں عمدہ تعلیم بہترین احتیاط نہیں؟

گلوکون نے کہا: ان کی عمدہ تعلیم تو ہو ہی چکی ہے۔

میں نے کہا: نہیں۔ مجھے تو اس درجہ اعتماد نہیں۔ ہاں، میرا عقیدہ ہے کہ انھیں عمدہ تعلیم یافتہ ضرور ہونا چاہیے کہ صحیح تعلیم ہی خواہ اس کی نوعیت کچھ ہو انھیں مہذب اور متمدن بنانے اور ان کے آپس کے تعلقات اور زیردستوں سے ان کے برتاؤ کو انسانیت کا رنگ دینے میں سب سے زیادہ مؤثر قوت ثابت ہوگی۔

گلوکون نے کہا: بجا۔

میں نے کہا: اور صرف تعلیم ہی نہیں ان کی تو قیام گاہیں اور ان کی تمام املاک اسی قسم کی ہونی چاہیے کہ نہ بحیثیت محافظ ان کی خوبیوں کو کم کرے اور نہ انھیں دوسرے شہریوں پر دست درازی کرنے کی ترغیب دلا سکے۔ غالباً ہر سمجھدار شخص مجھ سے اتفاق کرے گا۔

گلوکون نے کہا: لازماً۔

میں نے کہا: اچھا تو اگر انھیں ہمارے خیال کے مطابق پورا اترنا ہے تو دیکھیں ان کا طرز معاشرت کیا ہونا چاہیے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ سوائے بہت ہی ضروری چیزوں کے کسی کے پاس اپنی کوئی ذاتی ملک نہ ہوگی، نہ ان کے پاس کوئی نجی مکان ہوگا نہ گودام جس میں کوئی دوسرا آنا چاہے اور نہ آ سکے۔ ان کی غذا میں صرف ایسی چیزیں شامل ہوں گی جن کی ضرورت تربیت یافتہ اور صاحبِ جرأت وعفت جنگ آزماؤں کو ہوتی ہے۔ انھیں شہریوں سے ایک مقررہ شرح تنخواہ کے وصول کرنے کا معاہدہ کرانا چاہیے تاکہ ان کے سالانہ اخراجات کی کفالت ہو سکے، بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ سب کے سب ایک جگہ رہیں اور ایک جگہ کھانا کھائیں، جس طرح لشکر میں سپاہی کرتے ہیں۔ ہم انھیں بتائیں گے کہ سونا چاندی تو تمھیں خدا کی طرف سے عطا ہو چکا ہے، جب وہ اعلیٰ دھات خود تمھارے اندر موجود ہے تو پھر اس میل کی تمھیں کیا ضرورت جو انسانوں میں رائج ہے، تم ہرگز اس آسمانی عطیے کو اس آمیزش ارضی سے آلودہ اور ناپاک نہ کرو کہ یہ رائج اور عام دھات بہت سے ناپاک اعمال کی وجہ ثابت ہوتی ہے، اور وہ خاص اور اعلیٰ دھات جو تمھارے قبضے میں ہے وہ بالکل نکھری ہوئی ہے۔ چنانچہ سارے شہر میں بس انہی لوگوں کو سونا چاندی نہیں چھونا چاہیے۔ یہ لوگ نہ تو سونا چاندی پہنیں، نہ سونے چاندی کے برتنوں سے کچھ پئیں، نہ اس چھت کے تلے رہیں جہاں سونا چاندی موجود ہے۔ ان کی نجات اسی میں ہے اور اسی طرح یہ ریاست کی نجات کرا سکتے ہیں۔ اور اگر کہیں ان کے پاس اپنے ذاتی مکان یا زمینیں یا اپنا ذاتی زر و مال ہوا تو یہ اچھے تاجر اور کسان تو ضرور بن جائیں گے۔ لیکن محافظ نہ رہیں

گے۔ بجائے معین و مددگار ہونے کے یہ دشمن اور ظالم بن جائیں گے۔ یہ دوسروں سے نفرت کریں گے، دوسرے ان سے، یہ اوروں کے خلاف سازش کریں گے، اور دوسرے ان کے خلاف؛ خارجی دشمنوں سے زیادہ اندرونی مخالفتوں کے ڈر میں ان کی زندگی گزرے گی اور خود ان کی اور ان کی ریاست کی تباہی کا وقت قریب آ جائے گا۔ ان وجوہ کی بنا پر کیا ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب نہیں کہ ہماری ریاست کا ایسا ہی انتظام ہونا چاہیے اور محافظوں کے مکانوں اور نیز دیگر امور کے متعلق بھی یہی ضابطے مقرر ہونا چاہئیں۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

☆☆☆
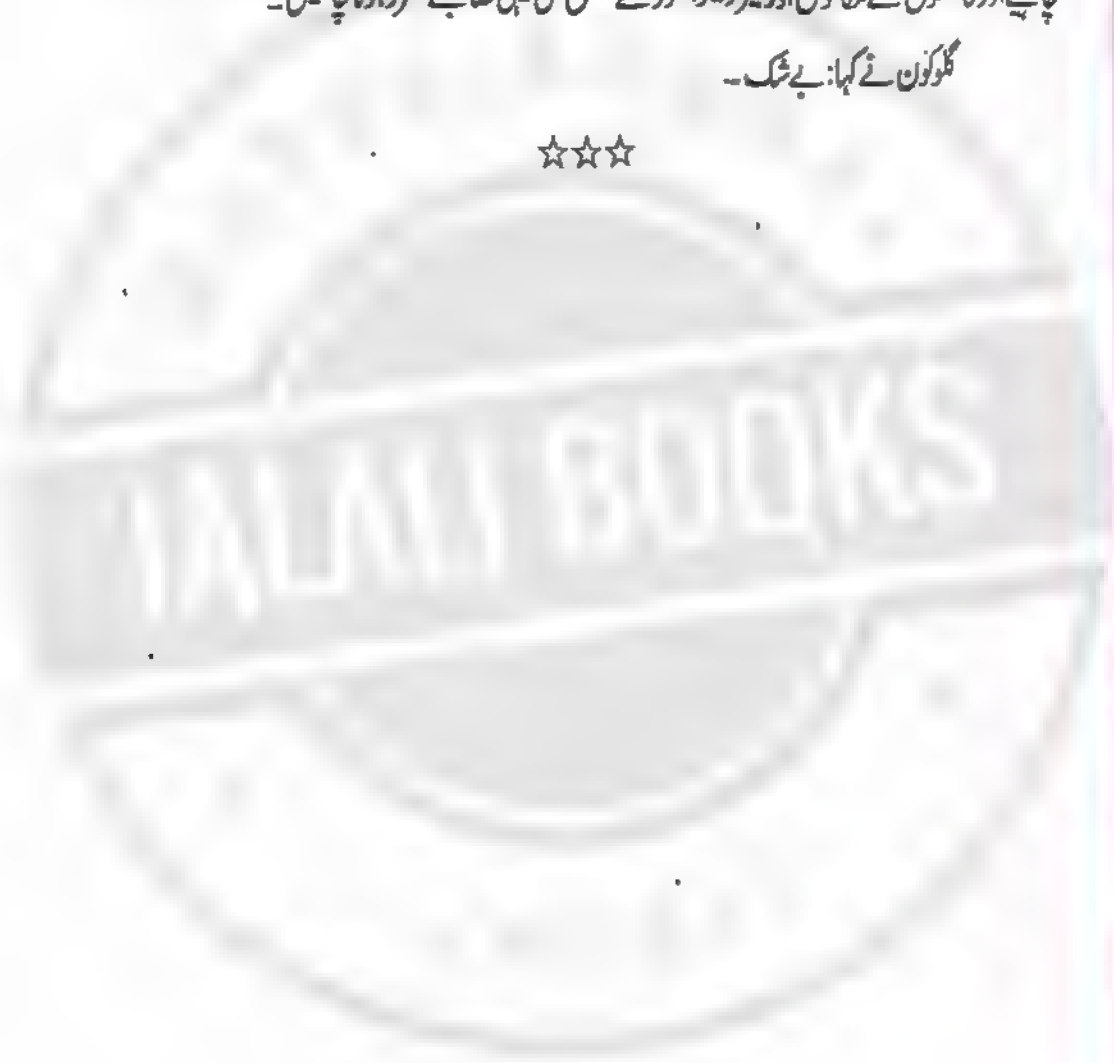
چوتھی کتاب

گفتگو کا سلسلہ یہاں تک پہنچا تھا کہ ایڈیمنٹس نے بات کاٹ کر یہ سوال کیا "یہ تو فرمائیے کہ اگر کوئی شخص یہ شکایت کرے کہ آپ نے اس طبقے کے لوگوں کی خوشی اور آرام کا کوئی خاص خیال تو رکھا نہیں تو آپ کیا جواب دیں گے۔ اور سچ تو یوں ہے کہ یہ خود انہی لوگوں کی غلطی ہوگی کہ ان کے آرام و آسایش کا سامان مہیا نہ ہوا۔ سارے کا سارا شہر دراصل انہی کا ہے اور یہی اس سے فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ دوسرے زمین خرید سکتے ہیں، اس پر بڑے بڑے اور خوبصورت مکان بنوا سکتے ہیں، ہر طرح کی حسین چیزیں اپنے گرد جمع کر سکتے ہیں، دیوتاؤں کے نام پر نج کی قربانیاں بھی چڑھا سکتے ہیں، اُنھیں اجازت ہے کہ اپنے دوستوں کی دعوتیں کریں، سونا، چاندی اور وہ سب کچھ جو قسمت کے دھنی لوگوں کے پاس معمولاً ہوتا ہے اُنھیں میسر ہے، لیکن یہ غریب ہیں کہ شہر میں کرایے کی فوج کی طرح تعینات ہیں اور بس اپنے فوجی فرائض کے انجام دینے میں ہمہ تن مصروف"!

میں نے کہا: ہاں، بے شک آپ صحیح فرماتے ہیں اور دیکھیے اس خدمت کے صلے میں اُنھیں بس کھانا دیا جاتا ہے، تنخواہ یا معاوضہ کچھ نہیں۔ چنانچہ اگر یہ سیر یا سفر کو جانا چاہیں تو اپنے طور پر نہیں جا سکتے، نہ اپنی محبوبہ عورتوں کو تحفے تحائف دے سکتے ہیں، اور نہ اوروں کی طرح جو خوشحال سمجھے جاتے ہیں یہ اپنی دوسری خواہشوں کے پورا کرنے کے لیے دام صرف کر سکتے ہیں۔ آپ نے شکایتوں کی فہرست میں یہ اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں شامل نہیں کیں۔

اس نے کہا: اچھا تو اب اُنھیں بھی شامل کیجیے۔

میں نے کہا: تو آپ پوچھتے یہ ہیں کہ ہم اس اعتراض کا کیا جواب دے سکیں گے؟

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اپنے اسی پُرانے راستے پر چلیں تو ہمیں اس مسئلے کا حل بھی مل جائے گا۔ اور ہمارا

جواب مختصراً یہ ہوگا کہ جس حالت میں یہ ہیں اس میں بھی کچھ تعجب کی بات نہ ہوگی کہ یہ لوگ اپنے آپ کو تمام انسانوں میں سب سے زیادہ آسودہ اور خوشحال پائیں۔ تاہم اگر ایسا نہ بھی ہو تو ہمارا مقصد اس ریاست کے بنانے میں خاص طور پر کسی ایک طبقے کی خوشحالی کا خیال رکھنا تو ہے نہیں بلکہ جہاں تک ہو سکے پوری ریاست کو خوشحال بنانا ہے۔ کیونکہ ہمارا گمان ہے کہ اسی قسم کی ریاست میں عدل اور انصاف کے ملنے کی سب سے زیادہ اُمید کی جاسکتی ہے۔ برخلاف اس کے کسی غیر منتظم ریاست میں ناانصافی کا ملنا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ چنانچہ ان دونوں قسم کی ریاستوں کو دیکھنے کے بعد ہم اس مسئلے کے متعلق کوئی فیصلہ کر سکیں گے جس کی تحقیق میں ہم مشغول ہیں (یعنی عدل کی ماہیت)۔ فی الحال ہم خوشحال ریاست کی تنظیم کر رہے ہیں اور یہ کسی خاص طبقے یا بعض ارکان کی خوشحالی کا خیال کر کے نہیں بلکہ تمام ریاست کو بحیثیتِ مجموعی خوشحال بنا کر، تھوڑی دیر میں ہم اس کے بالکل متضاد نظام پر نظر ڈالیں گے۔ اچھا آپ ہی غور کیجیے کہ اگر ہم کسی مورت کو رنگ رہے ہوں اور کوئی شخص ہمارے پاس آئے اور لگے ہمیں الزام دینے کہ تم سب سے خوبصورت حصے پر سب سے خوشنما رنگ نہیں لگاتے۔ چنانچہ دیکھو آنکھیں جسم کا حسین ترین حصہ ہیں لیکن تم نے بجائے خوش نما ارغوانی رنگ کے اُنھیں کالا رنگ دیا ہے تو کیا ایسے آدمی کے لیے یہ جواب کافی نہ ہوگا، کہ بھائی ہم آنکھوں کو اتنا خوبصورت نہیں بنانا چاہتے کہ وہ پھر آنکھیں نہ رہیں، نہ دوسرے اعضا کو اتنا خوشنما بنا سکتے ہیں کہ اُن کی اصلی حیثیت ہی باقی نہ رہے۔ ہاں تم یہ ضرور دیکھو کہ ہر حصے کو اس کا اصلی اور حقیقی رنگ دے کر ہم پورے مجسمے کو خوبصورت بناتے ہیں یا نہیں۔ بعینہٖ اسی طرح آپ زیرِ غور معاملے میں بھی ہمیں اس بات پر مجبور نہ کیجیے کہ ہم محافظ طبقے کو اتنا خوشحال بنا دیں کہ پھر وہ محافظ ہی باقی نہ رہیں، ورنہ پھر اسی اُصول پر ہم سے یہ مطالبہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے کسان لباسِ فاخرہ زیبِ تن کریں۔ ان کے سروں پر چھوٹے چھوٹے تاج ہوں، یہ جب چاہیں زمین جوتیں جب چاہیں نہ جوتیں۔ یا ہمارے کمہار آرام کرسیوں پر چین سے لیٹے مزے کریں۔ سامنے آگ جلتی ہو، شراب کی بوتلیں رکھی ہوں اور ہاں ایک طرف چاک بھی پڑا ہو کہ جب جی چاہے اور جتنی دیر ناگوارِ خاطر نہ ہو اس سے بھی ذرا شغل کر لیا کریں۔ اور اسی قسم کے سامانِ آسایش ہم تمام دوسرے طبقوں کے لیے بھی فراہم کریں تا کہ اس طرح سب شہر کا شہر نہایت خوشحال ہو جائے۔ لیکن مہربانی فرما کر ہمیں تو اس قسم کے مشوروں سے معاف ہی رکھیے کیونکہ آپ کی نصیحت پر عمل کرنے کی صورت میں نہ تو کسان کسان رہے گا نہ کمہار کمہار اور نہ دوسرے پیشے والے جن کے مجموعے سے ریاست عبارت ہے، اپنی صحیح حالت قائم رکھ سکیں گے اور پھر دوسرے پیشوں میں تو

چنداں ایسا نقصان بھی نہیں، مثلاً اگر جوتے بنانے والا اپنے کام میں ہوشیار نہیں نااہل ہے اور جس فن سے واقف نہیں اس کا مدعی ہے تو یہ ریاست کے لیے کوئی خطرے کی بات نہیں۔ لیکن اگر قانون اور ریاست کے محافظ صرف ظاہر میں محافظ ہوں اور حقیقت کچھ نہ ہو تو یہ تو سرے سے پوری کی پوری ریاست کی تباہی کا باعث ہوں گے، کیونکہ یہی لوگ تو ریاست میں عام مرفہ الحالی اور امن پیدا کر سکتے ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ جہاں ہمارا مقصد حقیقی محافظوں کا ایک طبقہ پیدا کرنا ہے جن میں ریاست کو نقصان پہنچانے کی کم سے کم صلاحیت ہو، وہاں ہمارے فرضی معترض کے پیشِ نظر دہقانوں کا ایک مجمع ہے جو کسی تعطیل میں خوشی سے جشن منا رہے ہیں نہ کہ ایک ریاست کے شہری۔ ہمیں دیکھنا یہ چاہیے کہ محافظ کی تربیت میں ہمارا مقصد ان کے لیے زیادہ سے زیادہ آرام و آسائش مہیا کرنا ہے، یا ہمارا فرض یہ ہے کہ یہ آرام و آسائش کل ریاست کو بحیثیتِ مجموعی میسر ہو اور ہم محافظوں اور ان کے مددگاروں کو اور یہی کیا دوسرے سب پیشے والوں کو بھی اس امر کی ترغیب دیں یا اس پر مجبور کریں کہ وہ اپنے اپنے فرض کو بہترین طریقے سے انجام دینے کی فکر کریں تاکہ پوری ریاست ایک اعلیٰ درجے کی منظم ریاست بن جائے اور پھر اس میں ہر طبقہ وہ مسرت و کامرانی پائے جو قدرت نے اُس کے لیے مقرر کی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میرے خیال میں آپ جو کچھ فرماتے ہیں بالکل صحیح ہے۔

میں نے کہا: نہ معلوم آپ اسی سے متعلق ایک دوسرے بیان کو بھی قابلِ پذیرائی سمجھیں گے یا نہیں؟

ایڈیمنٹس نے کہا: وہ کیا؟

میں نے کہا: ذرا یہ تو سوچیے کہ دوسرے اہلِ حرفہ بھی ان چیزوں سے کیا اسی طرح متاثر ہوں گے؟

ایڈیمنٹس: کن چیزوں سے؟

میں نے کہا: میرا مطلب دولت اور افلاس سے ہے۔

ایڈیمنٹس: کس طرح؟

میں نے کہا: سُنیے، یوں۔ کیا آپ کے خیال میں متمول ہو جانے کے بعد کمہار اپنے پیشے پر پہلی سی توجہ کرے گا؟

ایڈیمنٹس: ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: پہلے سے زیادہ کاہل اور بے پرواہو جائے گا۔

ایڈیمنٹس: یقیناً۔

میں نے کہا: یعنی بحیثیت کمہار پہلے سے بُرا ہو جائے گا۔

ایڈیمنٹس: بہت بُرا۔

میں نے کہا: برخلاف اس کے اگر غربت اور افلاس کے باعث وہ اپنے کام کے لیے اوزار اور پیشے کی دوسری ضرورتیں فراہم نہیں کرسکتا تو لازمی ہے کہ وہ ادنیٰ درجے کے برتن بنائے اور اس کے لڑکے اور دکان پر دوسرے کام کرنے والے پیشے کی اچھی تعلیم حاصل نہ کرسکیں۔

ایڈیمنٹس: بلاشبہ۔

میں نے کہا: یعنی یہ دونوں چیزیں دولت اور افلاس خود کاریگر کو اور اس کے مال کو بُرا بناتے ہیں۔

ایڈیمنٹس: اور کیا؟

میں نے کہا: گویا ہمیں چند اور ایسی چیزوں کا علم ہو گیا جن پر ہمارے محافظوں کو خاص طور پر نگاہ رکھنی چاہیے تاکہ وہ نظر بچا کر کہیں ہمارے شہر میں داخل نہ ہو جائیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: وہ کیا چیزیں ہیں؟

میں نے کہا: یہی دولت اور افلاس۔ کیونکہ اگر پہلی سے تعیش اور کاہلی پیدا ہوتی ہے تو دوسری سے کم ظرفی اور شرارت اور دونوں سے بے اطمینانی۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک یہ درست ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ذرا یہ بھی تو سوچیے سقراط! کہ اگر ہمیں میدانِ جنگ میں کسی دوسرے شہر سے خصوصاً کسی مالدار اور زیادہ آباد شہر سے مقابلہ کرنا پڑا تو دولت کے بغیر ہم کیا کرسکیں گے؟

میں نے کہا: ہاں اگر اس قسم کا مخالف شہر ایک ہو تو البتہ اس سے جنگ کرنا دشوار ہوگا لیکن اگر دو ہوئے تو پھر آسانی ہو جائے گی۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یہ کیسے؟

میں نے کہا: سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ فرض کرو ہمیں جنگ کرنی پڑی تو جہاں ہمارے مخالف مالدار لوگ ہوں گے وہاں ہماری امتیازی خصوصیت سپہ گری ہوگی۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یہاں تک تو بات بے شک صحیح ہے۔

میں نے کہا: تو پھر ایڈیمنٹس، کیا تمھیں اس بات کا یقین نہیں ہے کہ ایک شخص جس نے گھونسا چلانے کی خوب تعلیم پائی ہو وہ نہایت آسانی کے ساتھ دو ایسے موٹے اور مال دار آدمیوں سے لڑ سکتا ہے جو اس ہنر سے بالکل نابلد ہوں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: دونوں سے ایک ہی وقت میں تو شاید مشکل ہو۔

میں نے کہا: کیوں؟ اگر وہ پہلے کچھ پالی دے اور جیسے ہی مخالفوں میں سے ایک دوسرے سے ذرا آگے بڑھ آئے بس اس پر وار کرے اور اُسے ریل دے اور اسی طرح چلچلاتی دھوپ میں چند مرتبہ کرے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ کیا دو سے زیادہ مخالفوں کو زیر کر لے گا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ہاں، اگر ایسا کرلے تو کچھ اچنبھے کی بات تو نہیں ہوگی۔

میں نے کہا: اور فنِ جنگ کے مقابلے میں تو امیر لوگ گھونسا بازی کے اُصولوں اور اُن پر عمل کرنے کے طریقوں سے پھر بھی زیادہ واقف ہوتے ہیں!

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: تو غالب گمان یہ ہے کہ ہمارے سکھائے ہوئے سپاہیوں کو اپنے سے دوگنی یا تگنی تعداد کا مقابلہ کرنے میں زیادہ دقت نہ ہوگی۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ہاں، میں مان گیا۔ آپ ہی صحیح فرماتے ہیں۔

میں نے کہا: لیکن اس سے قطع نظر، فرض کرو کہ ہم ان دو حریفوں میں سے ایک کے پاس یہ سچا پیام کسی سفیر کے ہاتھ بھیجیں کہ ”ہم تو سونے چاندی کا استعمال کرتے نہیں اور نہ اس کی ہمارے شہر میں اجازت ہے۔ ہاں آپ کے یہاں البتہ یہ جائز ہے، اس لیے آپ اپنی فوجوں کو ہم سے لا ملائیے اور مخالفوں کا تمام مال اور ملکیت آپ کی ہو جائے گی“ تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس خبر کے بعد کوئی شخص پسند کرے گا کہ وہ دُبلے اور خوفناک کتوں کے خلاف جنگ کرے اور ان کتوں کے ساتھ مل کر موٹی لیکن نازک بھیڑوں کا شکار نہ کرے؟

ایڈیمنٹس نے کہا: کوئی کیوں ایسا کرنے لگا۔ لیکن کیا فریق مخالف کی تمام دولت کا ایک شہر میں چلا جانا اس شہر کے لیے خطرے کا باعث نہ ہوگا جو مالدار نہیں ہے؟

میں نے کہا: خوب! بخدا! میں جناب کو اس خیال پر مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ کسی ایسی چیز کو بھی

"شہر" کے نام سے موسوم کرسکتے ہیں جو ہمارے مرتب کردہ نظام کا پابند نہ ہو۔

ایڈیمنٹس نے کہا: کیوں، تو آپ پھر اُسے کیا کہیں گے؟

میں نے کہا: اُن کے لیے تو بھائی کوئی اور بڑا شاندار سا نام ہونا چاہیے کہ ان میں سے ہر ایک کئی شہروں کا مجموعہ ہے ایک شہر کہاں! اس میں کم سے کم دو شہر تو ضرور ہیں جو ایک دوسرے کے دشمن ہیں، یعنی ایک غریبوں کا شہر اور ایک امیروں کا۔ اور پھر ان میں بھی اور کئی کئی شہر ہیں۔ آپ انھیں ایک شہر سمجھ بیٹھیں تو بڑی غلطی ہوگی۔ انھیں بالکل جدا جدا شہر تصور کر کے اگر آپ ایک طبقے کو دوسرے کا مال و متاع دیں گے تو ہمیشہ آپ کے دوست زیادہ ہوں گے اور دشمن کم۔ اور میں تو خیال کرتا ہوں کہ جب تک آپ کے شہر میں سلیقے کے ساتھ انہی اُصولوں پر حکومت نہیں ہوگی جو ہم نے ابھی مرتب کیے ہیں تو فی الحقیقت یہ بہت بڑا شہر ہوگا۔ میرا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ یہ بڑے شہر کی حیثیت سے مشہور بھی ہوگا البتہ واقعتاً بہت بڑا ہوگا چاہے اس کی فوج ہزار آدمیوں سے زیادہ کی نہ ہو۔ کیونکہ آپ کو اتنا بڑا شہر نہ یونان میں ملے گا نہ اس کے باہر غیر متمدن ممالک میں۔ اگرچہ ایسے شہر بہت سے ملیں گے جو بظاہر اس سے کئی گنا بڑے معلوم ہوتے ہوں۔ آپ اس معاملے میں مجھ سے اختلاف تو نہیں کرتے۔

اس نے کہا: نہیں، مطلق نہیں۔

میں نے کہا: اور یہی ہمارے حکمرانوں کے لیے ریاست کی وسعت کو متعین کرنے کا معیار ہوگا جس کے مطابق وہ ریاست کے لیے زمین کا ایک مناسب رقبہ مقرر کر دیں گے اور اس کے باہر کسی اور چیز سے سروکار نہ رکھیں گے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: وہ معیار کیا ہے؟

میں نے کہا: یہی کہ جہاں تک شہر کی توسیع، اس کی وحدت یا اس کے ایک شہر ہونے میں حائل نہ ہو وہاں تک اُسے بڑھنے دیا جائے، اس کے آگے ہرگز نہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک یہ قاعدہ ہے تو خوب۔

میں نے کہا: تو پھر ہم اپنے محافظوں پر یہ فرض اور عائد کریں گے کہ وہ اس بات کا خیال رکھیں کہ شہر نہ تو بہت چھوٹا ہو نہ دیکھنے میں بہت بڑا۔ بلکہ اس کی امتیازی خصوصیت اس کی وحدت اور اس کا کافی بالذات ہونا ہو۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یہ تو ایک معمولی سا فرض ہے جو ان کے سپرد کیا جاسکتا ہے۔

میں نے کہا: اس پر ہم ایک اور اس سے بھی معمولی فرض کا اضافہ کریں گے جس کا سرسری سا تذکرہ ہم اس وقت کر چکے ہیں جب اثنائے گفتگو میں ہم نے کہا تھا کہ یہ مناسب ہوگا کہ اگر طبقہ محافظین میں کوئی بچہ ادنیٰ قسم کا پیدا ہو تو اُسے نیچے کسی دوسرے طبقے میں بھیج دیا جائے اور نیچے طبقوں میں اگر کوئی غیر معمولی خوبی کا بچہ پیدا ہو تو اُسے محافظوں کے طبقے میں جگہ دی جائے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے شہریوں کو بھی اس کام پر رکھنا چاہیے جس کے لیے قدرت نے اُنھیں بنایا ہے، یعنی ہر شہری کو کوئی ایک کام دیا جائے تا کہ ہر ایک اپنے مخصوص کام کو انجام دے اور اس طرح ایک انسان بنے، نہ کہ کئی انسان، اور پھر ان کی مجموعی مساعی سے جو شہر پیدا ہو وہ ایک شہر ہو، نہ کہ کئی شہروں کا مجموعہ۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ہاں، یہ پہلے سے بھی زیادہ معمولی فرض ہے۔

میں نے کہا: بے شک۔ ہماری ان ہدایات اور احکام پر عمل کرنا کوئی دشوار کام نہیں، جیسے ممکن ہے بعض لوگ خیال کریں۔ بلکہ اگر ہمارے محافظ ایک اہم بات کو ہر وقت پیشِ نظر رکھیں تو یہ نہایت معمولی باتیں ہو جائیں گی۔

اس نے کہا: وہ بات کیا ہے؟

میں نے کہا: تعلیم اور تربیت۔ کیونکہ اگر اچھی تعلیم دے کر اُنھیں سمجھ دار انسان بنا دیا جائے تو پھر وہ آسانی سے ان تمام مسئلوں کا حل معلوم کر سکیں گے جن کا ہم نے تذکرہ کیا ہے یا جنھیں ہم نے فی الحال نظر انداز کر دیا ہے، مثلاً مرد اور عورت کا تعلق، شادی بیاہ، اور توالد و تناسل، جن سب میں جہاں تک ہو سکے اس مقولے کا خیال رکھنا چاہیے کہ ''دوستوں میں تمام چیزیں مشترک ہوتی ہیں''۔

اس نے کہا: جی ہاں، یہ سب سے بہتر تدبیر ہے۔

میں نے کہا: اور سچ یہ ہے کہ جب ریاست کی ابتدا ایک مرتبہ صحیح طریقے پر ہو گئی تو پھر یہ جیسے جیسے بڑھتی ہے چلتے پہیے کی طرح اس کا زور بڑھتا جاتا ہے۔ تعلیم و تربیت کے اچھے چلنے سے اچھی طبائع پیدا ہوتی ہیں اور اچھی طبائع اس اچھی تعلیم کی مدد سے اور بھی بہتر بن جاتی ہیں اور دوسرے حیوانوں کی طرح منجملہ اور صفات کے اولاد میں بھی ترقی ہوتی ہے۔

اس نے کہا: بے شک، یہ تو قدرتی بات ہے۔

میں نے کہا: چنانچہ مختصراً ریاست کے نگرانوں کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اس اُصول کی سختی سے پابندی کریں اور بلا اپنے علم کے اس میں کوئی تبدیلی نہ ہونے دیں، بلکہ ہر دوسری چیز کے مقابلے میں اس کی حفاظت کریں اور وہ اُصول یہ ہے کہ تعلیم کی ہر دو اصناف، ورزش اور موسیقی، کے موجودہ مقرر کیے ہوئے نظام میں کوئی بدعت یا ترمیم روا نہ رکھیں بلکہ اسی پر سختی سے کاربند رہیں۔ لہٰذا جب یہ کہا جائے کہ "لوگ اُس گیت پر سب سے زیادہ توجہ کرتے ہیں جو بالکل نیا ہو" اور جس کی موسیقی مغنّی پر چھا جاتی ہو تو اندیشہ ہے کہ لوگ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ شاعر کا مفہوم صرف نئے گیتوں سے ہی نہیں بلکہ موسیقی کے نئے طریقوں سے بھی ہے اور اس میں بھی جدّت قابلِ تعریف بات ہے۔ حالانکہ اس میں جدّت ہرگز قابلِ تحسین نہیں اور نہ ان الفاظ کا یہ مفہوم ہے۔ موسیقی کے نئے طریقوں کے اجرا سے تو سخت پرہیز کرنا چاہیے کہ اس سے ریاست کا وجود ہی معرضِ خطر میں آ جاتا ہے، کیونکہ اس میں تجدّد و تبدّل اہم ترین سیاسی نظاموں کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ کم سے کم ڈیمون کا یہی خیال ہے اور میں اس پر یقین کرتا ہوں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میرا شمار بھی اس خیال کی تائید کرنے والوں میں کیجیے۔

میں نے کہا: جہاں تک میں دیکھ سکتا ہوں، یہ موسیقی ہی وہ نقطہ ہے جہاں ہمارے محافظوں کو اپنے حفاظت خانے کی تعمیر کرنی چاہیے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ہاں، کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں سے بے آئینی چپکے چپکے دبے پاؤں داخل ہوتی ہے۔

میں نے کہا: ہاں، شر اور فساد کا گمان بھی نہیں ہوتا اور یہ تفریح کے بھیس میں آ جاتی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: اور شر اور فساد بپا بھی کیا کرتی ہے! صرف یہ کہ جہاں ذرا قدم جما لیا کہ بس لگی رفتہ رفتہ خاموشی سے لوگوں کے رسموں اور طور طریقوں پر اثر ڈالنے اور اس طرح قوت پکڑ کر باہمی معاہدوں میں اپنا ظہور کرنے۔ پھر کیا ہے، اب تو اس کا حملہ ملکی اور اساسی قانون پر اس دیدہ دلیری سے شروع ہوتا ہے کہ انجام کار سقراط! ہر چیز، خواہ جماعتی ہو، خواہ شخصی، ایک مرتبہ درہم برہم ہو جاتی ہے۔

میں نے کہا: سچ کہتے ہو، یہ ایسی چیز ہے۔

اس نے کہا: میں تو یہی سمجھتا ہوں۔

میں نے کہا: لہٰذا کیا ہمیں اس بات کا انتظام بھی نہیں کرنا چاہیے کہ شروع ہی سے ہمارے بچوں کی

تفریح جائز حدود سے باہر نہ ہونے پائے کیوں کہ جہاں ایک مرتبہ بچوں کو ناجائز تفریحوں کا چسکا پڑ گیا بس پھر ناممکن ہو جاتا ہے کہ یہ بڑے ہو کر نیک اور وفادار آدمی بن سکیں۔

اس نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: اور اگر شروع ہی سے موسیقی کے ذریعے بچوں کے دماغ میں وفاداری کے خیالات جڑ پکڑ جائیں تو نتیجہ اس کے بالکل برعکس ہوگا۔ یہ وفاداری ان کی ترقی کا باعث ہوگی، اس کا ظہور اُن کے ہر عمل میں ہوگا اور اگر ریاست کا کوئی کونا کھسک بھی جائے گا تو یہ اسے جھٹ پھر سے بنالیں گے۔

اس نے کہا: بے شک، یہ بالکل سچ ہے۔

میں نے کہا: اور ان لوگوں کی نظر ان چھوٹے چھوٹے اخلاق و آداب پر بھی ضرور رہے گی جنھیں دوسروں نے، جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں، پس پشت ڈال دیا ہے۔

اس نے کہا: آپ کا مطلب کن آداب سے ہے؟

میں نے کہا: مثلاً بڑوں کے سامنے چھوٹوں کا متانت اور خاموشی سے بیٹھنا، جب وہ آئیں تو اُٹھ کر اُن کی تعظیم کرنا، جھک کر آداب بجالانا، والدین کا ہر طرح سے خیال رکھنا، یا مثلاً سر کے بال ٹھیک بنانا، جوتے کپڑے اور ذاتی آرائش کا مناسب خیال کرنا، اُٹھنے بیٹھنے میں شائستگی اور عام سلیقہ۔ کیوں بھائی، ٹھیک ہے نا؟

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: ان باتوں کے متعلق قانون بنانا تو احمقانہ سی بات ہوگی، میں تو جانتا ہوں کہ ایسا ہوتا نہیں اور نہ میرے خیال میں ان اُمور کی بابت لفظی قانون کچھ پائیدار ثابت ہو سکتا ہے۔

اس نے کہا: بے شک، کیسے ہو سکتا ہے؟

میں نے کہا: ایڈیمنٹس، البتہ تعلیم کے ذریعے جو رجحان پیدا کر دیا جائے وہ ان تمام چیزوں پر مؤثر ہوتا ہے، کیونکہ اچھی چیز اچھی کو اور بُری بُری کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

اس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: چنانچہ میری خیال میں ہمیں اُمید رکھنی چاہیے کہ جو نظام ہم نے مرتب کیا ہے اس سے کوئی کامل اور شاندار نتیجہ ضرور نکلے گا، خواہ یہ نتیجہ اچھا ہو یا بُرا۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اسی وجہ سے میں ان باتوں کے متعلق جن کا ذکر ہوا قانون بنانا ضروری نہیں سمجھتا۔

اس نے کہا: اور یہی قرینِ عقل ہے۔

میں نے کہا: لیکن کچھ اور معاملات بھی تو ہیں اُن کے متعلق کیا رائے ہے؟ مثلاً بازار میں لوگوں کی باتیں، لین دین، یا اہلِ حرفہ کے باہمی معاہدے، کسی پر الزام لگانے یا حملہ کر دینے کے متعلق قانونی چارہ جوئی، یا فہرستِ وکلا کی تدوین، یا سرکاری محاصل کا مسئلہ، یا بازار یا بندرگاہ پر چنگی لینے کا سوال، اور بازار، پولیس، اور چنگی وغیرہ کے تمام قاعدے اور ضابطے۔ کیا ہمیں ان سارے معاملات سے متعلق بھی قانون بنانا چاہیے؟

اس نے کہا: نہیں۔ میرے خیال میں تو نیک اور تعلیم یافتہ آدمیوں کو ان باتوں کے متعلق ہدایات دینا محض وقت ضائع کرنا ہے، کیونکہ اکثر و بیشتر ان لوگوں کو صحیح قانون کے خود معلوم کر لینے میں کوئی دقت نہیں پڑے گی۔

میں نے کہا: ہاں۔ بشرطیکہ خدا انھیں ان قوانین کی پابندی کی توفیق عطا فرمائے جو ہم بنا چکے ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: اور یہ خدائی مدد شامل حال نہ ہوئی تو قانون کو مکمل کرنے کی نیت سے یہ لوگ اپنی تمام عمر نئے نئے قانون نافذ کرنے اور ان میں نئی نئی ترمیم میں کرنے میں گنوا دیں گے۔

میں نے کہا: آپ کے خیال میں ان کی مثال ان لوگوں کی سی ہوگی جو اگرچہ بیمار ہیں لیکن اپنے نفس پر قابو نہ رکھنے کے باعث زندگی کے اس طریقے کو جو صحت کے لیے مضر ہے ترک نہیں کر سکتے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی، ان کی مثال بس ٹھیک یہی ہے۔

میں نے کہا: اور واہ واہ، یہ لوگ زندگی بھی کیا خوب بسر کرتے ہیں، ہمیشہ طبیبوں کے تختۂ مشق ہیں، لیکن فائدے کا تو ذکر ہی کیا اپنے روگ کو اور زیادہ شدید اور پیچیدہ بنا لیتے ہیں، البتہ یہ آس ہمیشہ لگی رہتی ہے کہ کوئی تو کبھی ایسی دوا بتا ہی دے گا جس سے پوری شفا حاصل ہو جائے گی۔

اس نے کہا: جی ہاں، ان مریضوں کی تو یہی حالت ہوتی ہے۔

میں نے کہا: اور لطف یہ کہ یہ لوگ ہر اس شخص کو اپنا دشمن جانتے ہیں جو انھیں حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا اور انھیں یقین دلاتا ہے کہ جب تک آپ اپنی شراب خوری، عیاشی، پُرخوری اور کاہلی کو نہیں چھوڑیں گے اس وقت تک نہ کوئی دوا کام دے سکتی ہے، نہ تیزابوں کا استعمال اور نہ جراحی اور نہ جھاڑ پھونک سے، نہ گنڈے تعویذ سے کام چل سکتا ہے۔

ایڈیمنٹس نے جواب دیا: لطف! اس میں کیا لطف ہے کہ ایک آدمی تو آپ کو سچی نصیحت کر رہا ہے اور آپ ہیں کہ خفا ہوئے جاتے ہیں!

میں نے کہا: معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایسے لوگوں کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے؟

اس نے کہا: نہیں، ہرگز نہیں دیکھتا۔

میں نے کہا: لہٰذا اگر سارا شہر کا شہر انھی لوگوں کی طرح ہو جائے تو یہ بھی آپ پسند نہیں کریں گے اور کیا افراد کی طرح ریاستیں بھی اس مرض میں مبتلا نہیں ہوتیں کہ باوجود اپنے اساسی قانون کی خرابی کے اور اُس کے نقائص کے باوجود یہ اپنی رعایا کو اس کے چھیڑنے اور تبدیل کرنے سے روکتی ہیں اور اگر کوئی ایسی کوشش کرے تو اُسے موت کی سزا دی جاتی ہے۔ ہاں، وہ شخص البتہ نہایت اچھا، عقلمند اور قابلِ عزت سمجھا جاتا ہے جو رائج نظام کے ماتحت رہ کر ان کی خدمت انجام دے اور خوشامد درآمد اور ذلیل طریقوں سے ان کی خوشنودی حاصل کرے، اُن کی خواہشوں کو پہلے سے تاڑ لے اور انھیں پورا کرنے کی قابلیت بھی رکھتا ہو۔ کیوں، ان ریاستوں کی مثال ان ہی کی سی ہے نا، جن کا ہم ذکر کر رہے تھے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک، میں تو ان دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں دیکھتا اور نہ اس طرزِ عمل کو پسند کرتا ہوں۔

میں نے کہا: اور کیا ان لوگوں کی ہمت اور ہوشیاری قابلِ داد نہیں جو ایسی ریاستوں کی خدمت کے لیے آمادہ ہوتے ہیں بلکہ اس کے متمنی بھی رہتے ہیں۔

اس نے کہا: جی ہاں، ہوگی۔ لیکن ان لوگوں کی نہیں، جو بہت سے آدمیوں سے اپنی تعریف سُن کر خود اس دھوکے میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ یہ واقعتاً نہایت عقلمند مدبّر ہیں۔

میں نے کہا: ارے کیوں، بھائی تم کیا کہتے ہو۔ ان بے چاروں پر ظلم نہ کرو۔ تمھارے خیال میں اگر ایک شخص ہے جو پیمائش کے متعلق ایک حرف نہیں جانتا اور اسی جیسے بہت سے جاہل لوگ اُس سے کہتے ہیں کہ تم دو گز اونچے ہو تو کیسے ممکن ہے کہ وہ اُن پر یقین نہ کرلے۔

اس نے جواب دیا: جی ہاں، یہ تو ممکن نہیں۔

میں نے کہا: تو پھر ان غریبوں سے کیوں خفا ہوتے ہو؟ یہ تو بڑے دلچسپ لوگ ہیں، جو اس خیال میں مگن ہیں کہ جن چیزوں کا ذکر ہوا ان کے متعلق اپنی دائمی قانون سازی اور ترامیم سے، یہ اس جعل سازی کا

سدِّ باب کر سکیں گے جو معاہدوں میں آئے دن کیے جاتے ہیں، اور ان دوسری بدمعاملگیوں کا بھی جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ یہ بے چارے یہ نہیں سوچتے کہ فی الحقیقت ایک ہزار سر والے جانور کے سر کاٹنے کی سعی لاحاصل میں مشغول ہیں۔

اس نے جواب دیا: بے شک، بس ٹھیک یہی ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

میں نے کہا: اور میں تو ایک حقیقی قانون ساز کا، خواہ وہ بُری ریاست میں ہو یا اچھی میں، ہرگز یہ فرض نہیں سمجھتا کہ وہ قانون اور حکومت کے تفصیلی ضابطوں کے متعلق اپنا سر کھپائے، کیونکہ پہلی صورت میں تو یہ سارے ضابطے سراسر بے سود ہوں گے اور دوسری حالت میں ہر شخص کچھ قاعدے تو خود بنالے گا اور کچھ خود بخود سابقہ قانون سے پیدا ہو جائیں گے۔

اس نے جواب دیا: تو اب قانون ساز کی حیثیت سے ہمارے لیے کیا کام باقی رہا؟

میں نے کہا: ہمارے لیے تو کچھ باقی نہیں رہا۔ لیکن ڈیلفی (Delphi) کے دیوتا اپالو کے لیے قانون سازی کا سب سے بڑا اور سب سے اعلیٰ اور سب سے اہم کام باقی ہے۔

اس نے جواب دیا: وہ کیا ہے؟

میں نے کہا: عبادت گاہوں کی تعمیر، قربانیوں اور دیوتاؤں اور سورماؤں کے متعلق دوسری رسموں کا تعین، مُردوں کے جلانے کا طریقہ، اور ان تمام رسموں کے متعلق ہدایات جن کا اختیار کرنا ساکنانِ عالمِ بالا کی خوشنودی کے لیے ضروری ہے۔ یہ سب ایسی باتیں ہیں کہ ہم ان کے متعلق کچھ نہیں جانتے اور اپنے نظامِ حکومت کی ترتیب میں ان معاملات کی بابت ہمیں سوائے اپنے قدیم قومی ترجمان کے اور کسی کی نصیحت یا مشورے پر کاربند نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہی وہ دیوتا ہے جو بیچ میں نافِ زمین پر اپنے پُرجلال تخت کے اوپر بیٹھا ہوا تمام اس قسم کے معاملوں پر ہماری قوم کے تمام افراد کے فرائض کی ترجمانی کرتا ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: آپ بالکل صحیح ارشاد فرماتے ہیں، ہمیں بے شک یہی کرنا چاہیے۔

میں نے کہا: اچھا تو ارسٹن کے سپوت، اب ہماری ریاست کی تنظیم مکمل ہو گئی، چنانچہ تمہارا دوسرا فرض یہ ہے کہ نور و بصیرت کا کچھ سرمایہ ساتھ لے کر، اور اپنے بھائی اور پولیمارکس وغیرہ کی مدد سے اس جستجو میں لگ جاؤ کہ اس ریاست میں عدل کہاں ہے اور ظلم کہاں، تاکہ دونوں کا فرق معلوم ہو جائے اور یہ ظاہر ہو سکے

کہ اگر کوئی آدمی خوشی اور مسرت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اُسے ان میں سے کس چیز کی ضرورت ہوگی چاہے دیوتا اور انسان اسے دیکھتے ہوں یا نہ دیکھتے ہوں۔

گلوکون نے کہا: جی نہیں، یوں کام نہیں چلے گا۔ یہ جستجو تو آپ نے اپنے ذمے لے لی تھی اور یہ فرمایا تھا کہ اگر میں نے عدل اور انصاف کی حتی الوسع مدد نہ کی تو میں ایک گناہ کا مرتکب ہوں گا۔

میں نے کہا: ہاں، سچ ہے۔ مجھے یاد ہے میں نے یہ کہا تھا کہ میں اس کے لیے تیار بھی ہوں۔ البتہ، ذرا آپ لوگ بھی ساتھ دیں۔

گلوکون نے کہا: ہاں، ہم حاضر ہیں۔

میں نے کہا: پھر تو مجھے امید ہے کہ ہم جس چیز کی تلاش میں ہیں اُس کا پتا ضرور لگا لیں گے۔ اچھا، سنیے، چونکہ ہم نے اپنی ریاست کی بالکل صحیح تنظیم کی ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک کامل ریاست ہوگی۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

گلوکون نے کہا: ہونا تو چاہیے۔

میں نے کہا: یعنی دوسرے لفظوں میں یہ ریاست عاقل وحکیم، باہمت وشجاع، ضابطِ نفس وعفیف اور منصف وعادل ہوگی (کہ اچھائی انھی چار صفات سے عبارت ہے)۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: چنانچہ ان چار صفات میں سے اگر ہم چند کا پتا ریاست میں لگا لیں تو باقی جو رہے گا وہ دوسری صفات پر مشتمل ہوگا۔

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: فرض کیجیے کہ کوئی اور چیز چار اشیا پر مشتمل ہوتی اور ہم ان میں کسی ایک کے متلاشی ہوتے، تو اُس وقت دو صورتیں ممکن تھیں، یعنی یا تو یہ چیز ہمیں دوسرے تین اجزا سے پہلے معلوم ہو جاتی اور ہم مطمئن ہو جاتے، یا پھر ہم ان تین کو پہلے معلوم کر لیتے تو شے مطلوبہ خود بخود معلوم ہو جاتی، اس لیے کہ وہ سوائے باقی ماندہ کے اور کیا ہو سکتی ہے؟

اس نے کہا: آپ صحیح فرماتے ہیں۔

میں نے کہا: جس مسئلے پر ہم غور کر رہے ہیں اس میں بھی تو چار صفات زیرِ بحث ہیں، پھر ہم کیوں نہ

یہی طریقہ اختیار کریں؟

گلوکون نے کہا: ضرور کرنا چاہیے۔

میں نے کہا: اچھا تو شروع کیجیے۔ پہلی صفت تو آسانی سے دکھائی دیتی ہے، لیکن اسی سلسلے میں ایک خاص بات نظر آتی ہے۔

گلوکون نے کہا: وہ کیا؟

میں نے کہا: دیکھیے، ہماری ریاست اسی حد تک یا اسی لیے تو عاقل و حکیم ہے کہ وہ محتاط اور دوراندیش ہے۔

گلوکون: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور یہ دوراندیشی اور احتیاط کی صفت اپنی جگہ پر ایک قسم کا علم ہے، کیونکہ لوگ جہل سے ارادتاً محتاط اور دوراندیش نہیں بنتے بلکہ علم سے۔

گلوکون: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: لیکن ہماری ریاست میں تو بہت سے مختلف اقسام کے علم ہیں۔

گلوکون: بے شک۔

میں نے کہا: تو کیا ہماری ریاست اپنے بڑھئیوں کے علم کی وجہ سے عاقل یا دوراندیش و محتاط کہلائے گی۔

گلوکون: ہرگز نہیں۔ کیونکہ اس علم کی وجہ سے تو یہ فنِ نجاری کے اعتبار سے اچھی خیال کی جائے گی۔

میں نے کہا: ہاں، تو پھر کیا چوبی آلات کے متعلق جس علم سے کام لیا جاتا ہے اُس کا وجود ہماری ریاست کو عاقل کے لقب کا مستحق کر دے گا۔

گلوکون: ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: تو شاید پیتل کے برتن بنانے کا علم یا اسی قسم کی اور کوئی چیز اسے یہ استحقاق بخش دے گی؟

گلوکون نے کہا: نہ یہ بخش سکتی ہے، نہ وہ۔

میں نے کہا: اسی طرح فنِ زراعت کا علم ہمیں اس کا مستحق تو کر دے گا کہ ہم اپنی ریاست کو ایک

مر، زرعی ریاست کہہ سکیں لیکن اسے اس بنا پر عاقل نہیں کہہ سکیں گے۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: تو پھر بتایئے کہ ہماری اس نئی ریاست میں علم کی کوئی قسم ایسی بھی ہے جو شہریوں کے سے طبقے میں پائی جاتی ہو جو ریاست کے صرف کسی حصے تک اپنی کارروائیاں محدود نہ رکھتا ہو بلکہ اس کے سامنے ساری ریاست بحیثیت ریاست کے ہو اور جو اس کل کے داخلی اور خارجی تعلقات خوبی کے ساتھ ترتیب دیتا ہو۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: وہ علم کون سا ہے اور کن لوگوں میں پایا جاتا ہے۔

اس نے کہا: وہ علم ہے ہماری حفاظت کا علم، اور وہ اس حکمران جماعت میں پایا جاتا ہے جسے ہم نے محافظوں کی جماعت کے نام سے موسوم کیا ہے۔

میں نے کہا: اس علم کے وجود کی وجہ سے آپ ریاست کو کیا کہتے ہیں؟

اس نے کہا: میں اسے محتاط، دوراندیش اور عاقل کہتا ہوں۔

میں نے کہا: اچھا اب فرمایئے کہ ہماری ریاست میں اس طبقے کے آدمی زیادہ تعداد میں ہوں گے یا ٹھٹھیرے؟

اس نے جواب دیا: ٹھٹھیرے کہیں زیادہ ہوں گے۔

میں نے پوچھا: تو کیا اور سب طبقوں کے مقابلے میں جو دوسرے علوم وفنون کے جاننے کی وجہ سے مختلف ناموں سے پکارے جاتے ہیں یہ محافظوں کا طبقہ گنتی میں کم ہوگا؟

اس نے کہا: ہاں، یہ گنتی میں سب سے کم ہوگا۔

میں نے کہا: یعنی وہ سب سے چھوٹے گروہ یعنی حکمران طبقے کا علم ہوتا ہے جو کسی ریاست کو، جو فطرت کے مطابق مرتب کی گئی ہو، مجموعی حیثیت سے عاقل کہلائی جانے کا مستحق بناتا ہے اور وہ جماعت ریاست میں سب سے چھوٹی جماعت ہوتی ہے جس کا حق اور فرض اس علم سے کام لینا ہے جو تمام دوسرے علوم کے مقابلے میں حقیقی عقلمندی کہلایا جاسکتا ہے۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اچھا تو ہم نے کسی نہ کسی طرح منجملہ چار کے ایک صفت کا پتا تو لگا لیا اور ریاست کے اُس حصے کا بھی جہاں یہ ملتی ہے۔

گلوکون نے کہا: میرے خیال میں تو ٹھیک ہی پتا چلا لیا ہے۔

میں نے کہا: اسی طرح یقیناً ہمت اور شجاعت کی صفت کا پتا لگانا بھی چنداں مشکل نہ ہوگا جس کی موجودگی ریاست کو شجاع اور بہادر کہلانے کا مستحق کرتی ہے اور نہ ریاست کے اس حصے کے معلوم کرنے میں کچھ دشواری ہوگی جس میں یہ صفت پائی جاتی ہے۔

گلوکون نے کہا: یہ کیسے؟

میں نے کہا: کسی شہر کی بزدلی یا بہادری پر رائے دینے کے لیے سوائے اس طبقے کے جو اس کی حفاظت کے لیے جنگ کرتا اور اُس کی جانب سے میدان میں آتا ہے اور کس طبقے کو کوئی کیوں دیکھنے لگا؟

گلوکون نے کہا: بے شک۔ اور کسی کو کیوں دیکھے گا؟

میں نے کہا: دوسرے شہری چاہے بہادر ہوں، چاہے بزدل، اُن کی بہادری اور بزدلی کی وجہ سے شہر بہادر یا بزدل نہیں ہوگا۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں، نہیں ہے۔

میں نے کہا: لہٰذا کسی شہر کی شجاعت اور بہادری، عقلمندی کی طرح، اس کے ایک حصے کی صفات پر مبنی ہے، کیونکہ اس حصے میں ایسی قوت ہے کہ لوگوں میں ان چیزوں کے متعلق صحیح خیالات کو ہمیشہ بے خلل قائم اور محفوظ رکھتا ہے جن سے لوگوں کو ڈرنا چاہیے اور جن سے نہیں ڈرنا چاہیے اور لوگوں کو اس بات کی تعلیم بھی دیتا ہے کہ یہ چیزیں دراصل ویسی ہی ہیں جیسی کہ مجوزہ تعلیم میں قانون ساز جماعت نے ظاہر کی ہیں اور کیا یہی کام بہادری اور شجاعت نہیں؟

گلوکون نے کہا: میں ٹھیک سمجھا نہیں، ذرا مہربانی فرما کر دوہرا دیجیے۔

میں نے کہا: میں کہتا ہوں کہ بہادری ایک طرح کی حفاظت ہے۔

گلوکون نے کہا: کس قسم کی حفاظت؟

میں نے کہا: اس خیال کی حفاظت جو قانون نے تعلیم کے ذریعے چیزوں کے متعلق پیدا کیا ہے کہ کن سے ڈرنا چاہیے، کن سے نہیں ڈرنا چاہیے اور جب میں نے اس خیال کے بلاخلل اور بالتواتر قیام کا ذکر

کیا تو میرا مقصد یہ تھا کہ یہ خیال راحت والم، آرزو اور خوف کی متخالف کیفیتوں میں برابر ایک سا قائم رہے اور اسے کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔ آپ چاہیں تو میں اُسے ایک برمحل تمثیل سے زیادہ واضح کردوں؟

گلوکون نے کہا: ضرور۔

میں نے کہا: آپ جانتے ہیں کہ جب رنگریز اُون کو ارغوانی رنگنا چاہتا ہے تو اُون کی بہت سی قسموں میں سے ایک قسم یعنی سفید اُون لیتا ہے، اور پھر بہت سے مراحل طے کرتا ہے تاکہ اُس پر رنگ چوکھا چڑھے۔ اس سب عمل کے بعد اُسے رنگنا شروع کرتا ہے اور جب اس طرح اُون رنگا جائے تو اُس کا رنگ پکا ہوتا ہے اور چاہے بے صابن کے دھویئے، چاہے صابن سے رگڑیے اس رنگ کی چمک کم نہیں ہوتی، اور اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو نتیجہ ظاہر ہے۔

گلوکون نے کہا: ہاں، ورنہ رنگ کچھ عجیب بُری طرح اُڑ جاتا ہے۔

میں نے کہا: اس سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہم اپنے سپاہیوں کے انتخاب اور انھیں ورزش اور موسیقی کی تعلیم دینے میں اس قدر محنت اور جانفشانی کیوں کر رہے تھے۔ ہم چاہتے تھے کہ ان پر قوانین کا رنگ چڑھ جائیں تاکہ فطری جوہر اور اچھی تعلیم سے قابلِ خوف اشیا نیز دوسرے معاملات کے متعلق ان کے خیالات پکے اور اُمٹ ہو جائیں اور یہ رنگ راحت والم، آرام وتکلیف، خوف و آرزو جیسی رنگ کاٹنے والی چیزوں سے بھی نہ اُڑ سکے کہ یہ چیزیں اس امر میں اچھے سے اچھے کھار اور صابن سے زیادہ کارگر ہوتی ہیں۔ میں اسی قوت کو جو قابلِ خوف اور ناقابلِ خوف چیزوں کے متعلق صحیح اور آئینی خیالات وافکار کو محفوظ رکھتی ہے، ہمت اور جرأت سے تعبیر کرتا ہوں اور آپ معترض نہ ہوں تو اسی نام سے اسے موسوم کروں۔

گلوکون نے کہا: نہیں، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان معاملات کے متعلق صحیح رائے اگر بلا تعلیم کے قائم بھی ہو جائے، جیسے حیوانوں اور غلاموں میں، تو آپ اسے جائز خیال نہ فرمائیں گے اور اس کے لیے کوئی اور نام تجویز کریں گے۔

میں نے کہا: بلاشبہ۔

گلوکون نے کہا: تو پھر میں ہمت اور جرأت کی یہ تعریف قبول کرتا ہوں۔

میں نے کہا: کم سے کم شہریوں کی شجاعت وہمت کی تعریف تو اسی کو سمجھیے کسی اور موقع پر اس معاملے پر اور تفصیل سے گفتگو کریں گے۔ اس وقت تو ہمارا اصلی مقصود عدل کی ماہیت دریافت کرنا ہے اور اس غرض

کے لیے ہم نے بس شجاعت اور ہمت کی کافی تحقیق کر لی۔

گلوکون نے کہا: بے شک، آپ کا ارشاد بجا ہے۔

میں نے کہا: اب دو چیزیں باقی رہیں جن کا سُراغ ریاست میں اور لگانا ہے یعنی عفت اور ضبطِ نفس (اعتدالِ ذات) اور پھر عدل اور انصاف جو اس ساری تحقیق کا سبب ہے۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اگر ہم عفت کے متعلق پریشان نہ ہوں تو کیا طریقہ ہے کہ عدل کی حقیقت معلوم کر لیں؟

اس نے کہا: میرے علم میں تو کوئی ایسا طریقہ نہیں، اور نہ میں چاہتا ہوں کہ بلاعفت کی حقیقت معلوم کیے عدل کی ماہیت کا انکشاف ہو جائے، لہٰذا اگر آپ مجھے ممنون کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اسی کو لیجیے۔

میں نے کہا: کیوں نہیں، مجھے آپ کی خاطر ضرور منظور ہے۔

اس نے کہا: اچھا، تو شروع کیجیے۔

میں نے کہا: بہت مناسب۔ میرے خیال میں عفت میں بہ نسبت پچھلی صفات کے تناسب اور توازن کی کیفیت زیادہ پائی جاتی ہے۔

گلوکون نے کہا: کیسے؟

میں نے کہا: عرفِ عام میں عفت شہوتوں اور نفسانی خواہشات پر قابو اور غلبہ پانے کا نام ہے، مثلاً لوگ عام بول چال میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص کو "اپنے اوپر کیسا قابو ہے" اور اسی قسم کے دوسرے محاوروں میں اس خیال کا اثر جھلکتا ہے۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: لیکن یہ محاورہ "اپنے اوپر قابو ہونا" کیسا تمسخر انگیز ہے۔ جس شخص کو اپنے قابو ہے وہ اگر اپنا آقا ہے تو خود ہی غلام بھی ہے اور پھر غلام ہی آقا ہے! کیونکہ ان تمام صفات کا مورد تو اُسی کی ذات ہے۔

گلوکون نے کہا: اور کیا۔

میں نے کہا: میرے خیال میں اس کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود انسان میں یعنی اس کی روح میں مختلف اجزا ہیں، ایک اچھا اور ایک بُرا اور جب یہ فطری اچھا جزو بُرے جزو پر غالب ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ

انسان کو اپنے اوپر قابو ہے اور ایسا کہنے سے گویا اس شخص کی تعریف مقصود ہوتی ہے، لیکن جب ناقص تعلیم یا بُری صحبت کی وجہ سے اس اچھے جز کی قوت بُرے اجزا کی زیادتی سے دب جاتی ہے تو ایسے آدمی کو بُرائی اور ملامت کے الفاظ سے یاد کرتے اور اُسے آوارہ اور نفس کا غلام کہتے ہیں۔

گلوکون نے کہا: ہاں، بات تو قرینِ قیاس ہے۔

میں نے جواب دیا: اب اپنی نظر اس نئی ریاست پر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ مذکورہ دو صورتوں میں سے ایک اس میں بھی پائی جاتی ہے اور اگر عفت (اقتدار علی النفس) کے معنی یہی ہیں کہ اچھا جز بُرے پر غالب اور حاکم ہو تو یقیناً ہماری ریاست کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ اسے اپنے نفس پر قابو ہے۔

اس نے پوچھا: جی، میں نے نظر ڈال لی اور آپ کے بیان کی تصدیق کرتا ہوں۔

میں نے کہا: آپ غالباً یہ بھی مان لیں گے کہ یہ شہوات اور آلام اور آرزوئیں جو نت نئی شکل اختیار کرتی ہیں عموماً بچوں، عورتوں، نوکروں یا ان نام نہاد آزاد اشخاص میں پائی جائیں گی جو اَن گھڑ اور کثیر التعداد نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: برخلاف اس کے وہ سادہ اور معتدل خواہشیں جو عقلِ سلیم اور خیالاتِ صحیحہ کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور جن کی رہنمائی برابر عقل کرتی رہتی ہے عموماً اس کم تعداد والے گروہ میں پائی جاتی ہیں جنھیں قدرت کی طرف سے بھی بہترین جوہر ودیعت ہوا ہے اور پھر اچھی تعلیم اس پر سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔

اس نے جواب دیا: بے شک۔

میں نے کہا: کیا اسی کے مماثل کیفیت ہماری ریاست میں موجود نہیں جہاں بہت سے عوام کی خواہشوں پر تھوڑی سی تعلیم یافتہ جماعت کی خواہشیں اور ان کی عقل غالب ہے۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں موجود ہے۔

میں نے کہا: پس اگر کسی ریاست کی بابت کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے نفس، اپنی شہوات اور خواہشات پر قابو رکھتی ہے تو یقیناً ہماری ریاست اس حکم کی مستحق ہے۔

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: یعنی ہم اسے عفیف کہہ سکتے ہیں۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اسی طرح اگر کوئی ریاست ایسی ہوسکتی ہے جس میں حاکم اور محکوم اس معاملے میں ہموا ہوں کہ کسے حکومت کرنی چاہیے تو وہ یقیناً ہماری ریاست ہے۔ کیوں، آپ کی کیا رائے ہے؟

گلوکون نے کہا: بلاشبہ، آپ کا خیال صحیح ہے۔

میں نے کہا: اچھا اب یہ بتائیے کہ یہ عفت کی صفت کس طبقے میں موجود ہوگی؛ حاکم یا محکوم میں؟

اس نے جواب دیا: میں سمجھتا ہوں دونوں میں ہوگی۔

میں نے کہا: تم نے دیکھا کہ ہم نے اس پیشگوئی میں چنداں غلطی نہیں کی تھی کہ عفت ایک قسم کی ہم آہنگی (ایک طرح کا توازن وتناسب) ہے۔

گلوکون نے کہا: یہ کیسے؟

میں نے کہا: ایسے کہ جس طرح عقل اور شجاعت ریاست کے مخصوص حصوں میں رہ کر اسے عقل مند اور بہادر بناتے ہیں، وہ حال عفت کا نہیں۔ یہ تو تمام ریاست میں جاری وساری ہے اور آپ کوئی معیار مقرر کیجیے خواہ عقل ودانش، جسمانی قوت، تعداد کی کثرت یا مال ودولت کی فراوانی یا اور کوئی بھی معیار یہ ہر لحاظ سے قوی، ضعیف اور متوسط طبقوں میں اتحادِ عمل کی ضامن ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم بالکل حق بجانب ہوں گے اگر عفت کی تعریف یہ کریں کہ یہ اس ہم آہنگی سے عبارت ہے جو ریاست یا افراد میں حکمرانی کے حق کے متعلق اعلیٰ اور ادنیٰ طبقوں کی یک جہتی سے وجود میں آتی ہے۔

گلوکون نے کہا: میں آپ سے بالکل متفق ہوں۔

میں نے کہا: بظاہر ہم نے اپنی ریاست میں منجملہ چار کے تین اُصول دریافت کر لیے ہیں۔ کم از کم میں تو یہی سمجھتا ہوں۔ اب وہ چوتھی چیز کیا ہے جو ریاست کی نیکی کو مکمل کردے گی۔ گمان تو یہ ہے کہ غالباً یہ عدل ہی ہو۔

گلوکون نے کہا: بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے۔

میں نے کہا: اچھا تو گلوکون ذرا ہوشیار ہو جاؤ اور آؤ شکاریوں کی طرح گھیرا ڈال لیں اور دیکھتے رہیں کہ کہیں عدل نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ کیوں کہ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ چیز ہے یہیں کہیں۔ بس تاک میں رہو، ممکن ہے تم ہی پہلے دیکھ لو تو پھر مجھے بھی فوراً خبر دے دینا۔

گلوکون نے کہا: خدا کرے ایسا ہی ہو! لیکن میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ مجھے اپنے نقشِ قدم پر چلنے والا سمجھیں، جو آپ کے پیچھے پیچھے آ رہا ہے اور جو کچھ اُسے دکھایا جائے البتہ اُسے دیکھ لیتا ہے۔

میں نے کہا: اچھا بھائی، تو پھر دعا میں میرے شریک رہو اور پیچھے پیچھے چلے چلو۔

گلوکون: ہاں ہاں! آپ رہنمائی کیجیے میں چل رہا ہوں۔

میں نے کہا: راہ نہایت دشوار ہے اور ایک دشت ناپیدا کنار حائل، ہر چہار طرف ظلمت ہے اور منزل سخت کٹھن، لیکن بہر حال قدم بڑھاتے چلنا چاہیے۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: دیکھو دیکھو، گلوکون، وہ دیکھو، مجھے یہاں کچھ رستے کا نشان سا معلوم ہوتا ہے، اب خدا نے چاہا تو شکار بچ کر نہیں جائے گا۔

گلوکون نے کہا: مبارک ہو۔

میں نے کہا: بخدا، ہم لوگ سخت حماقت میں مبتلا ہیں!

گلوکون نے پوچھا: یعنی؟

میں نے کہا: معلوم ہوتا ہے کہ ہم جس چیز کی تلاش میں سرگرداں ہیں وہ تو خود ہمارے پیروں پر پڑی لوٹ رہی ہے، اور ہماری نظر اس پر نہیں پڑتی۔ جیسے اکثر ہوتا ہے کہ لوگ کسی کھوئی ہوئی چیز کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں حالانکہ یہ چیز خود اُن کے ہاتھ میں موجود ہوتی ہے، اسی طرح ہم نے بھی اصلی چیز کو دیکھنے کے بجائے اپنی نظر کہاں کہاں دور دور پہنچائی اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہماری جستجو اب تک بے سُود رہی۔

گلوکون نے کہا: آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں نے کہا: مطلب کیا ہے، یہ کہ ہم ابھی ابھی اسی چیز کے متعلق باہم گفتگو کر رہے تھے اور بلا سمجھے اور بلا جانے ہم نے خود اس کی تعریف بھی کی۔

گلوکون نے کہا: بس خدا کے لیے اس تمہید کو ختم کیجیے، میں آپ کی توضیح سننے کے لیے بے تاب ہوں۔

میں نے کہا: اچھا تو سُنو اور کہو کہ میں ٹھیک کہتا ہوں کہ نہیں۔ شروع ہی میں ریاست کی بنیاد رکھتے

وقت ہم نے جو عام اُصول کار تجویز کیا تھا وہی خود یا تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ عدل کی حقیقت ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ہم نے یہ طے کیا تھا اور بار بار اس کی تکرار بھی کی تھی کہ ہماری ریاست میں ہر فرد کا کوئی ایک کام ہونا چاہیے جس کے لیے اس میں بہترین صلاحیت ہو۔

گلوکون نے کہا: بے شک، یہ طے کیا تھا۔

میں نے کہا: اور ہم نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے بھی سُنا ہے "خود اپنے کام سے کام رکھنا اور دوسروں کے معاملات میں مداخلت نہ کرنا عدل ہے"۔ بلکہ خود ہم نے یہی بات بارہا کہی ہے۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں، کہی تو ضرور ہے۔

میں نے کہا: گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی شکل سے خود اپنا کام کرنا عدل ہے۔ آپ سمجھیے کہ میں نے یہ نتیجہ کہاں سے نکالا؟

گلوکون نے کہا: نہیں، میں نہیں سمجھا۔ مہربانی کر کے بتا دیجیے۔

میں نے کہا: اپنی ریاست کا تجزیہ کرتے ہوئے جب ہم نے ان تین صفات یعنی حکمت، شجاعت اور عفت کو علیحدہ کر دیا تو میرے خیال میں چوتھی صفت وہ ہونی چاہیے تھی جس نے ان تینوں صفات کا ریاست میں پیدا ہونا اور ان کا قائم رہنا ممکن بنایا اور یہ ہم طے کر ہی چکے ہیں کہ اس چوتھی صفت کا نام عدل ہوگا۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اب اگر یہ تصفیہ کرنا ہو کہ ان چار صفات میں سے کون سی صفت ریاست کی خوبی کی تکمیل میں سب سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے تو بڑی دشواری کا سامنا ہوگا۔ کیا سب سے اہم چیز حاکم و محکوم کے خیالات کی باہمی ہم آہنگی ہے؟ یا اس سے زیادہ اہمیت سپاہ کی وفاداری کے ساتھ، اس یقین پر قائم رہنے کو حاصل ہے جو مختلف چیزوں کے قابلِ خوف یا ناقابلِ خوف ہونے کے متعلق ان میں پیدا کیا گیا ہے؟ یا حکمران طبقے میں عقل و حکمت کا وجود؟ یا پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کہیں ریاست کی تمام تر خوبی اس چوتھے اصول کی رہینِ منت تو نہیں جس کی وجہ سے ہر مرد، عورت، چھوٹا بڑا، غلام اور آزاد، حاکم اور محکوم یا کاریگر غرض ہر ایک بس اپنے مفوضہ کام میں لگا رہتا ہے اور دوسری چیزوں میں بے جا دخلت نہیں کرتا۔

گلوکون نے کہا: اس سوال کا جواب تو واقعتاً نہایت دشوار ہے۔

میں نے کہا: یعنی کم سے کم یہ چوتھا اُصول جس کی وجہ سے ہر شخص کا عمل اپنے مفوضہ کام تک محدود

ہے اہمیت کے لحاظ سے باقی تین صفات سے کم نہیں؟

گلوکون نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: اگر ایسا ہے تو پھر کیوں نہ اسی کو عدل سے تعبیر کریں؟

گلوکون نے کہا: ہاں، ضرور کرنا چاہیے۔

میں نے کہا: اچھا، اسی مسئلے پر دوسری طرح غور کرو پھر دیکھیں کہ یہی نتیجہ نکلتا ہے یا نہیں؟ اچھا فرمایئے کہ آپ ریاست کے حاکموں کے سپرد قانونی مقدموں کا فیصلہ کریں گے؟

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اور اس کا فیصلہ کرنے میں انھیں سب سے زیادہ اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ کوئی شخص دوسرے کی مِلک پر متصرف نہ ہو سکے اور نہ اپنی ذاتی مِلک سے محروم کیا جائے۔

گلوکون نے کہا: بلاشبہ یہی تو ان کا مخصوص فرض ہوگا۔

میں نے کہا: اسی لیے تاکہ یہ طرز عادلانہ اور منصفانہ ہے۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: لہٰذا اس خیال کے بموجب بھی اپنی مخصوص ذاتی مِلک پر تصرف رکھنا اور اپنے مخصوص مفوضہ فرض کو انجام دینا عدل کا مرادف ہے۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اب ذرا غور کیجیے کہ آپ اور میں متفق الرائے ہیں یا نہیں؟ اگر ایک بڑھئی چمار کا کام کرنے لگے یا ایک چمار بڑھئی کا، اور یہ آپس میں ایک دوسرے سے اوزار بدل لیں اور دوسری خصوصیات بھی ایک دوسرے کی اختیار کر لیں، یا یوں ہو کہ ایک ہی شخص دونوں کام کرنے لگے تو کیا اس سے ریاست کا ایسا بڑا نقصان ہو جائے گا؟

گلوکون نے کہا: کچھ ایسا بہت نقصان تو نہ ہوگا۔

میں نے کہا: لیکن اگر کوئی کاریگر یا اہلِ حرفہ میں سے کوئی شخص اپنی دولت، تعلقات، جسمانی طاقت، یا کسی اور وجہ سے اتنا اُبھر جائے کہ لگے سپاہیوں کے کام میں دخل دینے یا کوئی سپاہی ریاست کے محافظوں کے کام میں دخل دینے لگے حالانکہ اس کی ذرا بھی صلاحیت نہیں رکھتا اور پھر یہ لوگ جیسا کہ پہلے

والی مثال میں کہا تھا اپنے اوزار اور خصوصیات تبدیل کر لیں؟ یا اگر ایک ہی شخص ایک ہی وقت میں کئی اہم فرائض ادا کرنے کی کوشش کرے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ تبدیلی اور بے جا مداخلت ریاست کے لیے بڑی تباہی کا باعث ہوگی۔

اس نے جواب دیا: ہاں، یقیناً ہوگی۔

میں نے کہا: لہٰذا چونکہ ان تینوں طبقوں میں باہم مداخلت یا ایک سے دوسرے میں تبدیلی سراسر ریاست کے نقصان کا باعث ہے اس لیے ہم بجا طور پر اسے صاف صاف لفظوں میں ایک بُرا کام کہہ سکتے ہیں۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اور آپ اس بات کو تو یقیناً تسلیم کریں گے کہ اپنی ریاست کے ساتھ ایسی سخت بُرائی کرنا بڑی ناانصافی ہے۔

اس نے جواب دیا: بلاشک۔

میں نے کہا: اچھا تو یہ ناانصافی ہوئی۔ اب اس کے برعکس اہلِ حرفہ، سپاہی اور ریاست کے محافظوں کا اپنے اپنے مفوضہ فرائض پر قائم رہنا اور صرف اسی کو انجام دینا عدل ہے اور یہی چیز ریاست میں بھی عدل کی صفت پیدا کرتی ہے۔

گلوکون نے کہا: میں اس خیال میں آپ سے حرف بحرف متفق ہوں۔

میں نے کہا: نہیں نہیں، ابھی اتنی قطعی رائے نہیں دینی چاہیے۔ ہاں اگر اس خیال کا تطابق انفرادی حالت سے کیا جائے اور وہاں بھی عدل کی ماہیت یہی معلوم ہو تو البتہ ہم اس پر صاد کر سکتے ہیں، اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر نئے سرے سے تحقیقات کریں گے۔ فی الحال اسی تحقیق کو جاری رکھنا چاہیے کیونکہ یہ شروع ہی اس خیال سے کی گئی تھی کہ اگر ہم پہلے کسی بڑی چیز میں اس عدل کی صفت کو معلوم کر لیں تو پھر آسانی سے افراد میں بھی اس کا پتا لگ سکے گا۔ وہ بڑی چیز ریاست قرار دی گئی تھی۔ چنانچہ ہم نے بہتر سے بہتر ریاست بنائی کہ اس میں عدل ضرور پایا جائے گا۔ اس طرح جس حقیقت کا نشان ملا ہے اُسے اب فرد پر لاگو کیجیے۔ اگر مطابقت ہوگئی تو کیا کہنا۔ اور اگر فرد کچھ مختلف ہوا تو پھر سے ریاست کی طرف رجوع کریں گے اور اس نظریے کو دوبارہ آزمائیں گے۔ ان دونوں کے تصادم سے ممکن ہے وہ روشنی پیدا ہو جس میں عدل چمک اُٹھے، پھر اس وقت جو

نظارہ ہمارے پیشِ نظر ہوگا اُسے ہم اپنی روح میں پیوست کر لیں گے۔

گلوکون نے کہا: ہاں، یہ تو پھر ہوگا ہی؛ آپ جو کچھ فرماتے ہیں ضرور کیجیے۔

میں نے کہا: اچھا، دو چیزیں ہیں، ایک بڑی ایک چھوٹی۔ دونوں کو ایک نام سے پکارتے ہیں، تو جہاں تک اُن کے ایک نام سے موسوم ہونے کا تعلق ہے یہ مماثل ہے یا نہیں؟

اس نے جواب دیا: ہیں۔

میں نے کہا: تو اگر صرف عدل کا تصور پیشِ نظر رکھا جائے، تو عادل انسان، ایک عادل ریاست کا مثل ہوگا۔

اس نے کہا: جی ہاں ہوگا۔

میں نے کہا: اور ریاست کو عادل ہم نے اس وقت قرار دیا تھا جب اس کے تینوں طبقے علیحدہ علیحدہ اپنے اپنے مقررہ کام میں مشغول ہوں اور ریاست کا شجاع، حکیم اور عفیف ہونا انہی تین طبقوں کی دوسری صفات اور خصوصیات پر منحصر قرار پایا تھا۔

اس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: یہی حال فرد کا بھی ہے۔ ہم فرض کر سکتے ہیں کہ اس کی روح میں بھی وہی تین اُصول ہیں جو ریاست میں پائے جاتے ہیں اور چونکہ یہ فرد بھی اُن سے اسی طرح متاثر ہوتا ہے اس لیے اسے بھی جائز طور پر انہی الفاظ سے بیان کر سکتے ہیں۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اور لیجیے، پھر ایک آسان سا سوال آ پہنچا کہ آیا روح میں یہ تین اُصول ہوتے بھی ہیں یا نہیں؟

گلوکون نے کہا: آسان سوال ہے! نہیں، یہاں بھی وہ ضرب المثل سچ اُترتی ہے کہ اچھی چیز ہمیشہ دشوار بھی ہوتی ہے۔

میں نے جواب دیا: بالکل سچ ہے؛ اور میں نہیں سمجھتا کہ ہم جو طریقہ استعمال کر رہے ہیں، وہ اس سوال کے صحیح حل کے لیے کافی بھی ہے۔ صحیح طریقہ دوسرا ہے اور اس سے زیادہ طویل۔ تاہم اس سے بھی ہم غالباً ایسے نتیجہ پر تو پہنچ ہی جائیں گے جو پچھلی تحقیق کی سطح سے پست نہ ہوگا۔

گلوکون نے کہا: تو کیا یہ کافی نہیں؟ بحالتِ موجودہ میں تو اسی پر قانع ہوں۔

میں نے کہا: ہاں ہاں، میں بھی مطمئن ہو جاؤں گا۔

گلوکون نے کہا: تو پھر اس خیال کے پیچھا کرنے میں کسر نہ ہو!

میں نے کہا: کیا ہمیں یہ نہیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ وہ اُصول اور میلان جو ریاست میں ہوتے ہیں وہی ہم سب میں بھی پائے جائیں۔ فرد ہی سے تو چیزیں ریاست میں پہنچتی ہیں۔ ورنہ اور کون سا ذریعہ ہو سکتا ہے؟ مثلاً غصہ یا شجاعت کی صفت کو لیجیے۔ یہ خیال کس درجہ تمسخر انگیز ہوگا کہ یہ صفت جب ریاست میں پائی جاتی ہے تو ان افراد سے حاصل نہیں ہوتی جن میں یہ واقعتاً موجود ہوتی ہے۔ مثال کے لیے اہلِ تھریس (Thracian)، اہلِ سائتھی (Scythian) یا بالعموم تمام شمالی قوموں کو دیکھ سکتے ہیں تو یہی حال علم کی محبت کا ہے جو ہمارے ملک کا خاص شیوہ ہے، یا حبِ زر کا جو اہلِ مصر و فونیقیا (Phoenician) کے ساتھ وابستہ کی جاتی ہے۔

اس نے کہا: بالکل درست۔

میں نے کہا: اس کے سمجھنے میں تو کوئی دقت نہیں۔

گلوکون نے کہا: مطلق نہیں۔

میں نے کہا: لیکن جب سوال یہ ہو کہ یہ اُصول تین ہی ہیں یا صرف ایک، تو مسئلہ اتنا آسان نہیں رہتا، یعنی کیا ہم اپنی طبیعت کے ایک حصے سے علم حاصل کرتے، ایک سے غصہ اور خفگی کرتے، اور تیسرے سے اپنی طبعی شہوتوں کی تسکین کے خواہاں ہوتے ہیں؟ یا ہر قسم کے کام میں پوری کی پوری روح عمل کرتی ہے؟ اصل مشکل تو اس بات کے فیصلے میں ہے۔

گلوکون نے کہا: بے شک، مشکل تو یہی ہے۔

میں نے کہا: اچھا تو کوشش کر کے اب یہ معلوم کریں کہ یہ اُصول ایک ہی ہے یا مختلف۔

گلوکون نے کہا: یہ معلوم کیسے ہو؟

میں نے کہا: ایسے! ظاہر ہے کہ کوئی چیز اپنے ایک ہی حصے میں، ایک ہی وقت، اور ایک ہی چیز کے تعلق میں دو متضاد طریقوں سے عامل یا معمول نہیں ہو سکتی چنانچہ جب کبھی ان چیزوں میں یہ تضاد واقع ہوتا ہے جو بظاہر ایک معلوم ہوتی ہیں تو ہم جان لیتے ہیں کہ یہ دراصل ایک نہیں مختلف چیزیں ہیں۔

گلوکون نے کہا: درست۔

میں نے کہا: مثلاً کیا کوئی چیز ایک وقت اور اپنے ایک ہی حصّے میں ساکن اور متحرک دونوں ہو سکتی ہے؟

گلوکون نے کہا: ناممکن۔

میں نے کہا: پھر بھی اچھا یہی ہے کہ ان لفظوں کے معنی کو زیادہ متعین کر لیا جائے کہ کہیں ہم بعد کو بھٹک نہ جائیں۔ ایک ایسے آدمی کا تصور کرو جو کھڑا ہے اور ساتھ ہی اپنا سر اور اپنے ہاتھ ہلا رہا ہے۔ ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ ایک ہی آدمی ایک وقت میں ساکن بھی ہے متحرک بھی۔ اس کا جواب ہم یہ دیں گے کہ نہیں اس کا ایک حصّہ متحرک ہے اور ایک حصّہ ساکن۔

گلوکون نے کہا: بہت بجا۔

میں نے کہا: معترض اگر اور مُوشگافی کرے اور کہے کہ جب لٹو اپنی کیل پر چکر کرتا ہے تو اس کا کوئی حصّہ ہی نہیں بلکہ پورے کا پورا لٹو ایک ہی وقت میں ساکن بھی ہوتا ہے اور متحرک بھی (اور وہ یہی بات ہر اُس چیز کے متعلق کہہ سکتا ہے جو ایک نقطہ پر گردش کرتی ہو) تو ہم اس اعتراض کو بھی تسلیم نہیں کریں گے۔ اس لیے کہ ان صورتوں میں حرکت اور سکون دونوں اس چیز کے ایک ہی حصّے میں نہیں پائے جاتے ہیں۔ ان چیزوں میں ایک محور ہوتا ہے۔ ایک قطر، محور تو ساکن کھڑا رہتا ہے اس لیے کہ وہ اپنے زاویہ قائمہ سے انحراف نہیں کرتا اور قطر چکر کاٹتا ہے، اور اگر گردش میں محور بھی دائیں بائیں، آگے پیچھے جھک جائے تو پھر کسی اعتبار سے اس جسم میں سکون باقی نہیں رہتا۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں، ان مختلف کیفیتوں کے بیان کرنے کا یہی ٹھیک طریقہ ہے۔

میں نے کہا: تو ہم ان اعتراضوں سے پریشان نہ ہوں گے، نہ اس بات کو باور کریں گے کہ کسی چیز کا ایک ہی حصّہ ایک ہی وقت میں اور ایک ہی چیز کے تعلق میں دو متضاد طریقوں سے عامل یا معمول ہو سکتا ہے۔

گلوکون نے کہا: میرے خیال میں تو یقیناً ایسا نہیں ہو سکتا۔

میں نے کہا: پھر بھی اس خیال سے کہ کہیں ہم اس قسم کے اعتراضوں کی تحقیق پر مجبور نہ ہوں اور لمبی چوڑی مفصل بحث کے بعد انھیں غلط ثابت کریں، ہم ان کا مہمل ہونا فرض کیے لیتے ہیں اور اس باہمی سمجھوتے پر آگے چلتے ہیں کہ اگر کہیں یہ مفروضہ بالآخر غلط ثابت ہو گیا تو ہم تمام ان نتائج کو جو اس سے نکلے ہیں واپس

لے لیں گے۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں: یہ بہترین صورت ہے۔

میں نے کہا: اچھا، کیا قبول اور رد، خواہش اور تنفر، رغبت اور نفرت، جذب اور دفاع سب کے سب ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں، خواہ معروف حیثیت سے لو یا مجہول، کہ اس سے تو ان کے متضاد ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں، یہ سب متضاد ہیں۔

میں نے کہا: اچھا تو بھوک، پیاس اور عام طور پر تمام خواہشات، نیز ارادہ اور آرزو ان سب کو مذکورہ بالا کیفیتوں کی پہلی قسم ہی سے تو متعلق کریں گے۔ کیوں یہی کہیں گے نا کہ روح شے مطلوب کی متلاشی ہوتی ہے، یا جس چیز پر تصرف کی اُسے خواہش ہے، اسے اپنی طرف کھینچنا چاہتی ہے یا جب کوئی شخص چاہتا ہے کہ یہ چیز مجھے دی جائے تو اُس کی روح اس خواہش کو پورا کرنے کی آرزو میں اپنی خواہش کا اظہار اپنے سر کو حرکت دے دے کر اس طرح کرتی ہے گویا اس سے کوئی سوال کیا گیا تھا اور اُس نے اسے قبول کیا۔

گلوکون نے کہا: بہت ٹھیک۔

میں نے کہا: اور نارضامندی، تنفر، اور فقدانِ خواہش کے متعلق کیا کہیے گا؟ کیا انھیں رد اور دفاع کی متضاد تقسیم میں نہ رکھیے گا؟

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اچھا، عام طور پر تو خواہشات کے متعلق اس بیان کو صحیح تسلیم کر لیں اور آؤ اب ان خواہشوں کی ایک خاص تقسیم کریں اور ان میں بھوک اور پیاس کو لیں کہ یہ سب سے زیادہ جانی پہچانی خواہشات ہیں۔

گلوکون نے کہا: اچھا انہی کو لیجیے۔

میں نے کہا: ایک کا مقصد کھانا ہے، دوسرے کا پینا۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور یہیں ایک نکتہ پیدا ہوتا ہے یعنی کیا پیاس روح کے پینے کی اور محض پینے کی آرزو کا نام نہیں۔ یعنی پینے کے ساتھ کوئی اور صفت نہیں لگی ہے، مثلاً گرم یا سرد، زیادہ یا کم، یعنی کسی خاص قسم کا پینا۔ اگر

پیاس کے ساتھ گرمی شامل ہو تو خواہش سرد چیز پینے کی ہوگی، اور سردی شامل ہو تو گرم چیز کی۔ اگر پیاس شدید ہے تو زیادہ پینے کی اور شدید نہیں تو کم کی، لیکن خالص پیاس میں تو محض پینے کی خواہش ہوگی اور کچھ نہیں۔ کہ اسی سے پیاس کی قدرتی تسکین ہوتی ہے جس طرح کھانے سے بھوک کی۔

گلوکون نے کہا: سادہ خواہش تو سادہ چیز کی ہوتی ہے، اور اگر خواہش کسی صفت سے متصف ہو تو جس چیز کی خواہش ہے وہ بھی متصف ہوگی۔

میں نے کہا: لیکن اس جگہ ذرا اُلجھاؤ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس مخالف کے مقابلے میں بھی تو بحث کرنی ہے جو ابھی کھڑا ہو کر کہنے لگے کہ کوئی انسان صرف ''پینا'' نہیں چاہتا بلکہ اچھی چیز پینا چاہتا ہے۔ کوئی بھی محض غذا نہیں چاہتا بلکہ اچھی غذا۔ کیونکہ خوبی اور عمدگی تو خواہش اور طلب کا موردِ عام ہے اور پیاس چونکہ ایک خواہش اور طلب ہے اس لیے لازماً اچھی چیز کے پینے کی خواہش ہوگی۔ یہی حال اور تمام خواہشوں کا ہے۔

گلوکون نے کہا: ہاں، مخالف کو کچھ کہنے کی گنجائش تو ضرور ہے۔

میں نے کہا: تاہم میں اس بات پر قائم ہوں کہ جہاں دو چیزیں باہم اعتباری اور اضافی طور پر متعلق ہوں تو بعض اوقات اس علاقے کے دونوں حصوں کے ساتھ کوئی صفت لگی ہوتی ہے اور بعض میں دونوں سادہ اور بلا کسی صفت کے ہوتے ہیں۔

گلوکون نے کہا: میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

میں نے کہا: آپ تو یہ جانتے ہیں کہ ''بڑا'' اعتباراً و اضافاً متعلق ہے ''چھوٹے'' سے؟

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور ''بہت زیادہ'' ''بہت کم'' سے؟

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور ''جو کبھی بڑا تھا'' ''جو کبھی چھوٹا تھا'' سے، اسی طرح ''آئندہ بڑا ہونے والا'' ''آئندہ چھوٹا ہونے والے'' سے۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: یہی حال زیادہ اور کم اور دوسرے نسیب اور لازم و ملزوم کلمات کا ہے، مثلاً دوگنا اور آدھا، بھاری اور ہلکا، تیز اور سست، گرم اور سرد، یا اور کوئی اسی قسم کے الفاظ۔ کیوں کیا یہ بیان ان سب کے متعلق

صحیح نہیں اُترتا؟

اس نے کہا: جی ہاں اُترتا ہے۔

میں نے کہا: اور کیا یہی اصول حکمیات پر عائد نہیں ہوتا؟ حکمت کا مقصد ہے علم (اگر اسے صحیح تعریف فرض کر لیں) لیکن کسی خاص حکمت کا مقصد کسی خاص قسم کا علم ہے، مثلاً مکانات بنانے کی حکمت ایک ایسا علم ہے جو علم کی دوسری قسموں سے الگ اور ممتاز ہے اور اس لیے اسے علم تعمیرات کہتے ہیں۔

اس نے جواب دیا: بے شک۔

میں نے کہا: اس لیے کہ اس میں ایک خاص صفت ہے جو دوسرے علوم میں نہیں۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور یہ مخصوص صفت اس میں اس لیے ہے کہ اس کا ایک خاص مقصد اور ایک خاص موضوع ہے۔ یہی بات دوسرے علوم وفنون کے متعلق بھی سچ ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اگر میں نے اپنے مفہوم کو واضح کر دیا ہے تو اب آپ میرے اصلی مطلب کو سمجھ لیں گے کہ میں نے نسبیب اور لازم وملزوم کلمات کے متعلق کیا کہا تھا۔ میرا مطلب یہ تھا کہ اگر ایسے کسی علاقے کے ایک لفظ کو تنہا اور سادہ رکھو تو دوسرا بھی تنہا اور سادہ ہوگا۔ اگر ایک کے ساتھ کوئی صفت ہو تو دوسرے کے ساتھ بھی کوئی صفت ہوگی۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا ہوں کہ لازم وملزوم کی صفت ایک ہی ہو یعنی تندرستی کا علم تندرست اور مرض کا علم لازماً مریض ہے، یا خیر وشر کے علوم اسی وجہ سے اچھے اور بُرے ہیں۔ میرا مقصد صرف اس قدر ہے کہ جب لفظ ''علم'' بجائے خود مطلقاً استعمال نہ کیا جائے بلکہ اس کے موضوع کے ساتھ کوئی صفت لگی ہو، مثلاً اس جگہ صحت ومرض کی ماہیت تو اس سے وہ علم معین ومعروف ہو جاتا ہے اور اسے صرف علم نہیں کہتے بلکہ طب کا علم کہتے ہیں۔

گلوکون نے کہا: میں اب اچھی طرح سمجھ گیا اور میں آپ کا ہم خیال ہوں۔

میں نے کہا: تو کیا پیاس اصلاً اسی قسم کا اضافی واعتباری لفظ نہیں، جس کا بیّن علاقہ..........

گلوکون نے کہا: ہاں، پیاس کا علاقہ پینے کے ساتھ ہے۔

میں نے کہا: کسی خاص قسم کی پیاس، خاص قسم کے پینے سے علاقہ رکھتی ہے لیکن اگر محض پیاس کو لیں

تو وہ نہ زیادہ ہے نہ کم، نہ اچھی ہے نہ بُری، نہ کسی خاص قسم کی چیز پینے کی بلکہ محض پینے کی۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: پیاسے کی روح، جہاں تک پیاس کا تعلق ہے، صرف پینا چاہتی ہے، اُسی کی متلاشی ہوتی اور اُسی کے حصول کی کوشش کرتی ہے۔

گلوکون نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: اب کوئی ایسی چیز فرض کیجیے جو پیاسی رُوح کو پینے سے دور کھینچتی ہو، تو یہ چیز اس پیاس سے مختلف ہوگی جو اسے جانور کی طرح پینے کی طرف کھینچ رہی ہے۔ کیوں کہ جیسے ہم کہہ چکے ہیں کوئی چیز ایک ہی وقت میں اپنے اسی حصے سے اُسی چیز پر دو متضاد طریقوں سے عمل نہیں کرسکتی۔

گلوکون نے کہا: ہاں، یہ تو ناممکن ہے۔

میں نے کہا: جیسے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ تیرانداز کے دونوں ہاتھ ایک ہی وقت میں کمان کو اپنی طرف بھی کھینچتے ہیں اور اپنے سے دور بھی کرتے ہیں۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک ہاتھ سے کمان کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور دوسرے سے اُسے دور کرتا ہے۔

گلوکون نے کہا: بالکل درست۔

میں نے کہا: کیا یہ ممکن ہے کہ آدمی پیاسا ہو اور پھر بھی پینا نہ چاہے؟

گلوکون نے کہا: ہاں، اکثر ایسا ہوتا ہے۔

میں نے کہا: تو ایسی حالت میں پھر آپ کیا کہیں گے؟ یہی نا کہ روح میں ایک چیز ہے جو پینے کا حکم دیتی ہے، اور ایک دوسری چیز ہے جو اس سے منع کرتی ہے، اور یہ دوسری قوت اس سے مختلف اور زیادہ طاقتور ہے جو پینے پر آمادہ کرتی ہے؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں، یہی کہوں گا۔

میں نے کہا: منع کرنے والی قوت عقل پر مبنی ہے اور رغبت دلانے والی طاقت جذبے اور مرض سے پیدا ہوتی ہے۔

گلوکون نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: یعنی ہم بجا طور پر فرض کرسکتے ہیں کہ یہاں دو مختلف قوتیں ہیں۔ وہ جس سے انسان

تعلیل و توجیہ کرتا ہے اسے روح کا اُصولِ عقلی کہتے ہیں، دوسرے کو جس سے آدمی محبت کرتا، بھوکا پیاسا ہوتا، یا کسی دوسری خواہش کی تحریک محسوس کرتا ہے غیر عقلی یا اشتہائی اُصول کہہ سکتے ہیں، اور یہ دوسرا اُصول مختلف لذتوں اور اُن کو تسکین دینے اور پورا کرنے میں معاون ہوتا ہے۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں، ہم جائز طور پر انھیں مختلف قرار دے سکتے ہیں۔

میں نے کہا: اچھا تو پھر قطعی طور پر تسلیم کر لیں کہ رُوح میں دو اُصول (قوتیں) ہوتے ہیں، اور ہاں، جذبہ اور غصہ؟ کیا یہ کوئی تیسرا اُصول ہے، یا ان ہی مذکورہ اُصولوں میں کسی سے ملتا جلتا ہے؟

گلوکون نے کہا: مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ خواہشوں سے ملتا جلتا ہے۔

میں نے کہا: مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے ایک دفعہ ایک قصہ سُنا تھا اور میں تو بھائی اسے سچ بھی مانتا ہوں۔ قصہ یہ تھا کہ اگلائیون (Aglaion) کا بیٹا لیونٹیس (Leontius) ایک دن پائیریس (Piraeus) سے واپس آ رہا تھا، شمالی فصیل کے باہر کی طرف مقتل میں اُسے کچھ لاشیں زمین پر پڑی دکھائی دیں۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ انھیں دیکھے، مگر ساتھ ہی کچھ نفرت اور خوف کا احساس بھی ہوا۔ تھوڑی دیر تک یہ اندرونی کشمکش جاری رہی اور اس نے اپنی آنکھیں ہاتھوں سے ڈھانپ لیں، لیکن آخر کار اس سے نہ رہا گیا، دیکھنے کی خواہش غالب آئی چنانچہ آنکھوں کو خوب زور سے پھاڑ کر یہ لاشوں کی طرف یہ کہتا ہوا دوڑا: "لو دیکھ لو، کمبختو! اب جی بھر کر اس دلفریب نظارے کا تماشا کر لو"۔

اس نے کہا: میں نے خود یہ قصہ سُنا ہے۔

میں نے کہا: اس قصے سے یہ سبق ملتا ہے کہ کبھی کبھی غصہ خواہش سے اس طرح ٹکراتا ہے۔ گویا یہ دو مختلف چیزیں ہیں۔

اس نے کہا: جی ہاں، اس کا یہی مطلب ہے۔

میں نے کہا: اس کے علاوہ بھی آپ نے بہت سی ایسی صورتیں دیکھی ہوں گی جن میں آدمی کی خواہشات زبردستی اس کی عقل پر غالب آ جاتی ہیں، تو پھر یہ اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے اور اس اندرونی جبر و تشدد پر خفا ہوتا ہے اور اس کشمکش میں جس کی مثال ایک ریاست کے مختلف مخالف گروہوں کی کشاکش کی سی ہے۔ اس کا دل عقل کا طرفدار ہوتا ہے۔ لیکن غالباً تم نے نہ تو خود اپنی ذات میں دیکھا ہوگا نہ کسی اور میں کہ جب عقل نے ایک دفعہ فیصلہ کر دیا کہ میری مخالفت نہ کی جائے تو اس کے دل نے خواہشات کا ساتھ دیا ہو۔

اس نے کہا: ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: فرض کیجیے ایک شخص کو احساس ہے کہ اُس نے کسی کے ساتھ زیادتی کی ہے تو اس کی فطرت جس قدر شریف ہوگی اُسی قدر وہ اُن تکلیفوں (مثلاً بھوک، پیاس، سردی وغیرہ) پر کم غصہ محسوس کرے گا، جو اس شخص کی طرف سے اسے پہنچیں گی جس کے ساتھ اس نے زیادتی کی تھی۔ یہ تو اپنی اُن سزاؤں کو ٹھیک سمجھے گا؟ اور اسی لیے اس کا غصہ ان سے متحرک ہونے سے انکار کرے گا۔

گلوکون نے کہا: سچ ہے۔

میں نے کہا: لیکن جب وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے ساتھ بُرائی کی گئی ہے تو غصے سے پیچ و تاب کھانے لگتا ہے، اب یہ اپنے آپ کو حق بجانب جانتا ہے، چنانچہ بھوک، پیاس، سردی وغیرہ کی تکلیفیں برداشت کرکے اس میں عزم اور استقلال اور فتح حاصل کرنے کا جذبہ اور بھی زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کی شریف فطرت اس وقت تک ٹھنڈی نہیں پڑتی جب تک یا تو دشمن کو قتل نہ کردے یا خود قتل نہ ہو جائے یا پھر یہ ہو کہ اپنے پاسبان گڈریے یعنی عقل کی آواز نہ سنائی دے جائے کہ "بس کتے، بس، اب زیادہ مت بھونک"

گلوکون نے کہا: خوب، یہ تو نہایت کامل تمثیل ہے۔ ہم تو کہہ ہی رہے تھے کہ ہماری ریاست میں معاون گویا پاسبان کتے ہوں گے اور حاکموں کی آوازیں سُنیں گے کہ یہ بمنزلہ گڈریوں کے ہوں گے۔

میں نے کہا: میں دیکھتا ہوں کہ آپ نے میرا مفہوم پوری طرح سمجھ لیا ہے۔ لیکن ہاں ایک نکتہ اور ہے جس پر میں چاہتا ہوں کہ آپ ذرا غور کریں۔

گلوکون نے کہا: وہ کیا؟

میں نے کہا: آپ کو یاد ہوگا کہ پہلے پہل جذبہ اور نفس لوامہ خواہشات کی قسم معلوم ہوتے تھے لیکن اب تو ہم اس کے بالکل خلاف کہیں گے۔ کیونکہ رُوح کی کشاکش میں نفسِ لوامہ اصولِ عقلی کا جانب دار ہوتا ہے۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: لیکن ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے یعنی کیا جذبہ عقل سے مختلف ہے؟ یا اسی کی ایک قسم ہے؟ اگر دوسری صورت ہے تو روح میں بجائے تین قوتوں کے دو ہی ہوں گی یعنی عقلی قوت اور اشتہائی قوت۔ یا یوں ہے کہ جیسے ریاست میں تین طبقے تھے یعنی تاجر، معاون اور مشیر۔ اسی طرح فرد کی روح میں بھی ایک تیسرا

عنصر ہو یعنی نفسِ لوامہ اور اگر بُری تعلیم اُسے خراب نہ کر ڈالے تو یہ فطرتاً عقل کا معاون ہوتا ہو۔

اس نے کہا: ہاں، اسے تو ایک تیسرا اُصول ہونا چاہیے۔

میں نے کہا: ہاں، بشرطیکہ جس طرح یہ خواہشوں سے مختلف ثابت ہو چکا ہے، اسی طرح عقل سے بھی مختلف ثابت ہو جائے۔

اس نے کہا: یہ تو آسانی سے ہو جائے گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے بچوں میں نفسِ لوامہ تو پیدائش کے وقت سے ہی موجود ہوتا ہے، لیکن ان میں سے اکثر کو عقل کا استعمال کافی دیر میں آتا ہے اور بعض کو کبھی آتا ہی نہیں۔

میں نے کہا: بہت خوب۔ اور یہ تو آپ وحشی جانوروں میں بھی دیکھ سکتے ہیں جو آپ کے بیان کی صداقت کا مزید ثبوت ہے۔ ہم پہلے بھی اس کا ذکر کر چکے ہیں، اور اب پھر ہومر کے یہ الفاظ پیش کرتے ہیں کہ:

''اس نے اپنا سینہ پیٹا اور اپنے نفس کو ملامت کی''۔

کیوں کہ اس مصرعہ میں ہومر نے صاف طور پر اس قوت کے وجود کو تسلیم کیا ہے جو بُرے بھلے کی تمیز کرتی ہے اور اسے اس غیر عقلی غصّے سے مختلف مانتا ہے جسے یہ ملامت کرتی ہے۔

اس نے کہا: بہت درست۔

میں نے کہا: خدا کا شکر ہے کہ موجوں کے بہت سے تھپیڑے کھانے کے بعد ہم بالآخر ساحل پر آن لگے اور اس بات پر متفق ہو گئے کہ جو اُصول ریاست میں ہوتے ہیں وہی فرد میں بھی ہوتے ہیں اور ان کی تعداد تین ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: کیا اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ فرد بھی اسی طرح اور اسی صفت کے باعث عقلمند اور حکیم ہوتا ہے جیسے ریاست۔

اس نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: جو صفت ریاست میں شجاعت کا باعث ہے وہی فرد کی شجاعت کا سبب ہے اور فرد اور ریاست کا علاقہ دوسرے محاسن میں بھی ایک سا ہے۔

اس نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: اور گلا کون، ہم فرد کو بھی اسی طرح عادل تسلیم کریں گے جیسے ریاست کو کیا تھا؟

اس نے کہا: لامحالہ۔

میں نے کہا: خوب یاد ہوگا کہ ریاست کا عدل تو یہ تھا کہ تینوں طبقے اپنا اپنا کام ٹھیک ٹھیک انجام دیتے رہیں۔

اس نے کہا: اسے بھولنا تو بہت مشکل ہے۔

میں نے کہا: اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہیے کہ وہ فرد عادل ہوگا جس کی طبیعت کی مختلف خصلتیں اپنا اپنا کام کریں اور وہ خود بھی اپنا مفوضہ کام انجام دے۔

اس نے کہا: جی ہاں، یہ بھی ضرور یاد رکھنا چاہیے۔

میں نے کہا: پھر کیا یہاں بھی عقلی اُصول کو حکومت نہیں کرنی چاہیے کہ یہ حکیم ہے اور رُوح کی نگرانی اسی کے سپرد ہے اور نفس کو اس کا ماتحت اور معاون ہونا چاہیے۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اور جیسا کہ ہم کہہ رہے تھے موسیقی اور ورزش کا ملا جلا اثر ان میں یگانگت پیدا کر دے گا۔ اچھے اچھے اقوال اور اچھے اچھے سبقوں سے عقل کی نشوونما اور تقویت ہوگی اور ہم آہنگی اور موزونیت سے نفس کی وحشت میں اعتدال، نرمی اور تہذیب پیدا ہو جائے گی۔

اس نے کہا: بالکل بجا۔

میں نے کہا: جب ان دونوں کی نشوونما اور تعلیم ہو چکے گی اور یہ اپنے اپنے وظیفوں سے آشنا ہو جائیں گے تو پھر یہی اس اشتہائیہ اُصول پر حکومت کریں گے جس پر ہماری سب کی روحوں کا سب سے بڑا حصہ مشتمل ہے اور جو بالطبع سیر نہیں ہوتا۔ یہ دونوں اس پر نگران رہیں گے تاکہ کہیں جسمانی لذتوں کی کثرت سے پھول کر اور ان سے قوت حاصل کر کے یہ اشتہائیہ اُصول اپنے اصلی دائرے سے آگے نہ بڑھنے پائے اور روح کے ان حصوں پر اپنا تسلط جمانے لگے اور انہیں اپنا حلقہ بگوش بنانے لگے جو طبعی طور پر اس کے ماتحت نہیں اور اس طرح انسانی زندگی کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

اس نے کہا: نہایت درست۔

میں نے کہا: یہ دونوں مل کر کیا خارجی حملوں سے کل روح اور کل جسم کے بہترین محافظ نہ ہوں گے؟ ایک مشورہ دے گا، دوسرا اس کی قیادت میں لڑے گا اور شجاعت کے ساتھ اُس کے احکام اور مشوروں کی بجا آوری کرے گا۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اور شجاع اُسے سمجھنا چاہیے جس کا نفسِ لوامہ لذت اور الم، خوشی اور رنج میں عقل کے اُن احکام پر قائم رہ سکے کہ کس چیز سے ڈرنا چاہیے اور کس سے نہیں؟

اس نے کہا: بجا۔

میں نے کہا: حکیم اور عقلمند اُسے کہیں گے جس میں یہ چھوٹا سا عنصر موجود ہو، جو حکومت کرتا اور احکام دیتا ہے۔ یہ بات پہلے سے فرض کر لی گئی ہے کہ یہ حصہ اور تینوں حصوں اور نیز کل کے اغراض و مقاصد سے بخوبی واقف ہے۔

اس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: پھر کیا عفیف اسے نہ کہو گے جس میں یہ سب عنصر باہم دوستانہ ہم آہنگی رکھتے ہیں، جس میں عقل کا حکمران عنصر اور نفس (لوامہ) اور خواہشات کے ماتحت عنصر یکساں اس بات پر متفق بھی ہیں کہ عقل کو حکومت کرنی چاہیے اور اس کے خلاف بغاوت بھی نہیں کرتے۔

اس نے کہا: بے شک ریاست اور فرد دونوں میں عفت کی اصلی کیفیت یہی ہے۔

میں نے کہا: اور اس کی تشریح تو ہم بار بار کر چکے ہیں کہ ایک انسان کس طرح اور کس صفت کی وجہ سے عادل ہوتا ہے؟

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: کیا فرد میں عدل کچھ دھندلا اور کم روشن ہے اور یہاں بھی اس کی ماہیت وہی ہے جو ریاست میں تھی یا اس سے کچھ مختلف ہے؟

اس نے کہا: میرے خیال میں تو کوئی اختلاف نہیں۔

میں نے کہا: میں نے اس لیے پوچھا کہ اگر اب بھی ہمارے ذہن میں اس کی بابت کچھ شبہ باقی ہو تو چند روزمرہ کی عام مثالوں سے میرے بیان کی تصدیق ہو جائے گی۔

گلوکون نے پوچھا: کیسی مثالیں؟

میں نے کہا: مثلاً اگر ہمارے سامنے یہ معاملہ پیش ہو تو کیا ہم یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ ایک عادل ریاست یا ایک ایسا شخص جس کی تربیت ایسی ریاست کے اُصولوں میں ہوئی ہے اس میں سونے چاندی کی ایک امانت کو غیر منصف شخص کے مقابلے میں لے اُڑنے کا کم احتمال ہے۔ کیوں، کیا کوئی اس سے انکار کر سکتا ہے؟

اس نے کہا: کوئی نہیں۔

میں نے کہا: کیا ایک عادل انسان یا شہری کبھی مذہب کی اہانت کا، یا چوری کا مرتکب ہو سکتا ہے یا اپنے دوستوں یا ملک کے ساتھ دغا بازی اور غداری کر سکتا ہے؟

اس نے کہا: کبھی نہیں۔

میں نے کہا: کبھی اپنی قسم اور عہد توڑ سکتا ہے؟

اس نے کہا: ناممکن۔

میں نے کہا: زناکاری، والدین کی اہانت، دینی فرائض کی نافرمانی کا جتنا کم احتمال اس شخص سے ہے اور کسی سے نہ ہوگا۔

اس نے کہا: جی، کبھی نہیں۔

میں نے کہا: وجہ اس کی یہ ہے کہ اس کا ہر جزو اپنا اپنا کام انجام دے رہا ہے، چاہے یہ کام حکومت ہو چاہے محکومی۔

اس نے کہا: بالکل یہی بات ہے۔

میں نے کہا: کیا آپ اس بیان سے مطمئن ہیں کہ جو صفت ایسے افراد اور ایسی ریاستوں کو وجود میں لاتی ہیں اسی کا نام عدل ہے یا کسی اور انکشاف کی اُمید رکھتے ہیں؟

اس نے کہا: نہیں، مجھے تو کوئی اور اُمید نہیں۔

میں نے کہا: اچھا، تو ہمارا خواب پُورا ہوا اور اس تعمیر کے آغاز میں ہمیں جو گمان ہوا تھا کہ عدل کی اصلی صورت تک کسی الٰہی قوت نے ہمیں پہنچایا ہے، اس کی اب تصدیق ہوگئی۔

گلوکون نے جواب دیا: جی ہاں، بے شک۔

میں نے کہا: اور وہ تقسیمِ عمل جس کی رُو سے بڑھئی، موچی، اور دوسرے اہلِ حرفہ سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ اپنا اپنا کام دیکھیں۔ دوسرے کے کام میں دخل نہ دیں۔ وہ دراصل عدل کا ایک سایہ تھا، اور اسی لیے بہت کارآمد ثابت ہوا۔

اس نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: لیکن درحقیقت عدل کو انسان کے ظاہر سے سروکار نہیں باطن سے ہے کہ یہی انسان کی اصلی اور اس کی حقیقی غایت ہے۔ عادل آدمی اپنے مختلف اندرونی عناصر کو ایک دوسرے میں مداخلت کی اجازت نہیں دیتا؛ نہ ایک کو دوسرے کا کام کرنے دیتا ہے۔ وہ اپنی باطنی زندگی کو منضبط کر لیتا ہے۔ خود اپنا آقا ہوتا ہے، خود ہی اپنے لیے قانون بنالیتا ہے، وہ اپنی ذات سے برسرِ پیکار نہیں ہوتا، بلکہ صلح و سلامتی کے ساتھ رہتا ہے۔ جب یہ اس طرح اپنی روح کے تینوں اُصولوں کو (جو بمنزلہ اونچے، نیچے اور متوسط سُر اور ان کے درمیانی فصل کے ہیں) باہم متحد کر لیتا ہے اور اس میں کثرت باقی نہیں رہتی بلکہ ایک معتدل اور منضبط طبیعت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر ضرورت کے وقت یہ عمل کی طرف اپنا قدم اُٹھاتا ہے، خواہ یہ عمل املاک کے بارے میں ہو، یا جسم کے علاج کے متعلق یا کوئی سیاسی یا خانگی معاملہ ہو۔ جو چیز اس متناسب اور ہم آہنگ کیفیت کو قائم رکھے یا اس میں مدد دے، اسے یہ نیک اور عادلانہ سمجھے گا بھی اور کہے گا بھی۔ جو علم اس عملِ خیر کا باعث ہو اسے حکمت اور عقل سے تعبیر کرے گا، جو عمل اس کیفیت میں حارج ہو اُسے غیر عادلانہ قرار دے گا اور جو رائے اس کی وجہ ہوگی اُسے جہل جانے گا۔

اس نے کہا: آپ نے بالکل ٹھیک ٹھیک حقیقت کا اظہار فرما دیا۔

میں نے کہا: بہت خوب۔ تو اگر ہم اب یہ دعویٰ کریں کہ ہم نے عادل انسان اور عادل ریاست کا پتا چلا لیا اور ان دونوں میں عدل کی ماہیت بھی دریافت کر لی تو غالباً یہ کوئی جھوٹی بات نہ ہوگی۔

اس نے کہا: یقیناً نہیں۔

میں نے کہا: تو پھر کیا ہم یہ دعویٰ کریں۔

اس نے کہا: ہاں ہاں، کیوں نہیں۔

میں نے کہا: اچھا تو اب ظلم و ناانصافی پر غور کرنا باقی رہا۔

اس نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: ناانصافی ان تین اُصولوں میں کشمکش اور پیکار کی حالت ہوگی۔ ہر دم بے جا مداخلت، ہر لحظہ ایک دوسرے کی راہ میں حائل ہونا، روح کے ایک جزو کا کل کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا، ناجائز و ناروا اختیار کا دعویٰ جو باغی رعایا اپنے حقیقی بادشاہ کے خلاف کرتی ہے اگرچہ قدرتاً اس کی باج گزار ہے۔ یہ تمام پراگندگی اور فریب کیا ہیں؟ اگر ناانصافی، بے عفتی، بُزدلی، جہل اور شر کی شکلیں نہیں۔

اس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: اگر عدل اور ناانصافی کی ماہیت معلوم ہو تو غیر منصفانہ عمل کرنے اور غیر منصف ہونے یا منصفانہ عمل کرنے کے معنی بالکل صاف ہوں گے۔

اس نے کہا: آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں نے کہا: ان کی مثال صحت اور مرض کی سی ہے۔ روح میں ان کی حیثیت وہی ہے جو جسم میں صحت اور مرض کی۔

اس نے کہا: یہ کیسے؟

میں نے کہا: جو صحیح ہے وہ صحت کا باعث بھی ہوتا ہے، جو مریض ہے وہ مرض پیدا کرتا ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: عادلانہ عمل عدل کے باعث ہے اور غیر عادلانہ ظلم و انصافی کے۔

گلوکون نے جواب دیا: یہ تو یقینی بات ہے۔

میں نے کہا: اور صحت پیدا کرنے کے معنی ہیں جسم کے اجزا میں حکومت کے فطری نظام کا قائم کر دینا۔ مرض نام ہے اس فطری نظام سے متغائر حالات کے پیدا ہو جانے کا۔

اس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: اسی طرح کیا عدل رُوح کے اجزا میں ایک فطری نظام حکومت کے قیام کا نام نہیں اور کیا ناانصافی اس فطری نظام کے مخالف صورت حالات کے پیدا ہونے کو نہیں کہتے؟

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: لہٰذا نیکی اور خیر روح کی صحت، اس کی فلاح، اور اس کا حسن ہے، بُرائی اور شر اس کا مرض، اس کی کمزوری اور بدصورتی ہے۔

گلوکون نے کہا: درست۔

میں نے کہا: اور کیا اچھے کام نیکی کی طرف اور بُرے کام بُرائی کی طرف نہیں لے جاتے؟

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: اب تک عدل اور ناانصافی کے اعتباری فائدوں کے پرانے سوال کا جواب نہیں ہوا۔ عادل بننا، عادلانہ عمل کرنا، نیکی پر کاربند ہونا خواہ دیوتا اور انسان دیکھیں یا نہ دیکھیں یہ زیادہ سودمند ہے یا غیر منصف ہونا اور غیر منصفانہ اعمال کرنا بشرطیکہ سزا اور تادیب سے بچ نکلیں۔

گلوکون نے کہا: میری رائے میں تو یہ سوال اب کچھ مضحکہ خیز سا ہو گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جب کسی شخص کا جسمانی نظام بگڑ جاتا ہے تو زندگی دوبھر ہو جاتی ہے، چاہے پھر اسے طرح طرح کے کھانے پینے کی چیزوں سے کتنا ہی بھر دا ور خواہ کتنی ہی دولت اور قوت پاس کیوں نہ ہو۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ جب اُصول حیات کی جڑ بودی اور کھوکھلی ہو جائے تو اس وقت بھی انسان کے لیے زندگی اس لیے کوئی رکھنے کے قابل چیز ہو سکتی ہے کہ سوائے عدل اور نیکی کے حصول کے اور ناانصافی سے بچنے کے وہ جو چاہے کر سکتا ہے؟ اور پھر عدل و ناانصافی، خیر و شر کی ماہیت وہ ہو جو ہم نے بیان کی ہے!

میں نے کہا: بے شک، آپ کے نزدیک یہ سوال تمسخر انگیز ہے۔ لیکن پھر بھی چونکہ ہم اس مقام سے قریب ہیں جہاں سے خود اپنی آنکھوں سے حقیقت کا صاف نظارہ ہو سکتا ہے تو پھر راہ میں کیوں سُست پڑ جائیں۔

اس نے کہا: ہاں، ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: اچھا تو ادھر آؤ۔ اور شر کی مختلف شکلیں دیکھو، میرا مطلب ان سے ہے جو دیکھنے کے قابل ہیں۔

اس نے کہا: ہاں ہاں، آپ چلیے میں بھی پیچھے پیچھے آتا ہوں۔

میں نے کہا: معلوم ہوتا ہے کہ ہماری دلیل اس قدر بلندی پر پہنچ گئی ہے کہ وہاں سے ایک مشاہدے کے مینار کی طرح آدمی نیچے دیکھ سکتا ہے کہ نیکی اور خیر تو ایک ہی ہے لیکن بدی اور شر کی بے شمار شکلیں ہیں، ان میں سے چار خاص طور پر قابلِ لحاظ ہیں۔

گلوکون نے کہا: وہ کون سی؟

میں نے کہا: میرا مطلب یہ ہے کہ روح کی بھی اتنی ہی قسمیں معلوم ہوتی ہیں جتنی ریاست کی مختلف شکلیں ہیں۔

گلوکون نے کہا: یعنی کتنی؟

میں نے کہا: ریاست کی پانچ قسمیں ہیں اور رُوح کی بھی پانچ ہیں۔

گلوکون نے کہا: یہ قسمیں کیا ہیں؟

میں نے کہا: پہلی قسم تو وہ ہے جس کا بیان ہم لوگ کر رہے تھے اور اس کے دو نام ہیں۔ شاہی اور اشرافیہ: شاہی، اگر ایک ممتاز آدمی حکومت کرے اور اشرافیہ، اگر بہت سے ممتاز آدمی حکومت کریں۔

گلوکون نے کہا: درست۔

میں نے کہا: لیکن میرے نزدیک یہ دونوں نام ایک ہی قسم کا اظہار کرتے ہیں، کیونکہ حکومت کی باگ ایک شخص کے ہاتھ میں ہو یا بہت سے افراد کے، اگر حاکموں کی تربیت اس طرح ہوتی ہے جیسی کہ ہم نے بیان کی ہے تو ریاست کے اُصولی اور بنیادی قوانین کو یہ کبھی ٹوٹنے نہ دیں گے۔

گلوکون نے کہا: سچ ہے، کبھی نہیں۔

☆☆☆

پانچویں کتاب

میں نے کہا: گویا اچھے شہر اور حقیقی ریاست کا تو یہ حال ہے، اور نیک اور کامل انسان بھی اسی نمونے کے مطابق ہوتا ہے، اور اگر یہ نمونہ صحیح ہے تو دوسرے سب کے سب غلط ہیں۔ پھر اسی طرح بُرائی بھی وہی ہے جو صرف ریاست ہی کے نظام کو متاثر نہ کرے بلکہ انفرادی روح کے انضباط میں بھی حائل ہو۔ اور یہ چار شکلوں میں رُونما ہوتی ہے۔

گلوکون نے کہا: وہ کیا؟

میں ان چار بُرائیوں کو بالترتیب بیان کرنا ہی چاہتا تھا کہ پولیمارکس نے جو ایڈیمنٹس سے ذرا ادھر بیٹھا تھا اپنا ہاتھ بڑھایا اور شانے کے پاس اُس کا کوٹ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا، اور خود بھی اس کی طرف ذرا جھک کر آہستہ سے کان میں کچھ کہا۔ میں بس اتنا سُن پایا کہ "انھیں جانے دیں، یا کیا کریں؟" ایڈیمنٹس نے اس کے جواب میں ذرا اونچی آواز سے کہا "نہیں، ہرگز نہیں"۔

میں نے کہا: وہ کون غریب ہے جس کی رہائی سے آپ انکار کررہے ہیں؟

ایڈیمنٹس نے جواب دیا: خود جناب!

میں نے کہا: کیوں؟ آخر مجھے رہا نہ کرنے کی کیا خاص وجہ؟

ایڈیمنٹس نے کہا: اس لیے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ آپ سُست آدمی ہیں اور اس قصے کے ایک پورے کے پورے باب سے ہمیں آپ دھوکا دے کر نکال لے جانا چاہتے تھے۔ آپ شاید سمجھتے تھے کہ ہم آپ کے اس ہوائی اندازِ گفتگو کو نہ تاڑ سکیں گے۔ آپ نے تو ابھی ابھی ایسے فرمایا گویا یہ بات ہر ایک پر کھلی ہوئی ہے کہ عورتوں اور بچوں کے معاملے میں "احباب کے مابین سب کچھ مشترک ہونا چاہیے"۔

میں نے کہا: کیوں ایڈیمنٹس! کیا یہ ٹھیک نہ تھا؟

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک، لیکن بہت سی ٹھیک باتوں کی بھی تو تشریح کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً یہ

کہ اشتراک کئی قسم کا ہوتا ہے۔ لہٰذا براہِ کرم بتائیے کہ آپ کا مقصد کس قسم کے اشتراک سے ہے؟ ہم بڑی دیر سے اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ آپ شہریوں کی خانگی زندگی کے متعلق کچھ فرمائیں گے؛ کہ ان کے بچے کیسے پیدا ہوں گے؛ پیدائش کے بعد یہ ان کی پرورش کس طرح کریں گے یا عام لفظوں میں یہ کہ زن و فرزند کے اس اشتراک کی نوعیت کیا ہوگی۔ اس لیے کہ ہمارے خیال میں ان معاملوں کا اچھا یا بُرا انتظام ریاست کی اچھائی یا بُرائی پر بہت گہرا اثر رکھے گا۔ اور چونکہ اس سوال کا جواب ابھی متعین نہیں ہوا اور آپ لگے دوسری ریاست کی طرف متوجہ ہونے، اس لیے، جیسا کہ آپ نے خود سُن لیا، ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ جب تک آپ ان سب باتوں کو بیان نہ کر دیں آپ کو ہرگز نہ چھوڑا جائے۔

گلوکون نے کہا: اس قرارداد سے میں بھی بالکل متفق ہوں۔

تھریسی میکس نے کہا: زیادہ ہنگامے کی کیا ضرورت ہے، بس آپ سمجھیے کہ ہم سب نے اسے باتفاق رائے منظور کیا۔

میں نے کہا: آپ لوگ نہیں جانتے کہ مجھ پر اس طرح چھاپہ مار کر آپ لوگ دراصل کیا کر رہے ہیں۔ اللہ! آپ ریاست کے متعلق پھر کس مسئلے کو چھیڑتے ہیں؟ میں تو سمجھا تھا کہ بس میں نے اپنا بیان ختم کیا اور خوش تھا کہ اس مسئلے کو اس وقت تو سُلا دیا، اپنی خوش نصیبی پر ناز کر رہا تھا کہ آپ لوگوں نے میری گزارش کو شرفِ پذیرائی بخشا۔ لیکن آپ تو اب مجھے پھر نئے سرے سے چلنے کا حکم دیتے ہیں۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ آپ لفظوں کی بھڑوں کے کس چھتے کو چھیڑ رہے ہیں۔ میں اس آنے والی مصیبت کو سمجھتا تھا اور اسی لیے بچ کر نکلا تھا۔

تھریسی میکس نے کہا: لیکن آپ کے خیال میں آخر ہم لوگ یہاں کس لیے حاضر ہوئے ہیں، چشمۂ حیواں کی تلاش میں یا بس تقریر سُننے؟

میں نے کہا: درست۔ لیکن آخر تقریر کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں، عقلمندوں کے نزدیک اس قسم کی تقریریں سُننے کی حد ساری عمر ہے۔ لیکن خیر ہمیں جانے دیجیے، ہمارا خیال نہ کیجیے۔ آپ خود ہمت کیجیے اور اپنے خاص انداز میں اس سوال کا جواب دیجیے۔ عورتوں اور بچوں کا وہ کیسا اشتراک ہے جو ہمارے محافظوں میں رائج ہونا چاہیے۔ ولادت اور تعلیم شروع ہونے کے درمیان کے زمانے میں بچوں کا کیا انتظام ہوگا، کہ اس زمانے میں بڑی نگہداشت کی ضرورت ہے۔

ان باتوں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمایئے۔

میں نے کہا: بجا و درست۔ لیکن میرے بھولے دوست اس کا جواب نہایت دشوار ہے۔ پچھلے نتائج کے مقابلے میں اس معاملے پر بہت زیادہ شبہات وارد ہوتے ہیں۔ اول تو اس تجویز کا قابلِ عمل ہونا مشتبہ، اور پھر دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھو تو اگر قابلِ عمل سہی تو اس کا مفید اور اچھا ہونا بھی مشتبہ۔ اس لیے میں اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے جھجکتا ہوں کہ ہماری آرزوئیں بس ایک خواب نہ ثابت ہوں۔

گلوکون نے کہا: بہت زیادہ ڈریے نہیں۔ آپ کے سامعین بہت سخت گیری نہیں کریں گے۔ ان میں نہ تشکیک ہے نہ مخالفت۔

میں نے کہا: یہ کہہ کر آپ شاید میری ہمت بندھانا چاہتے ہیں؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: تو میں آپ سے عرض کردوں کہ آپ اس کے بالکل مخالف عمل کر رہے ہیں۔ آپ کی ہمت افزائی نہایت خوب ہوتی اگر خود مجھے یقین ہوتا کہ جس چیز پر میں گفتگو کر رہا ہوں اس سے واقف ہوں۔ ان اُمورِ مہمہ کے متعلق جن کی آدمی وقعت کرتا اور جن سے محبت رکھتا ہے، عاقلوں کے ایک ایسے مجمع میں جو سب خود اس کی ذات سے اُنس رکھتے ہوں، حق کا اعلان خوف و تذبذب کا سبب نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن جب آدمی خود تذبذب میں ہو اور پھر اس مسئلے کے متعلق دلائل دے تو یہ خطرے کی بات ہے اور یہی حال میرا ہے۔ مجھے اس کا ڈر نہیں کہ لوگ مجھ پر ہنسیں گے۔ یہ ڈر تو سراسر طفلانہ ہے، بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ جہاں اپنے قدم پر پورے اعتماد کی ضرورت ہے وہیں پاؤں لغزش نہ کھائے اور حقیقت سے محروم نہ رہوں اور خود گروں سو گروں، کہیں احباب کو بھی ساتھ نہ لے گراؤں۔ میں انتقام کی دیوی سے دست بہ دعا ہوں کہ میں جو کچھ کہنے والا ہوں وہ بس مجھ ہی پر صادق ہو۔ کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہ کسی انسان کو بلا ارادہ قتل کر دینا اتنا بڑا جرم نہیں جتنا کہ حُسن و خوبی اور عدل اور آئین کے اُصول کے متعلق کسی کو دھوکا دینا اور یہ خطرہ ایسا ہے کہ میں دشمنوں میں تو اسے برداشت بھی کرلوں لیکن دوستوں میں ہرگز نہیں کرسکتا۔ آپ نے دیکھا کہ آپ کی ہمت افزائی نے کیا کام کیا؟

گلوکون نے ہنس کر کہا: اچھا! اگر آپ نے یا آپ کے دلائل نے ہمیں کوئی سخت نقصان بھی پہنچایا تو بھی ہم پہلے سے آپ کو قتل کے جرم سے بری کرتے ہیں اور آپ کو دھوکا یا فریب دینے والا بھی نہیں ٹھہرائیں

گے۔ ہمت کیجیے اور فرمایئے۔

میں نے کہا: قانون کی رو سے اگر کوئی شخص رہا کر دیا جائے تو گویا وہ جرم سے بری ہے اور جو قانون کا دستور ہے وہی بحث و مباحثہ میں ٹھیک ہے۔

اس نے کہا: تو پھر کیا تامل ہے؟

میں نے کہا: میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ذرا پیچھے ہٹنا پڑے گا اور اب وہ کہنا ہوگا جو پہلے کہہ دیا جانا چاہیے تھا۔ اچھا، مردوں کا حصہ تو پورا ہو گیا، اب قدرتی طور پر عورتوں کی باری ہے۔ میں اب ان کا ذکر کرتا ہوں اس وجہ سے اور بھی کہ آپ لوگ اصرار کرتے ہیں۔

ہمارے شہریوں کی سی طبیعت اور تعلیم کے لوگوں کے لیے عورتوں اور بچوں کی حیثیت اور اس کے ساتھ برتاؤ کے متعلق صحیح نتیجہ پر پہنچنے کا بس ایک ہی راستہ ہے یعنی وہ جس سے ہم نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا تھا کہ مردوں کی وہ حیثیت ہونی چاہیے جو گلے میں محافظ اور نگران کتے کی ہوتی ہے۔

گلوکون نے کہا: درست۔

میں نے کہا: تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیجیے کہ ہماری عورتوں کی تولید و تعلیم بھی انھیں یا تقریباً ایسے ہی ضابطوں کی پابند ہے۔ اس کے بعد معلوم ہوگا کہ یہ نتیجہ ہمارے ارادے کے مطابق ہے یا نہیں۔

اس نے پوچھا: کیا، اس سے آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں نے جواب دیا: میرا مفہوم ایک سوال کی شکل میں رکھا جا سکتا ہے یعنی کیا کتوں میں نر مادہ کی تفریق ہوتی ہے؟ یا وہ سب کے سب شکار، نگہبانی اور دوسرے فرائض یکساں انجام دیتے ہیں؟ یا ایسا ہوتا ہے کہ ہم صرف نر کتوں کو تو گلے کی نگہداشت کے لیے چھوڑ دیں اور کتیوں کو یہ سمجھ کر گھر پر پڑا رہنے دیں کہ بچے دینا اور انھیں دودھ پلانا ان کے لیے بس کافی محنت ہے؟

اس نے کہا: نہیں، وہ تو سب یکساں ان کاموں میں شریک ہوتے ہیں، صرف اتنا فرق ہوتا ہے کہ نر زیادہ مضبوط ہوتے ہیں اور مادہ ذرا کمزور۔

میں نے کہا: اچھا بتاؤ کہ اگر جانوروں کو ایک سی تربیت اور ایک سی غذا نہ دی جائے تو کیا وہ دونوں ایک ہی کام کر سکتے ہیں؟

اس نے جواب دیا: نہیں۔

میں نے کہا: چنانچہ اگر عورتوں اور مردوں کے فرائض ایک سے ہیں تو ان کی تعلیم اور پرورش بھی ایک سی ہونی چاہیے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: مردوں کے لیے ہم نے جو تعلیم تجویز کی ہے وہ تو ورزش اور موسیقی ہے۔

اس نے کہا: جی۔

میں نے کہا: تو کیا عورتوں کو بھی موسیقی اور جسمانی ورزش کی تعلیم دی جائے، نیز جنگی فنون کی جس پر یہ بھی مردوں کی طرح عمل پیرا ہوں۔

اس نے کہا: جی، نتیجہ تو یہی نکلتا ہے۔

میں نے کہا: میرا گمان ہے کہ ہماری تجاویز اتنی غیر معمولی ہیں کہ اگر عمل میں آ گئیں تو شاید مضحکہ خیز ثابت ہوں۔

اس نے کہا: اس میں کیا شک ہے؟

میں نے کہا: ہاں، اور سب سے زیادہ مضحکہ خیز یہ منظر ہوگا کہ اکھاڑے میں عورتیں مردوں کے ساتھ برہنہ ورزش کرتی ہوں۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ اُن کی جوانی کا زمانہ رخصت ہو گیا ہو، کہ پھر اس وقت تو حُسن کا کوئی منظر بھی باقی نہیں رہے گا۔ جیسے، تم نے دیکھا ہو، بعض بوڑھے لیکن جوشیلے لوگ باوجود اپنی بدصورتی کے، کہ سارے بدن کا گوشت لٹکا اور جُھرّیاں پڑی ہیں، اکھاڑوں کی گرد چھانتے پھرتے ہیں۔

اس نے کہا: جی ہاں، موجودہ خیالات کے مطابق تو یہ تجویز نہایت مضحکہ خیز متصور ہوگی۔

میں نے کہا: لیکن ہم لوگوں نے چونکہ اپنے خیالات کے اظہار کا تہیہ کر لیا ہے، اس لیے ہم ظریف الطبع لوگوں کے ان فقروں کا کچھ خیال نہیں کریں گے جو اس جدت کو ملامت کا نشانہ بنائیں، ہمیں اس کی کیا پروا ہے کہ وہ موسیقی اور ورزش میں عورتوں کی قابلیت اور صلاحیت کا کس طرح ذکر کریں گے، یا ان کے زرہ بکتر پہن کر گھوڑوں پر چڑھنے کی کیسی خاک اڑائیں گے۔

گلوکون نے جواب دیا: بالکل بجا۔

میں نے کہا: لیکن جب ایک دفعہ شروع کر دیا تو اس قانون کے ناگوار حصّوں کو بھی لینا ہی ہوگا۔ اور ہم ان صاحبوں سے التجا کریں گے کہ زندگی بھر میں بس ایک بار تو ذرا سنجیدہ بن بیٹھیں۔ ہم انھیں یاد دلائیں

گے کہ بہت دن نہیں ہوئے خود اہلِ یونان کا یہ خیال تھا اور غیر مہذب قوموں میں تو اب بھی موجود ہے کہ کسی برہنہ مرد کو دیکھنا نہایت غیر مناسب اور مضحکہ خیز بات ہے، اور جب پہلے پہلے کریٹ (Cretan) کے باشندوں نے اور ان کے بعد لیسی ڈیمون (Lacedaemonian) کے باسیوں نے اس رسم کو شروع کیا تو اس زمانہ کے ظریف بھی بعینہٖ اسی طرح اس جدت کا مذاق اڑا سکتے تھے۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: لیکن جب تجربے نے بتادیا کہ سب چیزوں کا کھلا رکھنا انھیں چھپانے سے بہتر ہے اور ظاہر میں آنکھ پر جو مضحکہ خیز اثر اس منظر کا ہوتا تھا جب وہ عقل کے بہتر اُصولوں کے سامنے غائب ہوگیا تو اس شخص کی بے وقوفی کھل گئی جو حماقت اور بُرائی کے علاوہ کسی اور چیز کو اپنے طعن اور تمسخر کا نشانہ بناتا اور حُسن کے اندازے کے لیے خیر اور خوبی کے علاوہ کوئی اور معیار مقرر کرتا ہے۔

اس نے کہا: بالکل درست۔

میں نے کہا: خواہ اس سوال کو ہنسی سمجھیے یا سنجیدگی کے ساتھ سوچیے سب سے پہلے ہمیں عورت کی فطرت کے متعلق ایک بات پر قائم ہوجانا چاہیے یعنی آیا وہ کلی یا جزوی حیثیت سے مرد کے کاموں میں شریک ہوسکتی ہے یا مطلق نہیں؟ آیا جنگ کا فن منجملہ اُن فنون کے ہے جن میں وہ شرکت کرسکتی ہے؟ غالباً تحقیق کے شروع کرنے کا یہی سب سے اچھا طریقہ ہوگا اور اسی سے بہترین نتائج نکل سکیں گے۔

اس نے کہا: بے شک یہی بہترین طریقہ ہوگا۔

میں نے کہا: کیوں، تو پھر ہم پہلے اس دلیل کا دوسرا رُخ نہ لے لیں، پہلے اپنے خلاف دلیل پیش کریں۔اس طرح مخالف کا دعویٰ بلا وکالت نہ رہ جائے گا۔

اس نے کہا: ہاں ہاں، ضرور، کیوں نہیں۔

میں نے کہا: اچھا تو آؤ اپنے مخالفین کی زبان سے ایک تقریر کریں۔ وہ لوگ کچھ یوں کہیں گے:

''جناب سقراط اور گلوکون! اس کی ضرورت ہی کیا کہ کوئی مخالف آپ پر الزام لگائے۔ آپ نے تو خود ریاست کی بنیاد ڈالتے وقت اس اُصول کو تسلیم کیا تھا کہ ہر شخص بس وہی کام کرے جس کے لیے وہ فطرتاً موزوں ہے''

اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ بات ہم نے تسلیم ضرور کی تھی۔

''اور کیا عورت اور مرد کی فطرت میں بہت بڑا تفاوت نہیں ہوتا''؟

ہم جواب دیں گے کہ بے شک ہوتا ہے۔ پھر سوال ہوگا کہ "عورتوں اور مردوں کو جو کام تفویض کیے جائیں، کیا وہ علیحدہ علیحدہ اور ان کی مختلف طبیعتوں کے مناسب نہیں ہونے چاہئیں"؟ جواب: "بے شک، ہونے چاہئیں"۔ "پھر اگر ایسا ہے تو آپ نے یہ کہہ کر کیسی بے جوڑ بات کی کہ مرد اور عورتیں جن کی طبیعتوں میں اس درجے فرق ہے سب کے سب یکساں کام کریں"۔ کوئی یہ اعتراض کرے تو صاحب اس کا جواب آپ کے پاس کیا ہے؟

گلوکون نے کہا: ہاں، اگر یکا یک کوئی یہ سوال پوچھ بیٹھے تو اس کا جواب کچھ سہل نہیں اور میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اپنی طرف سے بھی اس معاملے کی پیروی کریں۔

میں نے کہا: میاں گلوکون! یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے اعتراضات ہیں جنھیں میں پہلے سے سمجھ رہا تھا اور اسی لیے عورتوں اور بچوں کی ملکیت اور پرورش کے متعلق کسی قانون کو ہاتھ لگانے سے ڈرتا اور جھجکتا تھا۔

گلوکون نے کہا: زیوس کی قسم! یہ مسئلہ اور چاہے کچھ ہو، آسان تو ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: ہاں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب آدمی اپنے قد سے زیادہ پانی میں گرا تو چاہے وہ تیرنے کا تالاب ہو یا بحرِ ذخار، اُسے دونوں جگہ تیر کر ہی پار ہونا پڑے گا۔

گلوکون نے کہا: بہت سچ فرماتے ہیں آپ۔

میں نے کہا: تو پھر ہم بھی تیر کر ساحل تک پہنچنے کی کوشش کیوں نہ کریں۔ اُمید رکھنی چاہیے کہ اریون (Arion) کی ڈالفن یا کوئی اور غیبی طاقت مدد کر کے ہمیں بچالے گی۔

گلوکون نے کہا: مجھے بھی یہی اُمید ہے۔

میں نے کہا: اچھا تو آؤ، دیکھیں کہ اس سے بچنے کی کوئی صورت بھی ہے۔ ہم نے تسلیم کیا تھا کہ مختلف طبیعتوں کے لیے مختلف کام ہونے چاہئیں اور یہ بھی تسلیم کیا تھا کہ عورتوں اور مردوں کی طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں۔ کیوں تسلیم کیا تھا نا؟ اور اب ہم کیا کہتے ہیں؟ یہ کہ مختلف طبیعتوں کے لیے ایک ہی شغل ہو۔ ہم پر اس سے بے جوڑ اور متضاد بات کا الزام لگایا جاتا ہے۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں، یہی تو الزام ہے۔

میں نے کہا: گلوکون! مناظرے کے فن کی قوت بھی عجب شان رکھتی ہے؟

گلوکون نے کہا: یہ آپ نے کیوں فرمایا؟

میں نے کہا: اس لیے کہ میرے خیال میں اکثر لوگ اپنے ارادے کے خلاف اس پر عمل پیرا ہوتے رہتے ہیں۔ آدمی سمجھتا ہے کہ معقول دلیل دے رہا ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ مناظرے میں مشغول ہوتا ہے۔ صرف اس لیے کہ تقسیم اور تعریف نہ کر سکنے کی وجہ سے وہ اپنی گفتگو کے موضوع سے ہی واقف نہیں ہوتا۔ مناظرے اور مباحثے کی خاطر محض لفظی داؤ پیچ میں پھنسا رہتا ہے اور اصل مسئلے پر کوئی معقول تحقیق نہیں کرتا۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں، اکثر ایسا ہوتا ہے، لیکن اسے آخر ہم سے یا ہماری بحث سے کیا واسطہ؟

میں نے کہا: کیوں، بہت کچھ۔ یقیناً ہمارے لیے بھی تو بے جانے ہوئے اسی لفظی بحث میں پھنس جانے کا اندیشہ ہے۔

گلوکون نے کہا: یہ کیسے؟

میں نے کہا: ایسے کہ ہم بھی تو نہایت شجاعانہ اور مجادلانہ اسی لفظی حقیقت پر مصر ہیں کہ مختلف طبیعتوں کی مناسبت سے مشغلے بھی مختلف ہونے چاہئیں۔ لیکن ہم نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ طبیعت کی یکسانی یا اختلاف کا مفہوم کیا ہے۔ اور ہم نے جب یکساں طبیعت والوں کو ایک سے اور مختلف طبیعت والوں کو مختلف مشغلے سپرد کیے تھے تو آخر یہ تفریق ہم نے کی کیوں تھی؟

گلوکون نے کہا: ہاں، بے شک۔ اس کا تو ہم نے بالکل خیال نہیں کیا۔

میں نے کہا: مثال کے طور پر فرض کرو ہم پوچھیں کہ گنجے اور بالوں والے آدمی میں طبیعت کا اختلاف ہے یا نہیں۔ اگر ہم اختلاف تسلیم کر لیں اور گنجے لوگ موچی کا کام کرتے ہوں تو کیا ہم تمام بالوں والے اشخاص کے لیے موچی کا کام ممنوع قرار دیں گے یا اس کی مخالف صورت میں اس کے برعکس؟

گلوکون نے کہا: یہ تو عجیب دل لگی ہو جائے گی۔

میں نے کہا: بے شک مذاق ہوگا۔ لیکن آخر کیوں؟ اس لیے کہ ریاست کے بناتے وقت ہمارا مطلب یہ نہیں تھا کہ یہ اختلاف ہر معمولی فرق سے عبارت ہے بلکہ صرف وہ فرق پیش نظر تھے جن سے اس فرد کے شغل پر اثر پڑتا ہے، مثلاً ہمیں کہنا چاہیے تھا کہ ایک طبیب اور ایک ایسا شخص جس کے دماغ کو طب سے مناسبت ہو دونوں ایک سی طبیعت رکھتے ہیں۔

اس نے جواب دیا: درست۔

میں نے کہا: لیکن طبیب اور بڑھئی کی طبیعتیں مختلف ہیں۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اب اگر مردوں اور عورتوں میں ان مشغلوں اور فنون کے اعتبار سے کوئی فرق ہے جن میں وہ مصروف ہونا چاہتے ہیں تو پھر تو ہمیں ضرور ایک مشغل ایک صنف کو اور دوسرا دوسرے کو تفویض کرنا چاہیے لیکن اگر فرق صرف اتنا ہے کہ عورتیں بچے جنتی اور مرد بچے پیدا کرتے ہیں، تو میرے نزدیک یہ تو اس امر کا ثبوت نہیں ہے کہ جس قسم کی تعلیم مرد کو دی جائے وہ عورت کے لیے مناسب نہیں۔ چنانچہ ہم اس خیال پر قائم رہ سکتے ہیں کہ محافظوں اور ان کی بیویوں دونوں کے لیے ایک مشغل ہونا چاہیے۔

گلوکون نے کہا: بالکل صحیح۔

میں نے کہا: اب ہم اپنے مخالف سے پوچھیں کہ مشغلوں کے اعتبار سے اور شہری زندگی کے فنون کے لحاظ سے عورت کی طبیعت مرد سے کس طرح مختلف ہے؟

گلوکون نے کہا: ہاں، یہ بالکل جائز سوال ہے۔

میں نے کہا: اور غالباً وہ بھی آپ کی طرح یہ جواب دے گا کہ فوراً تو اس سوال کا جواب دینا سہل نہیں۔ البتہ تھوڑے سے غور کے بعد کوئی دشواری نہیں رہے گی۔

گلوکون نے کہا: جی، غالباً یہی جواب ملے گا۔

میں نے کہا: اچھا تو ہم اسے دعوت دیں کہ گفتگو میں ذرا ہمارا ساتھ دے اور مجھے اُمید ہے کہ ہم اس پر واضح کر سکیں گے کہ عورت کی طبیعت میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں جس کا اثر ریاست کے انتظام پر پڑتا ہو۔

گلوکون نے کہا: ضرور دعوت دیجیے۔

میں نے کہا: ہم اس سے کہیں: ''آیئے۔ ہم آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتے ہیں۔ آپ نے جو یہ فرمایا کہ کسی میں ایک چیز کا ملکہ ہوتا ہے، کسی میں دوسری کا، تو اس سے آپ کا مطلب کیا تھا؟ کیا یہ مفہوم تھا کہ ایک آدمی ایک چیز کو آسانی سے حاصل کر سکتا ہے اور دوسرا مشکل سے۔ ایک تھوڑا سا علم حاصل کر کے بہت سے انکشافات کر سکتا ہے، دوسرا سخت مطالعے اور توجہ کے بعد بھی جو کچھ سیکھتا ہے بُھلا دیتا ہے۔ ایک کا جسم، اُس کے ذہن کا اچھا تابع اور دوسرے کا جسم اس کے لیے ایک سنگِ راہ ہے، یہی تو وہ فرق ہوں گے نا، جن کی وجہ سے اُس شخص کو جسے قدرت نے بہت کچھ ودیعت کیا ہے اس سے الگ کر سکیں گے جسے اس نے کچھ

عطا نہیں کیا؟

گلوکون نے کہا: اس سے کون انکار کر سکتا ہے؟

میں نے کہا: اور کیا آپ انسانی مشغلوں میں سے کسی کا نام لے سکتے ہیں، جس میں مرد کو عورت کے مقابلے میں یہ صفات زیادہ نہ ودیعت کی گئی ہوں۔ سُنیئے، میں آپ کا وقت نور بافی، مربے اور نان خطائی کی تیاری وغیرہ کے ذکر میں کیوں ضائع کروں کہ ان میں تو عورت درحقیقت افضل معلوم ہوتی ہے اور مرد یہاں آسانی سے زک کھاتے اور اپنی ہنسی اُڑواتے ہیں۔

گلوکون نے کہا: آپ صحیح فرماتے ہیں۔ عام طور پر عورتیں مردوں سے کم درجہ رکھتی ہیں۔ اگرچہ یہ بھی ضرور ہے کہ بہت سی عورتیں اکثر کاموں میں بہت سے مردوں سے بدرجہا بہتر ہوتی ہیں۔ پھر بھی مجموعی حیثیت سے آپ جو کچھ فرماتے ہیں درست ہے۔

میں نے کہا: اچھا تو میرے دوست۔ اگر ایسا ہے تو انتظام ریاست کے اعتبار سے کوئی ایسی خاص قابلیت نہیں جو عورت میں بحیثیت عورت، اور مرد میں بحیثیت مرد موجود ہوتی ہو۔ قدرت کی دین دونوں میں یکساں بٹی ہے۔ جو مرد کے شغل ہیں وہی سب عورت کے بھی شغل ہیں۔ ہاں، سب میں عورت مرد سے کمتر درجہ رکھتی ہے۔

اس نے کہا: بالکل صحیح۔

میں نے کہا: ہاں، تو کیا ہم اپنے قانون صرف مردوں ہی پر لاگو کریں، عورتوں پر کچھ نہیں؟

اس نے کہا: بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

میں نے کہا: ایک عورت میں مرض سے شفا دینے کی قابلیت ہوتی ہے، دوسری میں نہیں۔ ایک موسیقی کی ماہر ہے اور دوسری کی فطرت میں موسیقی یک قلم مفقود۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: یا ایک عورت کو جسمانی ورزش اور فوجی کاموں کی طرف رغبت ہوتی ہے، دوسری ورزش سے متنفر اور جنگ سے بیزار۔

اس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: کوئی عورت فلسفی ہوتی ہے، کوئی فلسفے کی دشمن۔ کسی میں جرأت ہوتی ہے، کسی میں یہ چیز

سرے سے غائب۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: یعنی کسی عورت کا مزاج محافظوں کا سا ہے اور کسی کا نہیں؟ مرد محافظوں کا انتخاب بھی تو آخر انہی اختلاف کی بنا پر ہوا تھا؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: عورت اور مرد دونوں میں محافظ بننے کی صفات موجود ہوتی ہیں، فرق صرف اُن کی اعتباری قوت اور کمزوری کا ہے۔

گلوکون نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: جن عورتوں میں یہ صفات موجود ہوں اُن کا انتخاب کر کے اُن مردوں کا ساتھی اور معاون بنانا چاہیے جن میں اسی قسم کی صفات ہوں اور جن سے یہ بہ اعتبارِ صلاحیت اور اخلاق مشابہ ہوں۔

گلوکون نے کہا: بہت درست۔

میں نے کہا: اور یکساں طبیعتوں کے لیے ایک سے ہی شغل بھی چاہئیں۔

گلوکون نے کہا: ضرور۔

میں نے کہا: چنانچہ، جیسے ہم پہلے کہہ چکے ہیں، محافظوں کی بیویوں کو ورزش اور موسیقی کا کام تفویض کرنے میں کوئی بات فطرت کے خلاف نہیں۔ گھوم گھام کر ہم پھر اسی نقطے پر آن پہنچے۔

گلوکون نے کہا: یقیناً فطرت کے خلاف کوئی بات نہیں۔

میں نے کہا: لہٰذا ہم نے جو قانون بنایا تھا وہ فطرت کے مطابق ہے۔ اور اس لیے نہ غیر ممکن ہے، نہ محض ایک آرزو ہی آرزو، بلکہ آج کل جو اس کے خلاف عمل ہوتا ہے دراصل یہ قدرت کے قوانین کی نافرمانی ہے۔

گلوکون نے کہا: جی، آپ کا ارشاد معلوم تو صحیح ہوتا ہے۔

میں نے کہا: ہمیں پہلے تو یہ دیکھنا تھا کہ ہماری تجاویز پر عمل ممکن بھی ہے یا نہیں اور دوسری بات یہ تھی کہ اگر عمل ہو سکے تو آیا یہی سب سے زیادہ سودمند تجاویز ہیں؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اب اُن کا امکان تو مسلّم ہو گیا؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: باقی رہا ان کے زیادہ سود مند ہونے کا ثبوت۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: آپ تو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جو تعلیم مرد کو اچھا محافظ بناتی ہے وہ عورت کو بھی اچھا محافظ بنا دے گی، کیونکہ ان کی اصلی طبیعت ایک ہے۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اب میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔

گلوکون نے کہا: وہ کیا؟

میں نے کہا: خوبی کے اعتبار سے کیا سب آدمی باہم برابر ہیں یا ایک شخص دوسرے سے بہتر ہوتا ہے۔

گلوکون نے کہا: دوسری صورت صحیح ہے۔

میں نے کہا: اچھا تو ہم جس ریاست کی بنیاد رکھ رہے ہیں اس میں وہ محافظ زیادہ کامل انسان ہوں گے جن کی تربیت ہمارے بنائے ہوئے نظام کے ماتحت ہوئی ہے یا وہ موچی جنھیں صرف موچی گری کی تعلیم ملی ہے؟

گلوکون نے کہا: کیا خوب! آپ نے بھی کیا مضحکہ خیز سوال دریافت فرمایا ہے!

میں نے کہا: جی، مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ اب یہ فرمائیے کہ ہم ذرا اور آگے بڑھ کر کیا یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے محافظین سب سے اچھے شہری ہیں؟

گلوکون نے کہا: سب سے اچھے؟

میں نے کہا: اور کیا ان کی بیویاں بہترین خواتین نہیں ہوں گی؟

گلوکون نے کہا: بے شک، سب سے بہتر ہوں گی۔

میں نے کہا: اور کیا ریاست کے اغراض کے لیے اس سے بہتر کوئی بات ہو سکتی ہے کہ اس کے مرد اور خواتین سب جہاں تک ہو سکے اچھے ہوں۔

گلوکون نے کہا: اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے؟

میں نے کہا: اگر موسیقی اور جسمانی ورزش کے فنون کو اس طرح برتا جائے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے تو کیا ان سے یہ نتیجہ مرتب نہ ہوگا؟

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: تو گویا ہم نے ایک ایسا قانون تیار کر لیا جو یہ ہی نہیں کہ قابلِ عمل ہے بلکہ ریاست کے لیے نہایت درجہ مفید بھی ہے۔

گلوکون نے کہا: درست۔

میں نے کہا: پھر کیا ہے! ہمارے محافظوں کی بیویاں کپڑے اُتار سکتی ہیں کہ نیکی اُن کا لباس ہے۔ اُنھیں جنگ آزمائی اور ملک کی حفاظت کی تکلیفیں بھی اُٹھانی ہوں گی۔ البتہ کام کی تقسیم میں عورتوں کو ذرا ہلکا کام دیا جائے گا کہ یہ بالطبع کمزور ہوتی ہیں ورنہ یوں بہ اعتبار فرائض کے تو سب یکساں ہیں۔ پھر اُن برہنہ عورتوں پر جو بہترین محرکات کے باعث جسمانی محنت کرتی ہیں اگر کوئی ہنسے تو وہ:

"حکمتِ خام کی خوشہ چینی کرتا ہے"

اور خود اس چیز سے بے خبر ہے جس پر ہنستا ہے اور جانتا بھی نہیں کہ کیا کر رہا ہے۔ کیونکہ بہترین مقولہ یہ ہے اور ہمیشہ رہے گا کہ:

"جو چیز مفید ہے وہی شریف ہے، جو مضر ہے وہ ہی ذلیل"

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: عورتوں کے متعلق ہمارے قوانین میں ایک دقت تو یہ تھی جس سے اب یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم بچ گئے۔ اس خیالی قانون کے بنانے پر کہ دونوں صنفوں کے محافظوں کے مشغلے ایک سے ہوں۔ شکر ہے کہ نکتہ چینی کا سیلاب ہمیں بہا نہیں لے گیا۔ اس انتظام کے افادے اور امکان کی شہادت خود ہمارے دلائل کی باہمی مطابقت سے فراہم ہوتی ہے۔

اس نے جواب دیا: جی، بڑی زبردست موج تھی وہ جس سے آپ بچ نکلے۔

میں نے کہا: لیکن ابھی اس سے بھی زور کی ایک اور موج آرہی ہے: اسے دیکھیے گا تو پہلی کو بھول جایئے گا۔

اس نے کہا: اچھا تو چلیے، دیکھوں۔

میں نے کہا: جو قانون ابھی گزرا اس کا اور سب پچھلے قوانین کا ماحصل یہ ہے کہ "ہمارے محافظوں کی بیویاں مشترک ہوں، بچے مشترک ہوں، ماں باپ اپنے بچوں کو نہ پہچانیں، نہ بچے اپنے ماں باپ کو"۔

گلوکون نے کہا: بے شک، یہ لہر تو پہلی سے کہیں بڑی ہے اور قانون کا امکان اور افادہ دونوں اس سے کہیں زیادہ مشتبہ ہے۔

میں نے کہا: میں تو سمجھتا ہوں کہ عورتوں اور بچوں کے مشترک رکھنے کے بھاری افادے سے کوئی بھی انکار نہیں کرے گا۔ البتہ اس کا قابلِ عمل ہونا، یہ دوسری بات ہے اور اس کی لوگ ضرور مخالفت کریں گے۔

گلوکون نے کہا: میری رائے میں تو دونوں باتوں کے متعلق بہت سے شبہات پیش کیے جاسکتے ہیں۔

میں نے کہا: آپ کا مطلب شاید یہ ہے کہ ان دونوں سوالوں کو ملا دیا جائے۔ میں یہ چاہتا تھا کہ آپ اس افادے کو تسلیم کر لیتے ہیں اور یوں میں ایک حصے کے بارِ ثبوت سے بچ جاتا اور صرف اس کا امکان ثابت کرنا باقی رہ جاتا۔

گلوکون نے جواب دیا: آپ کی یہ چالاکی تو پکڑی گئی۔ اب تو دونوں کی ہی دلیلیں دیجیے!

میں نے کہا: خیر، سزا بھگتوں گا۔ لیکن مجھ پر تھوڑی سی عنایت ضرور کیجیے، یعنی اجازت دیجیے کہ میں خیالی پلاؤ پکاؤں جیسے تنہائی میں ٹہلتے ہوئے دن میں خواب دیکھنے والے پکایا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اپنی خواہشوں کے پورا کرنے کے وسیلے دریافت کرنے سے پہلے (اور اس بارے میں تو وہ شاذ ہی اپنے آپ کو تکلیف دیتے ہوں) یہ کبھی ان کے امکان کے خیال سے اپنے دماغ کو نہیں تھکاتے۔ بلکہ پہلے تو یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ان کی تمام خواہشیں انھیں مل گئیں اور پھر اپنی خیالی تدبیروں کو چلتے ہیں اور ان آرزوؤں کے برآنے کے بعد جو کچھ کرنے کا ارادہ ہے اس کی تفصیلات سے اپنا جی خوش کرتے ہیں۔ اس وقت چونکہ میرا بھی دل کچھ چھوٹا سا جاتا ہے، اس لیے آپ کی اجازت سے چاہتا ہوں کہ فی الحال امکان کے سوال کو رہنے دوں۔ میں پہلے اس تجویز کو ممکن فرض کیے لیتا ہوں، اور یہ دریافت کرتا ہوں کہ حکام اس انتظام کو چلائیں گے کیسے۔ پھر یہ ثابت کروں گا کہ اگر اس پر عمل ہوا تو ریاست اور محافظ دونوں کو بہت کچھ فائدے حاصل ہوں گے۔ اس لیے اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو پہلے میں آپ کی مدد سے اس تجویز کے فائدوں پر غور کروں اور بعد میں اس کے قابلِ عمل ہونے پر۔

گلوکون نے کہا: جی نہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

میں نے کہا: میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارے محافظ اور ان کے معاون جس نام کے حامل ہیں اس کے شایانِ شان بھی ہوں تو لازم ہے کہ ایک میں اطاعت شعاری اور دوسرے میں حکم دینے کی قابلیت ہو۔ محافظ خود بھی قوانین کی پابندی کریں اور جہاں کہیں تفصیلات میں اختیارِ تمیزی حاصل ہو وہاں قانون کے اصلی مقصد کو پیشِ نظر رکھیں۔

گلوکون نے کہا: درست۔

میں نے کہا: بحیثیت قانون بنانے والے، آپ ہی نے مردوں کا انتخاب کیا تھا، اب آپ ہی عورتوں کا انتخاب کیجیے۔ جہاں تک ممکن ہو یہ عورتیں اور مرد ایک سی طبیعت کے ہوں، سب کے سب مشترک مکانات میں رہیں اور ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں۔ کسی کے پاس کوئی چیز بھی مخصوص کسی فرد کی مِلک نہ ہو۔ یہ سب ساتھ رہیں گے، ساتھ ہی ان سب کی تربیت اور پرورش ہوگی، جسمانی ورزش کے سلسلے میں ایک دوسرے کا ساتھ ہوگا اور اس طرح ایک فطری کشش لازمی طور پر ان میں جنسی تعلقات پیدا کردے گی۔ غالباً اس خیال کے لیے لزوم کا لفظ ضرورت سے زیادہ بھاری نہیں ہے۔

گلوکون نے کہا: جی؟ لزوم، علم ہندسہ والا ''لزوم'' نہیں بلکہ دوسری قسم کا جس سے محبت کرنے والے آشنا ہوتے ہیں اور عام آدمیوں کے لیے اس کی بُرہان کی قطعیت اور اس کا جابرانہ تحکم اس پہلے ''لزوم'' سے زیادہ ہی قوی ہوتا ہے۔

میں نے کہا: سچ ہے، گلوکون! لیکن اور چیزوں کی طرح اسے بھی ایک منضبط طریقے سے چلنا چاہیے۔ مبارک لوگوں کے شہر میں تو عیاشی کو ایک ناپاک فعل سمجھا جائے گا، اور محافظ اس کی ممانعت کریں گے۔

گلوکون نے کہا: بے شک، اس کی تو اجازت نہیں ہونی چاہیے۔

میں نے کہا: لہٰذا دوسری بات یہ ہے کہ شادی کو جہاں تک ہو سکے مقدس بنایا جائے، اور تقدس کا معیار یہ ہو کہ جو سب سے زیادہ مفید ہے وہی سب سے زیادہ مقدس ہے۔

گلوکون نے کہا: بالکل بجا۔

میں نے کہا: تو شادیوں کو سب سے زیادہ مفید کیوں کر بنایا جا سکتا ہے؟ میں آپ سے یہ سوال اس لیے کرتا ہوں کہ آپ کے مکان میں بہت سے شکاری کتے اور رنگ رنگ کی چڑیاں دیکھ رہا ہوں، براہِ کرم

فرمایئے کہ آپ نے کبھی ان کے جوڑ ملانے یا بچے نکالنے کی طرف بھی توجہ فرمائی؟

گلوکون نے کہا: کیسی توجہ؟

میں نے کہا: پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر چند یہ سب جانور اچھی قسم کے ہیں لیکن پھر بھی کیا ان میں سے بعض اوروں سے بہتر نہیں؟

گلوکون نے کہا: ہیں!

میں نے کہا: تو آپ سب سے بلا تفریق بچے لیتے ہیں یا صرف بہترین سے؟

گلوکون نے کہا: صرف بہترین سے۔

میں نے کہا: زیادہ عمر والے جانوروں کا انتخاب کرتے ہیں یا کم عمر والے یا صرف وہ جو ٹھیک جوان عمر کے ہیں۔

گلوکون نے کہا: ٹھیک جوان عمر والے۔

میں نے کہا: اگر بچے لینے میں کافی نگہداشت نہ کی جائے تو کتوں اور چڑیوں میں بہت انحطاط رونما ہو جائے۔

اس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: یہی حال گھوڑوں اور دوسرے جانوروں کا ہے۔

اس نے جواب دیا: بلا شبہ۔

میں نے کہا: بخدا، اگر یہی اصول نوعِ انسانی پر عائد کرنا ہو تو ہمارے محافظوں کو کتنی اعلیٰ درجے کی مہارت درکار ہو گی۔

گلوکون نے کہا: اُصول تو یقیناً یہی عائد ہو گا، لیکن اس میں خاص مہارت کی ایسی کون سی بات ہے؟

میں نے کہا: اس لیے کہ ہمارے حکام کو سیاسی جسم پر اکثر دواؤں کا استعمال کرنا ہو گا۔ آپ جانتے ہیں کہ جب مریض کو دوا دینے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی بلکہ کسی مخصوص غذا کا تجویز کر دینا ہوتا ہے تو اس کے لیے معمولی سا طبیب بھی کافی سمجھا جاتا ہے؛ لیکن جب دوا دینی ہو تو پھر طبیب کا پورا ماہر ہونا ضروری ہے۔

گلوکون نے کہا: یہ تو سب درست لیکن آپ کا اشارہ آخر کدھر ہے؟

میں نے جواب دیا: میرا مطلب یہ ہے کہ رعایا کی فلاح کے لیے حاکموں کو جھوٹ اور فریب کی

دواؤں کی کافی خوراک درکار ہوگی۔ یہ تو ہم مان ہی چکے ہیں کہ ان چیزوں کا استعمال دوا کے طور پر مفید ہوتا ہے۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں، اور ٹھیک مان چکے ہیں۔

میں نے کہا: ان چیزوں کا یہ جائز استعمال شادی بیاہ اور بچے پیدا کرنے کو نظم وضبط کا پابند کرنے کے لیے اکثر درکار ہوگا۔

گلوکون نے کہا: یہ کیسے؟

میں نے کہا: یہ اُصول تو ہم بیان کر ہی چکے ہیں کہ ایک صنف کے بہترین افراد کو دوسری صنف کے بہترین افراد سے جتنی زیادہ مرتبہ ہو سکے ملایا جائے اور دونوں اصناف کے بدترین افراد کو جتنا بھی ہو سکے کم؛ اور گلّے کو اعلیٰ درجے کی حالت میں رکھنا منظور ہے تو صرف اوّل الذکر سے جو بچے پیدا ہوں اُن کی پرورش کرنی چاہیے دوسروں کی نہیں۔ اب چاہیے کہ یہ ساری کارروائی صیغۂ راز میں ہو اور بس حکام کو اس کا علم ہو، ورنہ گلّے میں بغاوت کا ایک اور اندیشہ پیدا ہو جائے گا۔

گلوکون نے کہا: بالکل بجا۔

میں نے کہا: کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم کچھ تہوار مقرر کر دیں، ان موقعوں پر دُولہا دلہن یکجا ہو سکیں، قربانیاں کی جائیں، شاعر شادی کی نظمیں پڑھیں۔ رہی شادیوں کی تعداد، سو اسے تمام تر حکام کے اختیارِ تمیزی پر چھوڑنا چاہیے کہ ان کے پیشِ نظر ریاست کی اوسط آبادی برقرار رکھنے کا مقصد ہوگا، اس کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں ہیں جن کا انھیں خیال کرنا پڑے گا، مثلاً جنگ، وبا اور دوسری اسی قسم کی چیزوں کے اثرات، تاکہ جہاں تک ممکن ہو ریاست نہ تو بہت بڑی ہو جائے نہ بہت چھوٹی رہ جائے۔

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: اپنی باری کے لیے لوگوں کو چٹھیاں اُٹھا کر قسمت آزمائی کرنی ہوگی یا ایسا ہی اور کوئی عیارانہ طریقہ ایجاد کرنا ہوگا؛ تاکہ کم درجے کے لوگ جب کبھی یکجا ہونے والے ہوں تو انھیں یہ چٹھیاں اُٹھانی پڑیں اور وہ حکام پر الزام نہ لگا سکیں بلکہ خود اپنی بدنصیبی کو اس کا ذمہ دار قرار دیں۔

گلوکون نے کہا: ضرور۔

میں نے کہا: اور میں تو سمجھتا ہوں کہ اعلیٰ قسم کے بہادر نوجوانوں کو جہاں اور اعزاز و انعام عطا ہوں

وہاں ان کے لیے عورتوں سے خلوت کے معاملے میں بھی سہولتیں بہم پہنچانی چاہئیں۔ اس کی وجہ ان کی بہادری ہے، اور مقصد یہ ہے کہ ایسے باپوں کے جتنے زیادہ بیٹے ہو سکیں، ہوں۔

اس نے جواب دیا: بجا۔

میں نے کہا: اور افسر جن کا یہ کام ہو خواہ مرد ہوں یا عورت، کیونکہ افسر تو مرد بھی ہو سکتے ہیں اور عورتیں بھی..........

اس نے جواب دیا: جی ہاں۔

میں نے کہا: ہاں، تو افسر جن کا یہ کام ہوا اچھے والدین کے بچوں کو باڑے میں لے جائیں گے اور انھیں آیاؤں کے سپرد کر دیں گے؛ یہ آیائیں علیحدہ مکانوں میں رہا کریں گی۔ کم درجے والے لوگوں کی اولاد یا اچھے افراد کی وہ اولاد جو اتفاق سے بگڑ گئی ہو انھیں کسی مخفی نامعلوم مقام پر ڈال دیا جائے گا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ اسی کے مستحق بھی ہیں۔

اس نے کہا: جی ہاں، اگر نسل کو خالص رکھنا ہے تو محافظوں کو یہی کرنا ہوگا۔

میں نے کہا: پھر یہی افسر بچوں کی پرورش کا انتظام کریں گے۔ جب ماؤں کا دودھ بھر آئے گا تو انھیں باڑے میں داخل کریں گے لیکن اس بات کا خاص خیال رکھا جائے گا کہ کوئی ماں اپنے بچے کو نہ پہچان سکے۔ اگر ضرورت ہوئی تو دودھ پلانے کے لیے اور دائیاں رکھ لی جائیں گی۔ اس کا بھی خیال رکھا جائے گا کہ دودھ پلانے کا کام زیادہ دیر تک جاری نہ رہے۔ ماؤں کو رات میں وقت بے وقت اُٹھنا اور دوسری پریشانیاں بھی نہ اُٹھانا پڑیں، کیونکہ اس قسم کا سارا کام آیاؤں اور نوکروں کے سپرد کر دیا جائے گا۔

گلوکون نے کہا: یعنی محافظوں کی بیویوں کے جب بچہ ہوگا تو یہ خوب آرام کیا کریں گی؟

میں نے کہا: کیوں نہیں، ضرور کریں گی۔ خیر یہ تو ہوا، چلیے اپنی تجویز کو ذرا اور آگے بڑھائیں۔ ہم یہ کہہ رہے تھے نا کہ ماں باپ کی عمر کا زمانہ جوانی کا زمانہ ہونا چاہیے؟

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اور اس جوانی کے زمانے کا تعین کیسے ہو؟ کیا عورت کا شباب بیس سال اور مرد کا تیس سال نہیں ہوتا؟

گلوکون نے کہا: اور اس مدت میں آپ عمر کے کون سے سال شامل کریں گے؟

میں نے کہا: عورت بیس برس کی عمر سے ریاست کے لیے بچے پیدا کرنا شروع کر سکتی اور چالیس برس کی عمر تک اس کام کو جاری رکھ سکتی ہے۔ مرد تقریباً پچیس سال کی عمر سے شروع کر سکتا ہے جس وقت کہ وہ ... کے بعد جب نبض حیات کی رفتار سب سے زیادہ تیز ہوتی ہے اور پچپن سال کی عمر تک جاری رکھ سکتا ہے۔

گلوکون نے کہا: بے شک عورت اور مرد دونوں میں یہی زمانہ جسمانی اور ذہنی قوت کی معراج کا زمانہ ہے۔

میں نے کہا: ان مقررہ حدود سے کم یا زیادہ عمر کا کوئی شخص اگر شادی کے عام جشن میں حصہ لے تو بحیثیت ... ہونے کے گناہ کا مرتکب سمجھا جائے گا۔ اگر اس کا کوئی بچہ ہو تو سمجھا جائے گا کہ یہ بچہ ان قربانیوں اور عبادات کے زیر اثر قرار نہیں پایا جو ہر شادی کے جشن کے موقع پر تمام پجاری، پجارنیں اور سارے شہر کی طرف سے اس لیے ادا کی جاتی ہے کہ آئندہ نسل اچھے ماں باپ سے بہتر اور مفید تر ثابت ہو۔ بلکہ اس تخم ریزی ... ظلمت اور شہوت پرستی کا نتیجہ تصور ہوگی۔

گلوکون نے جواب دیا: درست۔

میں نے کہا: اور یہی قانون مقررہ حدود کے اندر عمر والوں پر بھی عائد ہوگا، اگر وہ عنفوانِ شباب میں حاکم کی اجازت کے بغیر کسی عورت سے تعلق پیدا کر لیں۔ کیونکہ پھر یہ ریاست کے لیے حرامی بچے پیدا کریں گے جن کی نہ تصدیق ہوگی نہ تقدیس۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اور جب عمر کی مقررہ حدود سے یہ لوگ نکل جائیں تو پھر انھیں آزادی ہونی چاہیے کہ جس سے چاہیں ملیں جلیں اور تعلق رکھیں۔ البتہ یہ ضرور ہو کہ کوئی شخص اپنی بیٹی یا نواسی یا اپنی ماں یا نانی سے تعلق نہ پیدا کرے۔ اسی طرح عورتوں کے لیے اپنے بیٹوں، پوتوں یا باپ دادا سے تعلق ممنوع ہو۔ ان لوگوں کو پہلے سے تاکید کے ساتھ اس امر پر متنبہ کر دینا چاہیے کہ اگر اس طرح کوئی حمل قائم ہو تو بچے کو پیدا نہ ہونے دیا جائے، اور اگر یہ کسی طرح پیدا ہو ہی جائے تو والدین کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ایسی اولاد کی پرورش نہیں کی جا سکتی۔

گلوکون نے کہا: یہ تجویز بھی معقول ہے۔ لیکن یہ تو فرمایئے کہ انھیں یہ معلوم کیسے ہوگا کہ کون باپ

ہے اور کون بیٹی؟

میں نے کہا: اس کا تو انھیں کبھی بھی علم نہیں ہوگا۔ لیکن یہ طریقہ رکھیں گے کہ شادی کے جشن سے، ان سے ساتویں یا دسویں مہینے تک جتنے لڑکے پیدا ہوں گے اُنھیں ہر دولہا اپنا لڑکا اور جتنی لڑکیاں پیدا ہوں گی اُنھیں اپنی بیٹی کہے گا۔ یہ سب اسے باپ کہہ کر پکاریں گے، ان بچوں کے بچوں کو وہ پوتا پوتی سمجھے گا اور یہ اس عمر رسیدہ جماعت کے سارے افراد کو دادا، دادی کہیں گے۔ ماؤں اور باپوں کی خلوت کے وقت جن جن کا حمل ساتھ قرار پایا تھا وہ بھائی بہن مانے جائیں گے اور ان میں باہم شادی منع ہوگی۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ بھائی بہنوں میں شادی کی یہ ممانعت بالکل قطعی ہے۔ اگر قرعہ اندازی اس کی موافقت کرے اور پائتھی (Pythian) کے کاہن سے بھی اجازت مل جائے تو قانون بھی اس کی اجازت دے دے گا۔

اس نے جواب دیا: بالکل درست۔

میں نے کہا: گلوکون، محافظوں میں بیویوں اور خاندان کے اشتراک سے متعلق تو یہ تجویز ہے۔ اب غالباً آپ یہ چاہیں گے کہ اسے جماعت کے دوسرے حصوں سے بھی مطابق ثابت کیا جائے اور یہ بھی ظاہر ہو سکے کہ اس سے بہتر اور کوئی صورت نہیں۔ کیوں؟ آپ بھی چاہتے ہیں نا؟

گلوکون نے جواب دیا: جی ہاں، یقیناً۔

میں نے کہا: کیا یہ ٹھیک نہ ہوگا کہ ہم پہلے ایک مشترک معیار دریافت کر لیں، یعنی یہ کہ قانون بنانے والوں کو قانون وضع کرنے میں اور ریاست کے نظم و ترتیب میں کیا مقصد خاص طور پر اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ سب سے زیادہ اچھی صورت کیا ہے، یعنی کثرتِ خیر کس میں ہے اور سب سے بُری کیا، یعنی کثرتِ شر کس میں؟ یہ معیار دریافت ہولے تو دیکھیں کہ ہماری تجویز پر خیر کا اطلاق ہو سکتا ہے یا شر کا۔

اس نے کہا: ضرور۔

میں نے کہا: اچھا تو کیا نفاق اور انتشار سے بھی زیادہ بُری کوئی چیز ہے؟ یا جہاں وحدت مطلوب ہو وہاں کثرت؟ اور کیا وحدت کے بندھن سے بھی زیادہ اچھی کوئی چیز ہے؟

اس نے کہا: جی، ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: اور وحدت اور ایکا وہیں ہوتا ہے جہاں لوگوں کا رنج اور راحت، آرام اور تکلیف، مشترک ہو، یعنی جہاں شہری خوشی یا رنج کے موقعوں پر سب کے سب ایک سے خوش یا رنجیدہ ہوتے ہیں؟

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اور جہاں کوئی مشترک احساس نہیں بلکہ صرف شخصی حس ہو تو ریاست غیر منظم اور منتشر ہو جاتی ہے، جیسے جب شہر میں ایک ہی واقعہ پر آدھی دنیا تو خوشیاں مناتی ہو اور دوسری آدھی غم میں ڈوبی ہو۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اور یہ اختلاف عموماً ان لفظوں کے استعمال میں اختلاف سے پیدا ہوتے ہیں، یعنی یہ چیز "میری ہے" یا "میری نہیں"۔ "اُس کی ہے" یا "اُس کی نہیں"۔

گلوکون نے کہا: جی، یہی وجہ ہے۔

میں نے کہا: تو کیا اُس ریاست کا انتظام بہترین نہیں جس میں لوگوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد اسی چیز پر "میری ہے" یا "میری نہیں" کا یکساں استعمال کر سکے!

اس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: یا وہ ریاست جس کی حالت ایک فرد کی سی ہو۔ جس طرح انسانی جسم میں ایک انگلی مجروح ہو جائے تو سارے کا سارا بدن (جس کا مرکز رُوح ہے اور جو اس کے زیرِ حکومت ایک ریاست کی حیثیت رکھتا ہے) اس تکلیف کو محسوس کرتا اور ماؤف حصے سے ہمدردی کرتا ہے، اور ہم کہتے ہیں کہ اس آدمی کی انگلی میں درد ہو رہا ہے، اسی طرح اگر کسی اور حصے میں درد کی وجہ سے تکلیف یا درد کی کمی کی وجہ سے آرام پہنچ رہا ہو تو اس کے لیے بھی ایسے ہی الفاظ استعمال کر سکتے ہیں۔

گلوکون نے کہا: بالکل درست۔ میں آپ سے متفق ہوں کہ جس ریاست میں بہترین نظام ہوگا وہ اس مشترک احساس کے بہت قریب پہنچ چکی ہوگی جو آپ نے بیان کیا ہے۔

میں نے کہا: یعنی اگر کسی ایک شہری پر کوئی اچھی یا بُری بات گزرے تو ساری ریاست اسے اپنا معاملہ سمجھے گی، اس کے ساتھ خوش ہوگی اور اسی کے ساتھ "اداس"۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں، ایک اچھی منظم ریاست میں تو یہی صورتِ حال ہوگی۔

میں نے کہا: ہاں، تو میں سمجھتا ہوں کہ اب وقت ہے کہ ہم اپنی ریاست کی طرف پھر مڑیں اور دیکھیں کہ اس کی جو شکل ہم نے تجویز کی ہے وہی ان بنیادی اُصولوں کے مطابق ہے یا کوئی دوسری۔

گلوکون نے کہا: بہت خوب۔

میں نے کہا: ہر دوسری ریاست کی طرح ہماری ریاست میں بھی حاکم اور محکوم ہوں گے؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: یہ سب کے سب ایک دوسرے کو شہری کہا کریں گے؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: لیکن دوسری ریاستوں میں کیا حاکموں کو کوئی دوسرا لقب نہیں دیتے؟

اس نے جواب دیا: عموماً "آقا" کہتے ہیں لیکن جمہوری ریاستوں میں صرف حاکم کہہ کر پکارتے ہیں۔

میں نے پوچھا: اور اپنی ریاست میں حاکموں کو شہری کے علاوہ اور کیا کہتے ہیں؟

اس نے جواب دیا: محافظ اور مددگار۔

میں نے کہا: اور حاکم عوام کو کیا کہتے ہیں؟

اس نے جواب دیا: پالنے اور پرورش کرنے والے۔

میں نے کہا: اور دوسری ریاستوں میں؟

اس نے جواب دیا: غلام۔

میں نے کہا: دوسری ریاستوں میں حاکم ایک دوسرے کو کیا کہتے ہیں؟

اس نے جواب دیا: شریک حکومت۔

میں نے پوچھا: اور اپنی ریاست میں؟

اس نے جواب دیا: شریک حفاظت۔

میں نے کہا: کیا تم کسی ایسی مثال سے واقف ہو کہ ایک ریاست میں کوئی حاکم اپنے ایک شریک کار کو تو دوست بتائے اور دوسرے کو دوست نہ سمجھے۔

اس نے کہا: جی ہاں، ایسی مثالیں تو اکثر ملتی ہیں۔

میں نے کہا: دوست کے ساتھ تو وہ دلچسپی کا اظہار کرتا اور اس سے واقعی دلچسپی رکھتا بھی ہے، لیکن دوسرے کو اجنبی جانتا ہے اور اس سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا؟

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: لیکن تمھارے محافظوں میں سے بھی کوئی کسی دوسرے محافظ کو اجنبی بتا سکتا ہے، یا سمجھ

ہم نے کہا: ہرگز نہیں۔ کیونکہ یہ تو جس سے ملیں گے اُسے اپنا بھائی یا بہن سمجھیں گے، یا ماں یا باپ یا بیٹا یا بیٹی یا پھر ان متعلقین میں سے کسی کی اولاد۔

میں نے کہا: بہت خوب، لیکن میں آپ سے ذرا ایک دفعہ اور پوچھ لوں کہ یہ مشترک خاندان کیا بس نام کا خاندان ہوگا یا اپنے کردار سے یہ لوگ اس نام کو حقیقت بنا دیں گے۔ مثلاً "باپ" کے لفظ کے ساتھ یہ کہ باپ کی سی نگرانی اور تعلقِ خاطر اور دوسری طرف قانون کے احکام کے مطابق اُس کی عزت اور اطاعت بھی لازم ہوگی یا نہیں؟ پھر کیا یہ نہیں ہوگا کہ ان فرائض کو پس پشت ڈالنے والا بد اور غیر متقی سمجھا جائے اور خدا اور بندے کسی کے ہاتھ سے اُسے کوئی نفع نہ پہنچے۔ اور کیا بچوں کے کانوں میں اپنے نام نہاد ماں باپ اور دوسرے رشتہ داروں کے متعلق اس قسم کی باتیں سب شہریوں کی زبانی پڑتی رہیں گی یا نہیں؟

اس نے جواب دیا: بے شک وہ یہی سُنیں گے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ کیونکہ یہ تو ایک ہنسی کی بات ہوگی کہ یہ بس مُنھ سے تو اپنی خاندانی قرابت کے نام لیں لیکن ان کی اصلیت پر ذرا بھی عامل نہ ہوں۔

میں نے کہا: یعنی ہمارے شہر میں دوسروں کی بہ نسبت یک جہتی اور میل ملاپ کی گفتگو زیادہ کثرت سے سُنی جائے گی اور جیسے کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، جب کوئی اچھے حال میں ہوگا یا بُرے حال میں تو سب کی زبان پر عام کلمہ یہ ہوگا کہ "میں خوش ہوں" یا "میں بُرے حال میں ہوں"۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: تو پھر فکر و گفتار کے اسی طریقے کے عین مطابق ہی تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ ان کی خوشی اور غم، آرام اور تکلیف، سب مشترک ہوں گے۔

اس نے کہا: جی ہاں، ایسا ہی ہوگا۔

میں نے کہا: جس چیز کو یہ سب "اپنا" کہیں گے اس میں سب مشترک دلچسپی بھی لیں گے اور اس دلچسپی کی وجہ سے اُن کی خوشیاں اور غم بھی مشترک ہوں گے۔

اس نے کہا: بے شک، دوسری ریاستوں کے مقابلے میں بہت زیادہ۔

میں نے کہا: ریاست کے عام اساسی دستور کے علاوہ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہوگی کہ محافظوں کے بیوی بچے مشترک ہوں گے۔

اس نے کہا: اور یہی تو خاص وجہ ہوگی۔

میں نے کہا: ایک اچھی منتظم ریاست کو جسم اور اعضا سے مشابہ کرتے وقت ہم نے احساس میں وحدت کو سب سے بڑی خوبی تسلیم کیا تھا۔

گلوکون نے کہا: جی، تسلیم کیا تھا اور صحیح تسلیم کیا تھا۔

میں نے کہا: گویا ہمارے شہر میں عورتوں اور بچوں کا مشترک ہونا ریاست کے لیے سب سے بڑی خوبی کا باعث ہے۔

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: اور یہ بات اس دوسرے اصول سے بھی مطابقت رکھتی ہے کہ محافظوں کے پاس مکان، زمین، یا اور کسی قسم کی املاک نہیں ہونی چاہیے۔ ان کی تنخواہ بس غذا ہو جو انھیں دوسرے شہریوں سے ملے۔ ان کا کوئی خانگی اور ذاتی خرچ نہ ہوتا کہ یہ حقیقی محافظ کی خصوصیات قائم رکھ سکیں۔

گلوکون نے کہا: درست۔

میں نے کہا: جیسے میں نے بتایا ملکیت اور خاندان کا اشتراک یہ دونوں باتیں انھیں حقیقی محافظ بنانے میں مدد دیں گی۔ یہ لوگ "اپنے" اور "پرائے" کے جھگڑوں میں شہر کے ٹکڑے ٹکڑے نہیں کریں گے۔ یہ نہیں ہوگا کہ جس نے جو کچھ حاصل کیا اسے بس ایک الگ گھر میں گھسیٹے لیے جا رہا ہے۔ جہاں اس کے علیحدہ بیوی بچے اور آرام و آسائش کا ذاتی سامان ہے، چنانچہ اس کا رنج اور خوشی کا احساس بھی محض شخصی ہے بلکہ حتی الامکان سب کے سب خوشی اور رنج سے ایک جیسا متاثر ہوں گے، اور عزیزوں و اقارب کے متعلق ان کا ایک ہی خیال ہوگا اس لیے خواہ مخواہ ایک ہی مقصد کی طرف ان سب کا جھکاؤ بھی ہوگا۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: ان کے پاس چونکہ اپنے بدن کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہوگی جسے یہ "اپنا" کہہ سکیں لہٰذا مقدمے اور استغاثے کا وجود ہی نہیں ہوگا؟ اور روپیہ، اولاد اور دوسرے علاقوں کی وجہ سے جو جھگڑے پیدا ہوتے ہیں ان سب سے یہ پوری طرح مامون ہو جائیں گے۔

گلوکون نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: حملہ یا ہتکِ عزت کے مقدموں کا ہونا بھی زیادہ قرین قیاس نہیں، کیونکہ یہ بات تو

جائز اور مستحب بھی جائے گی کہ برابر والا برابر والے کا مقابلہ خود کرے اور جسم کی حفاظت کو ہم لازمی قرار دے دیں گے۔

گلوکون نے کہا: یہ خوب ہوگا۔

میں نے کہا: ہاں، اور اس قانون میں ایک فائدہ اور ہے۔ وہ یہ کہ جہاں کسی کا کسی سے جھگڑا ہوا تو وہ وہیں اپنے غصے کو ٹھنڈا کرنے لگے گا اور معاملہ زیادہ خطرناک حد تک طول نہیں پکڑے گا۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: بوڑھوں کو کم عمر لوگوں پر حکومت کرنے اور انھیں سزا دینے کا فرض تفویض کیا جائے گا۔

اس نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: اور اس میں تو شبہ کی گنجایش ہی نہیں کہ بڑوں پر چھوٹے کبھی ہاتھ نہیں اٹھائیں گے، نہ اُن پر کوئی اور تشدد روا رکھیں گے، نہ کسی طرح ان کی سبکی کریں گے۔ سوائے اس صورت کے کہ کوئی حاکم انھیں اس کا حکم دے۔ چھوٹوں کو ان باتوں سے باز رکھنے کے لیے دو زبردست محافظ ہیں، شرم اور خوف۔ شرم تو اس سے مانع ہے کہ انسان اپنے ماں باپ پر ہاتھ اُٹھائے، خوف یہ کہ اس بوڑھے کی مدد دوسرے لوگ کریں گے جو اس کے بھائی، بیٹے یا باپ ہیں۔

گلوکون نے کہا: سچ ہے۔

میں نے کہا: غرض یہ کہ یہ قانون ہر طرح شہریوں میں باہمی صلح اور امن قائم رکھنے میں مدد دے گا۔

گلوکون نے کہا: صُلح اور امن کی تو بے شک کوئی کمی نہیں ہوگی۔

میں نے کہا: اور جب محافظوں میں آپس میں کوئی جھگڑا نہیں ہوگا تو پھر باقی شہر میں بھی ان کے خلاف یا خود آپس میں تفرقہ ہونے کا اندیشہ نہیں۔

گلوکون نے کہا: بالکل نہیں۔

میں نے کہا: میں ان چھوٹی چھوٹی اوچھی باتوں کا تو ذکر کرنا بھی خلافِ شان سمجھتا ہوں جن سے یہ بچ جائیں گے، مثلاً غریب لوگ جو امیروں کی خوشامد کرتے ہیں، یا خاندان کی پرورش میں جو تکلیفیں لوگوں کو برداشت کرنی ہوتی ہیں، یا گھریلو ضرورتوں کے لیے جو روپے کی ضرورت ہوتی ہے، اس روپے کا قرض لینا،

پھر ادا کرنے سے انکار کرنا، جیسے تیسے روپیہ حاصل کر کے عورتوں یا غلاموں کی تحویل میں دے دینا۔ اس قسم کی بہت سی بُرائیاں جو لوگوں کو پیش آتی ہیں ایسی جانی پہچانی اور اتنی ذلیل ہیں کہ ذکر کرنے کے قابل بھی نہیں۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں، ان بُرائیوں کے دیکھنے کے لیے تو آنکھیں بھی درکار نہیں۔

میں نے کہا: اچھا تو یہ لوگ ان ساری بُرائیوں سے بچ جائیں گے اور اُن کی زندگی اولمپی (Olympic) فاتحوں کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ مبارک ہو جائے گی۔

اس نے کہا: یہ کیسے؟

میں نے کہا: ہمارے شہریوں کو جو چیز نصیب ہے اس کا محض ایک حصہ مل جانے پر لوگ فاتح اولمپی کو خوش قسمت سمجھنے لگتے ہیں۔ ہمارے شہریوں نے جو فتح حاصل کی ہے وہ اس سے کہیں زیادہ شاندار ہے اور صرفِ عام سے ان کی زیادہ مکمل کفالت ہوتی ہے۔ کیونکہ انھیں جو فتح نصیب ہوتی ہے اس میں تو ساری ریاست کی نجات ہے اور ان کے اور ان کی اولاد کے سر پر جو تاج رکھا گیا ہے وہ اُن کی تمام زندگی کی ضرورتوں کا کفیل ہے۔ زندگی میں اپنے ملک کے ہاتھوں اُنھیں انعام ملتے ہیں اور مرنے کے بعد ان کی تجہیز و تکفین شاندار طور پر کی جاتی ہے۔

گلوکون نے کہا: اور کیسے شاندار اجر ہیں یہ!

میں نے کہا: نام لینے سے کیا حاصل، تمھیں یاد ہوگا کہ اس سے پہلے مباحثے میں ایک صاحب نے ہم پر الزام لگایا تھا کہ ہم محافظوں کو نہایت پھٹے حالوں رکھ رہے ہیں اور جہاں یہ سب چیزوں پر قابض ہو سکتے تھے ہم نے ان کے لیے کچھ بھی تو نہ چھوڑا۔ اس کا جواب ہم نے یہ دیا تھا کہ اگر آگے چل کر کوئی موقع ملا تو اس سوال پر پھر غور کریں گے، اس وقت تو ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ محافظوں کو حقیقی محافظ بنالیں اور ریاست کی تشکیل میں زیادہ سے زیادہ خوشحالی کو پیشِ نظر رکھیں، کسی خاص طبقے یا گروہ کی مرفہ الحالی نہیں بلکہ ساری ریاست کی۔

اس نے جواب دیا: جی ہاں، مجھے یاد ہے۔

میں نے کہا: اور اب آپ کیا کہتے ہیں؟ محافظوں کی زندگی تو فاتحانِ اولمپی سے بھی بہتر نکلی! تو کیا اب بھی اس سے موچیوں یا دوسرے کاریگروں یا کسانوں کی زندگی کا مقابلہ کیا جائے گا؟

گلوکون نے کہا: ہرگز نہیں۔
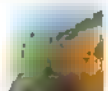
میں نے کہا: اس کے ساتھ میں اس موقع پر پھر اس بات کو دہرا دوں جو میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ
اگر ہمارا کوئی محافظ ایسی خوشی حاصل کرنا چاہے کہ وہ محافظ ہی باقی نہ رہے یا اگر وہ اس محفوظ اور مناسب زندگی پر
قانع نہ ہو جو ہمارے نزدیک بہترین زندگی ہے بلکہ جوانی کے دیوانہ پن سے متاثر ہو کر مسرت اور خوشی کے کسی
بیہودہ خیال کو اپنے سر میں جگہ دے کر ساری کی ساری ریاست خود لے بیٹھوں تو اسے پتا چلے گا کہ ہزیود کے فہم و حکمت
کی داد دینی ہوگی کہ اس نے کیا سچ کہا تھا کہ:

''کبھی کبھی آدھا پورے سے زیادہ ہوتا ہے''!

اس نے کہا: یہ اگر مجھ سے مشورہ کرے تو میں اسے یہی رائے دوں کہ بھائی جب تمھیں ایسی زندگی
نصیب ہے تو بہتر یہی ہے کہ جہاں ہو وہیں رہو۔

میں نے کہا: ہاں تو آپ اتفاق کرتے ہیں کہ مرد و عورت سب کی زندگی کا وہی مشترک طریقہ ہو جو ہم
نے تجویز کیا ہے۔ یعنی مشترک تعلیم، مشترک اولاد، اور شہر میں ہوں یا جنگ پر، سارے شہریوں کی مشترک
حفاظت، ساتھ مل کر پہرہ دیں، ساتھ مل کر شکار کریں (جیسے شکاری کتے کرتے ہیں) اور سب باتوں میں جہاں
تک ہو سکے عورتیں مردوں کا ساتھ دیں، کہ اُن کے لیے یہی بہترین راہ ہے، اور اس پر چل کر وہ مرد و عورت کے
قدرتی تعلق کو توڑنے کے بجائے اُسے قائم و محفوظ کریں گی۔

اس نے جواب دیا: میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔

میں نے کہا: لیکن ابھی یہ بات تو دریافت کرنی رہ ہی گئی کہ اور جانوروں کی طرح آدمیوں میں یہ
اشتراک ممکن بھی ہوگا یا نہیں؟ اور اگر ہوگا تو کس طرح؟

اس نے کہا: آپ نے پیش قدمی کی، ورنہ میں یہی سوال کرنے والا تھا۔

میں نے کہا: مثلاً اس بات کے دریافت کرنے میں تو کوئی دشواری نہیں کہ یہ لوگ جنگ کس طرح
کریں گے؟

گلوکون نے کہا: کیسے؟

میں نے کہا: کیوں، یہ سب مل کر مہم پر جایا کریں گے۔ جو بچے کافی مضبوط ہیں اُنھیں اپنے ساتھ
لے جائیں گے، تا کہ کاریگروں کے بچوں کی طرح یہ بچے بھی اپنی آنکھ سے اس کام کو دیکھ لیں جو بڑے ہو کر
انھیں کرنا ہے۔ اور یہی نہیں کہ یہ بچے صرف جنگ کا نظارہ کر لیں، بلکہ جنگ میں مدد بھی دیں گے، کارآمد ثابت

ہوں گے اور اپنے والدین کی خدمت کریں گے۔ تم نے کبھی مشاہدہ نہیں کیا کہ کمہار کے بچے چاک کو ہاتھ لگانے سے بہت پہلے اپنے والدین کو کام کرتے دیکھتے اور اُن کی مدد کرتے ہیں۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں، میں نے دیکھا ہے۔

میں نے کہا: تو کیا کمہار کو محافظوں کے مقابلے میں اپنے بچوں کی تربیت اور انھیں اپنے کام کے مشاہدے اور مشق کا موقع فراہم کرنے کا زیادہ خیال ہوگا؟

گلوکون نے کہا: یہ تو خیال ہی مضحکہ خیز ہے۔

میں نے کہا: پھر ایک بات اور یہ ہے کہ والدین پر بھی اُن کی موجودگی کا اثر ہوگا اور جانوروں کی طرح انسان کے لیے بھی اپنے بچوں کی موجودگی شجاعت کے اظہار کی زبردست محرک ہوتی ہے۔

گلوکون نے کہا: یہ تو سچ ہے۔ لیکن اگر انھیں شکست ہوئی (اور جنگ تو آخر جنگ ہے ایسا بھی ہوگا) تو پھر خطرہ کتنا بڑا ہے؟ ماں باپ کے ساتھ بچے بھی ضائع ہو جائیں گے اور ریاست کو دوبارہ پنپنے کا کوئی موقع نہیں رہے گا۔

میں نے کہا: ٹھیک ہے۔ لیکن کیا آپ انھیں کبھی کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے؟

گلوکون نے کہا: نہیں، میرا یہ مطلب تو نہیں۔

میں نے کہا: تو اگر کبھی نہ کبھی خطرہ برداشت ہی کرنا ہے تو پھر ایسے موقع پر کیوں نہ ہو کہ اگر وہ تباہی سے بچ جائیں تو پھر اس خطرے کو برداشت کرنے کی وجہ سے انھیں کچھ حاصل بھی ہو؟

گلوکون نے کہا: جی یہ تو ٹھیک ہے۔

میں نے کہا: آئندہ سپاہی بننے والے آیا کمسنی کے زمانے میں جنگ کا نظارہ کریں یا نہ کریں، یہ ایک اہم معاملہ ہے جس کی خاطر کچھ نہ کچھ خطرہ جائز طور پر برداشت کیا جاسکتا ہے۔

گلوکون نے کہا: بے شک معاملہ ہے تو بہت اہم۔

میں نے کہا: لہٰذا ہمارا پہلا قدم تو یہ ہونا چاہیے کہ بچوں کو جنگ کا نظارہ کرائیں، لیکن ایسی تدابیر بھی کرنی چاہئیں کہ یہ خطرے سے محفوظ رہیں۔ پھر تو سب ٹھیک ہوگا؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: ان بچوں کے ماں باپ کچھ اندھے تو ہوں گے نہیں کہ جنگ کے خطروں سے واقف نہ

... جس حد تک انسانی دوراندیشی کام دے سکتی ہے یہ، یہ بھی جان سکتے ہیں کہ کون سی مہم محفوظ ہے، کون سی
پُرخطر۔

گلوکون نے کہا: ہاں، یہ تو فرض کیا جا سکتا ہے۔

میں نے کہا: تو پھر یہ بچوں کو محفوظ مہم میں لے جائیں گے اور پُرخطر مہم میں احتیاط سے کام لیں گے۔

گلوکون نے کہا: درست۔

میں نے کہا: اور ان بچوں کو تجربہ کار اور جنگ آزمودہ لوگوں کے نیچے رکھیں گے اور انہی کو ان کا
سردار اور معلّم مقرر کریں گے۔

گلوکون نے کہا: بالکل ٹھیک۔

میں نے کہا: تاہم جنگ کے خطرے ہمیشہ پہلے سے معلوم نہیں ہو سکتے۔ پھر بھی ہزار اتفاق ہیں۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: ایسے اتفاقات کے خلاف تو ان بچوں کے پر لگا دینے چاہئیں تاکہ ضرورت کے وقت
بس اُڑ کر بچ نکلیں۔

اس نے پوچھا: وہ کیسے؟ آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں نے جواب دیا: میرا مطلب یہ ہے کہ شروع بچپن ہی سے انھیں گھوڑوں پر سواری کرانی
چاہیے۔ جب سواری سیکھ جائیں تو انھیں گھوڑوں پر سوار کر کے جنگ دکھانے کے لیے لے جانا چاہیے۔ یہ
خیال رہے کہ ان کے گھوڑے جوشیلے اور جنگی نہ ہوں بلکہ بہت سدھائے ہوئے لیکن نہایت سبک رفتار ہوں۔
اس طرح یہ بچے اپنی آیندہ زندگی کے شغل کا خوب نظارہ کر سکیں گے اور اگر خطرہ ہوا تو بس اپنے ہم عمر سرداروں
کے پیچھے پیچھے بھاگ کر اپنی جان بچا لیں گے۔

گلوکون نے کہا: میری رائے میں آپ بالکل درست فرماتے ہیں۔

میں نے کہا: اس کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ جنگ میں سپاہیوں کے باہمی تعلقات کیا ہوں گے اور
دشمن سے کیا؟ میں تو یہ تجویز کروں گا کہ جو سپاہی اپنی جگہ چھوڑ دے، یا ہتھیار ڈال دے، یا کسی اور بزدلانہ
حرکت کا مرتکب ہو اُسے کسانوں یا کاریگروں کے طبقے میں اُتار دینا چاہیے۔ کیوں، آپ کا کیا خیال ہے؟

گلوکون نے کہا: ضرور۔

میں نے کہا: جو اپنے آپ کو تو قید ہو جانے دے وہ دشمنوں کی نذر ہے۔ وہ اُن کا جائز شکار ہے، اس لیے وہ اس کے ساتھ جو چاہیں سو کریں۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: لیکن جس بہادر شخص نے جنگ میں امتیاز حاصل کیا ہو اس کے ساتھ کیا کرنا چاہیے؟ سب سے پہلے تو اس کی اپنے ہم عمر ساتھیوں سے عزت افزائی کرائی جائے اور پھر ان میں سے ہر ایک اُس کے سر پر ایک تاج رکھے۔ کیوں، ٹھیک ہے؟

اس نے جواب دیا: جی ہاں، میں اسے پسند کرتا ہوں۔

میں نے کہا: پھر سب اپنا اپنا ہاتھ اس سے ملانے کو آگے بڑھائیں۔

اس نے جواب دیا: میں اس سے بھی متفق ہوں۔

میں نے کہا: لیکن غالباً آپ میری اگلی تجویز سے اتفاق نہیں کریں گے؟

اس نے پوچھا: وہ کیا ہے؟

میں نے کہا: وہ یہ کہ ان سب کا بوسہ لے اور یہ سب لوگ اس کا بوسہ لیں۔

اس نے جواب دیا: ضرور۔ بلکہ میں تو اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھاؤں گا۔ وہ یہ کہ مہم کے دوران وہ جس کسی کا بوسہ لینا چاہے وہ اُسے بوسہ دینے سے انکار نہ کر سکے۔ تا کہ اگر فوج میں کوئی عاشق ہو (چاہے اُس کا معشوق کوئی لڑکا ہو یا لڑکی!) تو وہ اس طرح اپنی شجاعت کا انعام حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

میں نے کہا: بہت خوب۔ یہ بات تو پہلے ہی طے ہو چکی ہے کہ بہادر آدمی دوسروں سے زیادہ بیویاں رکھ سکے گا۔ اوروں کے مقابلے میں اسے انتخاب میں پہل کا حق بھی حاصل ہوگا تا کہ یہ جتنے بچے ممکن ہو پیدا کر سکے۔

اس نے کہا: صاد ہے۔

میں نے کہا: اس کے علاوہ ہومر کے نزدیک بہادر جوانوں کی عزت افزائی کا ایک اور طریقہ ہے۔ ہومر نے اجیکس (Ajax) کا حال بیان کیا ہے کہ میدانِ کارزار میں ممتاز خدمات انجام دینے پر اُسے

"گائے کے گوشت کے لوتھڑے کے لوتھڑے"

انعام میں ملے تھے۔ یہ ایک شجاع شخص کے لیے جس نے جوانی میں قدم رکھا ہو نہایت مناسب ہدیۂ تحسین

... ہے کہ اس سے یہی نہیں کہ اس کی عزت افزائی ہوتی ہے بلکہ یہ خود بہت طاقت دینے والی چیز بھی ہے۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: چنانچہ اس معاملے میں ہم ہومر کی اُستادی قبول کرتے ہیں، اور قربانیوں یا دوسرے ایسے مواقع پر ہم بھی اپنے بہادر مردوں اور عورتوں کی عزت افزائی ان کی شجاعت کی مناسبت سے گیتوں اور دوسرے پہلے بتائے ہوئے طریقوں سے کیا کریں گے۔ اس کے علاوہ یہ کہ انھیں:

"اعزازی جگہ" بھی دیں گے اور ان کے لیے "اچھا بھُنا ہوا گوشت اور شراب کے
لبالب بھرے ہوئے جام مہیا کریں گے"۔

اور ایسی عزت افزائی کے سلسلے میں اُن کی تعلیم بھی ہوتی جائے گی۔

گلوکون نے کہا: بالکل ٹھیک فرماتے ہیں، آپ۔

میں نے کہا: اور جب کوئی بہادری کے ساتھ جنگ کے میدان میں جان دے گا تو سب سے پہلے ہم اُسے زریں نسل کا رکن بتائیں گے۔

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: یہی نہیں۔ کیا ہمارے پاس ہزیوڈ کی شہادت موجود نہیں ہے کہ یہ لوگ مرنے کے بعد:

"زمین پر پاک اور مقدس فرشتوں کی طرح رہتے ہیں یعنی منبع خیر و مانع شر اور صفتِ
گفتار رکھنے والے انسان کے محافظ"۔

گلوکون نے کہا: ہاں ہاں، اور ہم اس کی شہادت کو تسلیم بھی کرتے ہیں۔

میں نے کہا: کسی دیوتا سے ہمیں یہ سبق بھی لینا چاہیے کہ ان الٰہی ہستیوں کے اور مشاہیر کے مقبروں کی تعمیر کس طرح عمل میں آئے اور ان کا خصوصی امتیاز کیا ہو۔ پھر دیوتا جو ہدایت کرے ہمیں اسی کے مطابق عمل پیرا ہونا چاہیے۔

اس نے کہا: ضرور۔

میں نے کہا: ہم لوگ ہمیشہ ہمیشہ ان کی عزت کریں گے اور مشاہیر کے مقبروں کی طرح ان کے مزاروں پر اپنا سر جھکایا کریں گے۔ یہ عزت انھی تک محدود نہیں ہوگی بلکہ ہر وہ شخص اس اعزاز کا مستحق ٹھہرایا

جائے جو غیر معمولی طور پر اچھا اور نیک خیال کیا جاتا ہو، چاہے وہ لمبی عمر کو پہنچ کر اجل کا شکار ہو یا اور کسی طرح۔

گلوکون نے کہا: بہت ٹھیک۔

میں نے کہا: اب دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے سپاہی دشمنوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کریں گے؟

گلوکون نے کہا: کس معاملے میں؟

میں نے کہا: سب سے پہلے تو غلامی کے بارے میں۔ کیا آپ کے نزدیک یونانیوں کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اور دوسری یونانی ریاستوں کو غلام بنائیں یا اگر اُن میں ان کی حفاظت کی قوت ہو تو انھیں دوسروں کا غلام بننے دیں۔ اس خطرے کا خیال کر کے کہ کہیں ساری یونانی نسل وحشی قوموں سے مغلوب نہ ہو جائے، کیا ان لوگوں میں یہ رواج نہ ہو کہ انھیں غلام بنانے سے درگزر کریں؟

گلوکون نے کہا: میرے خیال میں یہی بہتر ہے کہ یونانی ایک دوسرے کو گزند نہ پہنچائیں۔

میں نے کہا: یعنی یہ کسی یونانی کو اپنی غلامی میں نہ رکھیں۔ یہ خود اس قاعدے کی پابندی کریں گے اور دوسرے یونانیوں کو بھی اس پر عامل ہونے کا مشورہ دیں گے۔

گلوکون نے کہا: اس طرح یہ لوگ ایک دوسرے پر دست درازی نہیں کریں گے اور وحشی قوموں کے مقابلے میں متحد رہیں گے۔

میں نے کہا: دوسری بات، دریافت طلب، مقتولوں کی بابت ہے۔ کیا فاتح، مقتولوں کے ہتھیاروں کے علاوہ اور کچھ بھی لیں گے؟ کیا دشمن کو لُوٹنے کا شغل جنگ سے بچنے کا ایک حیلہ نہیں بن جاتا؟ بزدل لوگ لاشوں کے قریب چھپ رہتے ہیں اور بہانا یہ کرتے ہیں کہ ہم بھی تو ایک فرض انجام دے رہے ہیں۔ آج سے پہلے کتنی ہی فوجیں اسی لوٹ مار کی محبت میں تباہ ہو چکی ہیں۔

اس نے کہا: بجا ہے۔

میں نے کہا: اور کیا لاش کو لُوٹنے کھسوٹنے میں شقاوت اور ہوس کی بُو نہیں آتی؟ مردہ جسم کو دشمن سمجھنا، حالانکہ اصل دشمن صرف اپنا لباس جنگ چھوڑ کر اُڑ گیا ہے۔ اس میں بھی ایک طرح کا کمینہ پن اور ایک قسم کی نسائیت معلوم ہوتی ہے۔ یہ تو وہی کتے کی سی مثال ہوئی کہ جب اپنے حملہ آور تک نہیں پہنچ پاتا تو اُن پتھروں پر منھ مارتا ہے جو آ آ کر اُسے لگ رہے ہیں۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں، بالکل اسی کتے کی سی مثال ہے۔

میں نے کہا: لہٰذا ہمیں لاشوں کو لوٹنے سے باز رہنا اور اُن کے دفن کرنے میں کبھی حارج نہیں ہونا چاہیے۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں، اس سے تو یقیناً باز رہنا چاہیے۔

میں نے کہا: یوں تو کبھی بھی دیوتاؤں کے مندروں پر اسلحہ کا نذرانہ پیش نہیں کرنا چاہیے اور اگر دوسرے یونانیوں سے اچھے تعلقات رکھنا منظور ہیں تو پھر یونانیوں کے اسلحہ کا نذرانہ تو ہرگز نہیں، اور سچ پوچھو تو عزیزوں اور رشتہ داروں سے حاصل کیے ہوئے مالِ غنیمت کا نذرانہ تو ناپاک سمجھا جا سکتا ہے۔ ہاں سوائے اس صورت کے کہ خود دیوتا نے اس کا حکم دیا ہو۔

گلوکون نے کہا: بہت صحیح۔

میں نے کہا: اس کے بعد یونانی علاقوں کی تاخت و تاراج اور مکانوں کے جلانے کے متعلق ہمارا کیا رویہ ہونا چاہیے۔

اس نے کہا: آپ اپنی رائے فرمایئے، میں اُسے سننا چاہتا ہوں۔

میں نے کہا: میری رائے میں تو دونوں باتیں منع ہونی چاہئیں۔ میرے نزدیک صرف سالانہ پیداوار لے لینی چاہیے اور بس۔ اس کی وجہ بتاؤں۔

گلوکون نے کہا: فرمایئے۔

میں نے کہا: آپ جانتے ہیں کہ باہمی نفاق و فساد اور جنگ میں بس نام ہی کا فرق نہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اُن کی ماہیت بھی مختلف ہے۔ ایک سے اندرونی اور خانگی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے اور دوسرے سے بیرونی اور خارجی کا۔ پہلی کیفیت کو فساد اور دوسری کو جنگ کہتے ہیں۔

گلوکون نے کہا: جی، بالکل صحیح تفریق ہے۔

میں نے کہا: پھر کیا یہ بات بھی اسی طرح مسلّم نہیں کہ یونانی نسل سب کی سب خون اور دوستی کے تعلق کی وجہ سے متحد ہے، اور وحشی قوموں سے اجنبی اور جُدا۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: چنانچہ جب وحشی اور یونانی برسرِ پیکار ہوں تو یہ ایک دوسرے کے دشمن کہلائیں گے اور اس حالت کو جنگ سے تعبیر کیا جائے گا۔ لیکن اگر یونانی آپس میں لڑیں تو کہا جائے گا کہ یونان میں بدنظمی اور

فساد برپا ہے۔ یہ لوگ دراصل دوست ہیں اور ان کی وقتی دشمنی اور لڑائی ''فساد'' سے تعبیر کی جائے گی۔

گلوکون نے کہا: میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔

میں نے کہا: تو ذرا سوچو کہ اگر کسی شہر میں وہ کیفیت پیدا ہو جسے ہم نے فساد کا نام دیا ہے یعنی شہر میں دو فرقے ہو جائیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کی زمینوں کو تاخت و تاراج کرنے لگیں اور مکانوں کو آگ دیۓ تو یہ لڑائی کس قدر فتنہ خیز ہو جائے گی۔ ملک کا کوئی سچا محبت کرنے والا کس طرح اپنے آپ کو اپنی ماں (مادرِ وطن) اور دائی (پرورش کرنے والے وطن) کے ٹکڑے کرنے پر آمادہ کر سکے گا۔ البتہ فاتح اگر مفتوح کو اس کی سالانہ فصل سے محروم کر دے تو اس میں پھر بھی کچھ معقولیت ہے۔ لیکن اس میں بھی اُن کے دلوں میں صلح اور امن ہی کا خیال ہوگا اور وہ ہرگز ہمیشہ برسرِ پیکار رہنے کا ارادہ نہیں کریں گے۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں، یہی بہتر رویہ ہے۔

میں نے کہا: اور جس شہر کی آپ بنیاد رکھ رہے ہیں کیا وہ یونانی شہر نہ ہوگا؟

گلوکون نے کہا: کیوں نہیں، ضرور۔

میں نے کہا: تو کیا اس کے شہری بہت اچھے اور مہذب لوگ نہیں ہوں گے؟

گلوکون نے کہا: بے شک، بہت مہذب۔

میں نے کہا: کیا وہ یونان کے عاشق نہ ہوں گے، اور اسے اپنا وطن نہیں سمجھیں گے؟ یا یونان کے مشترک مندروں اور عبادت گاہوں میں شریک نہیں ہوں گے؟

گلوکون نے کہا: کیوں نہیں، ضرور ہوں گے۔

میں نے کہا: ان میں جب کبھی کوئی باہمی اختلاف ہوگا تو یہ اسے محض ایک نفاق یا فساد خیال کریں گے؟ یعنی دوستوں کا آپس کا جھگڑا جسے جنگ کے نام سے نہیں پکار سکتے۔

گلوکون نے کہا: اسے ہرگز جنگ نہیں کہہ سکتے۔

میں نے کہا: وہ ان لوگوں کی طرح جھگڑیں گے جو روٹھتے ہیں لیکن پھر ایک دن ملنے کے لیے۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: یہ باہم دوستانہ اصلاح کی کوشش کریں گے۔ اپنے مخالفین کو نہ تباہ کریں گے نہ انھیں غلام بنائیں گے: ایک دوسرے کے اصلاح کرنے والے ہوں گے نہ کہ دشمن؟

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: چونکہ خود بھی یونانی ہیں اس لیے یونان میں تاخت و تاراج نہیں کریں گے، نہ کبھی مکانوں کو آگ لگائیں گے۔ نہ یہ خیال کریں گے کہ کسی شہر کی ساری کی ساری آبادی مرد، عورت، بچے سب ہی اُن کے دشمن ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ جنگ کا جرم چند آدمیوں تک محدود ہوتا ہے اور اکثریت دراصل ان کی دوست ہے۔ ان وجوہ سے یہ نہ تو ان کی زمینیں خراب کریں گے، نہ ان کے مکان مسمار کریں گے۔ ان کی دشمنی بس اس وقت تک رہے گی جب تک کہ معصوم مظلوموں کی اکثریت ان چند مجرموں کو اپنے جرم کی تلافی کرنے پر مجبور کردے۔

گلوکون نے کہا: میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں کہ ہمارے شہری اپنے یونانی دشمنوں سے یہ رویہ رکھیں گے اور وحشیوں سے وہ طریقہ جو آج کل آپس میں برتتے ہیں۔

میں نے کہا: اچھا تو ہم اپنے محافظوں کے لیے یہ قانون بھی بنادیں کہ وہ نہ تو یونانیوں کی زمینوں پر تاخت و تاراج کریں نہ اُن کے مکان جلائیں۔

گلوکون نے کہا: طے ہے۔ اور دوسرے وضع شدہ قوانین کی طرح ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بھی بہت اچھا قانون ہے۔ لیکن سقراط، میں پھر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ اسی طرح چلتے گئے تو اس دوسرے سوال کو آپ بالکل بھول جائیں گے جسے اس تحقیق کے شروع میں آپ نے ایک طرف ڈال دیا تھا۔ یعنی آیا یہ صورت اور یہ نظام ممکن بھی ہے؟ اور ممکن ہے تو کس طرح؟ اس لیے کہ آپ کی تجویز اگر قابلِ عمل ہو تو میں اس کے تسلیم کرنے کے لیے بالکل تیار ہوں کہ اس سے ریاست کو طرح طرح کے فوائد ہوں گے۔ بلکہ میں تو یہ اور اضافہ کروں گا جو آپ نے چھوڑ دیا ہے یعنی ہمارے شہری بہادر ترین جنگ آزما ہوں گے اور کچھ ہو، یہ اپنی جگہ سے نہیں ٹلیں گے۔ اس لیے کہ ایک دوسرے سے واقف ہوں گے اور باہم باپ، بھائی یا بیٹا کہہ کر ایک دوسرے کو پکارتے ہوں گے اور اگر یہ بھی مانا جائے کہ عورتیں بھی ان فوجوں میں شامل ہوں گی، چاہے ساتھ ساتھ ہوں، چاہے پیچھے پیچھے، دشمن کے لیے برقِ عذاب کی حیثیت سے ہوں یا ضرورت کے وقت مردوں کو مدد پہنچانے کے لیے تو میرا یقین ہے کہ یہ فوج کبھی ہار نہیں سکتی۔ اس کے علاوہ بہت سے خانگی فائدے بھی ہیں جن کا ذکر اس سلسلے میں کیا جاسکتا ہے اور میں انھیں بے کم و کاست تسلیم کرتا ہوں لیکن چونکہ میں ان تمام فائدوں کو اور ان کے علاوہ جتنے آپ اور فرمائیں ان سب کو اس شرط پر تسلیم کرتا ہوں کہ آپ کی یہ ریاست عالمِ وجود میں بھی

آ جائے اور اس لیے اب ان فائدوں کے متعلق زیادہ کہنے سننے کی تو ضرورت نہیں۔ البتہ ہمیں اب ریاست کے وجود میں آنے کے امکان اور اس کے وسائل اور ذرائع کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔

میں نے کہا: میں جہاں ذرا بھٹکا، کہ آپ فوراً وار کر دیتے ہیں اور ذرا رعایت نہیں کرتے؛ میں پہلی اور دوسری رو سے بمشکل بچا اور آپ شاید نہیں جانتے کہ آپ نے تیسری موج مہیا کر دی۔ اور یہ تیسری موج سب سے زبردست اور سب سے بڑی ہے جب بھی اس تیسری موج کو دیکھ بھال لیں گے تو میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ میری مشکل کا زیادہ خیال کریں گے اور غالباً تسلیم کریں گے کہ ایسی غیر معمولی تجویز پیش کرنے سے پہلے میرا خوف اور میری جھجک فطری تھی۔

گلوکون نے جواب دیا: آپ جتنی زیادہ اس قسم کی درخواستیں کرتے ہیں اتنا ہی ہمارا عزم قوی ہوتا ہے کہ آپ سے اس ریاست کے وجود میں لانے کے وسائل دریافت کر کے چھوڑیں گے۔ بس کہیے بھی۔ جلدی کیجیے۔

میں نے کہا: میں پہلے تو آپ کو یہ یاد دلا دوں کہ ہم یہاں پہنچے ہیں عدل اور ناانصافی کی تلاش میں!

اس نے کہا: جی ہاں، لیکن اس سے مطلب؟

میں نے کہا: میں صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر ان چیزوں کی ماہیت معلوم ہو چکی ہے تو کیا عادل انسان کو کسی معاملے میں بھی عدلِ مطلق کے راستے سے انحراف نہیں کرنا چاہیے؟ یا ہم بس اس پر مطمئن ہو جائیں گے کہ وہ قریب قریب عادل ہو اور صفتِ عدل کا وجود اس میں دوسرے انسانوں سے زیادہ پایا جاتا ہو؟

اس نے کہا: بس قریب قریب عادل ہونا کافی ہوگا۔

میں نے کہا: مگر یاد رہے کہ ہم عدلِ مطلق کی ماہیت اور عادل کامل کی خصوصیات دریافت کر رہے تھے، اور اسی طرح مطلق ناانصافی کی ماہیت اور کامل غیر منصف کی خصوصیات۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ ہمارے سامنے ان چیزوں کا ایک تصور قائم ہو جائے اور ان کی تلاش اس لیے تھی کہ اس معیار سے مقابلہ کر کے اور یہ دیکھ کر کہ ہم ان سے کس درجہ مشابہ ہیں، ہم خود اپنی خوش حالی، بدحالی کا اندازہ کر سکیں۔ یہ تھوڑی ہی ظاہر کرنا تھا کہ یہ تصور واقعی موجود بھی ہو سکتے ہیں۔

اس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: کیا ایک مصور اس وجہ سے بُرا مصور ہو جائے گا کہ کمالِ ہنرمندی سے ایک حسین شکل

کے خط وخال تیار کرنے کے بعد وہ یہ نہیں بتا سکتا کہ آیا ایسی شکل کبھی موجود بھی تھی۔

اس نے کہا: نہیں، کبھی نہیں۔

میں نے کہا: اچھا، تو ہم بھی تو ایک کامل ریاست کی تصویر بنا رہے تھے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: تو کیا ہماری تصویر اس وجہ سے ناقص قرار پا جائے گی کہ ہم یہ نہیں ثابت کر سکتے کہ کسی شہریا ریاست کے اس طرح تشکیل پانے کا امکان بھی ہے۔

اس نے کہا: نہیں، ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: بے شک، حقیقت تو یہی ہے۔ لیکن میں آپ کی درخواست مان لوں اور یہ بتانے کی کوشش کروں کہ کن حالتوں میں ایسی ریاست کے وجود کا امکان سب سے زیادہ ہے تو میں پہلے آپ سے تمام سابقہ مُسلمات کے دُہرانے کی درخواست کروں گا۔

اس نے پوچھا: کون سے مُسلمات؟

میں نے جواب دیا: میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا زبان کبھی بھی تصورات کی پوری ترجمانی کر سکتی ہے؟ کیا الفاظ واقعات سے زیادہ اظہار نہیں کرتے اور آدمی جو چاہے سمجھے، کیا ماہیت اشیا کا تقاضا ہے کہ لفظ حقیقت سے پیچھے رہ جائیں۔ کہیے آپ کا کیا خیال ہے؟

اس نے جواب دیا: میں آپ کا ہم خیال ہوں۔

میں نے کہا: تو پھر آپ اس امر پر مُصر نہ ہوں کہ عالم وجود میں جو ریاست ہو میں اُسے من وعن اپنے تصور کے مطابق ثابت کروں۔ اگر بس اتنا ہی معلوم ہو جائے کہ ہماری تجویز کے لگ بھگ کسی شہر پر کس طرح حکومت ہو سکتی ہے تو غالباً آپ تسلیم کرلیں گے کہ آپ جس امکان کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ معلوم ہو گیا۔ بس اسی پر قناعت کیجیے گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں تو اس پر قانع ہو جاؤں گا۔ کیوں، کیا آپ نہیں ہوں گے؟

اس نے کہا: ہاں ہاں، میں بھی ہو جاؤں گا۔

میں نے کہا: اس کے بعد میں یہ بتانے کی کوشش کرتا ہوں کہ ریاستوں کی کون سی غلطی اُن کی موجودہ بدنظمی کا باعث ہے اور وہ کم سے کم اصلاح کون سی ہے جو ریاست کو بہتر شکل میں تبدیل کر سکتی ہے۔ ممکن ہو تو اصلاح بس ایک ہی چیز کی ہونی چاہیے یا دو کی۔ الغرض تبدیلیاں جتنی کم اور جس قدر خفیف ہوں بہتر ہے۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: میرے خیال میں بس اگر ایک تبدیلی کر دی جائے تو ریاست کی اصلاح ممکن ہے۔ ہر چند یہ تبدیلی نہ آسان ہے نہ خفیف، البتہ ممکن ضرور ہے۔

اس نے کہا: وہ کیا؟

میں نے کہا: میں اب اس چیز سے دوچار ہوتا ہوں جسے میں نے سب سے بڑی موج سے تعبیر کیا تھا۔ اب چاہے یہ لہر مجھے تمسخر وتحقیر کے طوفان میں غرق ہی کیوں نہ کر دے، حقیقت کا اظہار تو بہر حال ضروری ہے۔ اچھا تو غور سے میری بات سُنو۔

اس نے کہا: ارشاد۔

میں نے کہا:

> ''شہروں کو بلکہ نوع انسانی کو مصیبتوں سے اُس وقت تک نجات نصیب نہیں ہوگی جب تک دُنیا میں فلسفی بادشاہ نہ ہوں یا بادشاہوں اور شہزادوں میں فلسفے کی رُوح اور فلسفے کی قوت نہ آ جائے یعنی جب تک سیاسی عظمت اور حقیقت کا عرفان دونوں یکجا نہ ہو جائیں اور وہ عامیانہ طبیعتیں جو ان میں سے صرف ایک کی اتباع کرتی اور دوسرے کو چھوڑ دیتی ہیں، علیحدہ ہونے پر مجبور نہ ہو جائیں۔ ایسا ہو جائے تو ہماری ریاست عالم وجود میں آ سکتی ہے اور اسی وقت اس کے لیے زندہ رہنے کا امکان بھی ہے''۔

گلوکون نے کہا: میرا تو یہ خیال ہے، اور اگر یہ اس درجہ مبالغہ آمیز نہ معلوم ہوتا تو میں اب تک اس کا اظہار کر چکا ہوتا۔ لوگ اس کے بڑی مشکل سے قائل ہوں گے کہ کسی اور طرح کی ریاست میں شخصی یا جماعتی خوشی کا پایا جانا ممکن ہی نہیں۔

گلوکون نے کہا: جناب سقراط! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں اور جو الفاظ آپ نے ابھی ابھی فرمائے، اُن پر تو اکثر لوگ اور بہت معزز لوگ خود اپنی عبا قبا اتار، جو ہتھیار بھی بات پڑے اسے لے کر، آپ پر نہ معلوم کس نیت سے ایسے دوڑ پڑیں گے کہ آپ کو علم بھی نہیں ہوگا کہ آپ ہیں کہاں۔ اور اگر آپ نے پہلے سے کوئی جواب تیار نہ کر لیا تو یہ اپنی ذکاوت سے بس آپ کے ٹکڑے ٹکڑے ہی تو کر ڈالیں گے۔ اور ....اور بجا ہی کریں گے۔

میں نے کہا: جی جی، تم نے ہی تو مجھے اس مصیبت میں ڈالا۔

گلوکون نے کہا: اچھا تو کیا۔ لیکن خیر میں آپ کو اس سے نکالنے کی بھی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ لیکن سوائے نیک ارادے اور نیک مشورے کے اور میرے پاس ہے ہی کیا؟ البتہ شاید آپ کے سوالوں کا جواب اوروں سے بہتر دے سکوں تو دے سکوں، آپ نے سُنا؟ آپ کے مددگار کا تو یہ حال ہے، اب منکروں اور مخالفوں کو اپنے حق بجانب ہونے کا یقین دلائیے۔

میں نے کہا: آپ جب ایسی گراں قیمت کمک بہم پہنچائیں تو پھر مجھے بھی کوشش کرنی ہی چاہیے۔ ہمارے بچنے کی بس ایک یہ صورت ہے کہ ہم پہلے ہی بتا دیں کہ جب ہم کہتے ہیں کہ فلسفی بادشاہ ہوں، تو ہماری مراد کن لوگوں سے ہے۔ اس طرح ہم اپنا بچاؤ کر سکیں گے۔ دنیا میں بعض طبائع آپ کو ایسی ملیں گی جنھیں فلسفہ کا مطالعہ کرنا اور ریاست کا سردار بننا چاہیے اور بعض طبائع ایسی ہوں گی جو فلسفی بننے کے لیے پیدا ہی نہیں ہوئیں۔ یہ پیچھے پیچھے چلنے کے لیے ہوتی ہیں، رہنمائی کے لیے نہیں۔

گلوکون نے کہا: ہاں، تو فلسفی کی تعریف کر دیجیے۔

میں نے کہا: سُنیے۔ مجھے اُمید ہے کہ جیسے تیسے اس کی تسلی بخش توضیح کر دوں گا۔

گلوکون نے کہا: فرمائیے۔

میں نے کہا: آپ کو تو یاد ہو گا، اس لیے دُہرانے کی چنداں ضرورت نہیں، کہ ایک عاشق کو (بشرطیکہ وہ اس نام کا واقعی مستحق ہو) اپنے محبوب کے کسی جزو سے اظہارِ محبت نہیں کرنا چاہیے بلکہ کُل سے۔

گلوکون نے کہا: میں نہیں سمجھا۔ ذرا میرے حافظے کی مدد فرمائیے۔

میں نے کہا: کوئی اور شخص بھی آسانی سے یہی آپ کا سا جواب دے سکتا تھا لیکن آپ جیسے طرح دار آدمی کو تو معلوم ہونا چاہیے کہ سب وہ لوگ جو عنفوانِ شباب میں ہوتے ہیں کسی نہ کسی طرح کسی عاشق کے سینے میں ایک کسک پیدا کرتے یا کسی جذبے کو تحریک دیتے ہیں اور عاشق انھیں اپنی محبت آمیز توجہ کا مستحق سمجھتا ہے۔ حسینوں کے معاملے میں لوگوں کا طرزِ عمل کیا یہ نہیں ہوتا کہ اگر معشوق کی ناک ذرا چپٹی ہے تو اُس کے دلفریب چہرے کی تعریف ہو رہی ہے، کسی کی بہت لمبی ناک ہے تو اُس کے شاہانہ انداز کی تحسین ہے، جس میں یہ دونوں باتیں نہیں تو اس میں حسنِ تناسب کی مدح سرائی ہے۔ اگر رنگ ذرا سیاہ ہے تو یہ مردانگی کی علامت ہے؛ صاف رنگ والے دیوتاؤں کی اولاد ہیں، رہے "شہد کی سی زردی لیے ہوئے" تو اُن کے تو نام ہی سے

معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی عاشق کی تلاش اور تصنیف ہے جس کے لیے زردی اگر عارضِ شباب پر نمودار ہو تو وہ بھی ناگوار نہیں۔ غرض وہ کون سا بہانہ ہے جو لوگ اس غرض سے نہ تراش لیں گے۔ اور کون سی بات ہے جو اس لیے نہیں ڈھونڈھ لیں گے کہ بہارستان شباب کا ایک پھول بھی ان کے ہاتھ سے نہ جانے پائے۔

گلوکون نے کہا: اگر دلیل کی خاطر آپ مجھے عشق و محبت کے معاملوں میں سند بناتے ہیں تو خیر مجھے منظور ہے۔

میں نے کہا: پھر شراب کے دلدادہ لوگوں کا کیا حال ہے؟ وہ بھی یہی کرتے ہیں کہ کسی قسم کی شراب ہو، اُسے پینے کے لیے ہر طرح کا بہانہ خوشی سے ڈھونڈ لیں گے۔

گلوکون نے کہا: بہت درست۔

میں نے کہا: یہی حال حریص اور حوصلہ مند لوگوں کا ہے۔ پوری فوج کی قیادت نصیب نہیں ہوئی تو ایک قطار ہی کی سہی۔ اگر بڑے اور معزز لوگ ان کی عزت نہیں کرتے تو کم حیثیت اور نیچ لوگوں سے خراجِ تحسین وصول کر کے خوش ہیں، بس غرض یہ ہے کہ کسی نہ کسی قسم کی عزت ضرور ہو۔

گلوکون نے کہا: جی، بالکل یہی حال ہے۔

میں نے کہا: تو میں پھر ایک مرتبہ پوچھتا ہوں کہ جب کوئی شخص کسی نوع خوبی کا دلدادہ ہوتا ہے تو پوری نوع کی آرزو رکھتا ہے یا اس کے صرف ایک جزو کی۔

گلوکون نے کہا: کُل کی۔

میں نے کہا: چنانچہ ہم فلسفی کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ وہ حکمت اور عرفان کے کسی جزو کا عاشق نہیں ہوتا بلکہ کُل کا۔

گلوکون نے کہا: بے شک، کُل کا۔

میں نے کہا: جو علم کو ناپسند کرتا ہو خصوصاً کم سنی میں ہی، کہ ابھی خیر و شر میں تمیز کی قوت نہیں ہوتی، تو ایسے آدمی کو ہم فلسفی یا محبِ علم نہیں قرار دے سکتے۔ جو غذا سے انکار کرے وہ بھوکا نہیں، اُس کی اشتہا بُری ہے، اچھی نہیں۔

گلوکون نے کہا: بالکل ٹھیک۔

میں نے کہا: اس کے برعکس جسے ہر قسم کے علم کا ذوق ہو اور جو ہر بات کو سیکھنے کا متمنی ہو اور کبھی اس

سے سیر ہی نہ ہوتا ہو تو ایسے شخص کو بجا طور پر فلسفی (حکیم) کہا جا سکتا ہے۔ کیوں، میں ٹھیک کہتا ہوں نا؟

گلوکون نے کہا: اگر آدمی محض تجسس سے فلسفی بن جاتا ہے تو آپ کو عجیب و غریب ہستیاں اس لقب کی مستحق ملیں گی۔ مختلف نظارے اور تماشے دیکھنے والے سب کے سب کچھ سیکھنے سے خوش ہوتے ہیں، اس لیے یہ بھی شامل کیے جانے چاہئیں۔ موسیقی کے نوآموزیوں تو فلسفیوں میں کھپتے نظر آتے نہیں، اس لیے کہ ان سے بن پڑے تو کبھی فلسفیانہ بحث و تحقیق کے قریب بھی نہ پھٹکیں۔ لیکن سارے ڈائیونائیسی (Dionysiac) تہواروں میں یہ حضرات ادھر اُدھر ایسے دوڑے پھرتے ہیں گویا ہمہ تن گوش ہیں اور اپنے کانوں کو ہر ترانے کے سننے کے لیے وقف کر چکے ہیں۔ پھر چاہے یہ سماع کی محفل شہر میں ہو یا گاؤں میں، اس کی کچھ پروا نہیں۔ یہ ہیں کہ موجود ہیں۔ اچھا تو کیا اس وجہ سے ہم انھیں، اور ان کے ہم ذوق دوسرے لوگوں کو، نیز اور چھوٹے چھوٹے فن جاننے والوں کو فلسفی قرار دیں گے؟

میں نے کہا: نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ لوگ تو خالی نقل ہیں۔

اس نے کہا: اور اصل پھر کون ہیں؟

میں نے کہا: وہ جو نظارۂ حقیقت کے دلدادہ ہیں۔

اس نے کہا: بہت خوب، لیکن میں ذرا آپ کا مفہوم سمجھنا چاہتا ہوں۔

میں نے کہا: کسی اور کے سامنے اس کی تشریح شاید کچھ مشکل ہوتی، لیکن میں جو کچھ کہنے والا ہوں اُسے تم تو غالباً ضرور تسلیم کر لوگے۔

اس نے کہا: وہ کیا؟

میں نے کہا: چونکہ حُسن، بھونڈے پن کی ضد ہے، اس لیے یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اور چونکہ یہ دو مختلف چیزیں ہیں، اسی لیے ان میں سے ہر ایک، ایک چیز ہے۔

اس نے کہا: یہ بھی صحیح ہے۔

میں نے کہا: اسی طرح عدل و ناانصافی، خیر و شر اور ہر دوسری تقسیم کے متعلق یہی بیان راست آتا ہے۔ علیحدہ علیحدہ تو ان میں سے ہر ایک، ایک وحدت ہے۔ لیکن اعمال اور اشیا میں اُن کے باہم جو مجموعے بن جاتے ہیں ان کی وجہ سے یہ مختلف صورتوں میں دکھائی دیتے ہیں اور بہت سے معلوم ہوتے ہیں۔

اس نے کہا: بہت ٹھیک۔

میں نے کہا: یہی امتیاز ہے ایک طرف تماشائیوں، عملی فنون کے دلدادہ لوگوں اور ناچ گانے کے رسیا لوگوں میں اور دوسری طرف اُن لوگوں میں جن کا میں ذکر کر رہا ہوں، بس یہی مؤخرالذکر لوگ حقیقی فلسفی کہلانے کے مستحق ہیں۔

اس نے کہا: آپ یہ تفریق کس طرح کرتے ہیں؟

میں نے کہا: یہ نغمے کے شیدا اور جلووں کے دلدادہ میرے خیال میں سچ پوچھو تو اچھی آوازوں، بھلے رنگوں اور خوشنما شکلوں اور ان سے جو مصنوعی چیزیں پیدا ہوتی ہیں اُن کے چاہنے والے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا دماغ حُسنِ مطلق کے نظارے یا اس کی محبت کی ذرا صلاحیت نہیں رکھتا۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: وہ لوگ بہت کم ہیں جو اس کا نظارہ حاصل کر سکیں۔

اس نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: تو یہ پوچھتا ہوں کہ ایک آدمی ہے جو حسین چیزوں کی حس تو رکھتا ہے لیکن حسنِ مطلق کا اُسے بالکل احساس نہیں، پھر اگر کوئی اسے اس حُسن کی طرف لے جانا چاہے تو یہ اس کے پیچھے پیچھے چل بھی نہیں سکتا، تو آیا یہ آدمی بیدار ہے یا خواب میں؟ سوچو۔ کیا خواب دیکھنے والا، سویا ہوا ہو کہ بیدار، وہ نہیں ہوتا جو غیر مماثل اشیا کو باہم مشابہ کرے اور اصل چیز کے بجائے اس کی نقل کو قبول کرلے۔

اس نے کہا: بے شک، ایسا شخص خواب میں ہے۔

میں نے کہا: اس کے مقابلے میں ایک دوسرے شخص کا حال دیکھیے جو حُسنِ مطلق کے وجود کو پہچانتا اور اُس کے تصور کو ان اشیا سے ممیز کرسکتا ہے، جو اس تصور میں شریک ہیں اور نہ تو ان اشیا کو اس تصور کی جگہ رکھتا ہے، نہ اس تصور کو ان اشیا کی جگہ تو یہ شخص خواب میں ہے یا بیدار۔

اس نے کہا: بالکل بیدار۔

میں نے کہا: گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو جانتا ہے اس کے ذہن میں علم ہوتا ہے، اور جو محض قیاس سے کام کرتا ہے اس کے پاس ظن ورائے۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: لیکن فرض کرو کہ یہ شخص ہم سے جھگڑے اور ہمارے بیان کی تردید کرے تو ایسی حالت میں کیا یہ ممکن ہے کہ اس پر اس امر کا اظہار کیے بغیر کہ اس کے حواس میں سخت بے ترتیبی اور خبط ہے ہم کوئی چارۂ تسکین اس کے لیے تجویز کر دیں یا کوئی اور بہتر مشورہ اسے دے سکیں۔

اس نے کہا: بے شک، اس غریب کو کوئی اچھا مشورہ دینا چاہیے۔

میں نے کہا: اچھا تو آؤ سوچیں کہ اس سے کیا کہا جائے۔ میں جانتا ہوں کہ پہلے تو اسے یقین دلائیں کہ بھائی تمھیں اگر کسی چیز کا علم ہے تو ہم بہت خوش ہیں، یہ تمھیں مبارک۔ لیکن ہاں اس سے ایک سوال بھی پوچھنا چاہیے، یعنی جس شخص کو علم ہوتا ہے وہ کچھ جانتا ہے یا نہیں جانتا؟ آپ اس کی طرف سے جواب دیجیے۔

اس نے کہا: میں جواب دیتا ہوں کہ وہ کچھ جانتا ہے۔

میں نے کہا: یہ کچھ چیز موجود ہے یا موجود نہیں؟

اس نے کہا: موجود ہے۔ کیونکہ جو ہے ہی نہیں اس کا علم کس طرح ہو سکتا ہے؟

میں نے کہا: تو کیا اس مسئلے پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالنے کے بعد ہم کو یقین ہے کہ وجودِ مطلق کے متعلق تو علم ہے یا ہو سکتا ہے؛ لیکن جو چیز بالکل غیر موجود ہو یا معدوم ہو وہ بالکل غیر معلوم بھی ہوگی؟

اس نے کہا: اس سے زیادہ یقینی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔

میں نے کہا: بہت خوب لیکن اگر کوئی چیز ایسی ہو کہ ہو بھی، اور نہ بھی ہو تو اسے خالص وجود اور مطلق عدم وجود کے درمیان جگہ دی جائے گی۔

اس نے کہا: ہاں، ان کے بَین بَین۔

میں نے کہا: اور جس طرح علم کو وجود سے مطابقت تھی اور جہل لازماً عدمِ وجود سے وابستہ تھا، اسی طرح اس عدم و وجود کے درمیانی حالت کے لیے ایک کیفیت معلوم کرنی چاہیے جو علم اور جہل کے بَین بَین ہو بشرطیکہ ایسی چیز کہیں ہو بھی۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: کیا آپ ظن اور رائے کا وجود تسلیم کرتے ہیں؟

اس نے جواب دیا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: علم اور رائے ایک ہی چیز ہیں یا مختلف صلاحیتیں؟

اس نے کہا: مختلف صلاحیتیں۔

میں نے کہا: تو اس صلاحیت کے اختلاف کے مطابق علم اور رائے مختلف چیزوں سے بحث بھی کرتے ہوں گے؟

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: علم تو موجود سے متعلق ہے اور موجود کو جانتا ہے۔ لیکن ہاں آگے چلنے سے پہلے میں ایک تقسیم اور کروں گا۔

اس نے کہا: کیسی تقسیم؟

میں نے کہا: پہلے تو میں سب صلاحیتوں کو ایک گروہ میں رکھتا ہوں۔ صلاحیتیں ہماری اور دیگر اشیا کی وہ قوتیں ہیں جن کے باعث ہمارا عمل وہ ہوتا ہے جو کہ ہے۔ مثلاً باصرہ اور سامعہ کو میں صلاحیتیں کہوں گا۔ میں جس گروہ کا ذکر کر رہا ہوں اس کی غالباً کافی توضیح ہو گئی ہو گی؟

اس نے کہا: جی ہاں، میں سمجھ گیا۔

میں نے کہا: تو اب میں ان کے متعلق اپنا خیال ظاہر کروں۔ اُن کو چونکہ میں دیکھتا نہیں اس لیے رنگ، شکل وغیرہ کا اختلاف جو دوسری چیزوں میں باہم امتیاز کرا دیتا ہے وہ اُن پر عائد نہ ہو گا۔ میں جب صلاحیت کا ذکر کرتا ہوں تو اس کے حیطۂ اثر اور اس کے نتیجے کا خیال میرے ذہن میں ہوتا ہے۔ جن صلاحیتوں کا حیطۂ اثر اور نتیجہ ایک ہو انھیں میں ایک صلاحیت کہتا ہوں، جن کا حیطۂ عمل اور نتیجہ مختلف ہو انھیں مختلف صلاحیتیں۔ آپ بھی کیا اسی اُصول پر گفتگو کریں گے؟

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: کیا آپ مہربانی فرما کر ایک سوال کا اور جواب دیں گے؟ علم کو کیا آپ صلاحیت مانتے ہیں! یا اُسے کسی اور گروہ میں جگہ دیتے ہیں؟

اس نے کہا: بے شک، علم صلاحیت ہے، اور سب سے زبردست صلاحیت۔

میں نے کہا: اور رائے و قیاس بھی ایک صلاحیت ہے؟

اس نے کہا: بے شک، کیونکہ قیاس ہی وہ صلاحیت ہے جس سے ہم رائے قائم کرتے ہیں۔

میں نے کہا: اور ابھی تھوڑی دیر ہوئی آپ نے تسلیم کیا تھا کہ علم اور رائے ایک چیز نہیں۔

اس نے کہا: ہاں، تو کیا ہوا؟ کوئی معقول شخص ایک ایسی چیز کو جو غلطی اور خطا سے بری ہے اس چیز سے کیوں کر ملا سکتا ہے، جس میں غلطی اور خطا ہوتی ہے۔

میں نے کہا: آپ نے کیا خوب جواب دیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان دونوں کے فرق سے بخوبی آشنا ہیں۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: گویا علم اور قیاس کی جدا جدا قوتیں ہیں۔ ان کا میدان جدا ہے اور ان کا موضوع تحقیق جدا۔

اس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: علم کا موضوع یا میدانِ تحقیق وجود ہے، اور علم ماہیتِ وجود کے جاننے کا نام۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور قیاس گویا ایک رائے رکھنے کو کہتے ہیں۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: ہم جو قیاس کرتے ہیں کیا اُسے جانتے بھی ہیں؟ اور کیا قیاس اور علم کا موضوع ایک ہی ہے؟

اس نے کہا: نہیں، اس کے تو خلاف پہلے ہی ثابت ہو چکا ہے۔ صلاحیت کے اختلاف کے معنی ہیں حیطۂ اثر کا اور موضوع کا اختلاف اور اگر علم و قیاس مختلف صلاحیتیں ہیں تو پھر اُن کا میدانِ تحقیق ایک نہیں ہو سکتا۔

میں نے کہا: اگر علم کا موضوع وجود ہے تو قیاس کا اور کچھ ہونا چاہیے۔

اس نے کہا: جی ہاں، کچھ اور چاہیے۔

میں نے کہا: اچھا تو قیاس کا موضوع کیا غیر وجود ہے؟ مگر معدوم اور غیر موجود کے متعلق رائے کیسے قائم ہو سکتی ہے؟ ذرا سوچو۔ جب انسان رائے قائم کرتا ہے تو کسی چیز کے متعلق ہی تو قائم کرتا ہے یا ایسی رائے رکھنا بھی ممکن ہے جو کسی چیز سے متعلق نہ ہو۔

اس نے کہا: یہ تو ناممکن ہے۔

میں نے کہا: جو شخص رائے رکھتا ہے وہ کسی چیز کی بابت رکھتا ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور معدوم وغیر موجود چیز نہیں ہوتی۔

اس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: غیر موجود کا لازمی نصیب تو جہل تسلیم کیا گیا تھا اور وجود کا علم۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: تو گویا رائے موجود اور غیر موجود دونوں میں سے کسی سے تعلق نہیں رکھتی۔

اس نے کہا: جی ہاں، کسی سے نہیں۔

میں نے کہا: چنانچہ یہ نہ علم ہے، نہ جہل۔

اس نے کہا: یہ تو ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔

میں نے کہا: اس رائے کی تلاش کیا ان دونوں کے باہر اور ان سے پرے کرنی چاہیے یعنی علم سے زیادہ صفائی اور وضاحت میں یا جہل سے زیادہ تاریکی میں؟

اس نے کہا: دونوں میں سے کسی میں نہیں۔

میں نے کہا: میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے خیال میں رائے علم سے کچھ تاریک اور جہل سے کچھ روشن ہوتی ہے۔

اس نے کہا: جی، یہی دونوں صورتیں ہوتی ہیں اور کیسی کچھ تاریک اور کیسی کچھ روشن؟

میں نے کہا: ہاں، اور رائے علم اور جہل کی حدود کے اندر اور اُن کے بین بین ہی ہوتی ہے نا؟

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: گویا آپ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ قیاس اور رائے درمیانی چیز ہے۔

اس نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: تھوڑی ہی دیر ہوئی کہ ہم کہہ رہے تھے کہ اگر کوئی چیز ایسی ہو کہ ایک ہی وقت میں ہو بھی اور نہیں بھی ہو، تو وہ خالص وجود اور مطلق غیر موجود کے درمیان رکھی جائے گی اور اس کے مطابق صلاحیت نہ علم ہوگی نہ جہل بلکہ اُن کے بین بین ایک کیفیت۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اس بیچ کے فصل میں ہمیں ایک چیز معلوم ہوئی ہے جسے ہم رائے اور قیاس سے موسوم کرتے ہیں۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اب جس کا پتا لگانا ہے وہ وہ چیز ہے جو موجود اور غیر موجود دونوں کی ماہیت کی حامل ہو، اور جو نہ خالص وجود کہی جا سکے نہ محض غیر وجود۔ یہ نامعلوم لفظ جب معلوم ہو جائے گا تو یہی بجا طور پر رائے وقیاس کی صلاحیت کا موضوع قرار پائے گا۔ پھر سب موضوع اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق کر دیے جائیں گے، دونوں انتہائی موضوع انتہائی صلاحیتوں کے اور درمیانی موضوع درمیانی صلاحیت کے۔

اس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: جب یہ طے ہو چکا تو میں اب ان صاحبوں سے ایک سوال کروں گا جن کی رائے میں حُسن کا کوئی عین اور غیر متغیر تصور نہیں ہے جن کے نزدیک حُسن کثرت میں ہے؛ وہی، وہی آپ کے حسین نظاروں کے دلدادہ جنھیں اس امر کا اظہار گوارا نہیں کہ حُسن ایک وحدت ہے اور اسی طرح عدل وحدت ہے اور دوسری چیزیں بھی۔ میں ان حضرت کی خدمت میں گزارش کروں گا کہ ''جناب عالی۔ کیا آپ ازراہِ نوازش تمام حسین وجمیل چیزوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی بتا سکتے ہیں جو بھونڈی اور بدشکل بھی نہ معلوم ہوتی ہو، یا کوئی انصاف وعدل کی ایسی مثال جو غیر منصفانہ بھی نہ پائی جائے، یا کوئی ایسی مقدس چیز جو غیر مقدس بھی نہ ہو؟

اس نے کہا: نہیں، ہر حسین کسی نہ کسی پہلو سے ضرور بھونڈا اور بدشکل معلوم ہوگا، اور یہی حال دوسری چیزوں کا ہے۔

میں نے کہا: بہت سی چیزیں جو دُگنی ہیں کیا وہ آدھی بھی نہیں، یعنی اگر کسی کی دو چند ہیں تو کسی کی نصف؟

اس نے کہا: ہاں۔

میں نے کہا: جن چیزوں کو ہم بھاری یا ہلکا، بڑا یا چھوٹا کہتے ہیں کیا یہی بالکل اُلٹے نام سے نہیں پکاری جا سکتیں، یعنی بھاری کو ہلکا، بڑے کو چھوٹا، کہ یہ سب اختیاری لفظ ہیں۔

اس نے کہا: ہاں ہاں، دونوں نام عائد ہو سکتے ہیں۔

میں نے کہا: اور کیا ان بہت سی چیزوں کے متعلق جنھیں مخصوص ناموں سے پکارتے ہیں، کبھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہیں اور کبھی یہ کہ نہیں؟

اس نے کہا: یہ چیزیں تو ان پہیلیوں کی سی حیثیت رکھتی ہیں جنھیں لوگ دعوتوں کے موقعوں پر پوچھا کرتے ہیں یا بچوں کے اس معمے کی سی جس میں اسی خواجہ سرانے چمگادڑ کا نشانہ بنایا تھا۔ اس لیے تو پوچھتے ہیں کہ اس نے چمگادڑ کو کس چیز سے مارا اور چمگادڑ بیٹھا کس پر تھا۔ جن انفرادی چیزوں کا میں نے ذکر کیا وہ بھی معما ہیں اور دہرے معنی رکھتی ہیں۔ آپ انھیں اپنے ذہن میں نہ تو موجود کی حیثیت سے قائم کر سکتے ہیں نہ غیر موجود کی طرح، نہ یہی ہے کہ دونوں ہوں یا پھر ایک بھی نہ ہو۔

میں نے کہا: تو اب اُن کے ساتھ آپ کیا کریں گے؟ کیا وجود اور عدمِ وجود کی درمیانی جگہ سے کوئی اور بہتر جگہ اُن کے لیے نکل سکتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ غیر موجود و معدوم سے زیادہ تاریکی اور عدم میں تو نہیں ہیں اور نہ موجود سے زیادہ روشنی اور وجود میں۔

اس نے کہا: یہ تو بالکل صحیح ہے۔

میں نے کہا: تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہم نے یہ پتا لگایا کہ عوام حُسن اور دوسری چیزوں کے متعلق جو بہت سے خیالات و تصورات رکھتے ہیں وہ سب کے سب ایسی چیزوں کی بابت ہیں جو اس علاقے میں ماری ماری پھرتی ہیں جو خالص وجود اور بالکل غیر موجود کے درمیان واقع ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں، یہی پتا چلا۔

میں نے کہا: اور یہ ہم پہلے ہی طے کر چکے ہیں کہ اس قسم کی جس چیز کا بھی پتا چلے گا وہ قیاس کا موضوع قرار پائے گی نہ کہ علم کا یعنی یہ وہ درمیانی برزخ ہے جو بیچ والی صلاحیت کی گرفت میں آتا ہے اور رہتا ہے۔

گلوکون نے کہا: بالکل بجا۔

میں نے کہا: تو پھر جو لوگ بہت سی حسین اور جمیل چیزیں تو دیکھتے ہیں پھر بھی نہ تو حُسنِ مطلق کا نظارہ انھیں نصیب ہے، نہ وہ کسی ایسے راہبر کی پیروی ہی کرتے ہیں جو اُس کی راہ بتا سکے؛ یا وہ لوگ جو کثرت سے عادل تو دیکھتے ہیں لیکن عدلِ مطلق کو نہیں دیکھتے یا اُن جیسے اور لوگ، ان سب کو قیاس اور رائے والا کہا جا سکتا

بے علم والا نہیں۔

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: لیکن جو حقیقتِ مطلق کا نظارہ کرتے ہیں جو ابدی اور غیر متبدل ہے، وہ علم کے حامل ہوتے ہیں؛ یہ نری رائے ہی رائے نہیں رکھتے۔

گلوکون نے کہا: اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے؟

میں نے کہا: ایک گروہ تو علم کے موضوع سے محبت کرتا اور اُسے سینہ سے لگاتا ہے، دوسرا گروہ قیاس کے موضوع سے۔ یہ دوسرا گروہ ان ہی لوگوں کا ہے جو سامعہ نواز ترانے سُنتے اور نظر فریب نظارے دیکھتے تھے لیکن حُسنِ مطلق کا وجود انھیں گوارا نہ تھا۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں، وہ مجھے یاد ہے۔

میں نے کہا: تو اگر انھیں بجائے شیفتگانِ معرفت کے محبانِ قیاس ورائے کہیں تو کیا کچھ بے جا ہوگا؟ اور کیا واقعی اس پر یہ ہم سے بہت ناخوش ہو جائیں گے؟

گلوکون نے کہا: نہیں نہیں، میں سمجھا دوں گا انھیں کہ خفا نہ ہوں۔ حق بات پر تو کسی کو ناخوش نہیں ہونا چاہیے۔

میں نے کہا: اس کے برعکس جو لوگ ہر شے میں حقیقت کے دلدادہ ہیں انھیں محبانِ معرفت وحکمت کہا جائے گا نہ کہ شیدائیانِ قیاس ورائے۔

گلوکون نے کہا: یقیناً

☆☆☆

چھٹی کتاب

میں نے کہا: گلوکون! اس قدر طول طویل دلیل اور بحث کے بعد آخر کو سچے اور جھوٹے فلسفیوں کی حقیقت ظاہر ہو گئی۔

اس نے جواب دیا: میں تو سمجھتا ہوں کہ بحث میں اختصار ممکن ہی نہ تھا۔

میں نے کہا: ہاں غالباً نہیں تھا۔ لیکن بحث اگر اسی ایک موضوع تک محدود رہتی اور دوسرے سوال منتظر تحقیق نہ ہوتے، جن پر غور اور نظر اس شخص کے لیے از بس ضروری ہے جو عدل اور ناانصافی کی زندگی میں وجہ امتیاز معلوم کرنا چاہتا ہے، تو میرا یقین ہے کہ ہم فلسفیوں کی ان دو اقسام کا بہتر نظارہ کر سکتے۔

اس نے کہا: تو اب اس کے بعد دوسرا مسئلہ کیا ہے؟

میں نے کہا: یقیناً وہی سوال جو ترتیب سے اس کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ یعنی چونکہ فلسفی ہی ابدی اور غیر متبدل حقیقت کو پا سکتے ہیں اور جو لوگ کثرت اور تغیر کے میدان میں دشت پیمائی کرتے ہیں وہ فلسفی نہیں، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے کون سا گروہ ہماری ریاست کا حکمران ہو؟

اس نے پوچھا: اس سوال کا صحیح جواب کس طرح دیا جائے؟

میں نے جواب دیا: یوں کہ ان میں سے جو گروہ بھی ہمارے قوانین اور اداروں کی بہتر حفاظت کر سکے بس اسی کو ہم اپنا محافظ بنائیں۔

اس نے کہا: بہت خوب۔

میں نے کہا: اس میں بھی کلام نہیں کہ جس محافظ کو کوئی چیز قائم و برقرار رکھنی ہو اس کی آنکھیں ہونی چاہئیں، یہ نہیں کہ اندھا ہو۔

اس نے کہا: اس میں کیا کلام ہے۔

میں نے کہا: اور کیا وہ لوگ جو ہر چیز کے حقیقی وجود کے علم سے محروم ہیں، جن کی روح میں کوئی

صاف نمونہ موجود نہیں، جو اس قابل نہیں کہ مصور کی سی آنکھ سے حقیقت مطلق کو دیکھ سکیں اور پھر اسی اصل کی طرف رجوع کریں، اور دوسری دنیا کا کامل مشاہدہ کر کے اس عالم میں حسن اور نیکی اور عدل کے متعلق قانون نافذ کر سکیں (بشرطیکہ پہلے سے ان قوانین کا نفاذ نہ ہو چکا ہو) اور پھر ان کی ترتیب اور نظام کو برقرار اور محفوظ رکھ سکیں۔ جن لوگوں میں یہ کوئی بات موجود نہ ہو کیا وہ اندھے نہیں؟

اس نے کہا: سچ ہے۔ وہ تو کچھ ایسے ہی حال میں ہیں۔

میں نے کہا: پھر کیا یہ لوگ ایسی حالت میں ہمارے محافظ ہو سکتے ہیں جب کہ دوسرے ایسے لوگ موجود ہوں جو تجربے میں ان کے ہم پلہ اور کسی خاص خوبی میں ان سے کم نہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہر چیز کی اصل حقیقت کا علم بھی رکھتے ہیں۔

گلوکون نے کہا: کوئی وجہ نہیں کہ جن لوگوں میں یہ بہترین صفت موجود ہو انھیں مسترد کیا جائے۔ انھی کو ہمیشہ تقدم حاصل ہونا چاہیے بشرطیکہ یہ کسی دوسری حیثیت سے کم نہ ہوں۔

میں نے کہا: اچھا تو اب یہ معلوم کریں کہ یہ لوگ اس خوبی کے ساتھ دوسری خوبیوں کو کہاں تک یکجا کر سکتے ہیں۔

اس نے کہا: ضرور۔

میں نے کہا: جیسا کہ ہم شروع میں کہہ چکے ہیں سب سے پہلے تو فلسفی کی ماہیت دریافت کرنی چاہیے۔ اس کے متعلق پہلے ایک سمجھوتا ہو جائے۔ جب یہ ہو گیا تو غالباً (اگر میں غلطی پر نہ ہوں) ہم یہ بھی تسلیم کر لیں گے کہ خوبیوں کی یہ یکجائی ممکن ہے اور صرف وہی لوگ ریاست کے حاکم ہو سکتے ہیں جن میں یہ خوبیاں متحد اور یکجا ہوں۔

گلوکون نے کہا: آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں نے کہا: فرض کیجیے کہ فلسفیانہ دماغ ہمیشہ ایسے علم سے انس رکھیں گے جو انھیں اشیا کی اس ازلی ماہیت سے آگاہ کرے جو کون و فساد سے متغیر نہ ہو۔

گلوکون نے کہا: طے ہے۔

میں نے کہا: یہ بھی فرض کیجیے کہ وہ کُل کے کُل وجودِ حقیقی سے محبت کرتے ہیں اور کوئی حصہ بڑا ہو یا چھوٹا، کم قابل عزت ہو یا زیادہ، وہ اسے ترک کرنے کے لیے راضی نہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے عاشق اور حریص

انسان کے متعلق کہہ چکے ہیں۔

گلوکون نے کہا: درست۔

میں نے کہا: اور اگر ان لوگوں کی یہی حالت ہے جو ہم نے بیان کی تو کیا ان میں ایک اور صفت بھی نہیں ہوگی؟

گلوکون نے کہا: وہ کیا صفت؟

میں نے کہا: صداقت۔ یہ لوگ کبھی اپنے ذہن میں جان بوجھ کر جھوٹ اور کذب کو جگہ نہ دیں گے۔ جھوٹ سے تو یہ سخت متنفر ہوں گے اور صداقت کے دلدادہ۔

اس نے کہا: جی ہاں، ان کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔

میں نے کہا: کیا جا سکتا ہے، نہیں بلکہ کہیے کہ "کیا جانا چاہیے" کیونکہ جس طبیعت میں کسی چیز کی محبت ہے وہ اپنے محبوب کے متعلقات اور ملتی جلتی چیزوں سے محبت کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس نے کہا: بجا۔

میں نے کہا: کیا کوئی اور چیز علم وحکمت سے اس درجہ ملتی جلتی ہے، جتنی کہ صداقت؟

اس نے کہا: اور کون سی چیز ہو سکتی ہے۔

میں نے کہا: کیا ایک ہی طبیعت علم اور حکمت کی عاشق بھی ہو سکتی ہے اور جھوٹ اور کذب کی بھی؟

اس نے کہا: کبھی نہیں۔

میں نے کہا: سچے محبِ علم کو تو شروع عمر ہی سے جہاں تک ہو سکے سارے حق وصداقت کی آرزو ہونی چاہیے۔

اس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: اس کے علاوہ ہم تجربے سے جانتے ہیں کہ کسی شخص کی خواہشیں ایک طرف قوی ہوتی ہیں تو دوسری جانب کمزور ہو جاتی ہیں۔ اس کی مثال ایک دریا کی سی ہے جس کا پانی ایک طرف نہر سے نکال لیا گیا ہو۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: چنانچہ جس شخص کی تمام خواہشیں بس جملہ انواعِ علم کی طرف منعطف ہوں تو وہ

روحانی لذتوں میں محو ہو جائے گا اور جسمانی لذتوں کو مشکل سے محسوس کرے گا۔ لیکن میرا مطلب حقیقی فلسفی سے ہے یوں ہی کسی ایسے ویسے سے نہیں۔

گلوکون نے کہا: یہ تو یقینی امر ہے۔

میں نے کہا: ایسا آدمی یقیناً معتدل مزاج اور باعفت ہوگا اور لالچی کی ضد کیونکہ اس کی طبیعت میں ان محرکوں کی جگہ ہی نہیں ہوگی جو اوروں کو پانے اور صرف کرنے کا آرزومند بناتے ہیں۔

گلوکون نے کہا: درست۔

میں نے کہا: اس کے علاوہ فلسفیانہ طبیعت کا ایک اور معیار بھی توجہ کے لائق ہے۔

گلوکون نے کہا: وہ کیا؟

میں نے کہا: یعنی اس میں دنائت اور بے مروتی کے لیے کوئی چھپا ہوا کونا نہ ہو۔ جو طبیعت کہ الٰہی اور انسانی اشیا کی کلیت کی آرزو رکھتی ہو اس کے لیے کم ظرفی اور کمینے پن سے زیادہ کوئی چیز مخالف نہیں ہوسکتی۔

گلوکون نے کہا: بالکل بجا۔

میں نے کہا: تو جس شخص میں ذہنی بلندی اور عظمت ہو، اور جو کُل زمانہ اور کُل وجود کا ناظر ہو، وہ انسانی زندگی کو بہت اہمیت کیسے دے سکتا ہے۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں، نہیں دے سکتا۔

میں نے کہا: اور کیا ایسے آدمی کو موت کا خوف ہوسکتا ہے؟

گلوکون نے کہا: ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: اور کیا یہ شخص، جس کی طبیعت کی ترکیب نہایت متناسب ہوئی ہے، جو نہ لالچی ہے نہ کم ظرف، شیخی خور ہے نہ بزدل، میں پوچھتا ہوں کیا یہ شخص کبھی اپنے معاملات میں غیر منصف اور متشدد ہوسکتا ہے؟

گلوکون نے کہا: ناممکن۔

میں نے کہا: تو پھر تم آسانی سے دیکھ سکتے ہو کہ آیا ایک شخص منصف مزاج اور شریف ہے یا اکھڑ اور وحشی۔ یہ وہ علامتیں ہیں جو کمسنی ہی میں فلسفیانہ اور غیر فلسفیانہ طبیعتوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کر دیتی ہیں۔

گلوکون نے کہا: درست۔

میں نے کہا: ایک اور بات بھی ہے جس پر نظر کر لینی چاہیے۔

گلوکون نے کہا: وہ کیا؟

میں نے کہا: وہ یہ کہ آیا سیکھنے (تحصیل علم) سے اسے کچھ لذت اور حظ حاصل ہوتا ہے یا نہیں۔ کیونکہ کوئی آدمی ایسی چیز سے محبت نہیں کرتا جو اسے دکھ پہنچاتی ہو یا جس میں بہت سی محنت کے بعد وہ تھوڑی سی ترقی کرتا ہو۔

گلوکون نے کہا: یقیناً نہیں۔

میں نے کہا: یا اگر وہ بھول جاتا ہے اور جو کچھ سیکھتا ہے اسے محفوظ نہیں رکھ سکتا تو بس یہ ظرف تو خالی کا خالی رہے گا۔

اس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: اس سعی لاحاصل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بالآخر خود اپنی ذات اور اپنے فضول شغل دونوں سے نفرت کرنے لگے گا۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: چنانچہ جس روح میں بھول ہو وہ حقیقی فلسفیانہ طبیعتوں میں شمار نہیں کی جا سکتی، ہمیں اس بات پر اصرار کرنا چاہیے کہ فلسفیوں کا حافظہ اچھا ہو۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: تم نے پھر دیکھا کہ ناہموار اور بھدی طبیعت کا جھکاؤ عدم تناسب کی طرف ہے۔

گلوکون نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: اور تم صداقت کو تناسب سے متعلق سمجھتے ہو یا عدم تناسب سے؟

گلوکون نے کہا: تناسب سے۔

میں نے کہا: تو علاوہ دوسری صفتوں کے، ہمیں ایسے دماغ کی تلاش کرنی چاہیے جو اپنے اندر فطرتاً حسن تناسب اور شرافت رکھتا ہو اور خود بخود تمام اشیا کے وجود حقیقی کی طرف حرکت کرے۔

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: کیا یہ تمام صفات جنھیں ہم ایک ایک کر کے گنوا رہے ہیں یکجا نہیں ہوتیں اور ایسی روح

کے لیے جو وجود میں تمام و کمال شرکت کرے یہ سب گویا ایک طرح لازمی نہیں۔

گلوکون نے کہا: قطعاً لازمی ہیں۔

میں نے کہا: تو اس علم پر کون حرف رکھ سکتا ہے جس کا اکتساب بس وہ شخص کرے جو ذکی الفہم ہو اور اچھا حافظہ رکھتا ہو، شریف ہو اور شفیق اور صداقت اور انصاف جرأت و اعتدال کو دوست رکھتا ہو کہ یہ اس کے مجانس ہیں۔

گلوکون نے کہا: اس علم میں تو رشک کا دیوتا تک کوئی برائی نہیں نکال سکتا۔

میں نے کہا: چنانچہ ایسوں کو اور صرف ایسے افراد کو ہم اپنی ریاست سپرد کریں گے جب عمر اور تعلیم سے ان کی تکمیل ہو جائے۔ یہاں ایڈیمنٹس نے بات کاٹی اور کہنے لگے۔ ''جناب سقراط! آپ کے ان دعووں کا تو کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ لیکن جب آپ اس طرح گفتگو کرتے ہیں تو آپ کے سننے والوں کے ذہن میں ایک عجیب احساس پیدا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دلیل کے ہر قدم پر وہ حقیقت سے تھوڑا سا ہٹ جاتے ہیں اور یہ اس لیے کہ انھیں سوال پوچھنے اور ان کا جواب دینے میں کافی مہارت نہیں ہے۔ یہ تھوڑا تھوڑا مل کر بہت ہو جاتا ہے اور جب بحث ختم ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھیں سخت شکست ہوئی۔ اور بظاہر ان کے تمام پہلے والے خیالات بالکل الٹ جاتے ہیں۔ جس طرح شطرنج میں ایک ماہر کھلاڑی اپنے غیر ماہر حریف کے تمام گھر بند کر دیتا ہے اور وہ کوئی چال نہیں چل سکتا۔ اسی طرح یہ بیچارے محسوس کرتے ہیں کہ بالآخر گھِر گئے۔ چونکہ اس نئے کھیل میں جس کے مہرے لفظ ہیں ان کے پاس کوئی چال باقی نہیں رہی، لیکن باوجود اس کے دراصل وہی حق پر ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے جو ہو رہا ہے اس سے مجھے یہ خیال پیدا ہوا۔ کیونکہ ہم میں سے ہر ایک یہ کہہ سکتا ہے کہ باوجودیکہ وہ دلیل کی ہر منزل پر لفظوں سے آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتا، تاہم وہ اس بات کو بطور واقعہ کے دیکھتا ہے کہ فلسفے کے وہ دلدادہ جو اس کا مطالعہ صرف جوانی ہی میں تعلیم کے ایک جزو کے طور پر ہی نہیں بلکہ اپنی آخری عمر کے شغل کے طور پر بھی جاری رکھتے ہیں، ان میں سے اکثر اگر مطلق بدمعاش نہیں تو کچھ عجیب مسخ سے ضرور ہو جاتے ہیں۔ اور ان میں سے بہترین لوگ اسی مطالعے کے باعث جس کی آپ اس قدر تعریف کر رہے ہیں دنیا کے لیے بےکار ہو جاتے ہیں۔

میں نے کہا: اچھا تو جو لوگ یہ کہتے ہیں کیا وہ آپ کے خیال میں غلط کہتے ہیں؟

ایڈیمنٹس نے جواب دیا: میں تمھیں کہہ سکتا ہوں، البتہ میں آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے کہا: تو لیجیے میرا جواب سنیے۔ میری رائے ہے کہ یہ لوگ بالکل سچ کہتے ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جب ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ لوگ شہر کے لیے مفید نہیں تو پھر آپ یہ کس طرح فرماتے ہیں کہ شہر اس وقت تک برائی سے پاک نہیں ہوں گے جب تک فلسفی ان میں حکومت نہ کریں۔

میں نے کہا: آپ نے ایسا سوال کیا ہے جس کا جواب صرف ایک تمثیل سے دیا جا سکتا ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس طریق کلام کے سرے سے عادی نہیں!

میں نے کہا: ہاں، میں دیکھ رہا ہوں کہ مجھے اس مشکل بحث میں ڈال کر آپ بڑا مزہ لے رہے ہیں۔ لیکن اب میری تمثیل سنیے، اس کے بعد میرے تخیل کی تنگی سے آپ اور بھی محظوظ ہوں گے۔ کیونکہ بہترین آدمیوں کے ساتھ ان کی ریاستوں میں جس طرح سلوک ہوتا ہے وہ اس درجہ رنج دہ ہے کہ دنیا میں کوئی اور چیز اس کے مقابلے میں پیش نہیں کی جا سکتی اور اس لیے اگر میں ان کی طرف سے وکالت کروں تو مجھے افسانے کا سہارا لینا ہوگا اور بہت سی چیزیں ملا کر ایک شکل کھڑی کرنی ہوگی، جیسے بکروں اور بارہ سنگھوں کی خیالی ترکیب تصویروں میں ملتی ہے۔ اچھا تو ایک بحری بیڑے یا ایک جہاز کا تصور کیجیے جس کا کپتان دوسرے ملاحوں سے مضبوط اور زیادہ قد آور ہے لیکن ذرا اونچا سنتا ہے، اس کی بصارت بھی ذرا کمزور ہے اور فن جہاز رانی میں بھی اس کا علم دوسروں سے کچھ زیادہ بہتر نہیں۔ ملاح ناخدائی کے بارے میں ایک دوسرے سے لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ ہر شخص کی رائے ہے کہ اسے ناخدائی کا حق ہے اگرچہ اس نے کبھی جہاز رانی کا فن نہیں سیکھا اور یہ تک نہیں بتا سکتا کہ کب اور کس نے اسے یہ فن سکھایا بلکہ وہ ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے یعنی دعویٰ کرتا ہے کہ یہ فن سکھایا ہی نہیں جا سکتا۔ اگر کوئی شخص اس کے خلاف کچھ کہے تو یہ لوگ اسے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر تیار ہیں۔ یہ سب کے سب کپتان کے گرد جمع ہوتے ہیں اور التجا کرتے ہیں کہ پتوار ان کے سپرد کر دیا جائے اور اگر کبھی ایسا ہو کہ ان کی بات نہ مانی جائے اور دوسروں کو ان پر ترجیح دی جائے تو یہ ان دوسروں کو مار کر جہاز سے پھینک دیتے، اور پہلے شریف کپتان کے حواس کو شراب یا کسی نشے والی دوا سے مجبوس کر کے یہ لوگ بغاوت کا جھنڈا بلند کرتے ہیں اور جہاز پر قبضہ کر کے سب ذخیروں کو خوب اللے تللے سے اڑاتے ہیں۔ اور اسی طرح کھاتے اڑاتے اپنے سفر کو بس اسی طرح جاری رکھتے ہیں۔ جیسا کہ ایسے لوگوں سے توقع ہو سکتی ہے۔ جو کوئی ان کا شریک ہے اور چالاکی سے ان کی اس سازش

میں مدد دیتا ہے، کہ یہ جبر یا ترغیب سے جہاز کو کپتان کے ہاتھ سے نکال کر اپنے قابو میں لے آئیں، اسے یہ ملاح، ناخدا، قابل جہاز راں کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگوں کو برا بھلا کہتے اور بے کار اور نکما بتاتے ہیں۔ لیکن ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی کہ حقیقی ناخدا کے لیے (اگر وہ دراصل جہاز پر حکومت کے قابل ہونا چاہے) ضروری ہے کہ موسم، وقت، آسمان کی کیفیت، ستاروں، ہواؤں اور اپنے فن کی دیگر متعلقات کی طرف توجہ کرے، اور خواہ دوسرے لوگ اسے پسند کریں یا نہ کریں اسی کو جہاز کا ناخدا ہونا چاہیے اور وہی ہوگا۔ الغرض اختیار اور ناخدائی کے فن کا یہ اتحاد کبھی ان لوگوں کے خیال میں اچھی طرح داخل نہیں ہوا۔ اب تم ہی سوچو کہ ایک ایسے جہاز میں جو بغاوت کی حالت میں ہے، باغی ملاح سچے ناخدا کو کس نظر سے دیکھیں گے۔ کیا یہ سب اسے خواہ مخواہ بکواس کرنے والا، خیالی پلاؤ پکانے والا اور بے کار اور نکما نہیں کہیں گے؟

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: غالباً اب آپ کو اس تشبیہ کی مزید تشریح کی ضرورت نہیں ہوگی کہ یہ ریاست اور سچے فلسفی کا تعلق بیان کرتی ہے، آپ نے شاید اسے ابھی سے سمجھ لیا ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اچھا تو اب آپ اس تمثیل کو ان صاحبوں کے پاس لے جائیے جو اس بات پر متعجب تھے کہ شہروں میں فلسفیوں کی کوئی عزت نہیں۔ انھیں یہ اچھی طرح سمجھا دیجیے اور باور کرانے کی کوشش کیجیے کہ ان لوگوں کا شہروں میں معزز ہونا زیادہ معمول کے خلاف اور تعجب خیز ہوتا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میں ضرور ایسا کروں گا۔

میں نے کہا: ان سے کہیے کہ فلسفے کے دلدادہ لوگوں کو باقی دنیا کے لیے بے کار سمجھنے میں وہ صحیح ہیں، لیکن انھیں یہ بھی بتا دیجیے کہ ان کی بے کاری کو ان لوگوں کی غلطی سے منسوب کرنا چاہیے جو ان سے فائدہ نہیں اٹھاتے نہ کہ خود ان کی ذات سے۔ ناخدا کو یہ تھوڑی ہی چاہیے کہ ملاحوں سے بہ عجز التجا کرے کہ وہ اس کا حکم مانیں۔ یہ نظام فطرت نہیں۔ نہ یہ ہو سکتا ہے کہ ”عاقل و دانا لوگ دولت مندوں کے در پر جائیں“۔ اس مقولے کے چالاک مصنف نے ایک جھوٹی بات کہی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب آدمی بیمار ہوتا ہے تو چاہے غریب ہو چاہے امیر، اسے طبیب کے پاس جانا ہوتا ہے، اس طرح جو اپنے اوپر حکومت کرانا چاہتا ہے

اسے ایسے شخص کے پاس جانا ہوگا جو حکومت کرنے کا قابل ہے۔ جس حاکم میں کچھ بھی خوبی ہے اسے ہرگز اپنی رعایا سے التجا نہیں کرنی چاہیے کہ میرے محکوم بنو، اگرچہ نوعِ انسانی کے موجودہ حکمران ذرا دوسری قسم کے ہیں۔ ان کی مثال تو باغی ملاحوں کی سی ہے اور سچے ناخدا کی مثال ان کی سی، جنھیں یہ باغی بے کار اور نکما اور خیالی پلاؤ پکانے والا کہتے ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بالکل سچ ہے۔

میں نے کہا: اس قسم کے لوگوں میں، ان وجوہ سے جن کا ذکر ہو چکا، یہ قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ گروہ مخالف فلسفے کی، کہ اشرف ترین مشاغل ہے، کچھ زیادہ عزت کرے اور یہ بھی درست نہیں کہ اس علم کو اپنے مخالفین سے ہی شدید ترین اور پائیدار نقصان پہنچتا ہے بلکہ خود اپنے نام نہاد پیروؤں سے، اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق آپ کے فرضی مستغیث نے کہا تھا کہ ان میں سے اکثر، بر خود غلط بدمعاش، اور ان کے بہترین، بیکار اور نکمے ہوتے ہیں۔ اور اس رائے سے میں نے اتفاق کیا تھا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: ان میں سے جو اچھے ہوتے ہیں ان کے بیکار ہونے کی وجہ تو ظاہر ہوگئی۔

ایڈیمنٹس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: اب کیا ہم بتائیں کہ اس گروہ میں سے اکثر کا خراب ہونا بھی ناگزیر ہے، اور یہ کہ جو صورت اوپر گزر چکی اس کی طرح اسے بھی فلسفے کے جرائم میں نہیں شامل کرنا چاہیے؟

ایڈیمنٹس نے کہا: ضرور فرمائیے۔

میں نے کہا: اچھا تو باری باری سوال اور جواب کریں، اور سب سے پہلے نرم اور شریف طبیعت کے بیان کی طرف ذرا پھر لوٹیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ صداقت اس کی رہنما تھی جس کی پیروی وہ ہمیشہ اور ہر چیز میں کرتا تھا، کہ اگر یہ نہیں تو وہ کذاب ہے اور حقیقی فلسفے میں اس کا نہ کوئی دخل ہے نہ کوئی حصہ۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔ یہ بات تو ہو چکی ہے۔

میں نے کہا: دوسری صفات کا تو ذکر ہی کیا، کیا فلسفی کا جو موجودہ تخیل ہے اس سے خود یہی صفت بالکل بعید نہیں ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: اور کیا ہم اس کی وکالت میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ علم کا سچا عاشق ہمیشہ حقیقی وجود کی تلاش میں کوشاں رہتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ تو اس کی فطرت ہے۔ افراد کی اس کثرت میں جو صرف ظاہری ہے اسے نہ چین پڑے گا، بلکہ اپنی آرزو کی تیز دھار کو کند کیے بغیر اور اپنی خواہش کی قوت میں کمی کیے بنا وہ برابر بڑھتا چلے گا حتیٰ کہ اپنی روح کی مماثل اور ہمدردانہ قوت سے ہر اصلیت کی حقیقی ماہیت کا علم حاصل کر لے۔ اور اس قوت کے ذریعے حقیقی وجود سے قرب و اختلاط پیدا کرے اور آخر کو اس میں مل جائے۔ جب اس طرح ذہن اور صداقت پیدا ہو جائیں تو اسے علم حاصل ہوگا اور اب یہ صحیح معنوں میں زندگی گزارے گا اور نشو و نما پائے گا۔ کہیں اس وقت جا کر اس کی تکلیف وہ محنت ختم ہوگی، اس سے پہلے نہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: اس توضیح سے زیادہ صحیح اس کا کوئی بیان نہیں ہو سکتا۔

میں نے کہا: اور کیا کسی بھی جھوٹ کی محبت فلسفی کی طبیعت کا جزو ہوگی؟ کیا وہ جھوٹ سے مطلقاً نفرت نہیں کرے گا؟

ایڈیمنٹس نے کہا: ضرور کرے گا۔

میں نے کہا: اور جب صداقت رہنما اور سردار ہو تو جس گروہ کی یہ قائد ہے اس پر ہم کسی برائی کا شبہ نہیں کر سکتے؟

ایڈیمنٹس نے کہا: ناممکن۔

میں نے کہا: عدل اور ذہنی صحت مندی ان کے ہمراہ ہوں گے اور عفت اور پرہیزگاری پیچھے پیچھے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: اب غالباً اس کی ضرورت نہیں کہ میں پھر فلسفی کے تمام محاسن کو سامنے لاؤں، آپ کو یقیناً یاد ہوگا کہ جرأت، فراخ دلی، ذکاوت، حافظہ، اس کی فطری صفات ہیں۔ اس پر آپ نے اعتراض کیا تھا کہ اگرچہ میرے اس قول سے انکار ممکن نہیں، پھر بھی اگر لفظوں کو چھوڑ کر واقعات پر نظر کی جائے تو جن لوگوں کا یوں ذکر ہو رہا تھا ان میں سے بعض بین طور پر بے کار اور اکثر قطعی بدمعاش ہوتے ہیں۔ اس پر ہم نے ان الزامات کی وجوہات دریافت کیں، اور اب اس سوال پر پہنچے تھے کہ یہ اکثریت کیوں خراب ہوتی ہے اور اس سوال نے ضرورتاً ہمیں سچے فلسفی کی تعریف اور تحقیق کی طرف پھیرا تھا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بالکل بجا۔

میں نے کہا: اب اس کے بعد ہمیں فلسفیانہ طبیعتوں کی خرابی پر غور کرنا ہے کہ اتنی بہت سی کیوں خراب ہو جاتی ہیں اور کیوں اتنی کم بگڑنے سے بچتی ہیں۔ میں ان کا ذکر کر رہا ہوں جنھیں بے کار کہا گیا ہے، شریر نہیں۔ جب ہم ان سے نمٹ چکیں گے تو پھر فلسفے کے نقالوں کا ذکر کریں گے، کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں جو اس پیشے کے متمنی ہیں جو ان سے بالاتر ہے اور جس کے وہ اہل نہیں، اور جو اپنے گوناگوں نفسی تناقض و تضاد کے باعث فلسفے پر اور تمام فلسفیوں پر وہ عالمگیر ملامت عائد کراتے ہیں جو ہماری گفتگو کا موضوع ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یہ خرابیاں کیا ہیں؟

میں نے کہا: دیکھیے میں اس کی توضیح کی کوشش کرتا ہوں، معلوم نہیں بن پڑے یا نہیں۔ کیوں، اس بات کو تو ہر شخص تسلیم کرے گا کہ ایک ایسی طبیعت جس میں وہ تمام صفات بدرجۂ کمال موجود ہوں جو ہم فلسفی میں طلب کرتے ہیں انسانوں میں ایک کم یاب پودے کی طرح شاذ و نادر دکھائی دیتی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک۔ بہت کم یاب۔

میں نے کہا: اور کتنے بے شمار اور زبردست اسباب ہیں جو ان کم یاب طبیعتوں کو بھی برباد کر دیتے ہیں؟

ایڈیمنٹس نے کہا: کون سے اسباب؟

میں نے کہا: سب سے پہلے خود ان کے محاسن ہیں، یعنی ان کی جرأت، ان کی عفت اور اعتدال وغیرہ کی ان میں سے ہر ایک قابل قدر صفت ہے (اور یہ ایک عجیب معاملہ ہے) اس روح کو جو ان کی حامل ہے تباہ اور فلسفے سے مغایر کرتی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یہ تو طرفہ ماجرا ہے!

میں نے کہا: پھر ان کے بعد زندگی کی معمولی خوبیاں ہیں مثلاً حسن، دولت، قوت، مرتبہ، ریاست میں اعلیٰ تعلقات۔ آپ ان چیزوں کو سمجھتے ہوں گے تو یہ سب بھی خرابی اور بگاڑ کا اثر رکھتی ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میں سمجھا۔ لیکن میں ذرا ٹھیک ٹھیک معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کا ان کے متعلق کیا مطلب ہے۔

میں نے کہا: ذرا صحیح طریقے سے پوری حقیقت سمجھنے کی کوشش کرو تو پھر ان پچھلی باتوں کے سمجھنے میں

دشواری نہیں ہوگی۔ اور پھر یہ تمھیں عجیب بھی معلوم نہیں ہوں گی۔

ایڈیمنٹس نے کہا: لیکن میں آخر یہ کیسے کروں؟

میں نے کہا: کیوں؟ اس میں کیا ہے؟ ہم سب جانتے ہیں کہ تمام جراثیم یا بیج خواہ نباتی ہوں خواہ حیوانی جب انھیں صحیح غذا، یا آب وہوا، یا زمین نہیں ملتی تو اس وقت یہ جتنے قوی ہوتے ہیں اسی قدر اپنے ماحول کی ناموافقت کا اثر لیتے ہیں۔ کیونکہ جو چیزیں اچھی نہیں ہیں ان کے مقابلے میں برائی ان کی زیادہ دشمن ہے جو اچھی ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بہت صحیح۔

میں نے کہا: یہ فرض کرنے کے وجوہ ہیں کہ ناموافق حالات میں بہترین طبیعتوں کو بہ نسبت ادنیٰ طبیعت کے زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔ کیونکہ تضاد زیادہ ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: اور ایڈیمنٹس کیا ہم اسی طرح یہ نہیں کہہ سکتے کہ اگر تعلیم خراب ہو تو بہترین دماغ ہی ان سے سب سے زیادہ بگڑتے ہیں۔ اور کیا خالص شر کے جذبے اور بڑے بڑے جرائم کا سرچشمہ وہ نشو یافتہ طبیعتیں نہیں ہوتیں جنھیں تعلیم نے برباد کردیا ہے نہ کہ کم درجہ اور ادنیٰ طبیعتیں۔ برخلاف اس کے کمزور طبیعتوں میں نہ کسی بڑی اچھائی کی صلاحیت ہوتی ہے نہ کسی بڑی برائی کی۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ہاں، میرا خیال ہے کہ آپ بجا فرماتے ہیں۔

میں نے کہا: اور ہمارے فلسفی کی مثال بھی بس ایسی ہی ہے۔ وہ ایک پودے کی طرح ہے کہ اگر اس کی صحیح پرورش ہو تو وہ ضرور بڑھے اور اس میں تمام خوبیاں پیدا ہوں۔ لیکن اگر ناموافق زمین میں اس کا بیج بویا اور اسی میں اسے نصب کیا جائے تو وہی سب جھاڑیوں سے زیادہ مضرت رساں ثابت ہوتا ہے۔ الا یہ کہ کوئی الٰہی طاقت اسے محفوظ و برقرار رکھے۔ جیسا کہ اکثر لوگ کہتے ہیں، کیا آپ کا بھی واقعی یہ خیال ہے کہ سوفسطائی گروہ ہمارے نوجوانوں کی تخریب کا باعث ہے یا فنون کے خانگی اساتذہ کا اس میں معتدبہ اور قابل ذکر حصہ ہے؟ اور کیا سب سے بڑا سوفسطائی گروہ خود وہ عام جمہور نہیں جو یہ باتیں کہتے ہیں؟ کیا یہی نہیں ہیں جو ہر جوان اور بوڑھے، مرد اور عورت سب کو پورے طور پر تعلیم دیتے ہیں اور اپنی مرضی کے مطابق تربیت کرتے ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: اور یہ سب کچھ آخر کب؟

میں نے کہا: جب یہ باہم ملتے ہیں، یا مجلسوں میں ساری مخلوق جمع ہوتی ہے، یا عدالتوں، تماشا گاہوں، لشکروں اور دوسری عام ملاقات کی جگہوں پر ہجوم ہوتا ہے، سب کے سب شور و غوغا مچاتے ہیں، کسی چیز کی جو وہاں کہی یا کی جارہی ہو تعریف کرتے اور کسی کی مذمت کرتے ہیں، اور لطف یہ کہ چیخ چلا کر اور تالیاں بجا بجا کر دونوں حالتوں میں یکساں مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ خود جلسہ گاہ اور قریبی پہاڑیوں سے اس کی بازگشت ان کی تحسین یا مذمت کی صداؤں کو دو چند کر دیتی ہے۔ تو جب یہ سب کچھ ہو رہا ہو تو تم ہی بتاؤ کیا ایک جوان آدمی کا دل اس کے پہلو میں اچھلنے نہیں لگے گا۔ کیا کوئی خانگی تربیت اسے رائے عامہ کے اس امنڈتے ہوئے سیلاب کے مقابلے میں ثابت قدم رہنے کے قابل بنا سکے گی؟ یا وہ اس کی رو میں بہ جائے گا؟ عام جمہور کے ذہن میں خیر و شر کا جو تخیل ہے کیا وہی اس کے دماغ میں بھی نہ ہوگا؟ جو وہ کرتے ہیں یہ کرے گا، اور جیسے وہ ہیں ویسا ہی یہ بنے گا۔

اس نے کہا: جی ہاں، جناب سقراط، ضرورت اسے اس پر مجبور کرے گی۔

میں نے کہا: اور یہی نہیں۔ ابھی تو ایک اس سے بڑی ضرورت باقی ہے جس کا ذکر میں نے نہیں کیا۔

اس نے کہا: وہ کیا؟

میں نے کہا: شہری حقوق سے محرومی، املاک کی ضبطی، یا موت کی نرم طاقت۔ کہ جب باتوں سے کام نہیں چلتا، تو جیسا کہ آپ جانتے ہیں، سوفسطائیوں اور معلموں کا یہ طبقہ، جس کا نام جمہور ہے، اس قوت کا استعمال کرتا ہے۔

اس نے کہا: بے شک۔ کرتے ہیں اور نہایت زوروں میں کرتے ہیں۔

میں نے کہا: بھلا اس غیر مساوی مقابلے میں کسی دوسرے سوفسطائی یا کسی عام شخص کی رائے کا غالب آنا کیسے ممکن ہے۔

اس نے کہا: جی، کوئی صورت نہیں۔

میں نے کہا: سچ پوچھو تو اس کی کوشش کرنا ہی بڑی حماقت ہے۔ رائے عامہ سے اخلاقی خوبیوں کی تعلیم پا کر جو نمونہ پیدا ہوتا ہے اس سے مختلف نمونہ اخلاق کا نہیں ہے، نہ کبھی ہوا ہے، نہ آیندہ ایسا ہونا قرین

قیاس ہے۔ خیال رہے کہ یہ صرف انسانی خوبیوں کا ذکر ہے، جو فوق الانسان ہے وہ اس میں شامل نہیں۔ کیونکہ میں آپ کو اس امر سے بے خبر نہیں رکھنا چاہتا کہ حکومتوں کی موجودہ ابتر حالت میں جو کچھ بچ جاتا اور خیر میں منتج ہوتا ہے وہ سچ یہ ہے کہ خدا کی تائید سے محفوظ رہتا ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میں اسے پوری طرح سے قبول کرتا ہوں۔

میں نے کہا: تو پھر میں ایک مزید امر میں بھی آپ کے قبول کا ملتجی ہوں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: آپ کیا فرمانا چاہتے ہیں؟

ایڈیمنٹس نے کہا: یہ کہ تمام وہ کرایے کے ٹٹو جنھیں عوام سوفسطائی کہتے ہیں، اور وہ جنھیں ان کا مدمقابل خیال کیا جاتا ہے، سب کے سب دراصل عوام کی رائے ہی کی تعلیم دیتے ہیں، یعنی اپنی اپنی مجلسوں کی رائے کی۔ بس یہی ان کی حکمت ہے یہی ان کا عرفان۔ میں ان کی مثال اس شخص سے دے سکتا ہوں جو ایک بہت بڑے مضبوط جانور کو کھلاتا اور اس کے مزاج اور خواہشوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ یہ شخص رفتہ رفتہ معلوم کر لیتا ہے کہ اس جانور کے پاس کس طرح جائے اور اس سے کیسا برتاؤ کرے، کون سے وقت اور کن وجوہ سے یہ خطرناک ہو جاتا ہے اور کن سے اس کے برعکس، اس کی مختلف پکاروں اور آوازوں کا کیا مفہوم ہے، دوسرا شخص کیسی آوازیں نکالے تو یہ ٹھنڈا پڑتا ہے، یا برافروختہ ہو جاتا ہے۔ فرض کیجیے اس طرح متواتر نگہداشت سے یہ شخص ان باتوں میں کامل ہو گیا تو لگا اپنے اس علم کو حکمت کہنے، اس سے ایک نظام یا فن مرتب کرنے، اور اس فن کی تعلیم دینے۔ حالانکہ جن اصول یا جذبات کا یہ ذکر کرتا ہے اس کے ذہن میں ان کے مفہوم کا بھی کوئی حقیقی تصور نہیں۔ لیکن وہ بلا تامل اس بڑے جانور کے مزاج اور ذوق کی ہمنوائی میں ایک چیز کو عزت کے قابل اور دوسری کو مذمت کے قابل، اسے اچھا اُسے بُرا، کسی کو مبنی بر عدل اور کسی کو غیر عادلانہ بتاتا ہے، جن چیزوں سے یہ جانور خوش ہو یہ انھیں خیر اور جنھیں یہ ناپسند کرے ان کو شر کہتا ہے، اور اس بارے میں سوائے اس کے کوئی وجہ نہیں بتاتا کہ عدل و شرافت وہ ہے جو ضروری ہو۔ دراں حالیکہ اس نے کبھی نہ ان کا مشاہدہ کیا، نہ اس میں یہ صلاحیت ہے کہ دوسروں کو ان چیزوں کی ماہیت یا ان کا وسیع باہمی فرق سمجھا سکے۔ بخدا ایسا شخص کیسا نرالا معلم ہوگا!۔

اس نے کہا: سچ ہے، نہایت ہی نادر!

میں نے کہا: اور اس آدمی سے جس کا ہم نے ذکر کیا وہ شخص کس طرح مختلف ہے جو سمجھتا ہے کہ

حکمت رنگ برنگ انبوہ کے مزاج اور ذوق کی پہچان کا نام ہے، خواہ مصوری میں ہو یا موسیقی میں ہو یا بالآخر سیاست میں۔ کیونکہ جہاں آدمی نے عوام (اکثریت) سے رشتہ باندھا، اور ان کے سامنے اپنی نظم، یا کوئی لطیف کام، یا ریاست کے لیے اپنی خدمات پیش کیں اور انھیں اپنا حَکم بنایا (حالانکہ وہ ایسا کرنے پر مجبور نہیں) تو پھر ڈیومیڈی (Diomede) کی سی ضرورت اسے ایسی چیزیں بنانے پر مجبور کرے گی جس کی یہ لوگ تعریف کریں۔ تاہم، اچھے، اور قابل عزت، کے متعلق اپنے خیالات کی تصدیق میں یہ لوگ جو وجوہ پیش کرتے ہیں وہ بالکل مہمل اور مضحکہ خیز ہوتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی کوئی وجہ سنی جس پر یہ صادق نہ آتا ہو؟

اس نے جواب دیا: نہیں۔ اور نہ کبھی سننے کا احتمال ہے۔

میں نے کہا: جو کچھ کہہ رہا ہوں آپ اس کی صداقت تسلیم کرتے ہیں نا؟ تو اب میں آپ سے اس امر پر غور کرنے کی درخواست کرتا ہوں کہ کیا دنیا کبھی بھی حسن مطلق کے یقین پر آ سکتی ہے بجائے اس کے کہ بہت سی حسین چیزوں پر یقین کرے یا اسی طرح ہر نوع میں بجائے اس نوع کی بہت سی چیزوں کے اس کے عین مطلق پر۔

اس نے کہا: ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: تو دنیا کے فلسفی ہونے کا گویا کوئی امکان نہیں؟

اس نے کہا: ناممکن۔

میں نے کہا: لہٰذا لازم ہے کہ فلسفیوں پر ہمیشہ دنیا کی لعنت رہے۔

اس نے کہا: لازمی۔

میں نے کہا: اور ان لوگوں کی لعنت بھی جو عوام انبوہ سے ساز باز رکھتے اور اسے خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: اچھا، تو پھر کوئی طریقہ تمھیں ایسا نظر آتا ہے کہ فلسفی آخر تک اپنے کام میں ثابت قدم رہ سکے؟ اور ہم اس کے متعلق جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ یاد رہے یعنی ان میں چستی، حافظہ، جرأت اور فراخ دلی ہو کہ انھیں ہم سچے فلسفی کی صفات تسلیم کر چکے ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: تو کیا ایسا شخص شروع بچپن سے ہی ہر چیز میں سب سے آگے نہیں ہوگا۔ خصوصاً اگر اس کے جسمانی قویٰ بھی دماغی قویٰ کی طرح ہوئے؟

ایڈیمنٹس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: جوں جوں اس کی عمر بڑھے گی اس کے دوست اور دوسرے شہر والے اسے اپنی اغراض کے لیے استعمال کرنا چاہیں گے؟

ایڈیمنٹس نے کہا: اس میں کیا کلام ہے؟

میں نے کہا: یہ اس کے پیر پڑ پڑ کر اس سے درخواستیں کریں گے، اس کی عزت اور خوشامد ہوگی، کیونکہ یہ لوگ اس وقت اس قوت کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں، جو ایک دن اس کے قبضے میں ہوگی۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی اکثر ایسا ہوتا ہے۔

میں نے کہا: پھر اگر یہ چوڑا چکلا جوان کسی بڑے دولت مند شہر کا باشندہ ہے تو ان حالات میں اس سے کیا سرزد ہونے کا احتمال ہوگا؟ کیا اس کا دماغ بے شمار حوصلوں سے پر نہیں ہو جائے گا۔ اور وہ اپنے خیال میں اپنے آپ کو ہیلاز (Hellas) کے باشندوں اور وحشی قوموں سمیت سب کے معاملات کے انتظام کا اہل نہیں سمجھنے لگے گا۔ اور جب اس کے سر میں یہ سودا سمایا ہے تو کیا متمردانہ شان وشوکت اور بے معنی غرور میں وہ دل کھول کر اپنے آپ کو بڑھائے چڑھائے گا نہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ضرور ایسا کرے گا۔

میں نے کہا: اچھا تو جب اس کی دماغی کیفیت کا یہ حال ہو اور اس کے پاس آہستہ سے کوئی شخص آئے اور کہے کہ تم بے وقوف ہو، سمجھ حاصل کرنے کی کوشش کرو اور یہ سمجھ جان کھپائے بغیر نہیں ملتی، تو کیا تم سمجھتے ہو کہ ان ناموافق حالات میں وہ بآسانی اس شخص کی بات سننے پر آمادہ ہو جائے گا؟

ایڈیمنٹس نے کہا: توبہ کیجیے!

میں نے کہا: اور اگر کسی کی آنکھیں اپنی ذاتی خوبی یا فطری معقول پسندی کی وجہ سے کچھ کھلیں بھی، اس میں انکسار پیدا ہو اور فلسفہ اسے اپنا شیدائی بنالے تو ایسے شخص کے دوستوں کا کیا رویہ ہوگا، جب یہ لوگ سوچیں گے کہ اس کے ساتھ سے جن فوائد کی توقع تھی وہ سب کے سب ہاتھ سے جاتے ہیں؟ کیا یہ لوگ اسے اپنی فطرت کے اچھے جزو کی پیروی سے روکنے، اور اس کے معلم کو بے بس بنانے میں قولاً وفعلاً سب کچھ

نہیں کر ڈالیں گے اور اس غرض کے لیے پوشیدہ، سازشیں اور علانیہ سزائیں سب کچھ استعمال نہیں کریں گے؟

اس نے کہا: اس میں بھلا کیا شبہ ہے۔

میں نے کہا: تو پھر جس شخص کے ماحول کا حال یہ ہو وہ کیسے فلسفی بن سکتا ہے۔

اس نے کہا: ناممکن ہے۔

میں نے کہا: پھر کیا ہم اپنے اس قول میں صحیح نہیں تھے کہ اگر تعلیم خراب ہوئی تو نہ صرف دولت اور اس کے متعلقات یا اور نام نہاد متاعِ زندگی بلکہ خود وہ صفات جو انسان کو فلسفی بناتی ہیں اسے فلسفے سے منحرف کرنے کا باعث ہوں گی؟

ایڈیمنٹس نے کہا: ہم لوگ بالکل ٹھیک تھے۔

میں نے کہا: تو میرے اچھے دوست شغلوں میں افضل ترین شغل کے لیے جن طبیعتوں میں بہترین مناسبت ہوتی ہے ان کی تباہی و ناکامی اس طرح عمل میں آتی ہے۔ یہ وہ طبیعتیں ہیں جو ہمارے خیال میں ہر زمانے میں کم یاب ہوتی ہیں، یہی وہ طبقہ ہے جس میں سے وہ لوگ نکلتے ہیں جو ریاست اور افراد دونوں کے لیے بڑی بڑی برائیوں کے بانی ہوتے ہیں اور اگر رو انھیں دوسری طرف لے جائے تو بڑی سے بڑی بھلائیوں کے بھی۔ لیکن کسی چھوٹے آدمی نے فرد کے لیے یا ریاست کے لیے کبھی کوئی بڑا کام کیا نہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بالکل سچ ہے۔

میں نے کہا: چنانچہ یوں فلسفے کی دلہن اپنی شادی کی رسمیں پوری کیے بغیر تنہا اور بے یار و مددگار رہ جاتی ہے۔ جو اس کے اپنے تھے انھوں نے ایک ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑ دیا، اور جب یہ لوگ ایسی باطل زندگی گزارنے لگے جو ان کی شان کے شایان نہیں اور جب دوسرے نااہلوں نے دیکھا کہ اب اس کا کوئی عزیز قریب نہیں رہا جو اس کی حفاظت کرے تو یہ اس کے گھر میں گھس پڑے اور اس کی آبروریزی کی اور اس پر وہ ملامتیں عائد کرائیں جن کا بقول آپ کے فلسفے کے مخالف اظہار کرتے ہیں، یعنی یہ کہ فلسفے کے بعض دلدادہ تو بے کار اور نکمے ہوتے ہیں اور اکثر و بیشتر شدید ترین تعزیر کے مستحق ہوتے ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں، بے شک، لوگ یہی کہتے ہیں۔

میں نے کہا: ہاں، تو جب تم اس حقیر مخلوق کا خیال کرو تو اس کے علاوہ اور توقع ہی کیا ہو سکتی ہے۔ یہ

اس میدان کو اپنے لیے کھلا پاکر (اور میدان بھی کیسا، اچھے اچھے ناموں اور نمائشی خطابوں سے پر) ان قیدیوں کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں جو مجلس سے کسی امن کی جگہ میں بچ کر جا رہے ہوں، یہ اپنے پیشوں کو ترک کر کے فلسفے میں کود پڑتے ہیں۔ اور لطف یہ کہ ایسا کرنے والے غالباً وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی اپنی بدنصیب حرفت میں سب سے ہوشیار تھے۔ کیونکہ فلسفہ لاکھ بری حالت میں ہو پھر بھی اس کے ساتھ اتنی شان اور اتنا وقار باقی ہے کہ کسی دوسرے فن کو نصیب نہیں۔ چنانچہ اس وجہ سے بہت سے ایسے لوگ اس کی طرف کھنچتے ہیں جن کی طبیعتیں ناقص اور جن کی روحیں کم ظرفی اور کمینہ پن سے اسی طرح مجروح و بدنما ہو گئی ہے جیسے ان کا جسم ان کے پیشے اور حرفے سے۔ کیا یہ صورت حال ناگزیر نہیں؟

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: کیا ان کی مثال بالکل اس گنجے حقیر پھیری والے کی سی نہیں جس نے ابھی قید سے نکل کر خوش بختی کا منھ دیکھا ہے، اور اب نہا دھو، نئے کپڑے پہن، بن سنور کر دولہا بنا ہے اور اپنے آقا کی لڑکی سے جو بے یار و مددگار رہ گئی ہے شادی کرنے جا رہا ہے۔

اس نے کہا: نہایت ہی صحیح تمثیل ہے۔

میں نے کہا: تو پھر ایسی شادیوں کے نتیجے میں کیسے بچے ہوں گے؟ کیا یہ پاجی حرامی نہیں ہوں گے۔

اس نے کہا: اس میں کیا کلام ہے؟

میں نے کہا: اسی طرح جب ناقابل تربیت لوگ فلسفے کی طرف بڑھتے، اور اس سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں جو مرتبے میں ان سے بالاتر ہے تو اس سے کس قسم کے افکار و آرا کے پیدا ہونے کا احتمال ہے؟ کیا یہ محض سوفسطائی مغالطے نہ ہوں گے جو بس سامعہ فریب ہوں لیکن ان میں نہ کوئی اصلیت ہو نہ حقیقی حکمت سے قرب، نہ اس کے شایان شان۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: ایڈیمنٹس! اس طرح چھٹ چھٹا کر فلسفے کے سچے پیرو بس تھوڑے ہی سے باقی رہ جائیں گے۔ مثلاً شاید کوئی شریف اور تعلیم یافتہ شخص جلا وطنی کی وجہ سے اس کی خدمت میں لگا ہو اور بگاڑ کے اسباب نہ ہونے سے اب تک اس کا شیدائی رہا ہو، یا کوئی بلند پایہ روح کسی چھوٹے ذلیل سے شہر میں پیدا ہو جائے اور اس کی سیاست کو حقارت کی نظر سے دیکھ کر اس کی طرف رخ نہ کرے یا کچھ ایسے باکمال لوگ بھی

ہو سکتے ہیں جو فنون کو چھوڑ کر (جن کی جائز طور پر یہ تحقیر کرتے ہیں) فلسفے کی طرف آئے ہوں، یا پھر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ بعض کو ہمارے دوست تھیا گیس (Theages) کی لگام روکے، کیونکہ تھیا گیس کی زندگی میں تمام چیزوں نے گویا اسے فلسفے سے منحرف کرنے کی ایک سازش سی کی تھی لیکن بس بیماری نے اسے ہمیشہ سیاست سے الگ رکھا۔ رہا خود میرا سا معاملہ یعنی دلیل باطن، تو اس کا ذکر بھی چنداں ضروری نہیں، کیونکہ ایسا خبردار کرنے والا اگر کسی کو عطا کیا گیا بھی ہو تو بہت شاذ۔ ہاں تو جو لوگ (حقیقی فلسفیوں کے) اس چھوٹے سے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں انھوں نے اس کا مزہ چکھا ہے اور اس کی شیرینی اور برکت سے واقف ہیں۔ انھوں نے انبوہ کے جنون کو بھی خوب دیکھا ہے۔ یہ جانتے ہیں کہ سیاست دانوں میں کوئی بھی ایماندار نہیں۔ نہ ان میں عدل وانصاف کا کوئی ایسا حامی ہے کہ اس کے ساتھ معرکہ آرا ہو کر یہ اپنی نجات حاصل کر سکیں۔ اس گروہ کے افراد کی مثال اس انسان کی سی ہے جو جنگلی درندوں میں جا پڑا ہو، کہ نہ تو اپنے ساتھیوں کی شرارت کا شریک ہو سکتا ہے نہ اکیلے ان کی خونخوار طبیعتوں کا دفاع اس سے ممکن ہے، اس لیے جب یہ دیکھتا ہے کہ میں نہ ریاست کے لیے مفید ہو سکتا ہوں نہ اپنے دوستوں کے لیے، اور جب سوچتا ہے کہ اپنی ذات یا دوسروں کو کچھ فیض پہنچائے بغیر اسے بس اپنی زندگی اکارت کھونی ہے تو یہ غریب دم سادھ کر چپ رہتا اور اپنی راہ جاتا ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو گرد و غبار کے اس طوفان میں جو آندھی کے ساتھ اٹھتا ہے کسی دیوار کی پناہ لے کر الگ کو ہٹ جائے۔ یہ جب باقی نوع انسانی کی شر سے پُر پاتا ہے تو بس اسی پر قانع ہو جاتا ہے کہ خود تو اپنی زندگی جوں توں شر اور باطل سے پاک رہ کر گزار دے اور روشن امیدیں لیے ہوئے امن اور آشتی کے ساتھ یہاں سے رخصت ہو جائے۔

اس نے کہا: ہاں، رخصت ہونے سے پہلے اس نے یہ تو ایک بڑا کام انجام دے دیا۔

میں نے کہا: بے شک بڑا کام لیکن جب تک یہ اپنے مناسب حال ریاست نہ پالے اسے سب سے بڑا کام تو نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ مناسب حال ریاست میں اس کی نشوونما زیادہ پھلی ہوئی ہوگی اور یہ اپنی اور اپنے ملک دونوں کی نجات کا باعث ہوگا۔

اچھا تو اب فلسفے کی بدنامی کے اسباب کی کافی تشریح ہو چکی ہے، فلسفے کے خلاف جو الزام ہیں ان کی بے انصافی بھی ظاہر ہو گئی، کیا آپ کو اور کچھ کہنا ہے؟

اس نے کہا: اس مسئلے پر تو اب کچھ نہیں کہنا، البتہ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کی رائے میں

موجودہ حکومتوں میں سے کون سی فلسفے کے لیے سب سے زیادہ سازگار ہے؟

میں نے کہا: کوئی بھی نہیں۔ اور بس یہی الزام تو میں ان سب پر لگاتا ہوں کہ ان میں سے ایک بھی فلسفیانہ طبیعت کے شایان نہیں اور اس لیے یہ طبیعت ٹیڑھی اور بیگانہ سی ہو جاتی ہے۔ جس طرح پردیسی بیج باہر کی زمین میں اپنی ٹھیک فطرت کے مطابق نہیں اگتا بلکہ اس نئی مٹی میں اس کے دب کر فنا ہو جانے کا ڈر ہوتا ہے، اسی طرح فلسفے کی یہ نشوونما بجائے قائم رہنے کے بگڑ کر ایک نیا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن اگر فلسفے کو بھی ریاست میں وہ کمال مل جائے جس سے کہ وہ خود عبارت ہے، تو اس وقت پتا چلے کہ یہ اپنی صداقت میں الٰہی ہے اور تمام دوسری چیزیں چاہے، انسانی طبیعت ہو یا نظام اور ادارے، سب کی سب انسانی ہیں، اور میں جانتا ہوں کہ آپ اب یہ سوال کرنے والے ہی ہیں کہ ایسی ریاست کیا ہے؟

ایڈیمنٹس نے کہا: نہیں نہیں۔ آپ نے غلطی کی۔ میں ایک اور سوال پوچھنے والا تھا۔ وہ یہ کہ آیا وہ ریاست وہی ہے جس کے بانی و مخترع ہم ہیں یا کوئی اور؟

میں نے جواب دیا: ہاں ہاں، اکثر اعتبار سے ہماری ہی ریاست ہے۔ تمھیں یاد ہوگا میں نے پہلے کہا تھا کہ جس ریاست میں اساسی دستور کا وہی تخیل ہو جس نے آئین بناتے وقت تمھاری رہنمائی کی تھی تو ایسی ریاست میں ہمیشہ کسی زندہ اور کارفرما سیادت کی ضرورت ہوگی۔

ایڈیمنٹس نے جواب دیا: یہ تو کہا گیا تھا۔

میں نے کہا: ہاں، لیکن قابل اطمینان طریقے سے نہیں کہا گیا تھا۔ تم نے بیچ میں اعتراض کر کے سب کو ڈرا دیا تھا، اور ان اعتراضات سے یقینی طور پر ظاہر ہوتا تھا کہ بحث طویل اور دشوار ہوگی اور اب بھی جو کچھ باقی ہے وہ سہل کی ضد ہی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: کیوں، اور اب باقی کیا ہے؟

میں نے کہا: یہ سوال کہ فلسفے کے مطالعے کو کس طرح منظم کیا جائے کہ ریاست کی تباہی کا باعث نہ ہو۔ تم جانتے ہو کہ تمام بڑی کوششوں میں کچھ خطرہ ضرور ہوتا ہے، عام قول ہے "جو کٹھن سو اچھا"۔

ایڈیمنٹس نے کہا: پھر بھی اچھا ہے یہ نکتہ صاف ہی ہو جائے۔ تو پھر کہیں جا کر تحقیق پوری ہوگی۔

میں نے کہا: میں اگر رکا تو خواہش اور ارادے کی کمی کی وجہ سے نہیں، قوت اور قدرت کی کمی کی وجہ سے رکوں گا۔ میرا جوش آپ خود دیکھ سکتے ہیں اور میں جو کچھ اب کہنے والا ہوں اس میں مہربانی کر کے ذرا

دیکھیے گا کہ میں کس جرأت کے ساتھ بے پس وپیش اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ ریاستوں کو فلسفے کا حصول اس طرح ہرگز نہیں چاہیے جس طرح وہ آج کل کرتی ہیں، بلکہ اس سے مختلف طریقے سے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یعنی کس طرح؟

میں نے کہا: آج کل فلسفے کے متعلم بالکل نوجوان ہوتے ہیں، ابھی بچپن سے بمشکل گزر پاتے ہیں کہ اس کی ابتدا ہو جاتی ہے، روپیہ کمانے اور گھر کے کاموں سے جو وقت بچتا ہے صرف وہ ان مشاغل میں صرف کرتے ہیں اور ان میں سے وہ تک جن کی بڑی دھوم ہوتی ہے کہ ان میں فلسفیانہ جذبہ بہت ہے، جہاں مضمون کی بڑی دشواری یعنی منطق پر نظر پڑی کہ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ آیندہ عمر میں اگر کہیں کسی دوسرے نے بلالیا تو جا کر ایک آدھ تقریر سن آتے ہیں اور پھر اس کا بڑا چرچا کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ خود فلسفے کو اپنا اصلی اور صحیح شغل نہیں سمجھتے۔ بالآخر بوڑھے ہو کر اکثر صورتوں میں یہ ہراکلیٹس (Heracleitus) کے آفتاب سے بھی زیادہ صحیح معنوں میں بجھ جاتے ہیں، کیونکہ وہ تو پھر روشن بھی ہو جاتا ہے، یہ پھر کبھی روشن نہیں ہوتے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: لیکن آخر اور کیا طریقہ ہونا چاہیے؟

میں نے کہا: اس کا بالکل اُلٹ۔ بچپن اور جوانی میں ان کا مطالعہ، اور فلسفے میں یہ جو کچھ سیکھیں، وہ ان کی عمر کے مناسب ہونا چاہیے۔ اس زمانے میں جب وہ بڑھ کر پورے آدمی بن رہے ہیں ان کے جسموں کی طرف خاص توجہ کرنی چاہیے تاکہ انھیں فلسفے کی خدمات میں لگا سکیں۔ جوں جوں عمر بڑھے اور ذہن پختہ ہونا شروع ہو توں توں یہ روح کی پرورش کو بڑھائیں لیکن جب ان کی طاقت جواب دے دے اور یہ مدنی یا فوجی خدمت کے لائق نہ رہیں تو انھیں اپنی مرضی کے مطابق رہنے سہنے دیا جائے اور ان سے کوئی مشقت نہ کرائی جائے، کیونکہ ہم چاہتے ہیں کہ یہ یہاں خوش رہیں اور آیندہ زندگی میں بھی ایسی ہی خوشی پا کر اس پچھلی زندگی کے سر پر تاج رکھیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جناب سقراط! میں تو اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ اس رائے میں کس درجہ خلوص رکھتے ہیں۔ مجھے تو یقین ہے، لیکن اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ کے سامعین میں سے اکثر آپ کی مخالفت میں غالباً اس سے بھی زیادہ خلوص رکھتے ہیں اور یہ شاید کبھی قائل نہ ہوں، ان میں سب سے بڑھ کر تھریسی میکس۔

میں نے کہا: تھریسی میکس اور مجھ میں کیوں خواہ مخواہ پھر جھگڑا کراتے ہو، ابھی تو ملاپ ہوا ہے

اگر چہ سچ پوچھو تو دشمنی ہی کب تھی۔ البتہ میں تو اپنے بس بھر کوشش کیے ہی جاؤں گا حتیٰ کہ یا تو تھریسی میکس اور دوسرے لوگوں کو قائل کر لوں یا کوئی ایسی بات کروں جو اس دن ان کے کام آئے جب وہ دوبارہ زندہ ہوں اور اسی قسم کی گفتگو ایک دوسرے عالم میں کرتے ہوں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: آپ تو اس وقت کی باتیں کر رہے ہیں جو کچھ بہت قریب نہیں ہے۔

میں نے کہا: بلکہ یوں کہو کہ ایسے زمانے کی جو ازل کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ تاہم مجھے حیرت نہیں کہ اکثر لوگ یقین کرنے سے انکار کرتے ہیں، کیونکہ ہم جس چیز کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں اسے انھوں نے کبھی حاصل ہوتے نہیں دیکھا۔ انھوں نے تو بس فلسفے کی ایک رسمی نقل دیکھی ہے جو الفاظ کے محض ایک مصنوعی مجموعے پر مشتمل ہوتی ہے جن میں ہماری گفتگو کی سی فطری وحدت بھی نہیں ہوتی۔ لیکن ایسا انسانی وجود جو اپنے قول اور فعل کے اعتبار سے کامل طور پر ایسے سانچے میں ڈھل چکا ہو کہ اس میں بقدر امکان خیر سے مناسبت اور مماثلت پیدا ہو جائے اور پھر یہ شخص ایک ایسے شہر پر حکمران ہو جو خود بھی اسی سانچے میں ڈھلا ہو، ایسا انسان انھوں نے کبھی نہیں دیکھا، نہ ایک، نہ بہت۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ انھوں نے کبھی دیکھا ہے؟

ایڈیمنٹس نے کہا: واقعتاً نہیں دیکھا۔

میں نے کہا: اور میرے دوست، یہی نہیں بلکہ ان لوگوں نے اگر کبھی آزاد اور شریفانہ جذبات سنے بھی ہوں گے تو بس یوں ہی شاذ و نادر۔ میرا مطلب ایسے خیالات سے ہے جو انسان کے منہ سے اس وقت نکلتے ہیں جب وہ خلوص کے ساتھ اور اپنی تمام امکانی قوت سے علم کی خاطر حق اور صداقت کے متلاشی ہوتے ہیں، اور ان مناظرانہ موشگافیوں کی طرف سے سرد مہری اور بے اعتنائی برتتے ہیں جن کا حاصل بس مناقشہ اور قیاس ہوتا ہے خواہ یہ موشگافیاں قانونی عدالتوں میں ہوں یا معاشرے میں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔ جن الفاظ کا آپ ذکر کر رہے ہیں ان سے یہ لوگ بالکل ناآشنا ہوتے ہیں۔

میں نے کہا: اور یہی بات تھی جو ہم نے پہلے سے دیکھ لی تھی اور یہی وجہ تھی کہ صداقت نے ہمیں بلا خوف و تردد اس امر کے تسلیم کرنے پر مجبور کیا کہ شہر، حکومتیں، یا افراد ان میں سے کوئی اس وقت تک کمال کو نہیں پہنچ سکتا جب تک فلسفیوں کا وہ چھوٹا سا گروہ جسے ہم نے بے کار کہا ہے لیکن جو بگڑے نہیں ہیں اسے خواہ وہ

چاہے یا نہ چاہے ریاست کی خبر گیری پر من جانب خدا مامور نہ کیا جائے۔ اور اسی طرح ریاست پر ان کی اطاعت لازم نہ کر دی جائے، یا پھر یہ ہو کہ بادشاہوں، بادشاہوں اور شہزادوں کی اولاد کے دل میں خدا کی طرف سے حقیقی فلسفے کی سچی محبت پیدا کر دی جائے۔ میں یہ کہنے کی کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ ان دو صورتوں میں سے کوئی ایک یا دونوں ناممکن ہیں، اگر ایسا ہوتا تو لوگ بے شک ہمیں تخیل پرست یا خیالی پلاؤ پکانے والا کہہ کر ہماری ہنسی اڑا سکتے تھے۔ کیوں میں صحیح کہتا ہوں نا؟

ایڈیمنٹس نے کہا: بالکل درست۔

میں نے کہا: تو اگر ماضی کی بے شمار جگہوں میں یا خود اس وقت کسی ایسے ملک میں جو ہم سے دور اور ہمارے علم سے باہر ہے، کبھی کسی کامل فلسفی کو ایک اعلیٰ طاقت نے حکومت کی باگ ہاتھ میں لینے پر مجبور کیا، یا کبھی آیندہ اس طرح مجبور کرے تو ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں (اور ایسا دعویٰ کہ اگر غلط ہو تو ہماری سزا موت) کہ وہاں ہمارا دستور رائج تھا، یا رائج ہے، اور جہاں کہیں فلسفے کی دیوی ملکہ ہوگی وہاں یہی رائج ہوگا۔ اس میں کوئی بات محال نہیں، ہاں مشکل ضرور ہے، سو اس کا ہمیں خود اقرار ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میری رائے آپ سے متفق ہے۔

میں نے کہا: کیا تمھارا مطلب ہے کہ عوام کا یہ خیال نہیں؟

ایڈیمنٹس نے کہا: ہاں میں تو سمجھتا ہوں کہ نہیں ہے۔

میں نے کہا: اے میرے دوست، عوام پر حملہ نہ کرو، یہ تو اپنی رائے بدل دیں گے بشرطیکہ سر پر چڑھ کر جارحانہ طریقے سے نہیں بلکہ نرمی سے انھیں تسکین دینے اور ضرورت سے زیادہ تعلیم کے ساتھ ان کی جو نفرت ہے اس کو دور کرنے کے لیے تم انھیں اپنے اصلی فلسفی دکھاؤ اور ان کے سامنے ان فلسفیوں کے خصائص اور اشغال کو اس طرح بیان کرو جس طرح ابھی ابھی بیان کر رہے تھے تو جمہور عوام دیکھ لیں گے کہ تم جس کا ذکر کر رہے ہو وہ ایسا نہیں جیسا کہ یہ سمجھتے تھے۔ جب وہ اسے اس نئی روشنی میں دیکھیں گے تو یقیناً اس کے متعلق اپنا خیال بھی بدل دیں گے اور بالکل دوسرے ہی انداز میں تمھارے اس سوال کا جواب دیں گے۔ بھلا اپنے محبت کرنے والے سے کون دشمنی کرے گا۔ جو خود نرم دل اور حسد سے پاک ہو وہ ایسے آدمی سے کیوں رشک کرے گا جس میں خود رشک نہیں۔ نہیں۔ میں آپ کی طرف سے جواب دیتا ہوں کہ ممکن ہے اِکے دُکے میں طبیعت کی یہ سختی پائی جائے لیکن نوع انسانی کی اکثریت میں تو یہ کہیں نہیں ملتی۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میں آپ سے بالکل اتفاق کرتا ہوں۔

میں نے کہا: اور کیا تم بھی میری طرح یہ نہیں سمجھتے کہ عوام میں فلسفے کے خلاف جو شدید احساس پایا جاتا ہے اس کی ابتدا ہوتی ہے دراصل ان نام نہاد فلسفیوں سے جو بن بلائے آ کودتے ہیں اور ہمیشہ لوگوں کو برا کہتے ہیں اور ان پر نکتہ چینی اور ان کی عیب جوئی کرتے اور اشیا کے بجائے اشخاص کو اپنی گفتگو کا موضوع بناتے ہیں؟ اور فلسفی کی شان کے منافی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یہ بہت ہی نازیبا ہے۔

میں نے کہا: کیونکہ ایڈیمنٹس، جس کی لو وجود حقیقی سے لگی ہے اسے یقیناً دنیاوی معاملات پر نظر ڈالنے کی فرصت نہیں ہوتی، نہ اسے اس کی مہلت کہ کینہ اور بیر سے پُر انسانوں سے جھگڑتا پھرے۔ اس کی نگاہ جمی ہوتی ہے قائم اور دائم چیزوں پر، جنھیں وہ دیکھتا ہے کہ نہ یہ ایک دوسرے کو ضرر پہنچاتی ہیں، نہ انھیں کوئی ضرر پہنچتا ہے، اور سب کی سب عقل کے مطابق ایک نظام سے متحرک ہیں۔ وہ ان کی نقل کرتا ہے اور جہاں تک اس سے بن پڑتا ہے ان سے مطابقت کرنا چاہتا ہے۔ اور انسان بھلا اس کی نقالی کیے بغیر کیسے رہ سکتا ہے جس سے اسے معتقدانہ لگاؤ اور نسبت ہو۔

اس نے کہا: ناممکن۔

میں نے کہا: اور اس طرح نظام الٰہی سے ربط ضبط رکھنے والا فلسفی خود بھی، جہاں تک انسانی فطرت اجازت دیتی ہے، منظم اور الٰہی ہو جاتا ہے۔ البتہ اور ہر چیز کی طرح اس میں بھی تھوڑی سی کمی ضرور ہو گی۔

اس نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: اور اگر اس پر یہ کام لازم کر دیا جائے کہ نہ صرف اپنی بلکہ عام انسانی فطرت کی تشکیل خواہ ریاست میں ہو یا افراد میں اس کے مطابق کرے جو وہ کہیں اور دیکھ رہا ہے تو کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ عدل، عفت اور اعتدال، اور دوسرے شہری زندگی کے محاسن کا کوئی اناڑی کاریگر ثابت ہو گا۔

اس نے کہا: سب کچھ ہو سکتا ہے، لیکن اناڑی نہیں۔

میں نے کہا: اور اگر دنیا دیکھ لے کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہے تو کیا وہ فلسفے سے ناراض رہ سکتی ہے؟ اور کیا لوگ ہمارے اس کہنے پر یقین نہیں کریں گے کہ وہ ریاست کبھی خوش نہیں رہ سکتی جس کا نقشہ ایسے صناعوں نے نہ بنایا ہو جو آسمانی نمونے کی نقل کرتے ہیں؟

اس نے کہا: سمجھنے کے بعد تو پھر یہ ناراض نہ رہیں گے۔ لیکن جس نقشے کا آپ ذکر کرتے ہیں وہ یہ کس طرح کھینچیں گے؟

میں نے کہا: یہ ریاست اور آدمیوں کے اطوار سے ابتدا کریں گے اور جیسے تختی سے تصویر مٹا دیتے ہیں۔ یہ سب مٹا کر صاف سطح چھوڑ دیں گے۔ یہ کچھ سہل کام نہیں لیکن سہل ہو یا نہ ہو ان میں اور دوسرے قانون بنانے والوں میں بس یہی فرق ہوگا۔ یہ اس وقت تک فرد یا ریاست سے کوئی سروکار نہیں رکھیں گے، نہ کوئی قانون بنائیں گے جب تک یا تو انھیں پہلے سے ایسی صاف سطح نہ ملے یا خود اسے صاف نہ کر لیں۔

اس نے جواب دیا: بہت ٹھیک کریں گے۔

میں نے کہا: جب یہ ہو جائے گا تو پھر یہ اساسی دستور کا خاکہ بنانا شروع کریں گے۔

اس نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: اور اس خاکے کو پُر کرتے وقت میرے تخیل کے مطابق یہ اکثر اوپر تلے نظر ڈالیں گے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ یہ پہلے تو عدل مطلق، اور حسن مطلق اور اعتدال و عفت سے مطلق کو دیکھیں گے اور پھر ان کی انسانی نقل کو، اور زندگی کے مختلف عناصر انسانی شکل میں ملا کر داخل کریں گے اور اس کا تخیل وہ اس دوسری شکل سے قائم کریں گے کہ جو جب انسانوں میں آ موجود ہوتی ہے تو ہومر اسے شکل و تمثالِ خداوندی کہتا ہے۔

اس نے کہا: بالکل درست۔

میں نے کہا: یہ ایک شکل کو مٹائیں گے اور دوسری کو اس کی جگہ بٹھائیں گے۔ یہاں تک کہ انسانی اخلاق کہ جہاں تک ہو سکے گا الٰہی اخلاق کے مطابق بنا دیں۔

اس نے کہا: بے شک، کسی اور طرح یہ اس سے زیادہ حسین تصویر نہیں بنا سکتے۔

میں نے کہا: ہاں تو جن لوگوں کے متعلق تم نے کہا تھا کہ ہم پر غرا کر جھپٹیں گے شاید اب ہم انھیں یہ سمجھانے لگے ہیں کہ ریاست کے اساسی دستور کا نقشہ کھینچنے والا مصور ایسا ہی ہے جس کی ہم تعریف کر رہے تھے اور جس کے ہاتھ میں حکومت کی باگ دے دینے پر وہ اس درجے بپھرے تھے۔ کیا یہ لوگ ہماری ابھی کی یہ باتیں سن کر کچھ کچھ ٹھنڈے نہیں ہونے لگے؟

اس نے کہا: اگر ان میں ذرا بھی عقل ہے تو ضرور ٹھنڈے پڑیں گے۔

میں نے کہا: اب آخر اعتراض کی کون سی وجہ باقی رہی؟ کیا یہ لوگ اس میں شبہ کریں گے کہ فلسفی حق اور صداقت اور وجودِ مطلق کا عاشق ہے؟

ایڈیمنٹس نے کہا: ایسے بے عقل تو کیا ہوں گے!

میں نے کہا: یا اس میں شبہ کریں گے کہ اس کی فطرت کی تصویر جیسی کہ ہم نے اتاری ہے خیرِ اعلیٰ کے مطابق ہوگی!

ایڈیمنٹس نے کہا: نہ اس میں شبہ کر سکتے ہیں۔

میں نے کہا: تو کیا یہ لوگ پھر یہ کہیں گے کہ ایسی فطرت موافق اور مساعد حالات میں بھی کامل اچھی اور عقل مند نہیں ہو سکتی (بشرطیکہ کامل خیر و حکمت کبھی کسی کو حاصل ہوئی ہو) یا کہیں یہ لوگ انھیں ترجیح نہیں دیں جنھیں ہم نے مسترد کر دیا ہے؟

اس نے جواب دیا: نہیں، ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: پھر کیا یہ ہمارے اس کہنے پر اب بھی خفا ہوں گے کہ جب تک فلسفیوں کے ہاتھ میں حکومت نہ ہو ریاستوں اور افراد کو شر سے چین نصیب نہیں ہوگا اور نہ ہماری یہ خیالی ریاست کبھی عالم وجود میں آ سکے گی؟

اس نے کہا: میں سمجھتا ہوں کہ یہ لوگ اب کم ناخوش ہوں گے۔

میں نے کہا: کیا ہم یہ نہیں فرض کر سکتے ہیں کہ اب یہ نہ صرف کم ناخوش ہوں گے بلکہ بالکل نرم ہوں گے، اب ان کا خیال پلٹ گیا ہوگا اور کچھ نہیں تو شرما شرمی ہی یہ صلح کرنے سے انکار نہیں کریں گے۔

اس نے کہا: ضرور فرض کر سکتے ہیں۔

میں نے کہا: تو پھر فرض کرو کہ یہ باہمی سمجھوتا ہو گیا۔ اب کیا کوئی شخص ہماری دوسری صورت سے انکار کرے گا تو بادشاہوں اور شہزادوں کی ایسی اولاد ہو سکتی ہے جو بالطبع فلسفی ہو۔

اس نے کہا: یقیناً، کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

میں نے کہا: اور کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ عالم وجود میں آنے کے بعد ان کا تباہ ہو جانا لازمی ہے؟ اس سے تو ہمیں بھی انکار نہیں کہ ان کا بچانا بہت دشوار ہے۔ لیکن یہ بھلا کون کہہ سکتا ہے کہ قرنہا قرن میں ان میں

سے ایک فردِ واحد بھی نہیں بچ سکے گا؟

اس نے کہا: بے شک، کون کہہ سکتا ہے۔

میں نے کہا: لیکن ایک کافی ہے۔ بس ایک آدمی چاہیے کہ ایک شہر اس کے ارادے کا تابع ہو، اور یہ اکیلا حکمت کے اس بہترین نظام کو وجود میں لاسکتا ہے، جس کے متعلق دنیا اس قدر شک و شبے میں ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ہاں۔ بس ایک کافی ہے۔

میں نے کہا: حاکم ان قواعد اور قوانین کو نافذ کرے گا جو ہم بیان کر رہے تھے اور رعایا غالباً ان کی اطاعت پر آمادہ ہوگی۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: اور یہ بات نہ محال ہے نہ معجزہ کہ جسے ہم پسند کرتے ہیں اسے دوسرے بھی پسند کریں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میں تو سمجھتا ہوں کہ نہیں ہے۔

میں نے کہا: اپنی ساری گفتگو میں ہم نے کافی حد تک ظاہر کر دیا ہے کہ اگر یہ سب کچھ ممکن ہو تو یقیناً بہترین چیز ہوگی۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔

میں نہ کہا: اور اب ہم صرف یہ نہیں کہتے کہ اگر ہمارے قوانین نافذ ہو سکتے تو بہترین نتائج کا باعث ہوتے۔ بلکہ اب ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کا نفاذ اگرچہ مشکل سہی لیکن ناممکن نہیں ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بہت خوب۔

میں نے کہا: خیر، ہزار کاوش اور دشواری کے بعد ہم ایک مضمون کے ختم پر تو پہنچے لیکن ابھی بحث کے لیے اس سے زیادہ باقی ہے، باقی اساسی نظام کے محافظ کس طرح، کن اشغال سے اور کن چیزوں کے مطالعے سے پیدا ہوں گے، اور یہ ان مختلف علوم کی تحصیل پر کس کس عمر میں مصروف ہوں گے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: میں نے عورتوں پر قبضہ، بچوں کی پیدائش اور حکام کے تقرر کے تکلیف دہ معاملات اس لیے حذف کر دیے تھے کہ میں جانتا تھا کہ کامل ریاست پر لوگ رشک اور رقابت سے نظر ڈالیں گے اور اس کا قیام دشوار ہوگا، لیکن یہ چالاکی میرے زیادہ کام نہ آئی اور مجھے پھر بھی ان پر بحث کرنی ہی پڑی۔ اب

عورتوں اور بچوں کا معاملہ تو طے ہے لیکن دوسرا مسئلہ یعنی حاکموں کے سوال کی بالکل شروع سے تحقیق ہونی چاہیے۔ تمھیں یاد ہوگا ہم کہہ رہے تھے کہ یہ اپنے ملک کے عاشق ہوں، مسرت والم، حظ وکرب کے امتحان سے ان کی آزمایش ہو چکی ہو، صعوبتوں میں، خطرے میں یا کسی اور اہم اور کٹھن موقع پر یہ اپنے حب وطن کے جذبے کو کھو نہ بیٹھیں، جو ان آزمایشوں میں ناکام ہو، اسے مسترد کر دیا جائے، لیکن جو ہمیشہ خالص نکلے جیسے سنار کی بھٹی سے تپا ہوا سونا نکلتا ہے تو وہ حاکم بنایا جائے اور زندگی میں اور مرنے کے بعد اعزاز وانعام کا مورد ہو۔ ہم اس قسم کی باتیں کر رہے تھے کہ دلیل نے ایک طرف کو مڑ کر اپنے چہرے پر نقاب ڈال لیا۔ وہ چاہتی تھی کہ جو مسئلہ اب اٹھا ہے اسے اس وقت نہ چھیڑے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

میں نے کہا: ہاں میرے دوست، میں اس وقت صاف صاف کہتے جھجکتا تھا۔ لیکن اب میں صاف کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ کامل محافظ کے لیے لازم ہے کہ وہ فلسفی ہو۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ہاں اب تو یہ دعویٰ کر ہی دینا چاہیے۔

میں نے کہا: اور یہ نہ سمجھو کہ یہ فلسفی بہت سے ہوں گے، کیونکہ ہم نے جن صفات کو لازمی قرار دیا ہے وہ بہت شاذ یکجا ہوتی ہیں۔ وہ اکثر ٹکڑے ٹکڑے اور پارہ پارہ ملتی ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: آپ کا کیا مطلب ہے۔

میں نے کہا: تم واقف ہو کہ ذکاوت، حافظہ، ہوشمندی اور فہم، چالاکی اور دوسری ایسی ہی صفات اکثر یکجا نہیں ملتیں اور جن لوگوں میں یہ ہوتی ہیں، اور وہ ساتھ ساتھ فراخ دل اور عالی حوصلہ بھی ہوں تو فطرت کی طرف سے ان کی کچھ ایسی ساخت ہوتی ہے کہ وہ منظم پُر امن، پُر سکون اور ایک مستقل وضع کی زندگی نہیں گزار سکتے، ان کے ہیجانات انھیں جدھر چاہتے ہیں لے جاتے ہیں اور ان کی تمام ٹھوس اصلیت ان سے ضائع ہو جاتی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بہت درست۔

میں نے کہا: برخلاف اس کے وہ مستقل طبیعتیں ہوتی ہیں جن پر زیادہ اعتماد کیا جا سکتا ہے، جو جنگ میں اٹل اور خوف سے بالکل غیر متاثر ہوتی ہیں، تو یہ غریب جب کچھ سیکھنے سمجھنے کا معاملہ ہوتا ہے تب بھی ایسی ہی غیر متحرک اور مٹھ ثابت ہوتی ہیں۔ یہ ہمیشہ ایک ساکن کیفیت میں رہتی ہیں، اور جہاں کچھ ذہنی محنت کا معاملہ

آیا، احتمال ہوتا ہے کہ یہ جمائیاں لیں گے اور سو جائیں گے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بالکل بجا۔

میں نے کہا: لیکن ہم کہہ چکے ہیں کہ جن لوگوں کو اعلیٰ تعلیم دینی ہے اور جو کسی عہدے یا منصب کے حامل ہونے والے ہیں ان کے لیے یہ دونوں صفات لازمی ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: تو کیا یہ نہایت ہی کم یاب طبقہ ہوگا؟

ایڈیمنٹس نے کہا: ہاں یقیناً۔

میں نے کہا: تو اس کے امیدوار کا امتحان صرف ان مسرتوں، مشقتوں، اور خطروں سے نہیں ہوگا جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں، بلکہ ایک اور قسم کی آزمائش بھی ہے جس کا بیان ابھی رہ گیا تھا یعنی مختلف قسم کے علوم میں اس کی مشق کرانی چاہیے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آیا اس کی روح افضل ترین علوم کو تحمل کر سکے گی یا ان کے بوجھ سے دب کر بودی پڑ جائے گی۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ہاں یہ تو بالکل ٹھیک ہے کہ آپ اس کی آزمائش کر لیں۔ لیکن افضل ترین علم سے آپ کا مقصود کیا ہے؟

میں نے کہا: تمھیں معلوم ہوگا کہ ہم نے روح کے تین حصے کیے تھے، اور عدل، عفت، جرأت اور حکمت کی الگ الگ ماہیتوں میں امتیاز کیا تھا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: خوب، اگر میں اسی کو بھول جاؤں تو پھر آگے کچھ اور سننے کا مستحق ہی نہیں۔

میں نے کہا: اور ان پر بحث کرنے سے قبل جو لفظ تنبیہ کے طور پر کہے گئے تھے وہ بھی تمھیں یاد ہیں؟

ایڈیمنٹس نے کہا: آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟

میں نے کہا: اگر میں غلطی نہیں کرتا تو غالباً ہم نے کہا تھا کہ جو شخص انھیں ان کے کامل حسن میں دیکھنا چاہتا ہے اسے ذرا لمبا اور پُر پیچ راستہ اختیار کرنا ہوگا کہ اس راہ کے طے ہونے پر ہی یہ سامنے آئیں گے۔ لیکن ہم ان کی ایک عام فہم توضیح بھی کر سکتے ہیں جس کی سطح پچھلی بحث کی سی ہو۔ اس پر تم نے جواب دیا تھا کہ بس یہی توضیح تمھارے لیے کافی ہوگی۔ چنانچہ تحقیق اس انداز سے جاری ہوئی جو میرے خیال کے مطابق نہایت غیر صحیح طریقہ تھا۔ رہا یہ کہ تم بھی اس سے مطمئن ہوئے یا نہیں سو یہ تمھارے بتانے

کی بات ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی، میرا اور نیز دوسرے احباب کا خیال ہے کہ آپ نے ہمیں صداقت کا ایک معقول معیار فراہم کر دیا ہے۔

میں نے کہا: لیکن، میرے دوست، ان چیزوں کا ہر وہ معیار جو کامل صداقت سے ذرا بھی کم ہو وہ معقول معیار نہیں ہوتا۔ کوئی ناقص چیز کسی دوسری چیز کا معیار نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ لوگ عموماً قانع ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مزید تلاش کی ضرورت نہیں۔

اس نے کہا: جب لوگ کاہل ہوں تو یہ صورت کچھ غیر معمولی نہیں۔

میں نے کہا: ہاں، اور ریاست اور آئین کے محافظ کے لیے اس سے بڑا کوئی اور عیب نہیں ہو سکتا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: تو پھر محافظ سے یہ طویل راہ اختیار کرانی چاہیے اور اسے علم اور ورزش دونوں میں محنت کرنی چاہیے ورنہ وہ کبھی اس افضل ترین علم کو حاصل نہیں کر سکے گا جو، جیسے کہ ہم ابھی ابھی کہہ رہے تھے، اس کا اصلی مقصد ہے۔

اس نے کہا: کیا؟ کیا کوئی علم اس سے بھی اعلیٰ اور افضل ہے یعنی عدل اور دوسرے محاسن سے بھی اعلیٰ۔

میں نے کہا: ہاں ہے۔ اور خود ان مذکورہ محاسن کا بھی تو ہمیں خالی خاکہ ہی نہیں دیکھنا چاہیے جیسا کہ ہم فی الحال کر رہے ہیں۔ ہمیں تو بہترین اور مکمل تصویر سے کم پر مطمئن ہی نہیں ہونا چاہیے۔ جب چھوٹی چھوٹی چیزوں کو انتہائی محنت کے ساتھ تفصیلی طور پر بنایا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے پورے حسن اور کامل وضاحت سے ظاہر ہو سکیں، تو یہ کیسی ہنسی کی بات ہے کہ ہم اعلیٰ ترین حقیقتوں کو کامل صحت کے ساتھ حاصل کرنے کے قابل نہ سمجھیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: نہایت بلند خیال ہے۔ لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اس سوال سے باز آ جائیں گے کہ آخر یہ افضل ترین علم کیا ہے؟

میں نے کہا: نہیں نہیں، تمھارا جی چاہے تو پوچھو۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تم بارہا اس کا جواب سن چکے ہو، اور یا تو تم مجھے سمجھتے نہیں اور یا جیسا کہ میرا گمان ہے، تم محض شرارت پر آمادہ ہو۔ تمھیں اکثر بتایا گیا ہے کہ خیر کا تصور (عین) اعلیٰ ترین علم ہے۔ اور تمام دوسری چیزیں اسی کو استعمال کر کے مفید اور کارآمد بنتی

ہیں۔ تم اس سے تو بمشکل ہی ناواقف ہوں گے کہ میں اب اسی کے متعلق گفتگو کرنے والا تھا، اور تم نے مجھے اکثر کہتے سنا ہوگا کہ ہم اس کے متعلق سب سے کم جانتے ہیں اور اس کے بغیر ہر دوسرا علم اور ہر قسم کی متاع ہمارے لیے بے سود ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمام دوسری چیزوں پر قبضہ ہمارے لیے کوئی بھی قیمت رکھ سکتا ہے، اگر ہمارے قبضے میں خیر نہ ہو یا تمام دوسری چیزوں کا علم ہمارے لیے کوئی قدر رکھ سکتا ہے اگر ہمیں حسن و خیر کا علم نہ ہو۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یقیناً نہیں۔

میں نے کہا: تم اس سے بھی آگاہ ہو کہ اکثر لوگ مسرت اور لذت کو خیر کہتے ہیں لیکن ان سے بہتر عقلیں اسے علم سے تعبیر کرتی ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ یہ مؤخر الذکر لوگ یہ واضح نہیں کر سکتے کہ ان کا علم سے کیا مفہوم ہے اور بالآخر مجبور ہو کر اسے خیر کا علم کہہ دیتے ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: کیا خوب، کیسی ہنسی کی بات ہے!

میں نے کہا: جی ہاں۔ پہلے تو یہ لوگ ہم پر ملامت کرتے ہیں کہ خیر سے ناواقف ہو اور پھر فرض کر لیتے ہیں کہ ہمیں اس کا علم ہے۔ کیونکہ خیر کی تعریف یہ لوگ کرتے ہیں "علم خیر" گویا جب انھوں نے لفظ خیر استعمال کیا تو ہم اس کے معنی سمجھتے ہی تو تھے۔ نہایت مضحکہ انگیز بات ہے۔

اس نے کہا: بالکل بجا۔

میں نے کہا: اسی طرح جو مسرت و حظ کو خیر کہتے ہیں وہ بھی ایسی ہی پریشانی میں مبتلا ہیں، کیونکہ انھیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جہاں اچھی مسرتیں اور لذتیں ہیں وہاں بری مسرتیں اور لذتیں بھی ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: اس طرح گویا انھیں تسلیم کرنا ہوتا ہے کہ اچھا اور برا ایک ہی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: سچ ہے۔

میں نے کہا: جن بے شمار مشکلات میں مسئلہ الجھا ہوا ہے ان میں بھلا کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

ایڈیمنٹس نے کہا: کوئی شبہ نہیں۔

میں نے کہا: پھر کیا ہم بہت سے لوگوں کو اس پر آمادہ نہیں پاتے کہ اصلیت اور حقیقت سے قطع نظر کر کے بس وہ کریں، یا رکھیں یا معلوم ہوں جو صرف دیکھنے میں مبنی بر عدل اور قابل عزت ہو لیکن خیر کے محض ظاہر سے کوئی بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ یہاں تو تلاش حقیقت کی ہے اور خیر کے معاملے میں ہر ایک محض ظاہر صورت کو حقیر سمجھتا ہے۔

اس نے کہا: بالکل بجا۔

میں نے کہا: اس چیز سے جس کی تلاش ہر انسانی روح کو ہے اور جسے وہ اپنے تمام اعمال کا مقصد بناتی ہے، کیونکہ اسے پہلے سے یہ خیال ہے کہ ایسا مقصد ہونا چاہیے، لیکن پھر بھی اسے تامل ہے اس لیے کہ نہ اس کی ماہیت کا علم رکھتی ہے نہ اس کے متعلق وہ یقین جو دوسری چیزوں کے متعلق ہے اور اس طرح دوسری چیزوں میں جو کچھ خوبی ہے اسے بھی ضائع کر دیتی ہے۔ ہاں، تو کیا اس عظیم الشان اصول کے متعلق ہماری ریاست کا وہ بہترین انسان جس کے سپرد سب کچھ ہے، جہالت کی تاریکی میں ہوگا؟

اس نے کہا: ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: میرا یقین ہے کہ جو شخص یہ نہیں جانتا کہ حسن اور عدل ساتھ ہی ساتھ خیر بھی کس طرح ہوتے ہیں، وہ حسن اور عدل کا کچھ یوں ہی سا محافظ ہوگا۔ اور مجھے تو شبہ ہے اس میں بھی کہ جو شخص خیر سے ناواقف ہے وہ ان کا علم بھی کیسے رکھ سکتا ہے۔

اس نے کہا: نہایت بجا شبہ ہے۔

میں نے کہا: اور اگر ہمیں ایسا محافظ مل جائے جسے یہ علم ہو تو پھر تو ہماری ریاست میں کامل نظم ہوگا۔

اس نے کہا: بلاشبہ، لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ خود خیر کی اس اعلیٰ حقیقت کے متعلق کیا خیال کرتے ہیں؟ آیا یہ علم ہے یا مسرت اور لذت یا ان دونوں سے جداگانہ کوئی چیز؟

میں نے کہا: ہاں ہاں، میں پہلے ہی سے جانتا تھا کہ تم جیسا چھان بین کرنے والا ان معاملات پر بس دوسرے لوگوں کے خیالات سننے پر قانع نہیں ہوگا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جناب سقراط! یہ سچ ہے لیکن میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ آپ جیسے شخص کو جس نے اپنی ساری زندگی فلسفے کے مطالعے میں صرف کی ہے اس پر کبھی قانع نہیں ہونا چاہیے کہ بس دوسروں کی آرا دہرا دے اور خود اپنی رائے کبھی نہ بتائے۔

میں نے کہا: درست، لیکن کیا کسی شخص کو ایسی بات پر کوئی قطعی رائے دینے کا حق ہے جسے وہ نہ جانتا ہو؟

اس نے کہا: نہیں، اسے اپنا خیال قطعی یقین کے ساتھ نہیں پیش کرنا چاہیے۔ اس کا اسے بے شک حق نہیں لیکن وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اس معاملے پر اس کا کیا خیال ہے یعنی محض بطور اپنی رائے کے۔

میں نے کہا: کیا تم نہیں جانتے کہ محض آرا تمام کی تمام بری ہوتی ہیں اور ان میں سے بہترین بھی اندھی ہوتی ہے۔ تم اس سے تو انکار نہیں کرو گے کہ جن لوگوں کے ذہن میں بلا سمجھ کے کوئی صحیح خیال ہو ان کی مثال ان اندھوں کی سی ہے جو سڑک پر اٹکل سے اپنا رستہ ڈھونڈتے ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بالکل صحیح۔

میں نے کہا: پھر کیا تم اس چیز کو دیکھنے کی خواہش رکھتے ہو جو اندھی ہے، کج رو ہے، ذلیل ہے جبکہ دوسرے تمھیں حسن اور روشنی بتانے پر تیار ہیں۔

گلوکون نے کہا: پھر بھی جناب سقراط میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ عین اس وقت کہ ہم منزل مقصود پر پہنچ رہے ہیں اپنا منہ نہ موڑیے۔ اگر آپ خیر کی بھی ایسی ہی توضیح کر دیں جیسی آپ نے عدل اور عفت اور دوسرے محاسن کی کی ہے تو ہم مطمئن ہو جائیں گے۔

میں نے کہا: ہاں، میرے دوست، مجھے بھی کم از کم اتنا ہی اطمینان حاصل ہو گا، لیکن مجھے ڈر ہے کہ میں ناکام رہوں گا۔ اور میرا بے جا جوش میری ہنسی اڑوائے گا۔ نہیں نہیں، میرے مہربانو، ہم اس وقت نہ پوچھیں کہ خیر کی اصل ماہیت کیا ہے۔ کیونکہ اس مقام پر پہنچنے کے لیے جو اس وقت میرے خیال میں ہے، ایسی سعی درکار ہے جو میری طاقت سے باہر ہو گی۔ البتہ میں خیر کے ایک بچے کا ذکر کر سکتا ہوں جو سب سے زیادہ اس سے مشابہ ہے، بشرطیکہ مجھے یہ یقین ہو جائے کہ آپ لوگ اسے سننا چاہتے ہیں۔ ورنہ یہ بھی نہیں۔

گلوکون نے کہا: ہاں ہاں۔ ضرور بچے ہی کا ذکر کیجیے اور باپ کا بیان آپ پر گویا ادھار رہے گا۔

میں نے کہا: سچ پوچھو تو خود چاہتا ہوں کہ میں صرف اولاد ہی کا نہیں بلکہ والد کا حساب بھی چکا سکتا اور تم اسے بھی وصول کر لیتے۔ لیکن خیر فی الحال اسی کو بطور سود کے لے لو اور چوکس رہو کہ میں کہیں غلط حساب تو نہیں دیتا ہوں۔ اگرچہ سچ پوچھو تو میرے دل میں تمھیں دھوکا دینے کا ذرا بھی ارادہ نہیں ہے۔

گلوکون نے کہا: بہت اچھا، آپ آگے چلیے، ہم جہاں تک ہو گا پوری احتیاط برتیں گے۔

میں نے کہا: ہاں، لیکن پہلے میں آپ لوگوں سے ایک سمجھوتہ کرلوں، اور آپ کو ایک بات پھر یاد دلا دوں جو میں بحث کے دوران میں اور دوسرے موقعوں پر بھی بیان کر چکا ہوں۔

گلوکون نے کہا: وہ کیا؟

میں نے کہا: وہی پرانا قصہ، کہ ایک حسن کثرت ہوتا ہے اور خیر کثرت اور اسی طرح اور دوسری چیزوں کے متعلق جن کا تذکرہ اور تعریف ہم کرتے ہیں۔ ان سب پر لفظ کثرت کا اطلاق ہوتا ہے۔

اس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: اور ایک ہوتا ہے حسن مطلق اور خیر مطلق، نیز جن دوسری چیزوں پر لفظ کثرت عائد ہوتا ہے ان کا بھی ایک "مطلق" ہے، کیونکہ یہ سب ایک واحد عین کے ماتحت لائے جاسکتے ہیں، جو ہر ایک کا اصل اور جوہر کہلاتا ہے۔

گلوکون: بہت صحیح۔

میں نے کہا: "کثرت" دیکھی جاتی ہے، جانی نہیں جاتی، اور "اعیان" جانے جاتے ہیں دیکھے نہیں جاتے۔

گلوکون: بجا۔

میں نے کہا: مرئی چیزوں کو ہم کس سے دیکھتے ہیں؟

گلوکون نے کہا: باصرہ سے۔

میں نے کہا: اور سامعہ سے سنتے، اور دیگر حواس سے دوسرے موارد حس کا احساس کرتے ہیں۔

اس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: لیکن تم نے کبھی اس طرف توجہ کی ہے کہ باصرہ ہنرمندی کا سب سے قیمتی اور پیچیدہ کام ہے جو حواس کے بنانے والے نے انجام دیا ہے؟

گلوکون نے کہا: نہیں میں نے کبھی ادھر دھیان نہیں کیا۔

میں نے کہا: تو ذرا غور کرو۔ کیا کان یا آواز کو اس لیے کہ وہ سن سکے یا یہ سنی جاسکے کسی تیسری یا اضافی چیز کی ضرورت ہے؟

اس نے کہا: کسی چیز کی نہیں۔

میں نے کہا: واقعی نہیں۔ اور یہی حال اگر سب کا نہیں تو اکثر حواس کا ہے۔ کیا تمھارے خیال میں کسی حس کو یہ اضافی چیز درکار ہوتی ہے؟

گلوکون نے کہا: جی نہیں۔

میں نے کہا: لیکن کسی دوسری شے کے اضافے کے بغیر نہ دیکھنا ممکن ہے، نہ دیکھا جانا۔

گلوکون نے کہا: یہ کیسے؟

میں نے کہا: ایسے کہ باوجودیکہ آنکھوں میں باصرہ موجود ہو، اور آنکھوں والا دیکھنا بھی چاہتا ہو، رنگ بھی موجود ہو، لیکن جب تک اس غرض کے لیے ایک اور تیسری چیز موجود نہ ہو اس وقت تک آنکھوں والا کچھ نہ دیکھ سکے گا اور رنگ اَن دیکھے رہیں گے۔

گلوکون: آپ کس چیز کا ذکر کر رہے ہیں؟

میں نے کہا: اس کا جسے تم روشنی کہتے ہو۔

اس نے کہا: ہاں، درست ہے۔

میں نے کہا: شریف ہے وہ رشتہ جو باصرہ کو مرئی چیزوں سے جوڑتا ہے اور دوسرے رشتوں سے بوجہ اپنے اختلافِ ماہیت کتنا مہتم بالشان۔ کیونکہ یہ رشتہ روشنی ہے اور روشنی کوئی ذلیل شے نہیں۔

اس نے کہا: ذلیل کی بالکل ضد۔

میں نے کہا: اور تمھارے خیال میں آسمانی دیوتاؤں میں اس عنصر کا مالک کون ہے؟ وہ روشنی کس کی ہے جو آنکھ کو پوری طرح دیکھنے اور مشہود کو ظاہر ہونے دیتی ہے۔

اس نے کہا: آپ کا مطلب آفتاب سے ہے۔ آپ کا کیا، ساری نوعِ انسانی کا یہی خیال ہے۔

میں نے کہا: روشنی سے اس دیوتا کا تعلق کیا اس طرح بیان نہیں ہو سکتا؟

گلوکون: کس طرح؟

میں نے کہا: نہ تو آنکھ آفتاب ہے اور نہ باصرہ جو آنکھ میں رہتی ہے۔

گلوکون نے کہا: نہیں۔

میں نے کہا: تاہم تمام اعضائے حسیہ میں آنکھ ہی سب سے زیادہ سورج کی طرح ہے۔

گلوکون نے کہا: سب سے زیادہ۔

میں نے کہا: اور آنکھ میں جو قوت ہے وہ گویا آفتاب سے ایک طرح کا کسب فیض ہے۔

گلوکون نے کہا: بالکل۔

میں نے کہا: تو گویا آفتاب باصرہ نہیں، باصرہ کا باعث اور مبدع ہے جسے باصرہ جانتی اور مانتی ہے۔

اس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: اسی کو میں خیر کا بچہ کہتا ہوں جسے خیر نے اپنے مشابہ پیدا کیا تاکہ عالم مرئی میں اس کا تعلق باصرہ اور اشیائے مشہود سے وہی ہو جو تعلق ذہنی عالم میں خیر کو ذہن اور ذہنی اشیا سے ہے۔

گلوکون نے کہا: کیا آپ مہربانی فرما کر اسے ذرا اور واضح کر دیں گے؟

میں نے کہا: کیوں، تم یہ تو جانتے ہی ہو کہ اگر ایک شخص اپنی آنکھیں ایسی چیزوں کی طرف پھیرے جن پر دن کی روشنی نہ پڑی ہو بلکہ صرف چاند تاروں کی تو اس کی آنکھیں دھندلا دھندلا دیکھیں گی اور تقریباً اندھی ہوں گی، ان میں نظر کی تیزی اور صفائی نہیں ہوگی۔

گلوکون نے کہا: بہت صحیح۔

میں نے کہا: لیکن جب انھیں ایسی چیزوں کی طرف پھیرا جائے جن پر آفتاب چمک رہا ہو تو پھر ان میں بصارت ہوگی اور وہ صاف صاف دیکھ سکیں گی۔

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: تو روح کی مثال بھی آنکھ کی سی ہے جب وہ ادھر نظر اٹھاتی ہے جہاں حقیقت اور وجود مطلق اپنی روشنی ڈال رہے ہیں تو وہ دیکھتی ہے اور سمجھتی ہے اور اپنے فہم سے جگمگا اٹھتی ہے۔ لیکن جب اس کا رُخ کون و فساد کے جھلکے کی طرف ہوتا ہے تو پھر یہ محض ظن ورائے رکھتی ہے اور پھرتی ہے ادھر ادھر ٹاپک ٹوئیاں مارتی، کبھی ایک رائے رکھتی ہے کبھی دوسری اور معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کوئی فہم نہیں۔

گلوکون نے کہا: بالکل یہی حالت ہوتی ہے۔

میں نے کہا: ہاں تو یہ چیز جو معلوم کو صداقت اور عالم کو قوت علم عطا کرتی ہے، یہ ہے وہ چیز جسے میں چاہتا ہوں کہ تم عین خیر کہو۔ یہی تمام حکمت کی علت ہے اور تمام صداقت کی بھی، جہاں تک صداقت علم کا موضوع بن سکتی ہے۔ اور یوں اگرچہ صداقت اور علم دونوں حسین وجمیل ہوتے ہیں، لیکن تم حق بجانب ہوں گے اگر اس چیز کو ان دونوں سے زیادہ حسین وجمیل سمجھو، جس طرح پہلی مثال میں روشنی اور باصرہ کو

بجا طور پر آفتاب سے مشابہ کہہ سکتے تھے۔ لیکن پھر بھی یہ آفتاب نہ تھیں، اسی طرح اس دوسرے حلقے میں حکمت اور صداقت کو بھی خیر سے مشابہ مان سکتے ہیں لیکن خود خیر نہیں۔ خیر کے اعزاز کا تخت ان سے بھی بہت اونچا ہے۔

گلوکون نے کہا: وہ چیز حسن و جمال کا کیسا حیرت کدہ ہوگی جو حکمت اور صداقت کی موجد ہے، پھر حسن میں ان سے بڑھ کر۔ کیونکہ آپ کا یہ تو مطلب ہرگز نہ ہوگا کہ مسرت ولذت خیر ہے۔

میں نے جواب دیا: ہرگز نہیں۔ لیکن کیا میں آپ سے درخواست کرسکتا ہوں کہ اس تصویر پر ایک اور نقطے سے پھر نظر ڈالیں۔

گلوکون نے کہا: وہ کون سا نقطۂ نظر ہے؟

میں نے جواب دیا: آپ یہ تو کہیں گے نا کہ آفتاب نہ صرف تمام مرئی چیزوں کے ظہور ہی کا باعث ہے بلکہ تخلیق اور نشوونما کا بھی، اگرچہ وہ خود تخلیق نہیں۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: علیٰ ہذا القیاس خیر کے متعلق بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ تمام معلوم چیزوں کے علم ہی کا نہیں بلکہ ان کے وجود اور اصلیت کا بھی باعث ہے۔ لیکن اس کے باوجود خیر خود یہ اصلیت نہیں بلکہ اپنی شان اور قوت میں اس اصلیت سے کہیں افضل ہے۔

گلوکون نے ایک تمسخر آمیز ثقاہت سے کہا: آسمان کی روشنی کی قسم، کیسی حیرت انگیز باتیں ہیں یہ!

میں نے کہا: ہاں ہاں۔ اور اگر کچھ مبالغہ ہے تو اس کا الزام تمھارے ہی سر ہے کہ تم نے مجھے اپنے تخیلات بیان کرنے پر مجبور کیا۔

گلوکون نے کہا: خدارا ابھی بیان کیے جایئے۔ کم از کم اگر اس آفتاب والی تمثیل کے متعلق کچھ کہنا باقی ہو تو اسے ضرور سنایئے۔

میں نے کہا: ہاں۔ ابھی تو بہت کچھ باقی ہے۔

گلوکون نے کہا: تو پھر ذرا بھی چھوٹنے نہ پائے۔

میں نے کہا: میں اپنی سی کوشش کروں گا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بہت کچھ چھوڑنا ہی ہوگا۔

اچھا، تو پھر تصور کرو کہ دو حکمران طاقتیں ہیں، ایک ذہنی دنیا پر مسلط ہے اور ایک مرئی عالم پر۔ میں

آسمان اس لیے نہیں کہتا تم کہیں یہ نہ سمجھو کہ میں محض نام سے کھیل رہا ہوں، کیا میں سمجھ لوں کہ ذہنی اور مرئی کی یہ تفریق تمھارے ذہن میں اچھی طرح آ گئی؟

گلوکون: جی ہاں، آ گئی۔

میں نے کہا: اچھا اب ایک خط لو جو دو غیر مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان دو حصوں کو پھر اسی نسبت سے تقسیم کرو۔ اور فرض کرو کہ اصلی دو قسمیں مرادف ہیں ایک عالم مرئی اور دوسری عالم ذہنی کے، پھر ان مزید تقسیموں کا ان کی وضاحت اور عدم وضاحت کے اعتبار سے باہم مقابلہ کرو تو تمھیں معلوم ہوگا کہ عالم مرئی میں پہلا جز و تصاویر پر مشتمل ہے۔ اور تصادیر سے میری مراد ہے اول تو سائے سے اور دوسرے ان عکسوں سے جو پانی یا منجمد، چکنی یا چمکدار سطح پر یا ایسی ہی اور چیزوں پر پڑتے ہیں۔ آپ سمجھ گئے؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں، میں سمجھ گیا۔

میں نے کہا: اب دوسرے جزو کا تصور کرو جس کی یہ محض مشابہت تھی۔ اس میں وہ جانور شامل ہیں جو ہم دیکھتے ہیں اور ہر وہ چیز جو قدرتاً پیدا ہوتی یا بنائی جاتی ہے۔

گلوکون نے کہا: بہت خوب۔

میں نے کہا: کیا تم تسلیم نہیں کرو گے کہ اس تقسیم کے ہر دو ٹکڑوں میں صداقت کے مختلف درجے ہیں اور نقل کو اصل سے وہی نسبت ہے جو رائے کے حلقے کو علم کے حلقے سے۔

گلوکون نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: اس کے بعد دیکھو کہ ذہنی اشیا کا حلقہ کس طرح منقسم ہوتا ہے؟

گلوکون نے کہا: ہاں، کس طرح؟

میں نے کہا: اس طرح: اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ان میں سے اسفل میں روح ان شکلوں کو جو سابقہ تقسیم سے آتی ہیں تصویروں کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ تحقیق صرف فرضی ہو سکتی ہے، اور بجائے اس کے کہ کسی اصول کی طرف اوپر کو چلے یہ دوسرے سرے کی طرف اترتی ہے۔ قسم اعلیٰ میں روح مفروضوں سے گزر کر ایک اصول کی طرف جاتی ہے جو مفروضوں سے بالاتر ہوتا ہے۔ پہلے کی طرح صور کا استعمال نہیں کرتی بلکہ خود اعیان میں سے اور اعیان ہی کے ذریعے آگے بڑھتی ہے۔

اس نے کہا: میں آپ کا مفہوم پوری طرح نہیں سمجھا۔

میں نے کہا: تو میں پھر کوشش کروں گا۔ میں اگر کچھ تمہیدی ابتدائی باتیں پہلے کہہ دوں تو تم بہتر سمجھ سکو گے۔ تم جانتے ہو کہ ہندسہ، حساب اور دوسرے اسی قسم کے علوم کے طلبہ اپنے علوم کی مختلف شاخوں میں طاق و جفت، بعض اشکال، تین قسم کے زاویے اور اسی قسم کی چیزیں فرض کر لیتے ہیں۔ یہ ان کے مفروضات ہیں جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ خود اور ہر دوسرا شخص انھیں جانتا ہے۔ اس لیے ان کی تشریح کی تکلیف یہ نہ خود اپنے لیے گوارا کرتے ہیں نہ دوسروں کے لیے۔ لیکن شروع انھی سے کرتے ہیں اور آگے چلتے جاتے ہیں یہاں تک کہ بالآخر درجہ بدرجہ یہ اپنے نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں۔

اس نے کہا: جی ہاں، میں اس سے واقف ہوں۔

میں نے کہا: اور کیا تم یہ بھی نہیں جانتے کہ اگرچہ یہ لوگ مرئی اشکال کا استعمال کرتے اور انھی کے متعلق دلائل دیتے ہیں لیکن دراصل ان کے ذہن میں ان شکلوں کا خیال نہیں بلکہ ان اعیان کا ہے جن سے یہ مشابہ ہیں۔ ان شکلوں کا نہیں جو یہ کھینچتے ہیں بلکہ مربع مطلق اور قطر مطلق کا اور علیٰ ہذا القیاس۔ جو شکلیں یہ کھینچتے یا بناتے ہیں اور جن کا خود بھی پانی میں سایہ اور عکس پڑتا ہے۔ انھیں یہ لوگ تصویروں میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ لیکن دراصل متلاشی ہوتے ہیں یہ اس چیز کو نفسہ دیکھنے کے، اور اسے صرف ذہن کی آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے۔

گلوکون نے کہا: سچ ہے۔

میں نے کہا: اسی قسم کو میں نے قابل فہم کہا تھا۔ اگرچہ اس کی جستجو میں روح کو مفروضوں کا استعمال مجبوراً کرنا پڑتا ہے، وہ کسی اصول اولیہ کی طرف عود نہیں کرتی کیونکہ وہ مفروضوں کے عالم سے بلند ہونے کی قابلیت نہیں رکھتی۔ ہاں، ان چیزوں کو بطور صور استعمال کرتی ہے جن کے سائے خود اپنی جگہ تشبیہات ہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں اپنے سائے اور عکس کے مقابلے میں زیادہ وضاحت اور لہٰذا زیادہ قدر رکھتی ہیں۔

گلوکون نے کہا: میں سمجھتا ہوں۔ آپ ہندسہ اور دوسرے متعلقہ فنون کا ذکر کر رہے ہیں۔

میں نے کہا: اور جب میں قابل فہم کی دوسری تقسیم کا ذکر کروں گا تو تم سمجھ لوگے کہ میں اس دوسری نوع علم کی طرف اشارہ کر رہا ہوں جو عقل خود منطق کی قوت سے حاصل کرتی ہے۔ اور مفروضوں کو بطور اصول اولیہ نہیں بلکہ محض مفروضوں کے طور پر استعمال کرتی ہے، یعنی بالفاظ دیگر ایک ایسی دنیا میں جو مفروضوں سے بالاتر ہے بطور منزل و نشان، تاکہ ان سے پرے کل کے اصول اول تک پرواز کر سکے اور پھر بھی اس کے

سہارے سے جو اس پر منحصر ہے درجہ بدرجہ اور منزل بہ منزل یہ پھر کسی محسوس شے کی مدد کے بغیر اترتی ہے، اعیان سے اعیان میں ہوتے ہوئے پھر اعیان پر ہی آ کر ختم کرتی ہے۔

اس نے کہا: میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ بالکل تو نہیں کیونکہ آپ ایک ایسا کام بیان کر رہے ہیں جو سچ پوچھیے تو بہت بڑا کام ہے۔ تاہم میں یہ سمجھا کہ آپ کے نزدیک وہ علم اور وہ وجود، جو علم منطق کا موضوع ہیں ان فنون کے تصورات سے واضح تر ہوتے ہیں جو محض مفروضوں پر اپنی بنیاد رکھتے ہیں۔ انھیں بھی عقل ہی دیکھتی ہے حواس نہیں، تاہم چونکہ یہ ابتدا کرتے ہیں مفروضات سے اور کسی اصول تک صعود نہیں کرتے، اس لیے ان کے دیکھنے والے آپ کے نزدیک ان پر عقل اعلیٰ کا استعمال نہیں کرتے۔ اگرچہ جب ان کے ساتھ ایک اصول اولیہ کا اضافہ کر دیا جائے تو یہ عقل اعلیٰ کے لیے معروف ہو جاتے ہیں اور جو عادت ہندسہ اور متعلق علوم سے وابستہ ہے اسے غالباً آپ فہم کہیں گے نہ کہ عقل اور گویا یہ رائے اور عقل کے بین بین ہوگی۔

میں نے کہا: تم میرا مطلب بالکل سمجھ گئے۔ اب ضرورت ہے کہ ان چار تقسیموں کے مطابق روح میں چار صلاحیتیں یا قوتیں ہوں۔ اعلیٰ ترین کی مرادف عقل، دوسری کا مرادف فہم، تیسری کا عقیدہ اور آخری کے مرادف سایوں کا ادراک۔ اور ان کا ایک پیمانہ ہونا چاہیے۔ آؤ ہم یہ فرض کر لیں کہ مختلف صلاحیتوں میں اتنے ہی درجے کی وضاحت ہوتی ہے جتنی کہ ان کے موضوع میں صداقت ہو۔

گلوکون نے کہا: میں سمجھ گیا۔ اور میں اس سے اتفاق کرتا اور آپ کی ترتیب کو تسلیم کرتا ہوں۔

☆☆☆

ساتویں کتاب

میں نے کہا: اچھا اب آپ کو ایک تمثیل سے بتاؤں کہ ہماری طبیعتیں کس حد تک روشن ہیں اور کہاں تک غیر روشن۔

دیکھو! انسانوں کو ایک زمین دوز غار میں رہتا ہوا خیال کرو، جس کا منہ روشنی کی طرف ہے اور روشنی غار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچتی ہے۔ یہ لوگ اس غار میں بچپن سے ہیں ان کی پنڈلیاں اور گردنیں زنجیروں سے جکڑی ہوئی ہیں تاکہ یہ ہل جل نہ سکیں اور چونکہ زنجیروں کی وجہ سے سر بھی نہیں پھیر سکتے اس لیے یہ بس اپنے سامنے ہی دیکھ پاتے ہیں۔ ان کے اوپر پشت کی طرف کچھ فاصلے پر ایک آگ دہک رہی ہے اس آگ کے اور ان قیدیوں کے درمیان ایک اونچا راستہ ہے، اور اگر تم ذرا دھیان سے دیکھو تو اس راستے کے برابر برابر ایک نیچی سی دیوار بنی ہوئی دکھائی دے گی جس طرح بازی گر اپنے سامنے ایک پردہ سا بنا لیتے ہیں اور اس کے اوپر کٹھ پتلیاں نچاتے ہیں۔

گلوکون: جی میں نے دیکھا ہے۔

میں نے کہا: اور تم اس دیوار پر یہ بھی دیکھتے ہو کہ لوگ ادھر سے ادھر گزر رہے ہیں، ان کے ہاتھوں میں طرح طرح کے برتن، مجسمے، اور جانوروں کی مورتیاں ہیں، کچھ لکڑی کے، کچھ پتھر کے اور دوسری مختلف چیزوں کے۔ ان لوگوں میں سے کچھ باتیں کر رہے ہیں اور کچھ چپ ہیں۔

گلوکون: آپ نے تو مجھے ایک نرالی تصویر دکھائی اور یہ قیدی بھی عجیب ہیں!

میں نے جواب دیا: ہمارے جیسے ہی ہیں۔ اور یہ بس خود اپنا یا ایک دوسرے کا سایہ دیکھتے ہیں جو آگ کی روشنی سے غار کے مقابل دیوار پر پڑتا ہے۔

اس نے کہا: سچ ہے۔ جب انھیں سر ہی ہلانے کی اجازت نہیں تو پھر یہ سوائے سائے کے اور کچھ دیکھ بھی کیسے سکتے ہیں؟

میں نے کہا: اور ہاتھوں میں جو دوسری چیزیں ہیں ان کا بھی بس اسی طرح سایہ ہی تو دیکھیں گے۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور اگر یہ ایک دوسرے سے بات چیت کر سکیں تو کیا یہ نہیں سمجھیں گے کہ یہ ان چیزوں کے نام لے رہے ہیں جو واقعتاً ان کے روبرو ہیں؟

گلوکون نے کہا: بالکل درست۔

میں نے کہا: اب یہ اور فرض کرو کہ اس زنداں میں دوسری جانب سے ایک آواز بازگشت آتی، تو اگر کوئی باہر کا گزرنے والا کچھ کہتا تو کیا یہ یقیناً یہ نہ خیال کرتے کہ یہ آواز اس کے متحرک سائے ہی سے آ رہی ہے۔

اس نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: ان لوگوں کے لیے صداقت بس واقعی ان صورتوں کے سائے سے عبارت ہوگی۔

گلوکون نے کہا: یقینی بات ہے۔

میں نے کہا: اچھا اب ذرا یہ دیکھو کہ اگر ان قیدیوں کو رہا کر دیا جائے اور ان کی یہ غلط فہمی دور ہو جائے تو اس کا فطری نتیجہ کیا ہوگا۔ ان میں سے کسی کو آزاد کر کے جب ایک دم کھڑے ہو کر گردن پھیرنے، ذرا چلنے اور روشنی کی طرف دیکھنے پر مجبور کیا جائے گا تو پہلے پہل تو اسے نہایت سخت تکلیف محسوس ہوگی۔ روشنی کی چمک اسے اذیت پہنچائے گی اور وہ ان حقیقی چیزوں کو دیکھنے کے قابل نہیں ہوگا جن کا اپنی پہلے والی حالت میں وہ بس سایہ دیکھا کرتا تھا۔ اب تصور کرو کہ کوئی شخص اس سے کہتا ہے کہ اس نے پہلے جو کچھ دیکھا سب خیال کا دھوکا تھا۔ البتہ اب کہ وہ وجودِ اصلی سے قریب تر ہو رہا ہے اور اس کی آنکھیں زیادہ حقیقی وجود کی طرف مڑی ہیں، اس کا نظارہ پہلے سے واضح تر ہے، تو وہ اس کا کیا جواب دے گا؟ پھر فرض کرو کہ جیسے جیسے مختلف چیزیں اس کے سامنے سے گزرتی ہیں اس کا معلم اس سے ان کے نام پوچھنا چاہے تو کیا یہ مبہوت نہیں ہو جائے گا۔ کیا یہ غریب یہ نہیں سمجھے گا کہ جو سائے یہ پہلے دیکھتا تھا وہ ان چیزوں سے زیادہ حقیقی تھے جو اب اسے دکھائی جا رہی ہیں!

گلوکون: جی ہاں۔ کہیں زیادہ حقیقی سمجھے لگا۔

میں نے کہا: اور اگر اسے مجبور کیا جائے کہ بالکل سیدھے روشنی کی طرف دیکھے تو اس کی آنکھوں

میں کیسی تکلیف ہوگی اور کیا یہ ان چیزوں کی طرف منھ موڑ کر پناہ نہ لینا چاہے گا، جنھیں یہ دیکھ سکتا ہے اور جو اس کے خیال میں دراصل ان چیزوں سے زیادہ واضح ہیں جو اسے اب دکھائی جا رہی ہیں۔

گلوکون نے کہا: سچ ہے۔

میں نے کہا: اور آگے فرض کرو کہ اسے ایک دشوار گزار سیدھی چڑھائی پر اس کی مرضی کے خلاف گھسیٹ کر لے گئے اور اس وقت تک اسے خوب مضبوط پکڑے رکھا کہ یہ خود آفتاب کے حضور میں مجبوراً پیش ہوگیا تو کیا اس کا درد محسوس کرنا اور اس پر چڑ چڑانا قرین قیاس نہیں؟ یہ جب روشنی کی طرف بڑھے گا تو اس کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی اور جنھیں ہم حقیقی چیزیں کہہ رہے ہیں یہ ان میں سے کسی کو بھی نہیں دیکھ سکے گا۔

اس نے کہا: ہاں بھلا یکا یک کیسے دیکھ سکے گا؟

میں نے کہا: اس عالم بالا کے نظارے کا تو یہ ہوتے ہوتے ہی عادی ہوگا۔ پہلے تو سائے کو سب سے اچھی طرح دیکھ سکے گا، پھر پانی میں آدمیوں اور دوسری چیزوں کے عکس کو اور پھر کہیں خود اصلی چیزوں کو۔ تب یہ چاند تاروں اور روشن آسمان کی روشنی کی طرف نظر کرے گا۔ دن میں سورج یا اس کی روشنی کے بہ نسبت یہ رات میں آسمان اور تاروں کو زیادہ اچھی طرح دیکھ سکے گا۔

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: سب سے آخر میں آ کر یہ آفتاب کو دیکھ سکے گا۔ نہ صرف پانی میں اس کے عکس کو یا کسی اور جگہ بلکہ خود اس کی اپنی مخصوص جگہ پر اور یہ اب آفتاب کا نظارہ کرے گا، ایسا جیسا کہ وہ ہے۔

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: اب یہ لگے گا یوں دلیل کرنے کہ یہی آفتاب موسم اور سال کا باعث ہے، یہی تمام ان چیزوں کا محافظ ہے، جو عالم مرئی میں ہیں اور ایک معنی کر یہی ان تمام اشیا کی علت ہے جنھیں یہ اور اس کے ساتھی دیکھتے ہیں۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔ صاف ہے، پہلے یہ آفتاب کو دیکھے گا اور پھر اس کے متعلق عقلی دلائل دے گا۔

میں نے کہا: اور جب یہ اپنے پرانے مسکن کو، اپنے اس غار والی عقل و دانش اور اپنے یارانِ مجلس کو یاد کرے گا تو کیا تم سمجھتے ہو کہ ان کے حال پر افسوس نہیں کرے گا اور اپنے آپ کو اس پر مبارک باد نہیں دے گا۔

اس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: اور اگر ان میں ان لوگوں کو خطاب اور اعزاز دینے کی رسم ہوتی جو سب سے زیادہ تیزی سے چلتے پھرتے سائے کو پہچان سکتے تھے یا یہ بتا سکتے تھے کہ ان میں کون آگے جائے گا، کون پیچھے، اور کون کون ساتھ رہیں گے یعنی ان لوگوں کو جو مستقبل کے متعلق نتائج معلوم کرنے کی سب سے زیادہ قابلیت رکھتے تھے تو کیا اب یہ شخص ان خطابات اور اس شان وشوکت کی کچھ بھی پروا کرے گا یا ان لوگوں سے حسد کرے گا جنھیں اعزاز ملے تھے۔ کیا یہ بقول ہومر:

"غریب آقا کا غریب نوکر ہونا"۔

اور تمام مشکلات کو جھیلنا پسند نہیں کرے گا بمقابلہ اس کے کہ ان کی طرح سوچے سمجھے اور ان کی طرح زندگی بسر کرے؟

اس نے کہا: جی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ ہر قسم کی مصیبت جھیل لے گا لیکن ان باطل خیالات کو باور نہیں کرے گا، نہ ان جیسی تباہ زندگی بسر کرے گا۔

میں نے کہا: اچھا اب ایک مرتبہ یہ اور تصور کرو کہ اس شخص کو یکا یک آفتاب کی اس روشنی سے ہٹا کر اپنی اس پرانی جگہ پر پہنچا دیا جائے تو کیا اس کی آنکھوں میں اندھیرا نہیں آجائے گا۔

اس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: پھر اگر وہاں پہنچ کر کوئی بازی قرار پائے اور اسے، ابھی کہ اس کی نظر کمزور ہے اور اس کی آنکھیں سدھائی نہیں گئی ہیں (اور ہو سکتا ہے کہ نظر کی اس نئی عادت کے حاصل کرنے میں بہت زمانہ لگے) اسے ان قیدیوں سے جو کبھی غار کے باہر نہیں نکلے سایوں کے ناپنے میں مقابلہ کرنا پڑے تو کیا اس بیچارے کی حالت مضحکہ خیز نہیں ہوگی۔ لوگ اس کے متعلق کہیں گے کہ آپ اوپر تشریف لے گئے تھے اور آنکھیں کھو کر پھر نیچے تشریف لائے ہیں۔ بس یہی بہتر ہے کہ اوپر چڑھنے کا خیال ہی نہ کیا جائے اس واقعہ کے بعد اگر کوئی شخص ان میں سے پھر کسی ایک کو رہا کر کے روشنی میں لانا چاہے گا، تو اس مجرم کا پکڑا جانا شرط ہے، جان سے تو یہ لوگ یقیناً اسے مار ہی ڈالیں گے۔

اس نے کہا: اس میں کیا شک ہے؟

میں نے کہا: عزیزم گلوکون، اس پوری تمثیل کو تم گزشتہ دلیل پر اضافہ کر سکتے ہو۔ زندان یہ عالم نظر

ہے اور آگ کی روشنی آفتاب۔ اور اگر تم اوپر کی چڑھائی کے سفر کو ذہنی عالم میں روح کی پرواز سے تعبیر کرو تو گویا تم نے میرا مطلب غلط نہیں سمجھا۔ بھائی میرا تو یہ عقیدہ ہے، جو تمھاری خواہش پر میں نے ظاہر کر دیا، صحیح یا غلط خدا جانتا ہے۔ لیکن سچ ہو یا جھوٹ میری رائے یہ ہے کہ علم کی دنیا میں خیر کا تصور سب سے آخر میں آتا ہے اور پھر بھی بڑی کاوش سے دکھائی دیتا ہے۔ ہاں جب دکھائی دے جاتا ہے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام حسین اور صحیح چیزوں کا باعث، اور اس مرئی عالم میں نور اور سلطانِ نور دونوں کا پروردگار اور عالم ذہنی میں عقل اور صداقت کا بلاواسطہ منبع ہے، اور پتا چلتا ہے کہ جو کوئی شخصی یا اجتماعی زندگی میں عقل کے مطابق عمل کرنا چاہے اسے اپنی نگاہ اسی پر قائم رکھنی چاہیے۔

اس نے کہا: جہاں تک میں، آپ کا مفہوم سمجھ سکا ہوں میں آپ سے متفق ہوں۔

میں نے کہا: اور تمھیں اس پر بھی تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ جن لوگوں کی اس مسعود منظر تک رسائی ہو جاتی ہے وہ پھر انسانی معاملات کی پستی پر نہیں اترنا چاہتے، ان کی روحیں تو عالم بالا کی طرف رواں دواں چلی جاتی ہیں اور وہیں قیام کرنا چاہتی ہیں اور اگر ہماری تمثیل قابلِ اعتماد ہے، تو ان کی یہ خواہش بالکل قدرتی ہے۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔ بالکل قدرتی۔

میں نے کہا: اور کیا اس میں کوئی حیرت کی بات ہے کہ ایک شخص جو الٰہی افکار سے گزر کر انسان کی بری حالت پر اتر آتا ہے، اس سے یہاں نہایت مضحک عمل سرزد ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر ایسا ہو کہ ابھی اس کی آنکھیں چندھیا ہی رہی ہیں اور وہ اپنے ماحول کی تاریکی کا عادی نہیں ہوا ہے اسے قانونی عدالتوں میں مقدمے بازی سے سابقہ پڑے یا اور کہیں عدل کی ظاہری شکل یا خود اس شکل کے سائے کے متعلق لڑنا پڑے اور وہ ان لوگوں کے تصور سے مطابقت کرنا چاہے، جنھوں نے کبھی عدل مطلق کی شکل ہی نہیں دیکھی!

اس نے جواب دیا: اس میں حیرت کی کون سی بات ہے۔

میں نے کہا: ہر شخص جس میں معمولی سمجھ ہو جانتا ہوگا کہ آنکھ کی حیرت اور پریشانی دو قسم کی اور دو وجوہ سے ہوتی ہیں۔ یعنی یا تو روشنی کے نکلنے سے یا روشنی میں داخل ہونے سے۔ اور یہ حقیقت ذہنی بصیرت پر بھی ویسے ہی عائد ہوتی ہے جیسے جسمانی پر۔ جو شخص اس بات کو پیش نظر رکھتا ہے وہ جب کسی کو دیکھے گا کہ اس کی نظر کمزور اور پراگندہ ہے تو اس پر فوراً ہنس دے گا بلکہ وہ یہ دریافت کرے گا کہ آیا اس انسان کی روح روشن

زندگی سے ایسی تاریکی میں آئی ہے جس کی وہ عادی نہیں یا تاریکی سے روز روشن کی طرف رخ کرنے پر نور کی فراوانی نے اسے خیرہ کر دیا ہے۔ایک کی حالت پر اسے خوشی ہوگی، دوسرے پر افسوس اور اسے اگر ہنسنا ہی ہے تو اس روح پر اس کی ہنسی زیادہ قرین عقل ہوگی جو اوپر روشنی سے غار کی تاریکی میں آئی ہے بہ نسبت اس کے جو نیچے سے نور کی بلندی کی طرف چڑھ رہی ہو۔

اس نے کہا: جی یہ بالکل بجا فرق و امتیاز ہے۔

میں نے کہا: لیکن اگر میرا خیال درست ہے تو پھر بعض ان فاضل معلموں کا یہ خیال غلط ہونا چاہیے کہ جیسے کوئی اندھی آنکھوں میں روشنی داخل کرے، یہ روح میں وہ علم ٹھونس سکتے ہیں جو اس میں پہلے سے موجود نہیں ہوتا۔

اس نے جواب دیا: ہاں۔وہ کہتے تو بے شک یہی ہیں۔

میں نے کہا: حالانکہ ہماری دلیل یہ بتاتی ہے کہ سیکھنے کی قوت اور صلاحیت روح میں پہلے سے موجود ہوتی ہے اور جس طرح آنکھ تاریکی سے روشنی کی طرف بلا پورے جسم کے مڑے ہوئے اپنا رخ نہیں کر سکتی اسی طرح انسان کے علم کا آلہ بھی کل روح کی حرکت سے ہی شہود سے وجود کی طرف پھر سکتا اور رفتہ رفتہ وجود، اور وجود میں روشن ترین اور بہترین وجود، یعنی بالفاظ دیگر، خیر کے نظارے کی تاب لا سکتا ہے۔

گلوکون نے کہا: بہت درست۔

میں نے کہا: اور کیا کوئی ایسا فن نہیں ہونا چاہیے جو اس تبدیلی کو سہل تر اور زود تر طریقے سے عمل میں لے آئے۔اس فن کے لیے یہ کام نہیں کہ یہ بصارت کی قوت پیدا کرے، کیونکہ یہ تو پہلے ہی سے موجود ہے، البتہ اس کا رخ غلط سمت ہے اور وہ اس جانب دیکھ رہی ہے جو صداقت سے دور ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔ایسے فن کا وجود فرض کیا جا سکتا ہے۔

میں نے کہا: اور ہر چند روح کی دوسری خوبیاں جسمانی صفات سے ملتی جلتی ہیں اور اگر اصل میں فطرت کے اندر مضمر نہ بھی ہوں تو بعد میں عادت اور مشق سے پیدا کی جا سکتی ہیں مگر دانش اور عرفان کی خوبی ہر دوسری چیز سے زیادہ اپنے اندر ایک الٰہی عنصر رکھتی ہے جو ہمیشہ باقی رہتا ہے اور جو اس تبدیلی سے مفید اور سودمند ہو جاتا ہے، ورنہ دوسری حالت میں بے کار اور ضرر رساں بن جاتا ہے۔کیا تم نے کبھی کسی چالاک بدمعاش کی تیز آنکھوں میں کوتاہ بین ذہانت کی چمک نہیں دیکھی۔وہ کیسا متجسس ہوتا ہے اور اس کی چھوٹی روح
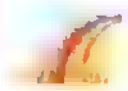
کس صفائی سے اپنے مقصد کی راہ دیکھ لیتی ہے؟ وہ اندھا کیوں اندھے کی تو ضد ہوتا ہے ہاں اس کی تیز نظر کی قوت شر کی خدمت میں لگی ہوتی ہے۔ وہ جتنا چالاک ہوتا ہے اسی نسبت سے شریر بھی ہوتا ہے۔

اس نے کہا گلوکون نے کہا: بہت درست۔

میں نے کہا: لیکن اگر نو عمری ہی میں ان طبیعتوں کی کاٹ چھانٹ ہو جاتی اور انھیں کھانے پینے جیسی شہوانی لذتوں سے الگ کر لیا جاتا جو پیدا ہونے کے ساتھ ہی ان کی گردن میں سیسے کے بوجھ کی طرح باندھ دی گئیں اور جو انھیں ہمیشہ اسفل کی طرف کھینچتی اور ان کی نظر کو نیچے کی چیزوں کی طرف پھیرتی ہیں، ہاں تو اگر ان موانع سے آزاد کر کے ان کا رخ دوسری سمت میں کر دیا جاتا تو ان کی یہی صلاحیت صداقت کو بھی اسی تیزی سے دیکھتی جس طرح اب ان چیزوں کو دیکھتی ہے جن کی طرف ان کا رخ ہے۔

گلوکون نے کہا: بہت ممکن ہے۔

میں نے کہا: ہاں اور ایک بات اور بھی اغلب ہے، بلکہ یوں کہیے کہ جو گفتگو گزر چکی اس سے لازمی طور پر نکلتی ہے۔ اور وہ یہ کہ نہ تو غیر تعلیم یافتہ اور صداقت سے بے خبر ہماری ریاست کے قابل وزیر ہو سکتے ہیں اور نہ وہ جو اپنی تعلیم کو ختم ہی نہیں کرتے۔ پہلے تو اس لیے نہیں کہ یہ اپنے فرض کا کوئی خاص مقصد نہیں رکھتے جو ان کے تمام شخصی اور اجتماعی اعمال کا دستور ہو اور دوسرے اس وجہ سے نہیں کہ یہ سوائے جبر کے اور کسی طرح کام ہی نہیں کرتے اور اس خیال میں مست ہوتے ہیں کہ گویا ابھی سے مقدس لوگوں کے علیحدہ جزیرے میں بستے ہیں!

گلوکون نے کہا: بہت صحیح۔

میں نے کہا: چنانچہ ہمارا کام، کہ ہم اس ریاست کے بانی ہیں، یہ ہے کہ بہترین دماغوں کو اس علم کے حصول پر مجبور کریں گے جسے ہم نے ابھی ابھی اعلیٰ ترین علم بتایا ہے، یہ اپنی چڑھائی اور پرواز وہاں تک جاری رکھیں کہ، خیر، تک پہنچ جائیں۔ لیکن جب اس بلندی پر چڑھ جائیں اور کافی دیکھ چکیں تو ہم انھیں وہ نہ کرنے دیں گے جو یہ آج کل کرتے ہیں۔

اس نے جواب دیا: آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں نے کہا: یعنی یہ لوگ اسی عالم بالا میں رہ جاتے ہیں۔ اس کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ انھیں پھر غار کے قیدیوں میں اتارنا چاہیے اور انھیں پھر ان کی مشقتوں اور ان کے انعامات میں حصہ لینا چاہیے خواہ یہ

لینے کے لائق ہوں یا نہ ہوں۔

اس نے کہا: مگر کیا یہ بے انصافی نہیں؟ جب یہ بہترین زندگی گزار سکتے ہیں تو کیا ہمیں ان کو ایک بدتر زندگی دینی چاہیے؟

میں نے کہا: میرے دوست۔ پھر تم قانون بنانے والے کا مقصد بھول گئے۔ اس کا مقصد سیاست میں سے کسی ایک طبقے کو دوسرے سے زیادہ خوش حال بنانا نہیں تھا۔ اسے خوش حالی درکار تھی ساری ریاست کی۔ اس نے شہریوں کو ترغیب اور ضرورت کے زور سے یکجا رکھا، انھیں ریاست کا محسن اور اس طرح گویا ایک دوسرے کا محسن بنایا۔ اسی غرض سے انھیں پیدا کیا، اس لیے نہیں کہ اپنی من مانی کریں بلکہ اس لیے کہ ریاست کے بندھن باندھنے کا آلہ بنیں۔

اس نے کہا: درست ہے، میں بھول گیا تھا۔

میں نے کہا: گلوکون، ادھر دیکھو۔ ہم اگر اپنے فلسفیوں کو دوسروں کی نگرانی اور پرورش کرنے پر مجبور کریں تو اس میں کوئی بے انصافی تو نہ ہوگی۔ ہم انھیں سمجھا دیں گے کہ دوسری ریاستوں میں ان کے طبقے کے لوگ سیاست کی مشقت میں حصہ لینے پر مجبور نہیں کیے جاتے۔ اور یہ بات ہے بھی معقول، کیونکہ یہ لوگ خود من مانی مرضی سے پیدا ہوتے ہیں بلکہ ریاست تو ان کے نہ ہونے کو شاید زیادہ پسند کرتی۔ چونکہ یہ اپنی تعلیم آپ کرتے ہیں اس لیے ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اس تعلیم کے لیے احسان مندی کا اظہار کریں جو انھیں کبھی ملی ہی نہیں لیکن تمھیں تو ہم نے دنیا میں اس چھتے کے حکمران بننے کے لیے پیدا کیا ہے، یعنی خود اپنے بادشاہ ہونے کے لیے اور نیز دوسرے شہریوں کے لیے۔ ان سے کہیں بہتر اور کامل تر تعلیم ہم نے تمھیں دی ہے اور تم ان سے زیادہ دہرے فرض میں حصہ لینے کے لائق ہو۔ اس لیے تم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ جب اس کی باری آئے تو وہ عام زمین دوز مسکن میں نیچے جائے اور تاریکی میں دیکھنے کی عادت ڈالے۔ جب تم یہ عادت ڈال لو گے تو تم غار کے باسیوں سے دس ہزار گنا بہتر دیکھ سکو گے۔ تم جانو گے کہ یہ مختلف صورتیں کیا ہیں اور کس کی نمایندگی کرتی ہیں کیونکہ تم نے حسن، عدل اور خیر کو ان کی سچی صورت میں دیکھا ہے۔ اس طرح ہماری ریاست، جو تمھاری ریاست بھی ہے، ایک حقیقت ہوگی نہ کہ محض ایک خواب، اور اس کا انتظام ان دوسری ریاستوں سے بالکل الگ انداز پر ہوگا جن میں انسان خالی سایوں کے متعلق ایک دوسرے سے لڑتے اور طاقت اور اقتدار کی کشمکش میں، جو ان کی نظر میں ایک خیر عظیم ہے، اپنے آپ کو منتشر اور پراگندہ رکھتے ہیں۔

حالانکہ سچ یہ ہے کہ جس ریاست کے حاکم حکومت سے سب سے زیادہ بچنا چاہیں اسی پر سب سے اچھی اور خاموشی کے ساتھ حکومت ہوتی ہے اور جس میں حاکم حکومت کرنے کے سب سے زیادہ شائق ہوتے ہیں اسی کی حکومت سب سے بری ہوتی ہے۔

اس نے جواب دیا: بالکل بجا۔

میں نے کہا: تو کیا ہمارے شاگرد یہ سب سننے کے بعد بھی اپنی باری آنے پر حکومت کے فرائض میں حصہ لینے سے انکار کریں گے حالانکہ انھیں، اس بات کی اجازت ہے کہ اپنے وقت کا بڑا حصہ باہم مل کر آسمانی نور میں گزاریں۔

اس نے جواب دیا: ناممکن ہے۔ یہ عادل لوگ ہیں اور ان پر جو حکم ہم لگا رہے ہیں وہ عدل پرمبنی ہیں۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ یہ لوگ اپنے عہدے کو اس طرح نہ لیں گے جیسے ہمارے موجودہ حاکم بلکہ اسے ایک ناگزیر ضرورت سمجھیں گے۔

میں نے کہا: ہاں، میرے دوست، یہی تو اصل نکتہ ہے تمھیں اپنے آنے والے حاکموں کے لیے محض ایک حاکم سے مختلف اور بہتر زندگی فراہم کرنی چاہیے۔ تب ہی کہیں تمھاری ریاست میں عمدہ نظام قائم ہوسکتا ہے۔ کیونکہ صرف اس ریاست میں جو یہ زندگی پیش کرتی ہے وہ لوگ حکومت کریں گے جو صحیح معنوں میں دولت مند ہیں، وہ نہیں جو سونا چاندی رکھتے ہیں بلکہ وہ جو خوبی اور عرفان کی دولت سے مالا مال ہیں کہ یہی زندگی کی سچی نعمتیں ہیں۔ برخلاف اس کے اگر یہ لوگ امور عامہ کے انتظام میں مفلس کی حیثیت سے اور اپنے خانگی فوائد کے لیے بھوکے مشغول ہوئے اور لہٰذا سمجھتے رہے کہ انھیں خود اصلی خوبی جھپٹ لینی چاہیے، تو پھر نظم ہرگز باقی نہیں رہ سکتا۔ اس لیے کہ یہ لوگ بس اپنے عہدے اور منصب کے لیے لڑتے رہیں گے اور جو خانگی اور شہری جھگڑے اس سے پیدا ہوں گے وہ خود ان حاکموں اور ساری ریاست کو تباہ اور برباد کر دیں گے۔

اس نے جواب دیا: بالکل صحیح۔

میں نے کہا: اور وہ واحد زندگی جو سیاسی حوصلہ مندی اور ہوس کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے وہ فلسفیانہ زندگی ہے، کیا تم کوئی اور ایسی زندگی جانتے ہو؟

اس نے کہا: سچ یہ ہے کہ میں نہیں جانتا۔

میں نے کہا: اور حکومت کرنے والوں کو حکومت کے اس شغل سے محبت نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ اگر

یہ اس پر فریفتہ ہوئے تو دوسرے رقیب عشاق بھی ہوں گے اور یہ پھر آپس میں لڑیں گے۔

گلوکون نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: تو پھر وہ کون لوگ ہیں جنھیں ہم محافظ بننے پر مجبور کریں؟ یقیناً یہ وہی لوگ ہوں گے جو ریاست کے کاموں میں سب سے عقل مند اور انتظامِ مملکت میں بہترین ہوں اور ساتھ ہی ساتھ یہ دوسرے اعزاز بھی رکھتے ہوں اور ایک دوسری زندگی بھی جو سیاسی زندگی سے بہتر ہو۔

اس نے جواب دیا: بس یہی لوگ ہیں، اور میں انہی کو منتخب کروں گا۔

میں نے کہا: اب کیا اس مسئلے پر غور کریں کہ ایسے محافظ آخر پیدا کیسے ہوں گے اور انھیں تاریکی سے روشنی میں کیسے لایا جائے گا جیسے بیان کیا جاتا ہے کہ بعض لوگ عالمِ اسفل سے ابھر کر دیوتاؤں کے پاس جا پہنچے ہیں۔

اس نے جواب دیا: ضرور۔

میں نے کہا: یہ طریقہ، یہ عمل ایک سیپ کے گھونگے کا چت یا پٹ پلٹ جانا نہیں بلکہ ایک روح کا رخ بدلنا ہے جو ایک ایسے دن سے، جو رات سے بمشکل بہتر تھا، اب وجود کے اصلی روزِ روشن میں آ رہی ہے یعنی اسفل سے اعلیٰ کی طرف پرواز کر رہی ہے اور یہی ہمارے دعویٰ کے مطابق سچا فلسفہ ہے۔

گلوکون نے کہا: بجا ہے۔

میں نے کہا: اور کیا اب ہم یہ دریافت نہیں کریں کہ ایسا تغیر پیدا کرنے کی طاقت کس علم میں ہے؟

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: تو گلوکون، وہ کون سا علم ہے جو روح کو شہود سے حقیقی وجود کی طرف کھینچے گا؟ اور ہاں، ابھی ابھی ایک اور بات دھیان میں آئی۔ تمھیں یاد ہوگا کہ ہمارے نوجوانوں کو جنگی پہلوان بھی تو ہونا چاہیے۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔ یہ تو کہا جا چکا ہے۔

میں نے کہا: تو اس نئی قسم میں ایک اور اضافی صفت بھی ہونی چاہیے؟

گلوکون نے کہا: یہ کون سی صفت؟

میں نے کہا: جنگ میں مفید اور کارآمد ہونا۔

گلوکون نے کہا: ہاں، اگر ممکن ہو۔

میں نے کہا: ہماری تعلیم کی پچھلی تجویز میں دو حصے تھے نا؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: ایک ورزش تھی جو جسمانی نشوونما اور انحطاط کی نگران تھی، لہٰذا اسے، تخلیق اور تخریب سے متعلق سمجھنا چاہیے۔

گلوکون نے کہا: بجا۔

میں نے کہا: تو پھر یہ تو وہ علم نہیں ہے، جس کے اکتشاف کے ہم متلاشی ہیں؟

گلوکون نے کہا: نہیں۔

میں نے کہا: لیکن موسیقی کے متعلق کیا کہتے ہو کہ یہ بھی ایک حد تک ہماری پچھلی تجویز میں شامل تھی؟

اس نے کہا: آپ کو یاد ہوگا کہ موسیقی ورزش کی مد مقابل تھی اور عادت کے اثر سے محافظوں کی تربیت کرتی تھی، یعنی اپنے تناسب سے ان میں تناسب، اور اپنے توازن سے ان میں توازن پیدا کرتی تھی لیکن یہ ان کے لیے حکمت فراہم نہیں کرتی تھی۔ یہی حال لفظوں کا تھا کہ خواہ یہ محض افسانہ ہوں یا ممکن ہے سچ ہوں، تناسب اور توازن کے عناصر ان میں شامل ہوتے تھے۔ لیکن موسیقی میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جو اس "خیر" کی طرف لے جاتی ہو جس کی اب آپ کو تلاش ہے۔

میں نے کہا: تمھاری یادداشت بہت صحیح ہے۔ موسیقی میں بے شک اس قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔ لیکن عزیز من، گلوکون! آخر یہ مطلوب صفت علم کی کس شاخ میں ہو سکتی ہے؟ ہم تمام کارآمد فنون کو تو گھٹیا قرار دے چکے ہیں۔

اس نے کہا: بے شک۔ اگر ورزش اور موسیقی کو نکال دیجیے اور پھر فنون کو بھی خارج کر دیجیے تو باقی کیا رہ جاتا ہے؟

میں نے کہا: ہاں، ممکن ہے ہمارے مخصوص مضامین میں کچھ باقی نہ رہے، اور پھر ہمیں کوئی ایسی چیز لینی ہو جو کسی خاص چیز پر نہیں بلکہ عالمگیر طور پر کارفرما ہوتی ہے۔

گلوکون نے کہا: ایسی کون سی چیز ہو سکتی ہے؟

میں نے کہا: یہ وہ چیز ہوگی جسے تمام علوم، فنون اور عقلیں مشترک طور پر استعمال کرتی ہیں اور جو ہر شخص کو ابتدائی تعلیم میں سیکھنا پڑتی ہے۔

گلوکون نے کہا: وہ کیا؟

میں نے کہا: یہ چھوٹی سی بات یعنی ایک، دو، تین میں تمیز کرنا یعنی مختصراً گنتی اور حساب۔ کیا سب کے سب علم اور فن لازمی طور سے انھیں استعمال نہیں کرتے۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: کیا فن جنگ بھی استعمال کرتا ہے؟

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: پالامیڈیس ہمیشہ جب بھی وہ المیہ ناٹک میں سامنے آتا ہے، تو آگا میمنون کو سپہ سالاری کے لیے کس درجے مضحکہ خیز طور پر نااہل ثابت کرتا ہے۔ کیا تم نے کبھی اس بات پر دھیان نہیں دیا کہ وہ کس طرح اعلان کرتا ہے کہ عدد اس نے ایجاد کیے، جہازوں کو گنا، اور ٹرائے میں فوج کو صف بستہ کیا؟ جس سے مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے کبھی انھیں گنا نہیں گیا تھا! آگا میمنون کے متعلق سمجھنا چاہیے کہ وہ اپنے پاؤں تک گننے سے قاصر تھا۔ اور جب عدد سے ہی ناواقف ہو تو آخر گنے بھی کیسے؟ اگر یہ سچ ہے تو وہ کیسا سپہ سالار رہا ہوگا؟

گلوکون نے کہا: اگر واقعہ آپ کے بیان کے مطابق تھا تو میں کہوں گا کہ عجیب وغریب سپہ سالار تھا۔

میں نے کہا: کیا ہم اس سے انکار کر سکتے ہیں کہ ایک جنگ آزما سپاہی کو حساب کا علم ہونا چاہیے؟

گلوکون نے کہا: یقیناً اگر یہ فوجی چالوں کو ذرا بھی سمجھنا چاہتا ہے، بلکہ میں تو کہوں گا کہ اگر مطلق طور پر آدمی ہی ہونا چاہتا ہے تو اسے ضرور یہ علم ہونا چاہیے۔

میں نے کہا: میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا اس علم کے متعلق تمھارا بھی وہی خیال ہے جو میرا ہے؟

گلوکون نے کہا: آپ کا کیا خیال ہے؟

میں نے کہا: مجھے تو یہ اس قسم کا علم معلوم ہوتا ہے جس کے ہم متلاشی ہیں۔ اور جو قدرتی طور پر تامل اور تفکر کی طرف لے جاتا ہے۔ لیکن اسے کبھی صحیح طور سے استعمال نہیں کیا گیا، کیونکہ اس کا صحیح استعمال تو بس روح کو وجود کی طرف کھینچتا ہے۔

اس نے کہا: کیا آپ ذرا اپنے مفہوم کی وضاحت فرمائیں گے؟

میں نے کہا: کوشش کروں گا، اور میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اس تحقیق میں میرے شریک بنو اور جب

میں اپنے ذہن میں علم کی ان شاخوں کو الگ الگ کرنے کی کوشش کروں جن میں یہ قوتِ جاذبہ موجود ہے تو تم ذرا 'ہاں' یا 'نہیں' کہتے جانا۔ تاکہ ہم پر ذرا اور وضاحت سے ثابت ہو جائے کہ حساب کا علم میرے گمان کے مطابق منجملہ ان علوم کے ہے یا نہیں۔

اس نے کہا: بہت خوب فرمائیے۔

میں نے کہا: میرا مطلب یہ ہے کہ حسی چیزیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ بعض تو فکر اور تحقیق کی طرف توجہ نہیں کرتیں اس لیے کہ ان کے بارے میں مشاہدہ کافی حکم ہے، برخلاف اس کے دوسری قسم کی چیزوں کے بارے میں حواس اس درجہ بے بھروسا ہیں کہ مزید تحقیق شدت کے ساتھ درکار ہوتی ہے۔

اس نے کہا: ظاہر ہے کہ آپ کا اشارہ اس طرف ہے کہ حواس فاصلے سے یا روشنی اور سایے کی مصوری سے کس طرح دھوکا کھا جاتے ہیں۔

میں نے کہا: نہیں نہیں یہ مطلقاً میرا مفہوم نہیں۔

اس نے کہا: تو پھر اور آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں نے کہا: فکر کو متوجہ نہ کرنے والی چیزوں سے مراد ان سے ہے جو ایک حس سے دوسری مخالف حس میں نہیں پہنچتے، اور متوجہ کرنے والے وہ ہیں جو پہنچتے ہیں۔ اس دوسری صورت میں حاسہ جب کسی چیز پر عمل کرتا ہے تو چاہے نزدیک سے ہو یا دور سے، سوائے اس کی ضد کے اور کسی دوسری چیز کا اتنا واضح تصور پیدا نہیں کرتا۔ ایک تمثیل سے میرے معنی زیادہ صاف ہو جائیں گے۔

یہ دیکھو، تین انگلیاں ہیں۔ چھوٹی انگلی، دوسری انگلی اور بیچ کی انگلی۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: فرض کرو کہ انھیں بالکل قریب سے دیکھا جا رہا ہے۔ اور سنو، اب اصلی نکتہ آتا ہے۔

گلوکون نے کہا: وہ کیا؟

میں نے کہا: ان میں سے ہر ایک مساوی طور پر انگلی معلوم ہوتی ہے، خواہ اسے بیچ میں دیکھو یا سرے پر، خواہ یہ سفید ہو یا سیاہ، موٹی ہو کہ پتلی۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ انگلی بہر حال انگلی ہی ہے۔ ایسی حالت میں انسان فکر اور عقل سے یہ سوال کرنے پر مجبور نہیں ہوتا کہ انگلی کیا چیز ہے؟ کیونکہ باصرہ کبھی ذہن کو یہ نہیں بتاتی کہ انگلی علاوہ انگلی کے اور کچھ ہے۔

گلوکون نے کہا: درست۔

میں نے کہا: چنانچہ ہماری توقع کے مطابق اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو سمجھ یا عقل کی دعوت یا تحریک کا باعث ہو۔

اس نے کہا: بے شک نہیں ہے۔

میں نے کہا: لیکن انگلیوں کی بڑائی اور چھوٹائی کے متعلق بھی کیا یہ بات ایسی ہی صحیح ہے؟ کیا باصرہ انھیں کافی طور پر محسوس کر سکتی ہے اور کیا اس امر سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایک انگلی بیچ میں ہے اور ایک سرے پر؟ اسی طرح کیا لامسہ موٹے یا پتلے پن کو کافی صحت کے ساتھ محسوس کر سکتی ہے یا سختی اور نرمی کو اسی طرح سے دوسرے حواس بھی، کیا ایسے امور میں کامل اطلاع بخشتے ہیں؟ کیا ان کے عمل کا طریقہ کچھ اس قسم کا نہیں جو حس سختی کی صفت سے متعلق ہے وہی لازمی طور پر نرمی سے بھی تعلق رکھتی ہے اور روح کو بس یہ اطلاع پہنچاتی ہے کہ ایک ہی چیز سخت اور نرم دونوں طرح محسوس ہوتی ہے۔

اس نے کہا: آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں۔

میں نے کہا: اور کیا روح اس اطلاع پر پریشان نہ ہوتی ہوگی جو حاسہ ایک ایسی سخت چیز کے متعلق دیتا ہے جو نرم بھی ہے! پھر اسی طرح دیکھو کہ ہلکے اور بھاری کے آخر کیا معنی ہیں جب ہر وہ شے جو ہلکی ہے وہی بھاری بھی ہے اور ہر بھاری چیز ہلکی بھی ہے۔

اس نے کہا: جی، بے شک۔ یہ اطلاعات جو روح کو پہنچتی ہیں کچھ عجیب وغریب ہیں اور توضیح کی محتاج ہیں۔

میں نے کہا: ان پیچیدگیوں میں روح فطری طور پر اپنی مدد کے لیے سمجھ اور حساب کو طلب کرتی ہے تاکہ یہ دیکھ سکے کہ یہ جو مختلف چیزیں اس کے سامنے پیش کی گئی ہیں ایک ہی ہیں یا دو۔

گلوکون نے کہا: درست۔

میں نے کہا: اور اگر یہ دو نکلیں تو کیا ان میں سے ہر ایک خود ایک اور جداگانہ (چیز) نہیں؟

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: اور جب ان میں سے ہر خود ایک ہے اور دونوں مل کر 'دو' ہیں تو روح ان دو کو تقسیم کی حالت میں تصور کرے گی۔ کیونکہ اگر یہ غیر منقسم ہوتے تو ان کا تصور صرف ایک ہی کی حیثیت سے ہو سکتا۔

گلوکون نے کہا: درست۔

میں نے کہا: آنکھ نے بلاشبہ چھوٹے اور بڑے دونوں کو دیکھا تھا، لیکن یونہی صرف ایک مبہم طور پر۔ یہ دونوں باہم دگر ممتاز نہ تھے۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: برخلاف اس کے اس گتھی کو سلجھانے کے لیے فکری ذہن اس عمل کے طریقے کو بالکل پلٹ دینے پر مجبور ہوا اور اس نے چھوٹے اور بڑے پر مخلوط حیثیت سے نہیں بلکہ جدا جدا نظر کی۔

گلوکون نے کہا: بہت صحیح۔

میں نے کہا: تو کیا اس تحقیق کا آغاز یہ نہ تھا کہ ''بڑا کیا ہے'' اور ''چھوٹا کیا''؟

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: چنانچہ اس طرح مرئی اور مفہوم کی تفریق پیدا ہوتی۔

گلوکون نے کہا: بالکل درست۔

میں نے کہا: جب میں نے ان آثار کا ذکر کیا تھا جو عقل کو متوجہ کرتے ہیں اور ان کا جو متوجہ نہیں کرتے تو اس سے میرا مطلب یہ تھا۔ جن آثار کے ساتھ ساتھ ان کی ضد بھی ہو وہ فکر کو متوجہ کرتے ہیں اور جن کے ساتھ نہ ہو وہ نہیں کرتے۔

اس نے کہا: میں سمجھ گیا اور آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔

میں نے کہا: اور وحدت اور عدد ان میں سے کس قسم میں آتے ہیں؟

اس نے کہا: میں نہیں جانتا۔

میں نے کہا: ذرا غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ہماری پچھلی گفتگو سے اس کا جواب مل جاتا ہے۔ اس لیے کہ اگر ہم محض سادہ وحدت کو باصرہ یا کسی دوسری حس سے محسوس کر سکتے ہیں تو جیسا کہ ہم انگلی کے بارے میں کہہ چکے ہیں اس میں بھی کوئی چیز مطلق وجود کی طرف کھینچنے والی نہ ہوتی۔ لیکن جہاں ہمیشہ ایک ضد موجود ہو اور ایک ایک کا الٹا بھی ہو اور وحدت میں کثرت کا تصور بھی مضمر ہو تو پھر ہم میں فکر کو تحریک ہوتی ہے اور پریشان روح فیصلے پر پہنچنے کے لیے سوال کرتی ہے کہ ''مطلق وحدت کیا ہے؟'' اس واسطے وحدت کے مطالعے میں دماغ کو مطلق وجود کے سوچنے کی طرف مائل کرنے کی قوت مضمر ہے۔

اس نے کہا: اور یقیناً یہ بات وحدت کے معاملے میں تو اور بھی خاص طور پر پائی جاتی ہے اس لیے کہ اسی چیز کو ہم وحدت کی حیثیت سے بھی دیکھتے ہیں اور کثرت کی حیثیت سے بھی جو لا محدود ہے۔

میں نے کہا: ہاں اور جب یہ وحدت کے متعلق ٹھیک ہے تو اور اعداد کے متعلق بھی ایسا ہی درست ہوگا؟

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: اور تمام حساب اور گنتی شمار کو عددوں ہی سے تو واسطہ ہے؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ ذہن کو صداقت کی طرف لے جاتے ہیں۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں ایک بہت خاص انداز سے۔

میں نے کہا: تو یہی اس قسم کا علم ہے جس کی ہمیں تلاش ہے، یعنی جس کا دوہرا استعمال ہو، فوجی اور فلسفیانہ جنگی آدمی کو اعداد کا فن سیکھنا لازمی ہے ورنہ وہ اپنی فوجوں کو صف بستہ کرنا نہیں جانے گا اور فلسفی کو بھی ضروری ہے کہ یہ تغیر کے بیکراں سمندر سے نکل کر حقیقی وجود کو پانا چاہتا ہے۔ چنانچہ اسے بھی حساب دان ہونا ضروری ہے۔

گلوکون نے کہا: بجا ہے۔

میں نے کہا: اور ہمارا محافظ تو سپاہی بھی ہوگا اور فلسفی بھی؟

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: لہٰذا یہ ایسا علم ہے جسے قانون بنانے والے بجا طور پر لازم قرار دے سکتے ہیں۔ اور ہمیں اپنی ریاست کے مستقبل کے خواص کو رغبت دلانی چاہیے کہ وہ حساب کو محض شوقیہ مبتدیوں کی طرح نہ سیکھیں بلکہ اس وقت تک اس کا مطالعہ جاری رکھیں جب تک خالص ذہن سے وہ اعداد کی ماہیت کو نہ دیکھ لیں، اسی طرح اس کا مطالعہ تاجروں اور خوردہ فروشوں کی طرح خرید و فروخت کے خیال سے نہیں بلکہ اس کے فوجی فائدے اور خود روح کی خاطر کریں۔ کیونکہ روح کے لیے شہود سے صداقت اور مطلق وجود تک پہنچنے کا یہ سب سے سہل راستہ ہے۔

گلوکون نے کہا: بہت ہی خوب۔

میں نے کہا: ہاں اب جب کہ یہ ذکر ہو چکا ہے مجھے یہ بھی اضافہ کر دینا چاہیے کہ یہ کس قدر دلفریب علم ہے! اور اگر دکانداروں کی طرح نہیں بلکہ فلسفیانہ انداز سے اسے حاصل کیا جائے تو ہمارے مقصد کے حصول میں کس کس طریقے سے مدد ہو سکتا ہے۔

گلوکون: کیسے کیسے؟

میں نے کہا: جیسا کہ میں کہہ رہا تھا، حساب کا علم نہایت عظیم الشان اور رفعت بخش اثر رکھتا ہے، یہ روح کو مجرد اعداد کے متعلق توجیہ اور تعقل پر مجبور کرتا اور جہاں کہیں دلیل میں مرئی یا محسوس چیزیں داخل ہوئیں بگڑ بیٹھتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ اس فن کے اساتذہ کس پامردی سے ہر اس شخص کو رد کرتے اور اس کا مضحکہ اڑاتے ہیں جو ان کے حساب کرنے میں مطلق وحدت کو تقسیم کرنے کی کوشش کرتا ہے، اگر تم ادھر تقسیم کرو وہ ادھر ضرب دے دیتے ہیں تا کہ وحدت وحدت باقی رہے اور کسروں میں گم نہ ہو جائے۔

گلوکون: بالکل بجا۔

میں نے کہا: اب اگر ان سے کوئی شخص پوچھے کہ "اے میرے دوستو! یہ جن عجیب و غریب اعداد کے متعلق تم بحث کر رہے ہو، یہ ہیں کیا کہ ان میں بقول تمھارے تمھاری مطلوبہ وحدت بھی ہے اور ہر واحد مساوی، غیر متغیر اور غیر تقسیم پذیر ہے، تو یہ کیا جواب دیں گے؟

گلوکون نے کہا: میرے خیال کے مطابق تو وہ یہ جواب دیں گے کہ ہم ان اعداد کا ذکر کر رہے ہیں جو صرف فکر و خیال میں حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

میں نے کہا: ہاں، تو تم نے دیکھا کہ ہم اس علم کو بجا طور پر لازمی کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اس میں خالص صداقت کے حصول کے لیے خالص فہم اور عقل کا استعمال ضروری ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔ یہ اس کی ایک ممتاز خصوصیت ہے۔

میں نے کہا: اور تم نے کبھی یہ بھی دیکھا ہے کہ جن لوگوں میں حساب کا فطری ملکہ ہوتا ہے وہ دوسری قسم کے علم میں بھی عام طور پر تیز ہوتے ہیں اور اگر غبی لوگوں کو بھی حساب کی تعلیم دی جائے، تو چاہے اس سے وہ کوئی اور فائدہ نہ اٹھائیں، لیکن اس سے زیادہ ذکی اور تیز ضرور ہو جاتے ہیں جتنا کہ دوسری صورت میں ہوتے۔

گلوکون نے کہا: بہت درست۔

میں نے کہا: اور واقعہ یہ ہے کہ اس سے مشکل علم بھی آسانی سے نہ ملے گا اور نہ بہت سے علم اس جیسے دشوار۔

گلوکون نے کہا: ہاں نہیں ملے گا۔

میں نے کہا: چنانچہ ان وجوہ سے حساب علم کی ایسی قسم ہے جس کی تعلیم بہترین طبیعتوں کو دینی چاہیے اور اسے ہرگز ترک نہیں کرنا چاہیے۔

گلوکون نے کہا: میں اتفاق کرتا ہوں۔

میں نے کہا: اچھا تو منجملہ تعلیمی مضامین کے ایک تو یہ ہوا۔ اب اس کے بعد کیا اس بات کی تحقیق کریں کہ آیا اس سے بہت قریب کا تعلق رکھنے والے علم سے بھی ہمیں سروکار ہوگا یا نہیں۔

گلوکون نے کہا: آپ کا مطلب "ہندسے" سے ہے؟

میں نے کہا: بالکل۔

گلوکون نے کہا: ظاہر ہے کہ ہندسے کے اس حصے سے تو ہمیں واسطہ ہے ہی جو جنگ سے متعلق ہے۔ کیونکہ پڑاؤ ڈالنے، کوئی موقع اختیار کرنے، اپنی فوج کی صفوں کو مجتمع کرنے یا وسعت دینے یا کسی دوسری فوجی حرکت میں خواہ اصلی معرکۂ جنگ ہو یا فوجی نقل وحرکت میں، اس بات سے بہت بڑا فرق پڑے گا کہ سپہ سالار مہندس ہے یا نہیں۔

میں نے کہا: ہاں، لیکن اس غرض کے لیے تو بہت تھوڑا سا ہندسہ یا حساب کافی ہوگا۔ سوال تو دراصل ہندسے کے بڑے اور زیادہ اعلیٰ حصے کا ہے کہ آیا یہ عین خیر کے نظارے کو کسی درجے میں زیادہ سہل بناتا ہے یا نہیں۔ اور جیسا کہ میں کہہ رہا تھا، اس غرض کے لیے ہر وہ چیز مدد دیتی ہے جو روح کو اس طرف دیکھنے پر مجبور کرے۔ جہاں وجود کا کمال اعلیٰ ترین حالت میں ہے اور جو اس کو بہرصورت دیکھنا چاہیے۔

اس نے کہا: سچ ہے۔

میں نے کہا: چنانچہ اگر ہندسہ ہمیں وجود کے دیکھنے پر مجبور کرتا ہے تو ہمیں اس سے واسطہ ہے، اور اگر صرف شہود کے دیکھنے پر مجبور کرے تو ہمیں اس سے کچھ سروکار نہیں۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔ یہ تو ہمارا دعویٰ ہی ہے۔

میں نے کہا: تاہم کوئی شخص جسے ہندسے سے ذرا بھی واقفیت ہو وہ اس سے انکار نہیں کرے گا کہ

اس علم کا یہ تصور ہندسے کے ماہروں کی معمولی گفتار کے بالکل منافی ہے۔

گلوکون نے کہا: یہ کیسے؟

میں نے کہا: ان لوگوں کے پیش نظر بس اس کی علمی حیثیت ہوتی ہے، یہ ہمیشہ نہایت تنگ نظر اور مضحکہ خیز انداز سے مربع کرنے، وسعت دینے، وضع کرنے، یا اسی قسم کی اور باتوں کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ یہ ہندسے کی ضرورتوں کو روزانہ زندگی کی ضرورتوں سے خلط ملط کر دیتے ہیں حالانکہ اس ساری حکمت کا اصلی مقصد علم اور جاننا ہے۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: تو پھر ایک اقرار اور درکار ہے۔

گلوکون نے کہا: وہ کون سا اقرار؟

میں نے کہا: یہ کہ جو علم ہندسہ کا مقصود ہے وہ ازلی اور ابدی چیزوں کا علم ہے، کسی فانی اور عارضی شے کا نہیں۔

اس نے کہا: یہ تو فوراً تسلیم کیا جا سکتا ہے اور سچ بھی ہے۔

میں نے کہا: تو پھر میرے مکرم دوست، ہندسے کا علم روح کو صداقت کی طرف کھینچے گا۔ فلسفے کا جذبہ پیدا کرے گا، اور اس چیز کو رفعت بخشے گا جسے آج کل بدبختی سے نیچے گرنے دیا جاتا ہے۔

اس نے کہا: یہ اثر غالباً کوئی اور دوسری چیز اس طرح نہ پیدا کر سکے۔

میں نے کہا: چنانچہ کوئی اور چیز اتنی سختی سے نافذ نہ کی جائے جتنی یہ کہ ہمارے حسین شہر کے باشندے ہر حالت میں ہندسہ سیکھیں۔ علاوہ بریں اس علم کے اور بالواسطہ اثرات بھی ہیں جو کچھ کم نہیں۔

اس نے کہا: وہ کس قسم کے اثرات ہیں؟

میں نے کہا: مثلاً فوجی فائدے ہیں جن کا تم نے ذکر کیا اور اس کے علاوہ علم کی تمام شاخوں میں تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ جس شخص نے ہندسے کا مطالعہ کیا ہے وہ اس شخص کے مقابلے میں بہت ذکی الفہم ہوتا ہے جس نے اسے نہیں سیکھا۔

اس نے کہا: ہاں۔ بلاشبہ، ان میں زمین اور آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

میں نے کہا: تو پھر نوجوانوں کے مطالعے کے لیے اسے علم کی دوسری شاخ کی حیثیت سے تجویز

کردیں؟

گلوکون نے کہا: ضرور۔

میں نے کہا: اور فرض کرو ہیئت کو ہم تیسری شاخ بنادیں۔ تمھاری کیا رائے ہے؟

گلوکون نے کہا: میرا اس طرف بہت میلان ہے۔ موسموں اور ماہ وسال کا مشاہدہ سپہ سالار کے لیے بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ کسان یا جہاز ران کے لیے۔

میں نے کہا: میں تمھارے دنیا کے ڈر سے بہت محظوظ ہوتا ہوں کہ تم کیسے اپنے آپ کو اس بات سے بچاتے ہو کہ کہیں یہ نہ ظاہر ہو کہ بے کار چیزوں کے مطالعے پر اصرار کر رہے ہو۔ اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس بات کا یقین بڑا دشوار ہے کہ ہر انسان میں ایک روحانی آنکھ ہوتی ہے کہ جب یہ دوسرے مشاغل سے دھندلی پڑ جاتی یا ضائع ہو جاتی ہے تو پھر یہ علم اسے دوبارہ روشن کرتے ہیں۔ اور یہ آنکھ دس ہزار جسمانی آنکھوں سے زیادہ بیش قیمت ہے کہ بس اسی کے ذریعے صداقت کا دیکھنا ممکن ہوتا ہے۔ اب سنو، انسانوں کے دو گروہ ہیں۔ ایک وہ جو تم سے اتفاق کرے گا۔ اور تمھارے لفظوں کو وحی والہام سمجھے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جسے یہ محض لایعنی باتیں معلوم ہوں گی اور وہ انھیں محض خوش گپیاں تصور کرے گا کیونکہ ان کی نظر میں ان سے کسی قسم کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ لہٰذا بہتر ہے کہ فوراً اس امر کا فیصلہ کر لو کہ ان دو طبقوں میں سے تم کس سے دلیل کرنا چاہتے ہو غالب گمان یہ ہے کہ تم کہو گے کہ کسی سے نہیں، اور دلیل کے جاری رکھنے میں تمھارا اصلی مقصد خود اپنی بہتری ہے لیکن پھر بھی دوسروں کو اس تھوڑے بہت فائدے سے کیوں محروم رکھو جو وہ حاصل کر سکتے ہیں۔

گلوکون نے کہا: میں تو خود اپنے ہی لیے دلیل کو جاری رکھنے کو ترجیح دیتا ہوں۔

میں نے کہا: تو ایک قدم پیچھے ہٹاؤ، کیونکہ ہم علوم کی ترتیب میں غلط راستہ پر چل پڑے ہیں۔

گلوکون نے کہا: آخر کیا غلطی ہوئی؟

میں نے کہا: سطحی ہندسہ سے، بجائے اس کے کہ ہم محض اجسام صلب کر لیتے، ہم ایک دم متحرک اجسام پر پہنچ گئے۔ حالانکہ دوسری قدر مساحت کے بعد تیسری کو آنا چاہیے تھا جن کا تعلق مکعب اور عمق کے ابعاد سے ہے۔

گلوکون نے کہا: جناب سقراط، یہ سچ ہے، لیکن ان مضامین کے متعلق فی الحال تو بظاہر بہت کم

معلوم ہے۔

میں نے کہا: ہاں، کیوں نہ ہو۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی تو یہ کہ کوئی حکومت ان کی سرپرستی نہیں کرتی جس کی وجہ سے ان کے اوپر محنت کم صرف کی جاتی ہے، اور ہیں یہ مشکل۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب تک کوئی راہ بتانے والا نہ ہو طلبہ انھیں سیکھ نہیں سکتے۔ اور رہنما شاذ ہی دستیاب ہوتا ہے اور اگر ہو بھی سکے تو موجودہ صورت حال کچھ ایسی ہے اور طلبہ کچھ ایسے برخود غلط ہیں کہ اس کی بات پر دھیان نہیں دیتے۔ یہ صورت بالکل بدل جائے اگر کل ریاست ان علوم کی رہنما بن جائے اور ان کی حیثیت کو بلند کر دے۔ پھر شاگرد آتا جا ہیں گے، مسلسل اور مخلصانہ تلاش اور جستجو ہوگی، اکتشافات ہوں گے۔ کیونکہ اب بھی کہ دنیا ان کی طرف سے بے پروا ہے اور ان کا حسنِ تناسب مجروح اور خود ان کے شیدائیوں میں کوئی بھی ان کا استعمال اور افادہ نہیں بتا سکتا، تاہم یہ اپنی فطری دلفریبی کے سہارے گھس بیٹھ کر اپنی جگہ نکال ہی لیتے ہیں۔ اگر انھیں ریاست کی امداد ملے تو بہت ممکن ہے یہ کسی دن (تاریکی سے) روز روشن میں نکل آئیں۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔ ان میں ایک عجیب دلکشی ہے۔ لیکن میں اس تغیر کو نہیں سمجھا جو آپ نے ترتیب میں کیا۔ پہلے آپ نے مستوی سطحوں کے ہندسے سے شروع فرمایا تھا نا؟

میں نے کہا: جی ہاں۔

گلوکون نے کہا: پھر آپ نے ہیئت کو اس کے بعد رکھا اور بعد میں ایک قدم پیچھے ہٹے؟

میں نے کہا: ہاں۔ میں نے جلدی کی اور اس کا نتیجہ نکلا دیر۔ اجسام صلب کے ہندسے کی مضحکہ خیز حالت نے مجھے اس شاخ پر سے گزار دیا حالانکہ قدرتی ترتیب سے باری اسی کی تھی اور میں ہیئت یعنی متحرک اجسام پر جا پہنچا۔

گلوکون نے کہا: درست۔

میں نے کہا: یہ فرض کر کے کہ جس علم کو ہم نے ابھی حذف کر دیا تھا وہ ریاست کی ہمت افزائی سے وجود میں آ جائے گا ہم ہیئت پر پہنچتے ہیں جس کا نمبر چوتھا ہے۔

اس نے کہا: یہ بہت صحیح ترتیب ہے۔ پہلے میں نے جس بھونڈے پن سے ہیئت کی مدح کی تھی اس پر چونکہ آپ نے ہجو ملیح فرمائی اس لیے اب کی مرتبہ میری مدح سرائی آپ کے خیال کے مطابق ہوگی۔ کیونکہ میرے خیال میں ہر شخص کو دیکھنا چاہیے کہ ہیئت روح کو اوپر پہنچنے پر مجبور کرتی ہے اور ہمیں اس دنیا سے ایک

دوسرے عالم کی طرف لے جاتی ہے۔

میں نے کہا: ہاں سوائے میرے ہر کسی کو۔ اور ہر کسی کے لیے ممکن ہے یہ بات واضح ہو لیکن میرے لیے تو نہیں۔

گلوکون نے کہا: اور آپ کیا فرماتے ہیں۔

میں نے کہا: میں تو یہ کہوں گا کہ جو لوگ ہیئت کو فلسفے کا بلند درجہ دیتے ہیں وہ ہم سے بلندی کی طرف نہیں دکھواتے بلکہ پستی کی طرف۔

گلوکون نے کہا: آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں نے کہا: اوپر والی چیزوں کے متعلق آپ کا خیال واقعی بہت بلند ہے۔ اور میں یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص اپنا سر پیچھے ڈال کر چھت کی تصویروں کو دیکھتا ہو تو آپ کے نزدیک اس وقت بھی اس کی آنکھیں نہیں بلکہ اس کا دماغ ادراک کرتا رہتا ہے۔ اور کیا عجب ہے کہ آپ ہی صحیح ہوں اور میں ممکن ہے کہ بس ایک سادہ لوح بے وقوف ہوں۔ لیکن میری رائے میں صرف وہی علم روح کو نظر کی بلندی عطا کرتا ہے جو حقیقی وجود اور غیر مرئی کا علم ہو۔ اور یوں چاہے انسان منہ پھاڑ کر آسمان کو گھورے یا جھک جھک کر زمین پر نظر ڈالے تا کہ کسی حسی خاصے کا علم حاصل کر لے تو میں تو ہر دو حال میں اس کا منکر ہوں کہ وہ کچھ سیکھ سکتا ہے۔ کیونکہ اس قسم کی کوئی چیز حکمت کا موضوع نہیں۔ اس کی روح کی نگاہ پستی کی جانب ہے بلندی کی طرف نہیں۔ خواہ اس کے علم کی راہ، خشکی کے ذریعے ہو خواہ تری کے، چاہے وہ پانی پر تیرتا پھرے، یا خالی زمین پر اپنی پیٹھ لگائے لیٹا ہو۔

گلوکون نے کہا: میں آپ کے طعن کو حق بجانب تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن پھر بھی میں یہ ضرور معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ہیئت کی تحصیل کا وہ کون سا دوسرا طریقہ ہے جس سے وہ اس علم میں مدد دے سکے جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔

میں نے کہا: عرض کرتا ہوں اس مرئی زمین پر یہ تاروں بھرا آسمان جو ہم تنا دیکھتے ہیں اس کی تصویریں اگرچہ مرئی چیزوں میں سب سے حسین اور کامل چیز ہیں تاہم مطلق رفتار اور مطلق سکون کے مقابلے میں لازمی طور پر اسے ادنیٰ درجہ دینا پڑتا ہے جو ایک دوسرے سے نسبت رکھتی اور ہر حقیقی عدد اور ہر حقیقی شکل میں اپنے ساتھ اپنے مافیہ کو رکھتی ہیں۔ اور ان کا ادراک عقل اور فہم ہی سے ہوتا ہے، باصرہ سے نہیں۔

اس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: ان مرصع افلاک کو اس اعلیٰ علم کی غرض کے لیے بطور نمونہ استعمال کرنا چاہیے۔ ان کا حسن ان نقوش اور تصاویر کا سا حسن ہے جنھیں ڈیڈالس (Daedalus) یا کسی دوسرے بڑے مصور کے ہاتھ نے نہایت خوبی سے بنایا ہے اور جو اب اتفاق سے ہمارے پیش نظر ہے، اگر کوئی مہندس انھیں دیکھے تو ضرور ان کی کاریگری کی نفاست کی داد دے لیکن یہ خیال تو اس کے خواب میں بھی نہیں گزرے گا کہ ان میں اسے حقیقی مساوی ملے گا یا حقیقی دوچند یا کسی اور نسبت کی حقیقت۔

اس نے کہا: جی ہرگز نہیں۔ یہ خیال تو مضحکہ خیز ہوگا۔

میں نے کہا: تو کیا تاروں کی حرکت دیکھ کر ایک حقیقی ہیئت دان کو بھی ایسا ہی احساس نہ ہوگا؟ وہ یہ ضرور سمجھے گا کہ بنانے والے نے افلاک اور اجرام فلکی کو نہایت کامل قدرت سے مرتب کیا ہے۔ لیکن وہ یہ بھی نہیں خیال کرے گا کہ روز و شب کا تناسب، یا ان دونوں کی نسبت ماہ سے، یا مہینے کی نسبت سال سے اور، اور کوئی چیزیں جو مادی اور مرئی ہوں وہ ابدی اور ناقابل تغیر بھی ہو سکتی ہیں۔ ایسا خیال مہمل ہوگا اور ان کی صحیح حقیقت کی تحقیق بھی اتنی ہی مہمل۔

اس نے کہا: میں بالکل اتفاق کرتا ہوں، اگرچہ میں نے کبھی پہلے اس کا خیال نہیں کیا تھا۔

میں نے کہا: چنانچہ اگر ہم اس مضمون تک صحیح راستے سے پہنچنا اور اس طرح عقل کے فطری عطیے کا کوئی حقیقی استعمال کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ہندسے کی طرح ہیئت میں بھی مسائل کا استعمال کرنا چاہیے، اور افلاک اور سماوات کو الگ رکھنا چاہیے۔

اس نے کہا: یہ کام ہمارے موجودہ ہیئت دانوں سے بہت دور ہے۔

میں نے کہا: ہاں۔ اور اگر ہمیں قوانین سے کچھ بھی فائدہ اٹھانا ہے اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جنھیں اس قسم کی وسعت دینا ضروری ہے۔ کیا تم مجھے کوئی اور مناسب مطالعہ کا مضمون بتا سکتے ہو؟

اس نے کہا: جی نہیں۔ بے سوچے تو نہیں بتا سکتا۔

میں نے کہا: حرکت کی ایک ہی نہیں، بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ دو تو ہماری جیسی عقلوں کے لیے بھی بیّن ہیں اور میں خیال کرتا ہوں اور بھی ہوں گی تو انھیں زیادہ عقل مند لوگوں کے لیے چھوڑ دیں۔

گلوکون نے پوچھا: لیکن وہ دو کون سی ہیں؟

میں نے کہا: ایک کا تو ذکر ہو چکا اور دوسری اسی کی شقیقہ ہے۔

گلوکون نے کہا: یعنی؟

میں نے کہا: اس دوسری قسم کو کانوں سے وہی نسبت ہے جو پہلی کو آنکھوں سے، کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ جیسے آنکھیں ستاروں کی طرف دیکھنے کے لیے بنائی گئی ہیں اسی طرح کان ہم آہنگ حرکتوں کے سننے کے لیے بنے ہیں۔ متبعین فیثا غورث کے بقول یہ دونوں بہنیں بہنیں ہیں۔ اور ہم بھی ان کے قول سے اتفاق کرتے ہیں۔

اس نے جواب دیا: جی ہاں۔

میں نے کہا: لیکن اس کے مطالعے میں بڑی محنت درکار ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم انہی لوگوں کے پاس جا کر اسے سیکھیں۔ یہ لوگ ہمیں بتا سکیں گے کہ آیا ان علوم کے اور کوئی استعمال بھی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہمیں اپنے اعلیٰ مقصد سے بھی چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے۔

اس نے کہا: وہ کیا؟

میں نے کہا: کمال کا ایک درجہ ہے جس تک ہر علم کو پہنچنا ہے اور وہ ہمارے شاگردوں کو بھی حاصل کرنا چاہیے۔ اس میں ناقص رہنا ٹھیک نہیں، جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ یہ لوگ ہیئت میں ناقص رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ ہم آہنگی کے علم میں بھی یہی صورت پیش آتی ہے اور تم تو شاید اس سے واقف بھی ہو۔ اس ہم آہنگی کے استاد بس ان آوازوں اور ان کے باہمی تطابق اور مناسبت کا مقابلہ کرتے ہیں جو سنائی دیں، چنانچہ ماہرین ہیئت کی طرح ان کی محنت بھی رائیگاں جاتی ہے۔

اس نے کہا: ہاں، بخدا۔ یہ لوگ جب اپنے نام نہاد بندھے ہوئے مقامات کے متعلق گفتگو کرتے ہیں تو ان کی باتیں ایسی ہوتی ہیں جیسے کھیل کود۔ یہ اپنے کان تار کے برابر لگا دیتے ہیں جیسے کوئی اپنے پڑوسی کی دیوار سے کان لگا کر چوری چھپے اس کی باتیں سننا چاہتا ہو۔ ان میں سے ایک گروہ مدعی ہے کہ اس نے ایک درمیانی مقام دریافت کر لیا اور اس قلیل ترین وقفے کا پتا لگا لیا جو پیمائش کا معیار قرار دیا جا سکتا ہے۔ دوسرا گروہ وہ اس پر مصر ہے کہ دونوں آوازیں مل کر ایک ہو گئی ہیں۔ بہرحال دونوں فریق اپنی سمجھ پر اپنے کانوں کو فضیلت دیتے ہیں۔

میں نے کہا: آپ کا مطلب ان لوگوں سے ہے جو تاروں کو چھیڑتے اور زحمت دیتے ہیں اور انھیں

اپنے ساز کی کھونٹیوں پر کستے ہیں۔ میں اسی استعارے کو اوپر بڑھا کر ان ضربوں کا ذکر کر سکتا ہوں جو مضراب دیتا ہے اور اسی طرح تاروں پر آواز سے آگے بڑھنے یا پیچھے رہنے کا الزام لگا سکتا ہوں۔ لیکن ان سب سے طبیعت اکتا جائے گی لہٰذا میں بس اتنا کہوں گا کہ میرا مطلب ان لوگوں سے نہ تھا بلکہ میں نے ابھی جو تجویز پیش کی تھی وہ متبعین فیثا غورث کے متعلق تھی کہ ان سے چل کر آہنگ کی بابت دریافت کیا جائے۔ کیونکہ ہیئت دانوں کی طرح یہ دوسرے لوگ بھی غلطی میں پڑے ہوئے ہیں کہ یہ سنے ہوئے نغمے کی تعداد کی تحقیق کرتے ہیں لیکن مجرد مسئلوں تک کبھی نہیں پہنچتے۔ عدد کی فطری ہم آہنگی تک ان کی رسائی نہیں ہوتی اور نہ یہ اس پر غور کرتے ہیں کہ بعض عدد کیوں ہم آہنگ ہوتے ہیں اور بعض کیوں نہیں ہوتے۔

گلوکون نے کہا: یہ تو فانی علم سے بالاتر چیز ہے۔

میں نے کہا: بلکہ ایسی چیز جسے میں مفید کے لفظ سے تعبیر کروں گا، یعنی اس حالت میں تو مفید کہ حسن اور خیر کی خاطر اس کی تلاش ہو لیکن اگر کسی اور نیت سے اس کی تحصیل کی جائے تو محض بے سود۔

گلوکون نے کہا: بہت صحیح۔

میں نے کہا: چنانچہ جب یہ سب علم باہمی ارتباط و ائتلاف کے درجے پر پہنچ جائیں اور پھر ان پر ان کے باہمی تعلقات کے اعتبار سے نظر کی جائے اس وقت (اور اس سے پہلے نہیں) ان کی تحصیل ہمارے مقاصد کے لیے قابل قدر ثابت ہوگی۔ ورنہ اس سے کوئی فائدہ نہیں۔

اس نے کہا: میرا بھی کچھ ایسا ہی گمان ہے۔ لیکن جناب سقراط! آپ تو ایک بڑے پھیلے ہوئے کام کا ذکر کر رہے ہیں۔

میں نے کہا: آپ کا کیا مطلب ہے؟ مقدمے سے یا اور کچھ؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ یہ سب کچھ اس اصلی کام کا مقدمہ ہے جو ہمیں سیکھنا ہے؟ کیونکہ آپ یقیناً ایک ماہر ریاضی داں کو منطقی تو نہیں مانیں گے؟

گلوکون نے کہا: یقیناً نہیں۔ میں تو مشکل سے کسی ایسے ریاضی داں کو جانتا ہوں جس میں تعقل کی صلاحیت ہو۔

میں نے کہا: لیکن کیا تم سمجھتے ہو کہ جن لوگوں میں تعقل کے داد و ستد کی صلاحیت نہ ہو ان میں وہ علم ہوگا جو ہمیں ان سے مطلوب ہے؟

اس نے کہا: نہ یہ فرض کیا جا سکتا ہے۔

میں نے کہا: چنانچہ، گلوکون ہم بالآخر منطق کی مدح پر آن پہنچے۔ یہ وہ لے ہے جو صرف ذہن سے متعلق ہے لیکن پھر بھی قوت باصرہ اس کی نقالی کرتی ہے۔ تمھیں یاد ہوگا کہ ہم نے باصرہ کا تخیل یوں کیا تھا کہ وہ کچھ عرصے کے بعد حقیقی جانوروں اور ستاروں کو اور بالآخر خود آفتاب کو دیکھ سکتی ہے۔ یہی حال منطق کا ہے، جب کوئی شخص صرف عقل کی روشنی میں بلاحواس کی مدد کے انکشاف مطلق کے لیے نکلتا ہے اور اس وقت تک ثابت قدم رہتا ہے کہ خالص عقل کے ذریعے مطلق خیر کا ادراک حاصل کر لے تو وہ آخرکار اپنے آپ کو ذہنی دنیا کے کنارے پر پاتا ہے جیسا کہ باصرہ اپنے کو مرئی عالم کے سرے پر پاتی ہے۔

گلوکون نے کہا: بالکل درست۔

میں نے کہا: تو کیا یہی وہ ترقی ہے جسے آپ منطق کہتے ہیں؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: لیکن زنجیروں سے قیدیوں کی رہائی، خالی سایوں سے کام کا نکالنا اور پھر روشنی میں اصل چیزوں کی طرف رخ موڑنا، زیر زمین غار سے آفتاب تک ان کا ابھرنا، پھر آفتاب کے حضور میں جانوروں اور درختوں، اور آفتاب کی روشنی کی طرف دیکھنے سے معذوری، البتہ اپنی ان کمزور آنکھوں تک سے پانی میں ان عکسوں کو دیکھ سکنے کی طاقت جو الٰہی ہیں اور حقیقی وجود کا سایہ ہیں (نہ کہ اس عکس کا سایہ جو آگ کی روشنی سے پڑتا ہے جو آفتاب کے مقابلے میں خود بمنزلہ عکس ہے) یہ روح کی اعلیٰ ترین اصل کو وجود کے بہترین حصے کے تفکر تک ابھار سکنے کی قوت، جس کا مقابلہ ہم اس صلاحیت سے کر سکتے ہیں جو جسم کا نور ہے اور جو مادی اور مرئی دنیا کے روشن سے روشن حصوں تک ہمیں پہنچا سکتی ہے۔ ہاں! تو یہ قوت، جیسا کہ میں کہہ رہا تھا ان فنون کے مطالعے اور تحصیل سے ہاتھ آتی ہے جن کا ابھی ذکر ہوا تھا۔

گلوکون نے کہا: میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں اگرچہ اس پر یقین ذرا مشکل ہے تاہم اگر ایک دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس سے انکار اور بھی زیادہ دشوار ہے۔ بہر حال یہ ایسا مسئلہ نہیں کہ اس پر چلتے چلتے سرسری نظر ڈالی جائے، اس پر تو بحث کرنی ہوگی۔ لہٰذا خواہ ہمارا نتیجہ صحیح ہو یا غلط اس وقت تو ہم اسے سب کا سب فرض کر لیں اور اس مقدمے یا تمہید سے فوراً اس خاص قانون کی طرف بڑھیں اور اسے بھی اسی انداز سے بیان کریں۔ ہاں، تو فرمایئے کہ منطق کی ماہیئت اور اس کی تقسیمیں کیا ہیں اور اس تک لے جانے والے راستے کون کون سے ہیں کیونکہ یہی راستے تو ہمیں آخری منزل تک بھی پہنچائیں گے۔

میں نے کہا: عزیز من، گلوکون! تم مجھے سمجھ نہیں سکو گے اگرچہ میں اپنے بس بھر پور کوشش کروں گا اور تم میرے تصور کے مطابق ایک عکس ہی نہ دیکھو گے بلکہ مطلق صداقت کا نظارہ کرو گے۔ یہ کہنے کی تو میں جرأت نہیں کرسکتا کہ جو کچھ میں کہوں گا وہ حقیقت ہوگی یا نہیں، البتہ اس کا مجھے پورا بھروسا ہے کہ تم ایک ایسی چیز دیکھ لو گے جو حقیقت سے بہت ملتی جلتی ضرور ہے۔

اس نے جواب دیا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: لیکن میں یہ پھر یاد دلا دوں کہ صرف منطق ہی کی قوت اس کا انکشاف کرسکتی ہے اور وہ بھی صرف اس شخص پر جس نے وہ علم حاصل کیے ہوں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

اس نے جواب دیا: اس دعوے پر آپ اسی قدر اعتماد کر سکتے ہیں جتنا کہ پہلے دعوے پر۔

میں نے کہا: اور یقیناً کوئی شخص یہ تو نہ کہے گا کہ تمام حقیقی وجود کے تفحص اور ہر چیز کی ذاتی ماہیت کی دریافت کا کوئی اور باضابطہ طریقہ بھی ہے۔ کیونکہ فنون تو عموماً انسانوں کی خواہشوں یا آرا سے متعلق ہوتے ہیں، یا تخلیق اور تعمیر کی خاطر انھیں ترقی دی جاتی ہے، رہے ریاضی علوم مثلاً، ہندسہ اور اسی جیسے علم، جنھیں، جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، حقیقی وجود میں کچھ درک ہوتا ہے تو یہ وجود کے متعلق خواب سا دیکھتے ہیں لیکن کبھی چلتی پھرتی حقیقت کو اس وقت تک نہیں دیکھ پاتے جب تک کہ یہ ان مفروضوں کو نہ ترک کر دیں جنھیں یہ بے جانچے اور بے امتحان کیے استعمال کرتے ہیں اور جن کی یہ کوئی تشریح نہیں کر سکتے کیونکہ جب انسان اپنے اصول اولیہ سے ہی واقف نہ ہو اور جب کہ درمیانی منزلوں اور نتائج کے متعلق بھی نہ جانتا ہو کہ یہ کس سے بنے ہیں تو وہ کیسے یہ گمان کرسکتا ہے کہ مشروط و معقاد کا یہ جال کبھی بھی علم بن سکتا ہے۔

اس نے کہا: ناممکن ہے۔

میں نے کہا: لہٰذا منطق اور صرف منطق براہ راست اصل اول تک جاتی ہے اور صرف یہی وہ علم ہے جو اپنی بنیاد کو محفوظ کرنے کے لیے مفروضوں سے درگزر کرتا ہے۔ روحانی آنکھ جو سچ یہ ہے کہ ایک خارجی دلدل میں دبی ہوئی ہے اسی کی مشفقانہ مدد سے اوپر اٹھتی ہے۔ تحویل و تبدیل کے اس کام میں یہ ان علوم کو اپنا معاون اور خادم بناتی ہے، جن پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ رواج عام تو انھیں علم کے نام سے پکارتا ہے، لیکن دراصل ان کے لیے کوئی اور ایسا نام چاہیے جس سے رائے و قیاس کے مقابلے میں زیادہ اور علم کے مقابلے میں کم وضاحت ظاہر ہوتی ہو۔ چنانچہ اپنے پچھلے خاکے میں ہم نے اسے ''سمجھ'' کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن جب

ایسی اہم حقیقتوں پر غور کرنا ہے تو خالی ناموں کے متعلق ہم کیوں جھگڑا کریں۔

اس نے کہا: ہاں کیوں جھگڑا کریں، جبکہ ہر وہ نام کافی ہے جو ذہن کے خیال کی وضاحت کے ساتھ ترجمانی کرے۔

میں نے کہا: بہر صورت، پہلے کی طرح ہم مطمئن ہیں کہ چار تقسیمیں ہونی چاہئیں، دو عقل کے لیے اور دو رائے اور قیاس کے لیے۔ پہلی تقسیم کو علم (یا حکمت) کہنا چاہیے، دوسری کو سمجھ (یا فہم) تیسری کو یقین (یا عقیدہ) اور چوتھی کو سایوں کا ادراک۔ رائے اور قیاس کا تعلق مشہود سے ہوگا اور عقل کا وجود سے۔ چنانچہ ہم یہ نسبت قائم کر سکتے ہیں۔

وجود کو جو نسبت شہود سے ہے، وہی نسبت عقل کو رائے اور قیاس سے ہے۔

اور عقل کو رائے اور قیاس سے جو نسبت ہے، وہی نسبت علم کو یقین اور سمجھ کو سایوں کے ادراک سے ہے۔

لیکن رائے اور عقل کی مزید تقسیم اور ان کے باہمی تعلقات کے مسئلے کو اس وقت ملتوی کرنا چاہیے کیونکہ یہ بڑی لمبی تحقیق ہوگی، یعنی جو تحقیق ہو چکی ہے اس سے کئی گنی لمبی۔

اس نے کہا: جہاں تک میں سمجھتا ہوں مجھے اتفاق ہے۔

میں نے کہا: اور کیا تم اس سے بھی اتفاق کرتے ہو کہ ہم اس شخص کو منطقی کہیں جسے ہر چیز کی اصلیت کا تصور حاصل ہو؟ اور جو یہ تصور نہ رکھتا ہو اور لہٰذا دوسرے تک اسے پہنچانے کی صلاحیت بھی اس میں نہ ہو تو اس میں جس درجے کا یہ نقص ہے اسی کے بقدر گویا وہ عقل میں بھی ناقص مانا جائے؟ کیا تم اسے تسلیم کرتے ہو؟

اس نے کہا: جی ہاں آخر اس سے انکار کیسے کر سکتا ہوں؟

میں نے کہا: اور کیا عین خیر کے متعلق بھی تم یہی کہو گے؟ جب تک کوئی شخص عین خیر کی عقلی تجرید اور تعریف کرنے کے قابل نہیں اور جب تک وہ تمام اعتراضات کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور ان اعتراضات کو، یہ نہیں کہ رائے اور قیاس کی بلکہ مطلق صداقت کی مدد سے، دوران بحث میں کہیں بھی لغزش کھائے بغیر، غلط ثابت کرنے پر تیار نہ ہو، ہاں تو جب تک وہ یہ سب کچھ نہ کر سکے، تو تم کہو گے کہ وہ نہ عین خیر سے واقف ہے، نہ کسی اور خیر سے۔ اگر کچھ ہے تو اسے بس ایک سائے کا ادراک ہے جو رائے اور قیاس کا عطیہ ہے نہ کہ علم کا۔ وہ اس

زندگی میں گویا سوتا ہے اور خواب دیکھتا ہے۔ اور قبل اس کے کہ یہاں پوری طرح بیدار ہو عالم زیریں میں پہنچ جاتا اور اپنی آخری خلاصی پالیتا ہے۔

اس نے کہا: ان سب باتوں میں مَیں یقیناً آپ سے متفق ہوں۔

میں نے کہا: اور یقیناً تم اپنی خیالی ریاست کے بچوں کو جن کی تعلیم اور تربیت تم کر رہے ہو (اگر کبھی یہ خیال حقیقت بنا) یعنی آنے والے حکمرانوں کو تم ایسا مور کھ نہ بننے دو گے کہ ان میں عقل کا تو پتا نہ ہو اور اعلیٰ سے اعلیٰ امور پر انھیں اختیار دے دیا جائے۔

اس نے کہا: یقیناً نہیں۔

میں نے کہا: تو پھر تم یہ قانون بناؤ گے کہ انھیں ایسی تعلیم دی جائے جو انھیں سوال کرنے اور جواب دینے میں اچھی سے اچھی مہارت بہم پہنچائے۔

اس نے کہا: جی ہاں، ہم آپ مل کر ہی یہ قانون بنائیں گے۔

میں نے کہا: چنانچہ تم اتفاق کرو گے کہ منطق تمام علوم کا سنگ شرف ہے اور ان کا سرتاج۔ کوئی اور علم اس سے زیادہ بلند نہیں ہو سکتا کہ علم کی ماہیت اس سے آگے جا ہی نہیں سکتی۔

اس نے کہا: میں اتفاق کرتا ہوں۔

میں نے کہا: لیکن اب یہ سوال تحقیق کے محتاج رہے کہ ان علوم کو کس کے سپرد کیا جائے اور کس طرح کیا جائے؟

گلوکون نے کہا: جی، ظاہر ہے۔

میں نے کہا: تمھیں یاد ہوگا کہ ہم نے پہلے حکمرانوں کا انتخاب کس طرح کیا تھا؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: انہی طبیعتوں کو اس بار بھی چننا چاہیے اور اب بھی ترجیح انھیں کو دینی چاہیے جو سب سے زیادہ اعتماد کے قابل اور بہادر اور اگر ہو سکے تو سب سے زیادہ حسین بھی ہوں۔ ان میں جہاں شرافت اور مزاج کا اعتدال ہو وہاں وہ فطری صفات بھی ہونی چاہئیں جو ان کی تعلیم میں آسانی پیدا کریں۔

گلوکون نے کہا: یہ کیا ہیں؟

میں نے کہا: ایسی صفات جیسے ذکاوت اور کسی چیز کو جلدی سے حاصل کر لینے کی قوت۔ کیونکہ دماغ

ورزش کی دشواری سے اتنا نہیں تھکتا جتنا کہ مطالعے کی مشقت سے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیتا ہے۔ اس لیے کہ دوسری صورت میں محنت زیادہ مکمل طور پر خود دماغ ہی کی ہوتی ہے اور جسم اس میں شریک نہیں ہوتا۔

گلوکون نے کہا: بہت درست۔

میں نے کہا: اس کے علاوہ ہمیں جس کی تلاش ہے اس کا حافظہ بھی اچھا ہونا چاہیے اور ضروری ہے کہ وہ ایک ان تھک ٹھوس آدمی ہو جو ہر قسم کی محنت کا شائق ہو ورنہ اس کے لیے جسمانی ورزش کی برداشت یا ذہنی ضبط اور وسیع مطالعے کے تمام مطلوبہ مراحل سے عہدہ برآ ہونا کبھی ممکن نہیں ہوگا۔

اس نے جواب دیا: بے شک، ان فطری صفات کی ضرورت ہے۔

میں نے کہا: آج کل یہ غلطی کی جاتی ہے کہ جو لوگ فلسفے کا مطالعہ کرتے ہیں ان کا کوئی پیشہ نہیں ہوتا اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں فلسفے کی بدنامی کی یہی وجہ ہے۔ اب تو ناخلفوں کو نہیں بلکہ اس کے سچے فرزندوں کو اس کی دست گیری کرنی چاہیے۔

اس نے کہا: آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں نے کہا: پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کے شیدائیوں کی محنت لنگڑی اور اچکی قسم کی نہ ہو۔ یعنی یہ نہیں کہ وہ آدھے محنتی ہوں اور آدھے کاہل، مثلاً جب ایک شخص ورزش اور دوسرے جسمانی کھیلوں اور شکار کا بہت شائق ہو لیکن سننے، سیکھنے اور تحقیق کرنے کی محنت سے، محبت رکھنا تو کجا، الٹے نفرت کرتا ہو، یا ہو سکتا ہے کہ جس شغل میں وہ مصروف ہو وہ بالکل دوسری قسم کا ہو اور اس کا لنگ دوسری قسم کا لنگ ہو۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اور کیا بالکل اسی طرح ایک روح صداقت کے اعتبار سے لنگڑی نہ سمجھی جائے جو ارادی جھوٹ سے تو نفرت کرتی اور جھوٹ بولنے پر خود اپنے آپ پر نیز دوسروں پر بے حد برافروختہ بھی ہوتی ہو لیکن غیر ارادی جھوٹ کو گوارا کر لے اور نہ تو جہالت کے دلدل میں ایک خنزیر صفت جانور کی طرح لتھڑے ہوئے چلنے کا کچھ خیال کرے نہ اس حال میں دیکھے جانے پر شرمندہ ہو۔

اس نے جواب دیا: بالیقین۔

میں نے کہا: اور پھر اسی طرح عفت اور اعتدال، جرأت، شوکت اور تمام دوسرے محاسن کے اعتبار سے کیا ہمیں نہایت احتیاط کے ساتھ سچے فرزندوں اور ناخلفوں میں تفریق نہیں کرنی چاہیے؟ کیونکہ جہاں ان

منتوں پر کڑی نظر نہ ہو تو ریاستیں اور افراد دونوں انجانے میں غلطی میں پڑ جاتے ہیں اور ریاست ایسے شخص کو اپنا حاکم اور فرد اپنا دوست بنا لیتا ہے جو نیکی کے کسی جزو میں ناقص ہونے کے باعث ایک لحاظ سے لنگڑا اور دوغلا ہے۔

گلوکون نے کہا: بہت صحیح۔

میں نے کہا: چنانچہ ان تمام چیزوں پر ہمیں نہایت احتیاط سے نظر رکھنی ہوگی اور صرف اگر وہ لوگ جنھیں ہم تعلیم اور تربیت کے اس وسیع نظام سے آشنا کرنا چاہتے ہیں تندرست دماغ اور جسم رکھتے ہوں تو خود عدل تک کو ہماری مخالفت میں کہنے کو کچھ نہیں ملے گا اور ہم ریاست اور اس کے دستور کے نجات دینے والے ثابت ہوں گے۔ لیکن اگر کہیں ہمارے شاگرد دوسری وضع کے لوگ ہوئے تو معاملہ بالکل برعکس ہوگا اور ہم فلسفے پر اس سے کہیں بڑا تضحیک اور تحقیر کا طوفان نازل کرانے کا سبب بنیں گے جو اسے آج کل جھیلنا پڑتا ہے۔

اس نے کہا: یہ تو کچھ اچھی بات نہ ہوگی۔

میں نے کہا: ہرگز نہیں۔ لیکن شاید مزاح کو ایسی اہمیت دے کر میں خود اپنے آپ کو اتنا ہی مضحکہ کا مستحق بنا رہا ہوں!

اس نے کہا: کس اعتبار سے؟

میں نے کہا: میں بھول گیا تھا کہ ہم لوگ متانت کو ہاتھ سے دے کر ذرا ضرورت سے زیادہ اشتعال کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ جب میں نے فلسفے کو ناحق انسانی قدموں سے پامال ہوتے دیکھا تو اس کی ذلت کے بانیوں پر میری برافروختگی مجھ سے روکے نہ رکی اور غصے نے مجھے ضرورت سے زیادہ سخت بنا دیا۔

اس نے کہا: کیا واقعی! میں تو سن رہا تھا، لیکن مجھے تو یہ خیال بھی نہ ہوا۔

میں نے کہا: لیکن میں نے جو کہ خود گفتگو کر رہا تھا، یہ محسوس کیا کہ میں مشتعل تھا اور اب میں تمھیں یاد دلاتا ہوں کہ اگرچہ پچھلے انتخاب میں، ہم نے بوڑھے آدمیوں کو چنا تھا لیکن اس مرتبہ ایسا نہیں کریں گے۔ سولون تو ہم میں مبتلا تھا جب اس نے کہا تھا کہ آدمی بوڑھا ہو کر بہت سی چیزیں سیکھ جاتا ہے۔ حالانکہ جس طرح وہ بوڑھا ہو کر زیادہ دوڑ نہیں سکتا ویسے ہی زیادہ سیکھ بھی نہیں سکتا۔ ہر غیر معمولی ریاضت کا وقت شباب

ہی ہے۔

گلوکون نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: لہٰذا حساب اور ہندسہ اور تمام وہ دوسرے تدریس کے عناصر جو منطق کی تیاری ہیں یہ سب بچپن ہی میں دماغ کو پیش کر دینے چاہئیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ اپنے تعلیمی نظام کو جبر یہ عائد کرنے کا خیال نہ پیدا ہو۔

گلوکون نے کہا: کیوں نہیں؟

میں نے کہا: کیونکہ آزاد آدمی کو کسی قسم کے علم کی تحصیل میں غلام نہیں ہونا چاہیے جسمانی ورزش اگر لازمی بھی ہو تو جسم کو نقصان نہیں پہنچاتی لیکن جو علم جبری طور پر حاصل کیا گیا ہو وہ دماغ پر تسلط نہیں پاتا۔

گلوکون نے کہا: بہت صحیح۔

میں نے کہا: لہٰذا میرے اچھے دوست، جبر کا استعمال نہ کرو بلکہ ابتدائی تعلیم کو ایک قسم کی تفریح بناؤ اس طرح تم فطری جھکاؤ کو زیادہ بہتر طور پر معلوم کر سکو گے۔

گلوکون نے کہا: نہایت معقول بات ہے۔

میں نے کہا: تمھیں یاد ہوگا کہ بچوں کو بھی گھوڑے پر بٹھا کر جنگ دکھانے کے لیے لے جانا ہوتا تھا اور اگر کوئی خطرہ نہ ہو تو انھیں بالکل قریب تک بھی لے جاتے تھے تاکہ کم عمر شکاری کتوں کی طرح ان کے منھ کو بھی خون لگا دیا جائے۔

اس نے جواب دیا: جی، مجھے یاد ہے۔

میں نے کہا: چنانچہ ہم بھی ریاضتوں، سبقوں اور خطروں ان سب چیزوں میں اسی عمل کی پیروی کر سکتے ہیں۔ اور جوان سب میں اچھا ہو اسے چنے ہوئے گروہ میں شامل کر سکتے ہیں۔

اس نے پوچھا: کس عمر میں؟

میں نے جواب دیا: جس عمر میں کہ جسم کی ضروری ورزش ختم ہو جائے۔ دو یا تین سال کا زمانہ، جو اس تربیت میں صرف ہوتا ہے، وہ کسی دوسری غرض کے لیے بالکل بے سود ہے۔ کیونکہ نیند اور ورزش علم کے حصول کے لیے ساز گار نہیں۔ اور یہ جانچ کہ جسمانی ورزش میں کون سب سے اول ہے منجملہ ان اہم ترین امتحانوں کے ہے جو ہمارے نوجوانوں کو دینے پڑیں گے۔

اس نے جواب دیا: یقیناً۔

میں نے کہا: اس مدت کے ختم ہونے پر بیس برس والے گروہ میں جن لوگوں کا انتخاب ہوگا انھیں اعلیٰ اعزاز میں ترقی دی جائے گی۔ جو علم انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم میں بلا کسی نظام کے سیکھے تھے وہ اب یکجا لائے جائیں گے اور یہ اب ان کی باہمی فطری مناسبتوں اور حقیقی وجود سے ان کے تعلق کو دیکھ سکیں گے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔ علم کی صرف یہی قسم پائیدار جڑ پکڑتی ہے۔

میں نے کہا: ہاں۔ اور اس علم کی قابلیت منطقی صلاحیت کا بڑا معیار ہے، کہ فہیم و مدرک دماغ ہمیشہ منطقی ہوتا ہے۔

اس نے کہا: میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔

میں نے کہا: الغرض ان سب باتوں پر تمھیں نظر کرنی چاہیے۔ اور پھر جن میں یہ ادراک سب سے زیادہ ہو اور جو تحصیل علم اور اپنے فوجی اور دوسرے مفوضہ فرائض کے انجام دینے میں سب سے زیادہ ثابت قدم ہوں تو تیس سال کی عمر میں پہنچنے کے بعد انھیں اس منتخبہ طبقے میں سے چننا اور اعلیٰ تر اعزاز تک ترقی دینا چاہیے۔ پھر تمھیں منطق کی مدد سے ان لوگوں کو پرکھنا ہوگا تاکہ یہ معلوم کر سکو کہ ان میں سے کون باصرہ اور دوسرے حواس کے استعمال کو ترک کرنے اور صداقت کی ہم رکابی میں مطلق وجود تک پہنچنے کے لیے تیار ہے۔ اور میرے دوست، اس جگہ بڑی احتیاط درکار ہے۔

اس نے کہا: کیوں، اتنی احتیاط کیوں؟

میں نے کہا: کیا نہیں دیکھتے کہ منطق نے ایک کیسی بری چیز پیدا کر دی ہے؟

اس نے کہا: کونسی برائی؟

میں نے کہا: اس فن کے طلبہ میں تمرد اور بے راہ روی بھر گئی ہے۔

اس نے کہا: سچ ہے۔

میں نے کہا: کیا تم سمجھتے ہو کہ ان کے لیے کوئی اور چیز اتنی غیر فطری اور ناقابل معافی ہو سکتی ہے؟ یا تم ان کے ساتھ کچھ رعایت کرو گے؟

اس نے کہا: کس طرح کی رعایت؟

میں نے کہا: میں چاہتا ہوں کہ آپ بطور مقابل ایک لے پالک لڑکے کا تصور کریں جس کی تربیت

بڑی دولت اور ثروت کے آغوش میں ہوئی ہے، وہ ایک بڑے اور کثیر التعداد خاندان کا رکن ہے، اور اس کے بہت سے خوشامدی ہیں۔ یہ جب بڑا ہو کر سن بلوغ کو پہنچتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اس کے والدین بتائے جاتے ہیں وہ اس کے اصلی والدین نہیں ہیں۔ لیکن اصلی والدین کون ہیں، اس کا پتا یہ نہیں لگا سکتا۔ کیا تم ان خوشامدیوں اور اپنے مفروضہ والدین کے ساتھ اس کے رویے پر ان دونوں صورتوں میں قیاس کر سکتے ہو یعنی پہلی تو اس زمانے میں جب وہ اپنے جھوٹے رشتے سے بے خبر تھا اور پھر اس وقت جب اسے اس کا علم ہو گیا؟ یا میں آپ کی طرف سے قیاس کروں؟

اس نے کہا: جی ہاں ضرور۔

میں نے کہا: میں تو یہ کہوں گا کہ جب تک وہ صداقت سے بے خبر ہے تو قرین قیاس یہ ہے کہ وہ اپنے ماں، باپ اور دوسرے مفروضہ رشتے داروں کی عزت خوشامدیوں سے زیادہ کرے گا۔ ضرورت کے وقت انھیں بھولنے، یا ان کے خلاف کچھ کہنے یا کرنے کا اس میں مقابلتاً کم میلان ہوگا۔ اور کسی اہم معاملے میں وہ کم ہی ان کی نافرمانی پر آمادہ ہوگا۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: لیکن حقیقت کے انکشاف کے بعد میرے خیال میں ان لوگوں کی عزت اور توقیر اس کی نظر میں گھٹ جائے گی اور اب یہ خوشامدیوں کا زیادہ دلدادہ ہو جائے گا، اس پر ان کا اثر بہت بڑھ جائے گا، یہ اب انہی کی وضع میں رہنا اور ان سے کھلے بندوں خلاملا رکھنا شروع کرے گا اور اگر نہایت غیر معمولی طور پر اچھی طبیعت کا آدمی نہیں ہے تو اب اپنے مفروضہ والدین اور عزیزوں کی ذرا بھی پروا نہیں کرے گا۔

اس نے کہا: بہت خوب۔ یہ سب کچھ تو بہت قرین قیاس ہے لیکن آخر یہ صورت فلسفے کے معتقدوں پر کیسے عائد ہوتی ہے؟

میں نے کہا: اس طرح۔ آپ جانتے ہیں کہ عدل اور عزت کے متعلق بعض اصول ہیں جو بچپن میں ہمیں سکھائے گئے تھے اور ان کے اختیار پدری کے ماتحت ہم نے پرورش پائی اور ہم ہمیشہ ان اصولوں کی عزت اور اطاعت کرتے رہے۔

گلوکون نے کہا: درست۔

میں نے کہا: ان کے مخالف اور دوسرے لذت بخش اصول اور عادتیں بھی ہوتی ہیں جو روح کی چاپلوسی کرتی اور اسے لبھانا چاہتی ہیں۔ لیکن ہم میں سے جن کو حق کا ذرا بھی احساس ہے ان پر ان کا اثر نہیں ہوتا اور یہ لوگ برابر اپنے بزرگوں کے اقوال کی عزت اور اطاعت کرتے رہتے ہیں۔

گلوکون نے کہا: صحیح۔

میں نے کہا: اچھا، ایک شخص اس حالت میں ہے اور فطرت کی اندرونی آواز دریافت کرتی ہے کہ کیا جو ئز ہے اور کیا قابل عزت؟ اور وہ اس پر وہی جواب دیتا ہے جو قانون کے بنانے والوں نے اسے سکھایا ہے، اس پر بہت سے طرح طرح کے دلائل سے اس کے الفاظ رد ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ یہ اس یقین پر مجبور ہو جاتا ہے کہ نہ کوئی چیز قابل عزت ہے نہ نا قابل عزت، نہ عادلانہ اور اچھی ہے اور نہ ان کی ضد، الغرض یہی حال اس کے تمام تصورات کا ہوتا ہے، جن کی وہ اب تک بہت قدر کرتا تھا۔ تو ایسی حالت میں کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ اب بھی پہلے کی طرح ان کی عزت اور اطاعت کرے گا؟

گلوکون نے کہا: کر ہی نہیں سکتا، ناممکن ہے۔

میں نے کہا: تو اب وہ قانون کو برقرار رکھنے کے بجائے اس کا توڑنے والا ہو گیا نا؟

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اور فلسفے کے ان طلبہ میں جن کا میں نے ذکر کیا ہے یہ سب کچھ بہت ہی قدرتی امر ہے اور جیسا کہ میں ابھی کہہ رہا تھا قابل معافی بھی۔

اس نے کہا: اور میں کہوں گا کہ قابل افسوس بھی۔

میں نے کہا: لہٰذا اس خیال سے کہ آپ کے افسوس اور ترحم کے جذبات کو اپنے ایسے شہریوں کے متعلق حرکت نہ ہو جو اب تیس سال کی عمر کو پہنچ چکے ہیں ہمیں ان کو منطق سے روشناس کرنے میں بہت احتیاط برتنی چاہیے۔

اس نے جواب دیا: ضرور۔

میں نے کہا: خطرہ یہ ہے کہ کہیں یہ لوگ اس گراں بہا مسرت کا مزہ قبل از وقت نہ چکھ لیں۔ آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ جب پہلے پہل کم عمر لوگوں کے کام و دہن ذائقے سے آشنا ہوتے ہیں تو یہ لگتے ہیں تو تفریح کے موافق دلیلیں دینے اور جو لوگ ان کی تردید کرتے ہیں ان کی نقالی میں خود ہر ایک کی تردید و تغلیط

کرنے۔ کتے کے پلوں کی طرح انھیں بھی تو اپنے پاس کی ہر چیز کو نوچنے کھسوٹنے اور چیرنے پھاڑنے میں لطف آتا ہے!

اس نے کہا: جی ہاں۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی چیز انھیں پسند نہیں ہوتی۔

میں نے کہا: اس طرح جب بہت سی جگہوں پر انھیں فتح حاصل ہوتی ہے اور بہت سے لوگوں کے ہاتھوں شکست کا منہ دیکھنا ہوتا ہے تو نہایت تیزی اور بڑی شدت کے ساتھ یہ ہر اس چیز سے اپنا یقین ہٹا لینے کی راہ پیدا کر لیتے ہیں جس پر یہ پہلے عقیدہ رکھتے تھے۔ لہٰذا نہ صرف یہ خود بلکہ فلسفہ اور اس کے تمام متعلقات بھی باقی دنیا میں بدنام ہوتے ہیں۔

اس نے کہا: بالکل درست۔

میں نے کہا: لیکن جب آدمی بوڑھا ہونا شروع ہوتا ہے تو پھر اس قسم کی بے عقلی کا مرتکب نہیں ہوتا۔ وہ حق کے متلاشی منطقیوں کا تتبع کرتا ہے نہ کہ کٹ حجتیوں کا جو صرف تفریح کی خاطر تردید کرتے ہیں۔ اور اس شخص کا اعتدال اس کے شغل کی عزت کو گھٹاتا نہیں بڑھاتا ہے۔

گلوکون نے کہا: بہت صحیح۔

میں نے کہا: ہم نے جب یہ کہا تھا کہ فلسفے کے سیکھنے والے باضابطہ اور مستقل ہونے چاہئیں نہ کہ آج کل کی طرح ہر اتفاق سے ذرا سی رغبت رکھنے والا یا ہر فضولی ٹانگ اڑانے والا، تو کیا اسی امر کے لیے خاص اہتمام نہ کیا تھا۔

اس نے کہا: جی۔ بے شک۔

میں نے کہا: فرض کرو کہ فلسفے کا مطالعہ جسمانی ورزش کی جگہ لے لے اور جتنے سال ورزش میں صرف ہوئے ان سے دوچند زمانہ تک اس کا مطالعہ نہایت محنت، خلوص اور دوسری چیزوں سے منہ موڑ کر کیا جائے تو کیا یہ کافی ہوگا؟

اس نے کہا: آپ کی رائے چھ برس کی ہے یا چار برس کی؟

میں نے کہا: فرض کرو پانچ سال۔ اس مدت کے اختتام پر انھیں پھر نیچے غار میں بھیجا جانا چاہیے اور فوجی یا اور کسی ایسے عہدے پر جن پر نوجوان لوگ مامور ہو سکتے ہوں کام کرنے پر مجبور کرنا چاہیے، اس طرح ان لوگوں کو زندگی کا تجربہ حاصل ہوگا اور یہ آزمانے کا موقع ملے گا کہ جب مختلف قسم کی لالچ انھیں، ہر طرف کھینچتی

ہیں تو وہ ثابت قدم رہتے ہیں یا ان کے پائے ثبات کو لغزش آ جاتی ہے۔

گلوکون نے کہا: اور ان کی زندگی کی یہ منزل کتنے عرصے تک جاری رہے گی؟

میں نے کہا: پندرہ سال۔ اور جب یہ پچاس سال کی عمر کو پہنچ جائیں تو اس وقت ان میں سے جو باقی ہوں اور جنھوں نے اپنی زندگی کے تمام اعمال میں اور علم کے ہر شعبے میں اپنے آپ کو ممتاز کیا ہو وہ بالآخر اپنے معراج کمال کو پہنچیں۔ اب وقت ہے کہ وہ اپنی روح کی آنکھ کو اس عالمگیر روشنی کی طرف اٹھائیں جو ہر چیز کو منور کرتی ہے اور مطلق خیر کا نظارہ کریں۔ کیونکہ یہی وہ نمونہ ہے جس کے مطابق انھیں ریاست کو، افراد کی زندگی کو، اور خود اپنی بقیہ زندگی کو منضبط کرنا ہے۔ فلسفہ ان کا خاص شغل ہو، لیکن جب باری آئے تو یہ سیاست کی مشقت بھی گوارا کریں اور عام مفاد کی خاطر حکومت بھی کریں، اس طرح نہیں کہ گویا یہ کوئی بڑی بہادری کا کام کر رہے ہیں بلکہ محض ایک فرض ادا کرنے کے طور پر۔ اور جب یہ ہر نسل میں اپنے جیسے لوگ پیدا کر دیں اور انھیں اپنی جگہ حکام ریاست کی جگہ پر چھوڑ جائیں تو اس وقت یہ "مبارکوں کے جزیرے" کو سدھار جائیں گے اور وہیں مقیم رہیں گے۔ اہل شہر کی طرف سے انھیں عمومی یادگاریں، قربانیاں اور اعزاز ملیں گے، اگر پائتھی ہاتف غیبی نے اجازت دی تو نیم دیوتاؤں کی طرح ورنہ کم از کم متبرک خدا والوں کی حیثیت سے۔

گلوکون نے کہا: جناب سقراط، آپ تو واقعی سنگ تراش ہیں اور اپنے حاکموں کے مجسمے حسن کے اعتبار سے آپ نے ایسے تراشے ہیں کہ کہیں انگلی دھرنے کی گنجایش نہیں چھوڑی۔

میں نے کہا: ہاں گلوکون، اور حاکمات کے بھی کیونکہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں جو کہہ رہا ہوں وہ صرف مردوں ہی پر عائد ہوتا ہے اور، جہاں تک ان کی فطرت اجازت دیتی ہے، عورتوں پر نہیں۔

گلوکون نے کہا: آپ بالکل ٹھیک فرماتے ہیں، کیونکہ ہم نے عورتوں کو تمام چیزوں میں مردوں کا سا حصہ لینے دیا ہے۔

میں نے کہا: خوب۔ اور آپ مجھ سے اس بات میں بھی اتفاق کریں گے (کیوں کریں گے نا؟) کہ ہم نے ریاست اور حکومت کے متعلق جو کچھ کہا ہے یہ محض ایک خواب نہیں ہے۔ اور اگرچہ دشوار ضرور ہے، تاہم محال نہیں۔ ہاں، البتہ یہ ممکن اسی صورت میں ہے جو ہم نے فرض کی ہے۔ یعنی ریاست میں حقیقی فلسفی بادشاہ پیدا ہوں اور ایک یا کئی بادشاہ اس موجودہ دنیا کے اعزازات کو حقیر اور بے وقعت جان کر ٹھکرا دیں، حق

اور حق سے پیدا ہونے والے عزت کو سب چیزوں سے اونچا سمجھیں، اور عدل کو سب سے اعلیٰ اور سب سے ضروری چیز خیال کریں، کہ یہ اسی کے کارپرداز ہیں اور اپنے شہر کو منظم کرنے میں اسی کے اصولوں کو بلند کرنے والے ہیں۔

گلوکون نے کہا: تو آخر یہ کام شروع کیسے کریں گے؟

میں نے کہا: یہ شروع اس طرح کریں گے کہ شہر کے باشندوں سے سب دس سال سے اوپر کی عمر والوں کو ملک میں چاروں طرف بھیج دیں گے اور بچوں پر قبضہ کر لیں گے۔ ان بچوں پر اپنے والدین کی عادتوں کا تو اثر ہوگا نہیں اور یہ انھیں اپنی عادتوں اور قوانین کی تعلیم دیں گے یعنی ان قوانین کی جو ہم نے انھیں دیئے ہیں اس طرح وہ ریاست اور وہ دستور، جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں جلد سے جلد اور نہایت سہولت کے ساتھ سعادت حاصل کریں گے اور سب سے زیادہ فائدہ وہی قوم حاصل کرے گی جس کا یہ دستور ہوگا۔

اس نے کہا: جی ہاں۔ بہترین طریقہ یہی ہوگا اور، جناب سقراط، میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے نہایت خوبی سے بیان فرمادیا ہے کہ ایسا اساسی دستور اگر کبھی وجود میں آیا تو کیسے آئے گا۔

میں نے کہا: اچھا تو بس، کامل ریاست اور اس کی تصویر کے حامل انسان کا بہت کافی ذکر ہو چکا۔ اب اس کے بیان کرنے میں کوئی دقت نہیں۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں کوئی دشواری نہیں اور میں آپ سے اس خیال میں متفق ہوں کہ اس کے متعلق کچھ اور زیادہ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔

☆☆☆

آٹھویں کتاب

میں نے کہا: اچھا تو گلوکون، ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ کامل ریاست میں بیوی بچے مشترک ہوں، تمام تعلیم اور صلح اور جنگ کے سارے مشغلے بھی مشترک ہوں اور سب سے اچھے فلسفی اور سب سے بہادر جنگ آزما ان کے بادشاہ ہوں۔

گلوکون نے جواب دیا: جی ہاں، یہ تو تسلیم کیا جا چکا ہے۔

میں نے کہا: جی۔ اور اس کے علاوہ ہم یہ بھی تسلیم کر چکے ہیں کہ جب حکمرانوں کا اپنا تقرر ہو چکے گا تو یہ اپنے سپاہیوں کو لے کر ایسے مکانوں میں رکھیں گے جیسے ہم بیان کر رہے تھے، یعنی ایسے جو سب میں مشترک ہوں اور جن میں کوئی چیز شخصی یا انفرادی نہ ہو۔ اور ان لوگوں کی املاک کے متعلق ہم نے جو تصفیہ کیا تھا وہ تمھیں یاد ہے نا؟

گلوکون نے جواب دیا: جی ہاں یاد ہے کہ کسی کے قبضے میں وہ چیزیں نہ ہوں گی جو عام طور پر لوگوں کے پاس ہوتی ہیں۔ یہ لوگ جنگ آزما، پہلوان اور محافظ ہوں گے اور دوسرے شہریوں سے سالانہ معاوضے کے طور پر انھیں صرف گزارہ مل جایا کرے گا۔ اور یہ خود اپنی اور پوری ریاست کی نگہبانی کرتے رہیں گے۔

میں نے کہا: درست۔ اب کہ ہمارے کام کا یہ حصہ ختم ہوا ذرا اس نقطے کا پتا چلائیں جہاں سے ہم لوگ ادھر مڑے تھے، تاکہ ہم پھر اسی پرانے راستے پر واپس جا سکیں۔

گلوکون نے کہا: واپسی میں تو کوئی دشواری نہیں۔ جیسے اس وقت ویسے ہی اس وقت، آپ کی باتوں سے واضح ہوتا تھا کہ آپ ریاست کا بیان ختم کر چکے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ ایسی ایسی ریاست اچھی ہوتی ہے اور اچھا آدمی وہ ہوتا ہے جو اس کے مطابق ہو، حالانکہ جیسا اب پتا چلا آپ کو ریاست اور فرد دونوں کے متعلق اور بھی اچھی اچھی باتیں کہنی تھیں۔ اس کے علاوہ آپ نے فرمایا تھا کہ اگر یہ ریاست کی حقیقی اور سچی شکل ہے تو

باقی سب جھوٹی ہیں اور، مجھے جہاں تک یاد ہے، آپ نے کہا تھا کہ ان جھوٹی شکلوں کی چار خاص قسمیں ہیں اور ان کے اور ان سے مطابقت رکھنے والے افراد کے عیبوں کی جانچ کرنی چاہیے اور جب ہم سب افراد کو دیکھ چکیں اور اس امر پر متفق ہو جائیں کہ ان میں کون سب سے اچھا ہے اور کون سب سے برا تو پھر ہم دیکھیں کہ آیا بہترین ہی سب سے زیادہ خوش حال اور بدترین ہی سب سے زیادہ بدحال ہوتا ہے یا نہیں۔ میں نے پوچھا تھا کہ یہ حکومت کی چار قسمیں جن کا آپ نے تذکرہ کیا، کیا ہیں کہ پولیمارکس اور اایڈیمنٹس بیچ میں بول اٹھے تھے، اس پر آپ نے پھر سرے سے قصہ شروع کیا تھا اور بالآخر اس مقام تک چلے آئے جہاں ہم اس وقت پہنچے ہیں۔

میں نے کہا: تمھاری یادداشت بہت ہی ٹھیک ہے۔

اس نے جواب دیا: اچھا تو پھر پہلوانوں کی طرح آپ اپنے آپ کو پھر اسی پہلو پر لائیے، میں پھر وہی سوال کروں اور آپ وہی جواب دیں جو آپ اس وقت دینے والے تھے۔

میں نے کہا: ہاں، اگر دے سکا تو ضرور دوں گا۔

اس نے کہا: میں خاص طور پر یہ سننا چاہتا ہوں کہ ریاست کے وہ چار دستور جن کا آپ نے ذکر کیا تھا کیا ہیں؟

میں نے کہا: اس سوال کا جواب تو آسانی سے دیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک ان کے جدا جدا نام ممکن ہیں، حکومت کی وہ چار قسمیں جن کا میں نے تذکرہ کیا تھا یہ ہیں: اول تو کریٹ اور سپارٹا کی حکومتیں جن کی عام طور پر بہت تحسین ہوتی ہے، اس کے بعد نمبر آتا ہے چندسری دولت شاہی کا اسے اتنا پسند نہیں کیا جاتا اور حکومت کی اس قسم میں بہت سی برائیاں ہوتی ہیں؛ تیسری حکومت جمہوری ہے جو اگرچہ دولت شاہی سے بہت مختلف ہے تاہم قدرتی طور پر اس کے بعد وجود میں آتی ہے؛ اور سب سے آخر میں استبداد اور جابریت، وہ بڑا اور مشہور استبداد، جو ان سب سے مختلف اور ریاست کے بگاڑ کی چوتھی اور سب سے بُری شکل ہے۔ ان کے سوا میں تو کوئی ایسا دستور نہیں جانتا جس کی کوئی ممتاز حیثیت ہو، کیا آپ کوئی جانتے ہیں؟ اس کے علاوہ پھر زمینداریاں اور تعلقے ہوتے ہیں جن کی خرید و فروخت ہوتی ہے، اور حکومت کی بعض اور درمیانی شکلیں ہیں لیکن یہ سب بہت ہی مجہول سی ہیں اور یونانیوں اور وحشیوں میں یکساں پائی جاتی ہیں۔

اس نے جواب دیا: جی، بے شک ان لوگوں میں تو حکومت کی عجیب عجیب شکلیں سننے میں آئی ہیں۔

میں نے کہا: آپ یہ جانتے ہیں کہ جیسے انسانی طبیعتیں بھانت بھانت کی ہوتی ہیں ویسی ہی حکومتیں بھی طرح طرح کی ہوتی ہیں۔ اور ایک کی جتنی قسمیں ہوں گی لازم ہے کہ دوسرے کی بھی اتنی ہی ہوں۔ ہم تو فرض نہیں کر سکتے کہ حکومتیں لکڑی پتھر سے بنتی ہیں اور ان انسانی طبیعتوں سے نہیں بنتیں جو ان میں موجود ہوتی ہیں بلکہ یوں کہیے کہ یہی پلا الٹ دیتی ہیں اور ہر دوسری چیز کو اپنے ساتھ گھسیٹ لے جاتی ہیں۔

اس نے کہا: جی ہاں، جیسے آدمی ویسی ہی ریاستیں، ریاستوں کی نشو و نما بھی تو انسانی سیرت ہی سے ہوتا ہے۔

میں نے کہا: تو اگر ریاستوں کے اساسی دستور پانچ ہیں، تو انفرادی دماغ کے خصائل اور میلان بھی پانچ ہی ہوں گے؟

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: حکومت صالحہ سے مطابقت رکھنے والے فرد کو جسے ہم بجا طور پر عادل اور اچھا کہتے ہیں، ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: تو اب ہم ادنیٰ درجے کی طبیعتوں کا حال بیان کریں، مثلاً وہ لالچی اور جھگڑالو طبیعتیں جو سپارٹا سماج سے مناسبت رکھتی ہیں، نیز اشرافیہ، جمہوری، اور مستبد حکومتوں سے مطابق طبیعتوں کا۔ پھر ہم سب سے زیادہ عادل کو سب سے زیادہ ظالم کے ساتھ رکھیں، کہ انھیں دیکھ کر ہم خالص عادل کی زندگی گزارنے والے اور خالص ظلم کی زندگی والے کی نسبتی سعادت یا شقاوت کا موازنہ کر سکیں گے، اس وقت جا کر تحقیق پوری ہوگی۔ اور ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ ہمیں تھریسی میکس کے مشورے کے مطابق ظلم اور ناانصافی پر عمل پیرا ہونا چاہیے یا اپنی دلیل کے نتائج کے مطابق عدل کو ترجیح دینی چاہیے۔

اس نے جواب دیا: بے شک، آپ جو فرماتے ہیں وہی تدبیر ٹھیک ہے۔

میں نے کہا: کیا پھر اسی اپنی پرانی تدبیر پر عمل کریں جو وضاحت کے خیال سے ہم نے اختیار کی تھی یعنی پہلے ریاست کو لیں اور پھر فرد کو۔ تو کیا عزت اور امتیاز والوں کی حکومت سے شروع کریں؟

میں اس حکومت کے لیے سوائے حکومت امتیازی کے اور کوئی نام نہیں جانتا۔ پھر اس سے اس کے مماثل انفرادی سیرت کا مقابلہ کریں گے، اس کے بعد چند سری دولت شاہی حکومت اور خواصی انسان پر نظر ڈالیں گے پھر جمہوریت اور جمہوری انسان کی طرف اپنی توجہ پھیریں گے اور آخر میں استبداد اور جبریہ حکومت کا شہر دیکھیں گے اور مستبد کی روح میں ایک بار پھر جھانکیں گے اور یوں ایک مناسب فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کریں گے۔

اس نے کہا: اس معاملے پر غور اور فیصلے کا یہی طریقہ نہایت مناسب ہوگا۔

میں نے کہا: چنانچہ پہلے ہمیں یہ دریافت کرنا چاہیے کہ امتیاز والوں کی حکومت، حکومت صالحہ اشرافیہ (بہترین اشخاص کی حکومت) سے کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ تمام سیاسی تبدیلیاں واقعی حکمران قوت میں مناقشے سے پیدا ہوتی ہیں۔ کیونکہ جو حکومت متحد ہو، خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو، اسے کوئی ہلا نہیں سکتا۔

گلوکون نے کہا: بہت صحیح۔

میں نے کہا: تو ہمارے بنائے ہوئے اور اچھے شہر میں آخر کس طرح تغیر پیدا ہوگا اور معاونین اور حکام کے دو طبقوں میں کیسے اختلاف ظاہر ہوگا، ایک ہی طبقے کے لوگوں میں آپس میں یا ایک طبقے کا دوسرے طبقے سے؟ کیا ہم بھی ہومر کی طرح بنات الادب سے پوچھیں کہ "اختلاف پہلے پہل کیسے پیدا ہوا؟ اور اپنے تخیل میں یہ فرض کریں کہ یہ نہایت متانت آمیز سوکھے منھ سے ہمارا مذاق اڑا رہی ہیں اور ہم سے بچوں کی طرح کھیلتی اور ٹھٹھا کرتی ہیں اور پھر نہایت بلند المناک انداز سے ہمیں مخاطب کر کے یہ بھی باور کرانا چاہتی ہیں کہ نہایت متین ہیں۔

اس نے کہا: ہاں تو کہیے، یہ ہمیں کیسے مخاطب کریں گی؟

میں نے کہا: کچھ اس طرح: ایک شہر جس کی تشکیل یوں ہوا سے مشکل ہی سے ہلایا جا سکتا ہے لیکن چونکہ ہر چیز جس کی ابتدا ہے اس کی ایک انتہا بھی ہوتی ہے اس لیے ایک ایسا دستور اساسی تک جیسا کہ تم نے بنایا ہے، ہمیشہ باقی نہیں رہ سکتا اور امتداد زمانہ سے یہ بھی منتشر ہو جائے گا۔ اور اس کا انتشار یوں ہوگا۔ زمین سے اگنے والے درختوں اور سطح زمین پر چلنے والے جانوروں سب میں روح اور جسم کی بار آوری اور بے باری اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ان کے دائروں کا چکر پورا ہو جاتا ہے۔ یہ چکر کم زندہ رہنے والی ہستیوں میں تھوڑی سی

اور زیادہ رہنے والوں میں بہت سی فضا پر گزرتا ہے۔ لیکن اس انسانی پیدائش یا بانجھ پن کے علم تک تمھارے حکمرانوں کی دانش و تعلیم کبھی نہیں پہنچ سکے گی۔ ان کو منضبط کرنے والے قوانین کا انکشاف ایسی عقل کے لیے ممکن نہیں جو حواس سے آلودہ ہو۔ یہ قانون اس سے کترا کر نکل جائیں گے۔ چنانچہ یہ حکام ایسی حالت میں دنیا میں بچے پیدا کریں گے جس میں انھیں نہ کریں چاہئیں۔☆

....

....

....

....

کیونکہ جب تمھارے محافظ توالد اور تناسل کے قوانین سے ناآشنا ہوں گے اور دولہا اور دلہن کو بے موسم یکجا کر دیں گے تو بچے لازماً اچھے اور خوش بخت نہیں ہوں گے اور اگرچہ ان بچوں کے پیش روان میں سے بہترین ہی کو اپنی جگہ متعین کریں پھر بھی یہ اپنے باپوں کی جگہ پر کرنے کے اہل نہ ہوں گے اور جب محافظ کی حیثیت سے برسر اقتدار آئیں گے تو جلد ہی پتا چل جائے گا کہ یہ ہماری (بنات الادب کی) خبر گیری نہیں کرتے۔ پہلے یہ موسیقی کی بے قدری کریں گے اور یہی غفلت بڑھ کر جسمانی ورزش تک پہنچے گی۔ چنانچہ تمھاری ریاست کے نوجوان پہلے کی بہ نسبت کم مہذب ہوں گے۔ ایک پشت بعد ایسے حکمران مقرر ہو جائیں گے جن میں محافظوں والی یہ قوت نہیں ہوگی کہ تمھاری ان مختلف نسلوں کی طبیعت میں جس دھات کا جوہر ہے اسے پرکھ سکیں جو ہزیوڈ کے مختلف طبقوں کی طرح سونے، چاندی، پیتل اور لوہے کی بنی ہیں۔ اس طرح چاندی میں لوہے اور سونے میں پیتل کا میل ہو جائے گا، اس سے عدم مطابقت، عدم مساوات اور بے ضابطگی پیدا ہوگی اور یہی ہمیشہ اور ہر جگہ نفرت اور جنگ کا سبب رہی ہے، بنات الادب کے خیال میں جہاں کہیں اختلاف پیدا ہوا ہے اسی اصل سے پیدا ہوا ہے اور (ہمارے سوال پر) ان کا یہ جواب ہے۔

گلوکون نے کہا: جی، اور ہم فرض کر سکتے ہیں، کہ ان کا جواب سچ ہے۔

☆ اس کے بعد چند سطریں ترجمے میں چھوڑ دی گئی ہیں اس لیے کہ ان کا قابل فہم ترجمہ ہم سے بن نہیں پڑا۔ دوسری زبانوں میں بھی "ریاست" کے جو ترجمے ہیں ان میں ان سطور کے معنی واضح نہیں کیے جا سکے ہیں۔ ڈیوس اور واگھن نے تو اپنے انگریزی ترجمے میں ان کا ترجمہ ہی نہیں کیا ہے۔ دلیل و گفتگو کے تسلسل پر ان سطروں کے چھوڑنے کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ (مترجم)

میں نے کہا: اور کیا! ظاہر ہے کہ صحیح ہے۔ بھلا بنات الادب (Muses) کیسے جھوٹ بول سکتی ہیں؟

گلوکون نے کہا: اچھا تو یہ بنات اور آگے کیا فرماتی ہیں؟

میں نے کہا: اختلاف پیدا ہونے پر دونوں گروہ مختلف راستوں پر چل پڑے۔ لوہے اور پیتل والے روپے پیسے، زمین، مکان اور سونے چاندی کے حصول پر ٹوٹ پڑے، لیکن سونے چاندی والا گروہ جنھیں روپے پیسے کی حاجت نہ تھی، کہ حقیقی دولت خود ان کی طبیعتوں میں موجود تھی، وہ نیکی اور قدیم صورت حالات کی طرف جھکا رہا۔ پھر ان میں ایک جنگ ہوئی اور بالآخر باہم طے پایا کہ یہ اپنی زمین اور مکانات مختلف افراد میں تقسیم کر دیں۔ اور اب اپنے ان دوستوں اور گزارہ فراہم کرنے والوں کو جن کی آزادی کو یہ پہلے بچاتے تھے لگے یہ خود غلام بنانے، انھیں اپنی رعایا اور چاکر بنالیا اور خود ان کے خلاف پہرہ چوکی رکھنے اور جنگ کرنے میں مشغول ہو گئے۔

اس نے کہا: میں یقین کرتا ہوں کہ آپ نے اس تغیر کی ابتدا کا صحیح تصور قائم کیا ہے۔

میں نے کہا: اس طرح جو نئی حکومت پیدا ہوگی وہ دولت شاہی اور اشرافیہ کے بیچ کی ایک شکل ہوگی۔

اس نے کہا: بہت درست۔

میں نے کہا: اچھا تو تغیر تو یہ پیدا ہوگا، لیکن اس تغیر کے بعد یہ کریں گے کیا؟ ظاہر ہے کہ یہ نئی ریاست چونکہ دولت شاہی اور کامل ریاست کے بین بین ہے اس لیے بعض جزئیات میں ایک کی پیروی کرے گی اور بعض میں دوسرے کی اور بعض خصوصیات خود اس کی اپنی ہوں گی۔

اس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: حاکموں کی تعظیم، فوجی طبقے کی زراعت، دستکاری اور عام تجارت سے علیحدگی، (عام دسترخوان پر) مشترک کھانے کی رسم، اور جسمانی ورزش اور جنگی تربیت پر توجہ، ان تمام باتوں میں تو یہ ریاست پہلی ریاست کی سی ہوگی۔

گلوکون نے کہا: سچ ہے۔

میں نے کہا: لیکن چونکہ سادہ اور خالص فلسفی انھیں ملتے نہیں بلکہ اب یہ مخلوط عناصر سے بنے ہوتے ہیں اس لیے یہ فلسفیوں کو اقتدار دیتے ڈرتے اور انھیں چھوڑ کر ایسی کم پیچیدہ اور جذباتی سیرتوں کی طرف رخ کرتے ہیں جو بالطبع امن کے مقابلے میں جنگ کے لیے زیادہ موزوں ہوں، اور پھر فوجی تدابیر اور ہتھکنڈوں

کی قدر اور دائمی جنگ آزمائی، یہ چیزیں زیادہ تر اس ریاست ہی سے مخصوص ہوں گی۔

گلوکون نے جواب دیا: جی ہاں۔

میں نے کہا: ہاں، اور اس قماش کے لوگوں کو روپے پیسے کی بڑی ہوس ہوگی (جیسے دولت شاہی ریاست میں رہنے والے رکھتے ہیں)۔ ان میں سیم و زر کی ایک مخفی اور خوفناک خواہش ہوگی۔ یہ اس مال کو کال کوٹھڑیوں میں جمع کریں گے، ان کے اپنے خزانے اور گودام ہوں گے جن میں انھیں چھپا کر رکھ سکیں۔ یہ محل بنائیں گے جو ان کے انڈوں کے لیے مناسب حال گھونسلے ہوں گے اور ان میں یہ اپنی بیویوں پر یا اور جس پر چاہیں گے بڑی بڑی رقمیں صرف کریں گے۔

گلوکون نے جواب دیا: بالکل سچ ہے۔

میں نے کہا: یہ کنجوس ہوں گے کیونکہ جس مال و دولت کی یہ اتنی قدر کرتے ہیں، سے علانیہ حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ان کے پاس ہے نہیں، یہ اپنی خواہشوں کے پورا کرنے کے لیے وہ مال صرف کرتے ہیں جو دراصل دوسرے کا ہے؛ یہ اپنی مسرتیں چوری سے حاصل کرتے ہیں اور پھر جس طرح بچے اپنے باپ سے بھاگتے ہیں یہ قانون سے فرار ہوتے ہیں۔ ان کی تربیت نرم اثرات سے نہیں بلکہ جبر سے ہوئی ہے، کیونکہ انھوں نے اس سے پہلو بچایا جو عقل اور فلسفے کو رفیق، حقیقی ادب کی دیوی ہے اور جسمانی ورزش کی موسیقی سے زیادہ عزت کی۔

اس نے کہا: بلاشبہ۔ حکومت کی جس قسم کو آپ بیان کر رہے ہیں وہ خیر اور شر کی ایک ملاوٹ ہے۔

میں نے کہا: جی ہاں، ملاوٹ تو ہے، لیکن اس میں ایک چیز اور بس ایک ہی چیز بیّن طور پر نظر آتی ہے۔ یعنی ہوس اور نزاع کا جذبہ، اور اس کی وجہ ہے جذباتی یا شجاعانہ عنصر کا عام تسلط۔

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: تو اس ریاست کی اصل اور اس کی کیفیت تو یہ ہے۔ میں نے صرف خاکہ بیان کیا ہے، (زیادہ تفصیل کی ضرورت نہ تھی)۔ کیونکہ کامل عدل پر اور کامل ظلم پر مبنی نمونوں کے اظہار کے لیے بس ایک خاکہ ہی کافی ہے۔ ورنہ یوں تو تمام ریاستوں اور تمام انسانی سیرتوں کا ایسا بیان کہ کوئی نہ چھوٹنے پائے ایک ایسی کوشش ہے، جو کبھی ختم ہونے والی نہیں۔

گلوکون نے کہا: بہت صحیح۔

میں نے کہا: اب دیکھیں کہ حکومت کی اس قسم کا جواب کون انسان ہوتا ہے، یہ کیسے پیدا ہوتا ہے اور کس سے مشابہ ہوتا ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میرے خیال میں ان میں نزاع کے جذبے کی جو امتیازی خصوصیت ہے اس کے اعتبار سے وہ ہمارے دوست گلوکون سے کچھ مختلف نہیں!

میں نے کہا: ہاں، شاید اس ایک اعتبار سے وہ ان کا مشابہ ہو، لیکن اور بہت سے اعتباروں سے وہ بہت مختلف ہوتا ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یہ کون سے اعتبار۔

میں نے کہا: اس میں اپنی بات کی ذرا زیادہ پچ ہونی چاہیے۔ اسے ذرا کم مہذب ہونا چاہیے لیکن پھر بھی تہذیب کا دوست ضرور ہو۔ سنتا زیادہ ہو، بولتا کم ہو۔ برخلاف ان تعلیم یافتہ آدمیوں کے جو اپنے آپ کو اس سے برتر سمجھتے ہیں، یہ غلاموں کے ساتھ ذرا درشت ہوگا، احرار کے ساتھ متواضع، اور حکومت کا خاص طور پر تابعدار۔ یہ اقتدار اور عزت کا عاشق ہوگا اور حاکم بننے کا مدعی، اس بنا پر نہیں کہ نہایت جادو بیان ہے یا اور کسی ایسی ہی وجہ کی بنا پر بلکہ اس لیے کہ یہ سپاہی ہے اور سپہ گری کے نمایاں کام انجام دے چکا ہے۔ یہ جسمانی ورزش کا بھی بڑا شائق ہوگا اور شکار کا بھی۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔ یہی سیرت کا نمونہ ہے جو حکومتِ امتیازی سے مطابق ہے۔

میں نے کہا: ایسا شخص صرف اپنی جوانی میں دولت کو نظر حقارت سے دیکھے گا، لیکن جوں جوں اس کی عمر بڑھتی جائے گی یہ روز بروز اس کی طرف زیادہ کھنچتا جائے گا۔ کیونکہ اس کی فطرت میں حرص اور لالچ کا ایک جز د موجود ہے اور چونکہ اپنے بہترین محافظ کو کھو چکا ہے اس لیے نیکی کی طرف یکسوئی کے ساتھ مائل نہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یہ محافظ کون تھا؟

میں نے کہا: موسیقی میں سمویا ہوا فلسفہ، جو آ کر انسان کے اندر اپنا گھر کر لیتا ہے اور پھر ساری عمر کی نیکی کا تنہا محافظ رہتا ہے۔

میں نے کہا: خوب۔

میں نے کہا: اچھا تو ''ممتاز'' نوجوان ایسا ہوتا ہے اور یہ حکومتِ امتیازی کے مشابہ اور مماثل ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بالکل۔

میں نے کہا: اس کا آغاز یوں ہوتا ہے۔ یہ عموماً کسی بہادر باپ کا جوان لڑکا ہوتا ہے۔ یہ باپ کسی ایسے شہر کا باشندہ ہے، جس کی حکومت خراب ہے، یہ اس شہر کے اعزاز اور منصب سے انکار کرتا ہے، اور نہ عدالتی چارہ جوئی کرتا ہے نہ اور کسی طرح اپنا اثر ڈالتا ہے بلکہ مصیبت سے بچنے کے لیے اپنے حقوق سے دست بردار ہونے پر آمادہ ہے۔

اس نے کہا: اور بیٹا پھر کس طرح عالم وجود میں آتا ہے؟

میں نے کہا: اس کی سیرت کی نشوونما اس وقت شروع ہوتی ہے جب یہ اپنی ماں کو شکوہ کرتے سنتا ہے کہ میری، شوہر کی حکومت میں کوئی حیثیت نہیں اور اس وجہ سے عورتوں میں میری کچھ پوچھ نہیں۔ پھر جب یہ اپنے شوہر کو دیکھتی ہے کہ اسے مال و دولت سے زیادہ شغف نہیں اور بجائے اس کے کہ قانونی عدالتوں یا مجلسوں میں جا کر اس کے لیے لڑے، جھگڑے اس کو جو بھی پیش آئے اس پر چپ ہو رہتا ہے، نیز جب یہ دیکھتی ہے کہ اس کے خیالات کا مرکز خود اس کی اپنی ذات ہے اور وہ اس کے ساتھ بہت بے اعتنائی کا برتاؤ کرتا ہے تو یہ اس پر چڑھتی بگڑتی ہے اور اپنے بیٹے سے کہتی ہے کہ تیرا باپ بس آدھا مرد ہے اور نہایت کاہل انگار۔ اور اس پر اپنے ساتھ بدسلوکی کی وہ تمام شکایتیں بھی اضافہ کر دیتی ہے جن کی تکرار کی عورتیں بہت شائق ہوتی ہیں۔

اس نے کہا: جی ہاں، بھلا شکایتوں کی ان کے پاس کیا کمی ہے، جیسی یہ ویسی ان کی شکایتیں۔

میں نے کہا: اور تم جانو بوڑھے بوڑھے نوکر چاکر جو خاندان کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں یہ بھی کبھی اپنے طور پر لڑکے سے اسی انداز کی بات چیت کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ہے جس پر اس کے باپ کا کچھ قرض آتا ہے یا کوئی کسی اور طرح اسے نقصان پہنچا رہا ہے اور یہ اس کے خلاف کوئی چارہ جوئی نہیں کرتا تو یہ اس نوجوان بیٹے سے کہتے ہیں کہ تم جب بڑے ہونا تو اس قسم کے لوگوں سے بدلہ لینا اور اپنے باپ سے زیادہ مرد بننا۔ پھر یہ جب ذرا باہر نکلتا ہے تو بھی اسی قسم کی باتیں دیکھتا اور سنتا ہے۔ شہر میں جو لوگ بس اپنے کام سے کام رکھتے ہیں انھیں سادہ لوح سمجھا جاتا ہے اور کوئی ان کی عزت نہیں کرتا وہاں خواہ مخواہ دخل در معقولات دینے والوں کی تعریف بھی ہوتی ہے عزت بھی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب یہ نوجوان ادھر یہ ساری باتیں سنتا اور دیکھتا ہے ادھر اپنے باپ کی باتیں سنتا اور اس کے زندگی کے انداز کو قریب سے دیکھتا ہے اور دوسروں کے حال سے اس کا مقابلہ کرتا ہے تو وہ مخالف سمتوں میں کھنچتا ہے۔ باپ تو اس کی روح کے عقلی اصول کی پرورش اور آبیاری کر رہا ہے اور دوسرے جذباتی اور اشتہائی اصولوں کو اکسا رہے ہیں، خود چونکہ اس کی فطرت تو خراب ہے نہیں،

صرف صحبت بری ہے، اس لیے ان مشترک اثرات سے یہ ایک درمیانی نقطے پر آجاتا ہے اور مسابقت اور جذبے کے اس درمیانی اصول کے بدلے اس دولت کو کھو بیٹھتا ہے جو اس کے اندر موجود تھی اور متمرد اور حریص بن جاتا ہے۔

اس نے کہا: میری رائے میں تو اس کی اصل آپ نے نہایت خوبی کے ساتھ بیان فرمائی۔

میں نے کہا: تو اب حکومت کی دوسری قسم اور سیرت کا دوسرا نمونہ آتا ہے؟

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: آؤ اب ایک دوسرے شخص کو دیکھیں جو بقول ایسکلس۔

''ایک دوسری ریاست کے مطابق ہے''۔

یا پھر اپنی تدبیر کے موافق پہلے ریاست سے شروع کریں۔

اس نے کہا: ضرور۔

میں نے کہا: میں سمجھتا ہوں کہ ترتیب سے اب دولت شاہی کا نمبر ہے۔

اس نے کہا: آپ کس قسم کی حکومت کو دولت شاہی کہتے ہیں؟

میں نے کہا: ایسی حکومت کو جس کی بنیاد املاک کی قدر پر ہو، جس میں مالدار با اقتدار ہوں اور غریب اس سے محروم۔

اس نے کہا: میں سمجھا۔

میں نے کہا: شروع میں مجھے یہ بیان کرنا چاہیے تاکہ حکومتِ امتیازی سے دولت شاہی میں تبدیلی کس طرح پیدا ہوئی۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اس کے دیکھنے کے لیے تو کچھ ایسی آنکھیں درکار نہیں کہ ایک قسم دوسری میں کس طرح آملتی ہے۔

اس نے کہا: کیسے؟

میں نے کہا: افراد کے خانگی خزانوں میں مال و زر کا جمع ہونا حکومتِ امتیازی کی تباہی ہے۔ یہ لوگ پھر اس مال کے صرف کرنے کے ناجائز طریقے نکالتے ہیں کیونکہ انھیں اور ان کی بیویوں کو بھلا قانون کا

کیا کھٹکا؟

اس نے کہا: جی، بے شک۔

میں نے کہا: پھر جب ایک دوسرے کو مالدار ہوتا دیکھتا ہے تو اس کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے اور اس طرح شہریوں کی بڑی تعداد مال و زر کی دلدادہ ہو جاتی ہے۔

اس نے کہا: بہت ممکن ہے۔

میں نے کہا: یوں یہ دن بدن مالدار ہوتے جاتے ہیں اور جوں جوں دولت کمانے کا خیال بڑھتا ہے نیکی کا دھیان کم ہوتا جاتا ہے۔ کیونکہ جب دولت اور نیکی ساتھ ساتھ ترازو کے پلوں میں رکھی ہوں تو ہمیشہ جیسے جیسے ایک پلہ جھکے گا دوسرا پلہ اٹھے گا۔

اس نے کہا: سچ ہے۔

میں نے کہا: اور جس نسبت سے دولت اور دولتمند لوگوں کی ریاست میں عزت ہوگی اسی نسبت سے نیک افراد کی بے عزتی ہوگی۔

اس نے جواب دیا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: اور جس چیز کی عزت ہوتی ہے اسی کی لوگ پرورش کرتے ہیں اور جس کی عزت نہیں اس سے غفلت برتتے ہیں۔

ایڈیمنٹس نے جواب دیا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: اس طرح بالآخر مسابقت اور جاہ و جلال کے بجائے لوگ تجارت اور روپے پیسے کے عاشق ہو جاتے ہیں۔ اب یہ مالدار کی عزت اور توقیر کرنے لگتے اور اسے اپنا حاکم بناتے ہیں اور غریب آدمی کی بے عزتی ہونے لگتی ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں، ایسا ہی ہوتا ہے۔

میں نے کہا: پھر یہ ایک قانون بناتے ہیں جس میں شہری بننے کے لیے ایک رقم بطور شرط مقرر کر دی جاتی ہے اور دولت شاہی کم یا زیادہ محدود ہونے کے اعتبار سے کہیں یہ رقم کم ہوتی ہے، کہیں زیادہ جس شخص کی املاک اس مقررہ رقم سے کم ہوتی ہے اسے یہ حکومت میں کوئی حصہ نہیں لینے دیتے۔ اگر ڈرانے دھمکانے ہی سے کام نہیں چل گیا تو دستور اساسی میں یہ تغیر، یہ لوگ تلوار کے زور سے عمل میں لاتے ہیں۔

اس نے کہا: بہت درست۔

میں نے کہا: عام طور پر دولت شاہی کے قیام کا یہی طریقہ ہے۔

اس نے کہا: جی درست لیکن یہ تو بتایئے کہ حکومت کی اس قسم کی خصوصیات کیا ہیں اور ہم جن عیبوں کا ذکر کر رہے ہیں وہ کیا ہیں؟

میں نے کہا: سب سے پہلے تو شہریت کے لیے جو شرط ہے اس کی ماہیت پر نظر کرو۔ ذرا سوچو کہ اگر ناخدا اور کشتی بانوں کا انتخاب ان کی املاک کے اعتبار سے ہونے لگے اور ایک غریب آدمی کو، چاہے وہ بہتر ناخدا ہو، کشتی بانی سے منع کر دیا جائے گا تو کیا پیش آئے۔

اس نے کہا: آپ کا مطلب ہے جہاز غرق ہو جائے گا؟

میں نے کہا: ہاں۔ پھر کیا۔ یہی بات ہر دوسری چیز کی حکومت کے بارے میں صحیح نہیں؟

اس نے کہا: میں تو یہی سمجھتا ہوں۔

میں نے کہا: لیکن کیا شہر اس سے مستثنیٰ ہے؟ یا آپ شہر کو بھی شامل کرتے ہیں؟

اس نے کہا: نہیں نہیں۔ شہر کا معاملہ تو سب سے زیادہ سنگین ہے۔ چونکہ شہر کی حکومت سب سے بڑی بھی ہے اور سب سے مشکل بھی۔

میں نے کہا: اچھا تو دولت شاہی کا پہلا بڑا عیب تو یہ ہے۔

اس نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: اور ایک عیب یہ ہے اور یہ بھی اتنا ہی برا ہے۔

اس نے کہا: وہ کیا؟

میں نے کہا: اس کی ناگزیر تقسیم۔ ایسی ریاست ایک نہیں ہوتی۔ بلکہ دو ریاستیں ہوتی ہیں۔ ایک غریبوں کی ریاست اور ایک امیروں کی، یہ دونوں ایک جگہ پر رہتی اور ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف سازش کرتی رہتی ہیں۔

اس نے کہا: یقیناً۔ یہ بھی کم از کم اتنی ہی بری بات ہے۔

میں نے کہا: ایک اور بری بات یہ ہے کہ اسی وجہ سے یہ جنگ نہیں کر سکتے۔ یا تو یہ جمہور کو مسلح کریں اور اس صورت میں یہ دشمن سے زیادہ خود ہی ان سے ڈرتے ہیں یا پھر اگر جنگ کے وقت انھیں نہ نکالیں تو یہ خود تو

پھر خواص ہی ٹھہرے، جیسے حکومت کرنے کے لیے تھوڑے سے ویسے ہی لڑنے کے لیے تھوڑے سے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ چونکہ روپے پیسے سے انھیں بڑی محبت ہوتی ہے اس لیے محاصل بھی ادا نہیں کرنا چاہتے۔

اس نے کہا: کیسی عیب کی بات ہے؟

میں نے کہا: اور جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں اس قسم کے دستور کے ماتحت ایک ہی شخص کے کئی پیشے ہوتے ہیں۔ کاشت کار، تاجر، سپاہی، سب کچھ ایک ذات میں جمع ہیں۔ یہ کیا کچھ اچھا معلوم ہوتا ہے؟

اس نے کہا: اور جو کچھ بھی ہو برا اچھا تو نہیں۔

میں نے کہا: ایک عیب اور ہے جو غالباً سب سے بڑا ہے اور جو پہلے پہل اس ریاست پر اپنا اثر کرتا ہے۔

اس نے کہا: وہ کیا عیب؟

میں نے کہا: ایک شخص کے پاس جو کچھ ہے وہ اس سب کو بیچ سکتا اور دوسرا اسے خرید سکتا ہے اور پھر اس بیچنے کے بعد بھی وہ اس شہر میں رہ سکتا ہے جس کا اب وہ جز نہیں۔ نہ وہ تاجر ہے نہ دستکار، نہ شہ سوار ہے نہ بانکا، بس ایک وجود ہے، غریب اور بے یار و مددگار۔

اس نے کہا: جی ہاں، یہ بھی ایک عیب ہے جو پہلے پہل اسی ریاست میں شروع ہوتا ہے۔

میں نے کہا: یقیناً یہ عیب وہاں روکا نہیں جاتا۔ کیونکہ دولت شاہی میں کثیر دولت اور مطلق افلاس کے دونوں انتہائی سرے ہوتے ہیں۔

اس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: لیکن ذرا پھر غور کرو کہ اپنی خوش حالی کے زمانے میں جب یہ شخص اپنی دولت صرف کرتا تھا تو کیا شہریت کے اغراض کے لیے اس حالت سے ذرہ بھر بھی زیادہ مفید تھا؟ یا کہ بس بظاہر حکمران جماعت کا رکن معلوم ہوتا تھا، اگرچہ درحقیقت نہ یہ حاکم تھا نہ محکوم، بس ایک فضول خرچ آدمی تھا۔

اس نے کہا: جیسا آپ نے فرمایا یہ بظاہر حاکم معلوم ہوتا تھا، لیکن تھا محض فضول خرچ۔

میں نے کہا: کیا اس کی حالت گھر کے نکھٹو کی سی نہیں جیسے شہد کے چھتے میں نکھٹو ہوتا ہے اور جس طرح وہ چھتے کے لیے وبال ہوتا ہے یہ شہر کے لیے عذاب ہے۔

اس نے کہا: بالکل درست (جناب) سقراط۔

میں نے کہا: اور ایڈیمنٹس، خدا نے ان اڑنے والے نکھٹوؤں کو تو سب کو بے ڈنک بنایا ہے لیکن ان چلنے والوں میں کچھ تو اس نے بے ڈنک بنائے ہیں لیکن بعض کے تو بہت ہی خوفناک ڈنک بھی ہوتے ہیں۔ بے ڈنک طبقے میں تو وہ ہیں جو بڑھاپے میں پہنچ کر اپنی زندگی مفلس بھکاری کے طور پر ختم کرتے ہیں اور ڈنک والے گروہ سے وہ سارا طبقہ نکلتا ہے جسے مجرم کہتے ہیں۔

اس نے کہا: نہایت بجا۔

میں نے کہا: صاف بات ہے کہ جب کبھی تم کسی ریاست میں مفلس بھکاری دیکھو تو بس سمجھ لو کہ یہیں کہیں پڑوس میں چور، گرہ کٹ، تیرتھوں کے لوٹنے والے اور ہر قسم کے بدمعاش بھی ضرور پوشیدہ ہوں گے۔

اس نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: اچھا تو کیا دولت شاہی ریاست میں تمھیں فقیر نہیں ملتے؟

ایڈیمنٹس نے کہا: ہاں (کیوں نہیں) ہر شخص جو حاکم نہیں وہ فقیر ہی ہے۔

میں نے کہا: اور کیا ہم یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ ان میں بہت سے مجرم بھی ملتے ہیں، یہی ڈنک دار بدمعاش جن پر بااختیار حاکم جبر سے روک تھام رکھتے ہیں۔

اس نے کہا: بیشک ہم یہ جرأت کر سکتے ہیں۔

میں نے کہا: ایسے لوگوں کے وجود کی علت ہے تعلیم کا نہ ہونا، تربیت کی خرابی، اور ریاست کا برا اساسی دستور۔

اس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: تو دولت شاہی کی یہ شکل ہے اور یہ اس کی برائیاں اور ممکن ہے اور بہت سی برائیاں بھی ہوں۔

اس نے کہا: بہت ممکن ہے۔

میں نے کہا: اب ہم دولت شاہی کو یعنی حکومت کی اس قسم کو ختم کر سکتے ہیں جس میں حاکموں کا انتخاب ان کی دولت کی بنا پر ہوتا ہے۔ آؤ اب اس فرد کی ماہیت اور اس کی اصل پر نظر کریں جو اس ریاست کے مطابق ہے۔

اس نے کہا: ضرور۔

میں نے کہا: کیا امتیازی حکومت والا فرد دولت شاہی فرد میں اس طرح نہیں بدلتا......؟

اس نے کہا: کس طرح؟

میں نے کہا: ایک وقت آتا ہے کہ ممتاز افراد کے طبقے میں کسی کے لڑکا ہوتا ہے۔ یہ لڑکا پہلے اپنے باپ کی نقل کرتا اور اس کے قدم بقدم چلتا ہے۔ لیکن آگے چل کر یہ دیکھتا ہے کہ اس کا باپ ریاست سے ٹکرا کر اس طرح برباد ہو گیا جیسے کوئی کشتی کسی تہِ آب چٹان سے ٹکرا کر ہو جائے۔ یہ خود بھی تباہ ہوا اور جو کچھ اس کے پاس تھا وہ بھی۔ مثلاً ممکن ہے کہ اس کا باپ کوئی سپہ سالار یا اور کوئی اعلیٰ افسر ہو جس کے خلاف چغل خوروں نے بدگمانی پھیلائی۔ اس کی وجہ سے اس پر مقدمہ چلا اور موت کی سزا دی گئی یا اسے جلاوطن کر دیا گیا یا شہریت کے سارے حقوق سے اسے محروم کر کے اس کی سب املاک اس سے چھین لی گئی۔

اس نے جواب دیا: بہت ہی قرین قیاس بات ہے یہ۔

میں نے کہا: اور اس کے بیٹے نے یہ سب کچھ دیکھا اور سب کچھ جانا۔ اب وہ ایک تباہ شدہ آدمی ہے اور خوف نے اسے سکھایا ہے کہ اپنے دل کے تخت پر سے حوصلے اور جذبے کو دھکے دے کر نکال دے۔ افلاس نے ذلیل کیا تو اس نے روپیہ کمانے کی طرف توجہ کی اور کمینہ پن اور کنجوسی سے بچا بچا کر بڑی محنت سے دولت جمع کی۔ تو کیا قرین قیاس نہیں کہ ایسا شخص اس خالی تخت پر اب اپنی فطرت کے شہوانی اور لالچی عنصر کو جگہ دے، اور اسے تاج، سونے کے توڑوں اور شاہی عصا سے آراستہ کر کے اپنے نفس پر شہنشاہی کرنے کی اجازت دے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بہت صحیح۔

میں نے کہا: اس شہنشاہ کے ہر دو جانب یہ عقل اور نفس کو بطور تابعدار کے بٹھا کر انھیں ان کی حیثیت جتائے گا اور ان میں سے ایک کو مجبور کرے گا کہ سوائے اس بات کے اور کچھ نہ سوچے کہ چھوٹی رقمیں بڑی رقموں میں کیونکر بدلی جا سکتی ہیں اور دوسرے کو دولت اور دولت مند لوگوں کے علاوہ کسی کی تعریف و تکریم نہیں کرنے دے گا، نہ کسی اور چیز کا اتنا دلدادہ ہونے دے گا جتنا کہ دولت کا اور دولت حاصل کرنے کے ذرائع کا۔

اس نے کہا: کوئی تغیر اس قدر تیزی سے اور اس درجہ یقینی نہیں ہوتا جتنا کہ حوصلہ مند نوجوان کا لالچی نوجوان میں۔

میں نے کہا: اور یہی لالچی نوجوان تو دولت شاہی ریاست کا نمایندہ ہوتا ہے۔

اس نے کہا: جی، کم از کم جس فرد میں سے یہ پیدا ہوا ہے وہ اس ریاست کے مماثل ضرور ہے، جس سے دولت شاہی حکومت پیدا ہوئی تھی۔

میں نے کہا: اچھا تو ذرا دیکھیں کہ ان میں کچھ مشابہت ہے یا نہیں؟

ایڈیمنٹس نے کہا: بہت خوب۔

میں نے کہا: اولاً تو یہ دونوں دولت کی قدر کرنے میں مشابہ ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: نیز اپنے افلاس اور محنت کشی میں۔ یہ فرد صرف اپنی ضروری اشتہاؤں کو پورا کرتا ہے اور اپنا صرف انھیں تک محدود رکھتا ہے۔ اور دوسری خواہشوں کو اس خیال سے دباتا ہے کہ بے سود ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: یہ بڑا ہی خسیس ہوتا ہے، ہر چیز میں سے کچھ نہ کچھ بچا بچا کر اپنی تھیلی بھرتا رہتا ہے اور اس قسم کے آدمی کی لغو اور بیہودہ لوگ مدح وستایش کرتے ہیں۔ کیا یہ شخص جس ریاست کی نمایندگی کر رہا ہے اس کا صحیح عکس اور نمونہ نہیں؟

اس نے کہا: مجھے تو معلوم ہوتا ہے۔ کم سے کم یہ بھی روپے پیسے کی بڑی قدر کرتا ہے اور یہ ریاست بھی۔

میں نے کہا: ہاں۔ اور یہ تربیت یافتہ آدمی بھی نہیں۔

اس نے کہا: میرے خیال میں نہیں ہے۔ کیونکہ اگر یہ تعلیم یافتہ ہوتا تو ایک اندھے دیوتا کو اپنے کورس کا اگوا نہ بناتا، نہ ہی اسے کوئی خاص عزت دیتا۔

میں نے کہا: بہت خوب۔ لیکن ذرا اس پر غور کرو کہ آیا ہمیں اس شخص کے متعلق یہ بات اور تسلیم نہیں کرنی چاہیے کہ عدم تربیت کے باعث اس میں ناداروں اور بدمعاشوں کی سی نکھٹوؤں والی خواہشات پائی جائیں گی، جو اس کی زندگی کی عام عادت سے مجبور اُدبی رہتی ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: تم جانتے ہو کہ اس کی بدمعاشیاں دیکھنی ہوں تو کہاں دیکھ سکتے ہو؟

ایڈیمنٹس نے کہا: کہاں دیکھنا چاہیے؟

میں نے کہا: تمھیں اسے ایسی جگہ دیکھنا چاہیے جہاں اسے بے ایمانی کا بہت بڑا موقع ہو، مثلاً جب کسی یتیم بچے کا ولی یا محافظ بنے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: اچھا۔

میں نے کہا: ایسی صورت میں ظاہر ہو جائے گا کہ اپنے عام معاملات میں جن کے سبب سے اسے دیانت داری کی شہرت حاصل ہے یہ اپنے برے جذبوں کو جبریہ نیکی سے دباتا ہے۔ یہ نہیں کہ ان پر ان کی غلطی ثابت کر دے یا عقل کے ذریعے انھیں سدھالے بلکہ چونکہ اپنے مقبوضات کے لیے مارے ڈر کے کانپتا ہے لہٰذا ضرورت اور خوف سے ان جذبات کو روکے تھامے رہتا ہے۔

اس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: ہاں، میرے عزیز دوست، تم سچ مچ یہ بات پاؤ گے کہ اسے جب کبھی ایسی چیز صرف کرنی ہوتی ہے جو اس کی نہیں تو نکھٹوؤں کی سی فطری خواہشیں عموماً اس میں موجود ملتی ہیں۔

اس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: ان وجوہ سے ایسے آدمی کی اور بہت سے دوسرے افراد سے زیادہ عزت ہوگی، مگر پھر بھی ایک یک آواز اور ہم آہنگ روح کی سچی نیکی تو اس سے دور ہی بھاگے گی اور کبھی اس کے قریب بھی نہیں پھٹکے گی۔

اس نے کہا: میں تو یہی توقع کرتا ہوں۔

میں نے کہا: اور بالیقین انفرادی حیثیت سے یہ کنجوس آدمی ریاست میں فتح مندی کے ہر انعام اور دوسری عزت کے قابل حوصلہ مندیوں کے لیے بڑے کم درجے کا گھٹیا مقابل ہوگا۔ یہ ایسے مقابلوں میں عزت حاصل کرنے کے لیے روپیہ کبھی نہیں صرف کرے گا، کیونکہ خرچیلی، مسرفانہ خواہشوں کو بیدار کر کے اس کشمکش میں شامل کرنے اور ان سے مدد لینے سے تو یہ بہت ڈرتا ہے۔ خاص خواصی انداز سے یہ اس معرکے میں اپنے وسائل کا ایک تھوڑا سا حصہ لگاتا ہے اور نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ انعام تو ہاتھ سے جاتا ہے لیکن روپیہ بچ رہتا ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بہت صحیح۔

میں نے کہا: کیا ابھی اور کوئی شبہ باقی ہے کہ کنجوس اور ہر رنگ روپیہ بنانے والا آدمی دولت شاہی

ریاست کے مطابق ہوتا ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔

میں نے کہا: اس کے بعد جمہوریت آتی ہے۔ اس کی اصل ماہیئت پر ہمیں ابھی غور کرنا ہے، پھر جمہوری انسان کے چلن کی تحقیق کرنی اور اس پر اپنا فیصلہ صادر کرنا ہوگا۔

اس نے کہا: جی یہ تو ہمارا قاعدہ ہی ہے۔

میں نے کہا: اچھا تو دولت شاہی حکومت سے جمہوریت میں تبدیلی کیسے ہوتی ہے؟ کیا اس طرح نہیں ہوتی کہ یہ ریاست جس خوبی کو اپنا مقصد بناتی ہے وہ یہ ہے کہ جس قدر ہوسکے مالدار بنے اور یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوتی؟

اس نے کہا: اچھا تو پھر؟

میں نے کہا: حکمران چونکہ یہ جانتے ہیں کہ ان کی طاقت کا دارومدار ان کی دولت پر ہے اس لیے نوجوانوں کی فضول خرچیوں کو قانوناً روکنے سے انکار کرتے ہیں کہ ان کی تباہی میں ان کا فائدہ ہے۔ وہ ان سے سود لیتے ہیں، ان کی جائیدادیں خرید لیتے ہیں اور اس طرح اپنی دولت اور اہمیت میں اضافہ کرتے ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بالیقین۔

میں نے کہا: اس میں تو کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ دولت کی محبت اور اعتدال کا جذبہ دونوں ایک ہی ریاست کے شہریوں میں کسی قابل لحاظ حد تک یکجا نہیں رہ سکتے۔ یا ایک کی طرف سے غفلت ہوگی یا دوسرے کی طرف سے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: خاصی صاف بات ہے۔

میں نے کہا: اور دولت شاہی ریاستوں میں بے پروائی اور فضول خرچی کے عام رواج کے باعث اچھے اچھے خاندانوں کے لوگ اکثر بھیک کے ٹکڑوں سے لگ جاتے ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی، اکثر۔

میں نے کہا: لیکن پھر بھی یہ رہتے شہر ہی میں ہیں، سب کے سب وہیں ڈٹے ہوئے، پورے مسلح اور ڈنک مارنے کو تیار! ان میں سے بعض قرض دار ہیں، بعض کا شہریت کا حق ضبط ہو چکا ہے۔ ایک تیسرا گروہ ہے جو ان دونوں وبالوں میں مبتلا ہے۔ یہ لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں جنھوں نے ان کی املاک لے لی ہے

اور انہی سے کیا ہر شخص سے ہی نفرت کرتے ہیں۔ پھر ان کے خلاف سازشیں کرتے اور انقلاب کے آرزومند رہتے ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: سچ ہے۔

میں نے کہا: دوسری طرف کاروباری لوگ ہیں جو سر جھکائے چلتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو انھوں نے تباہ کیا ہے انھیں دیکھتے تک نہیں۔ یہ اپنا ڈنک (یعنی اپنا روپیہ) اب کسی اور کو مارتے ہیں جو ان سے چوکنا نہیں ہوتا جو اصل رقم یہ دیتے ہیں (اور جو بمنزلہ والدین ہوتی ہے) اس کے بچے کچے ہو کر ایک خاندان کی شکل میں کئی گنا ہو جاتی ہیں۔ اور اس طرح یہ ریاست میں کاہلوں اور مفلسوں کی تعداد بڑھائے جاتے ہیں۔

اس نے کہا: ہاں، یقیناً ان کی تو وہاں بڑی بھرمار ہوگی۔

میں نے کہا: چنانچہ یہ خرابی اب آگ کی طرح بھڑک اٹھتی ہے اور یہ نہ تو ملکیت کے استعمال پر قیدیں لگا کر اسے بجھاتے ہیں نہ کسی دوسرے طریقہ سے۔

اس نے کہا: کون سا دوسرا طریقہ۔

میں نے کہا: وہ جو اس کے بعد بہترین طریقہ ہے اور جس میں یہ فائدہ ہے کہ وہ شہریوں کو اپنے اخلاق کی طرف توجہ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یعنی ایک عام قاعدہ ہو جائے کہ جو کوئی اپنی مرضی سے معاہدہ کرے وہ اپنی ذمہ داری پر کرے اس سے یہ شرمناک زرگری بہت کم ہو جائے گی اور جن برائیوں کا ہم ذکر کر رہے تھے وہ ریاست میں گھٹ جائیں گی۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی، ان میں بہت کمی ہو جائے گی۔

میں نے کہا: فی الحال تو حاکم ان محرکات کی وجہ سے جن کا میں نے ذکر کیا اپنی رعایا سے بُرا برتاؤ کرتے ہیں۔ یہ خود ان کے حالی موالی، خصوصاً حکمران طبقے کے نوجوان، تعیش اور جسمانی اور دماغی کاہلی کی زندگی کے عادی ہو جاتے ہیں، یہ کچھ کرتے دھرتے تو ہیں نہیں اور سکھ اور دکھ دونوں کے مقابلے کی صلاحیت ان میں نہیں رہتی۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بہت درست۔

میں نے کہا: انھیں تو بس روپیہ کمانے کی فکر ہوتی ہے اور نیکی کی پرورش کی طرف سے یہ بھی اتنے ہی

بے اعتنا ہوتے ہیں جتنا کہ نادار فقیر۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی، بالکل ویسے ہی بے نیاز۔

میں نے کہا: رائج صورت حال تو یہ ہے۔ اور حکمران اور رعایا اکثر ایک دوسرے سے ملتے ہی ہیں، کبھی سفر میں، کبھی کسی اور باہم ملنے کے موقع پر، کسی جاترا پر یا جنگ کے کوچ میں، ساتھ کے سپاہی یا ملاح کی حیثیت سے۔ اچھا اور خطرے کے موقع پر ہی یہ ایک دوسرے کا رویہ بھی دیکھ لیتے ہیں، کیونکہ جہاں خطرہ ہے وہاں اس کا کوئی ڈر نہیں کہ مالدار غریبوں کی تحقیر کریں۔ بہت ممکن ہے کہ دھوپ کا تپا ہوا مضبوط آدمی جنگ میں ایک ایسے مالدار آدمی کے دوش بدوش ہو جس نے کبھی اپنا رنگ نہیں خراب ہونے دیا اور جس کے پاس فاضل گوشت کی بھی افراط ہے۔ اچھا جب یہ غریب اسے ہانپتا کانپتا اور بدحواس دیکھے گا تو بھلا کیسے اس نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ لوگ مالدار بس اس وجہ سے ہیں کہ کسی دوسرے میں ان کو لوٹنے کی ہمت نہیں؟ پھر جب یہ اپنے طور پر باہم ملیں گے تو کیا ایک دوسرے سے یہ نہیں کہیں گے کہ "ہمارے یہ جنگ آزما تو بس کچھ یوں ہی سے ہیں"۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی، میں تو خوب واقف ہوں کہ یہ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔

میں نے کہا: اور جس طرح ایک کمزور جسم میں ایک معمولی سی خارجی بات بیماری پیدا کر سکتی ہے اور بعض اوقات تو بلا کسی خارجی تحریک کے خود اس میں ایک اندرونی ہیجان پیدا ہو جاتا ہے، اسی طرح ریاست میں جہاں کہیں کمزوری ہوتی ہے وہاں مرض کا ہونا بھی قرین قیاس ہے اور اس کے پیدا ہونے کی وجہ بہت خفیف سی ہو سکتی ہے۔ پھر ایک جماعت اپنے دولت شاہی اور دوسری اپنے جمہوری حلیفوں سے مدد لیتی ہے، ریاست گویا بیمار پڑ جاتی اور خود اپنے آپ سے برسرپیکار ہوتی ہے۔ اور بعض اوقات ممکن ہے کہ بلا کسی خارجی سبب کے اندرونی انتشار پیدا ہو جائے۔

اس نے کہا: جی ہاں، یقیناً۔

میں نے کہا: اور جب غریب لوگ اپنے مخالفین پر فتح پا جاتے ہیں، کچھ کو قتل اور کچھ کو جلاوطن کر دیتے ہیں، اور باقی بچے کھچوں کو آزادی اور اقتدار کا مساوی حصہ دے دیتے ہیں تو اس وقت جمہوریت وجود میں آتی ہے۔ یہ حکومت کی وہ قسم ہے جس میں حاکم اور عہدہ دار عموماً قرعہ اندازی سے منتخب کیے جاتے ہیں۔

اس نے کہا: جی، جمہوریت کی ماہیت یہی ہے، چاہے انقلاب تلوار کے زور سے ہو یا خوف کی وجہ سے مخالف جماعت نے اپنے آپ کو ہٹا لیا ہو۔

میں نے کہا: اچھا اب دیکھیں کہ ان کا طرز زندگی کیا ہے، اور ان کی حکومت کیسی ہے؟ کیونکہ جیسی حکومت ہوگی ویسے ہی تو آدمی بھی ہوں گے۔

اس نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: پہلی بات تو یہ کہ کیا یہ لوگ آزاد نہیں، کیا ان کا شہر آزادی اور صاف گوئی سے لبریز نہیں؟ آدمی جو چاہے کہہ سکتا ہے جو چاہے کر سکتا ہے۔

اس نے جواب دیا: کہتے تو یہی ہیں۔

میں نے کہا: اور جہاں آزادی ہو وہاں ظاہر ہے کہ ہر فرد اس قابل ہوتا ہے کہ اپنی زندگی جیسی چاہے بنائے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: ایسی ریاست میں انسانی طبیعتوں کا بڑے سے بڑا تنوع ہوگا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی، ہوگا۔

میں نے کہا: چنانچہ یہ سب سے خوشنما ریاست معلوم ہوتی ہے، جس کی مثال ایک کڑھے ہوئے لباس کی سی ہے جس پر طرح طرح کے پھول بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ اور جس طرح عورتیں اور بچے رنگوں کے تنوع کو اور سب چیزوں سے زیادہ دلفریب سمجھتے ہیں اسی طرح بہت سے آدمی ہوتے ہیں جنھیں یہ ریاست جو مختلف انسانی سیرتوں اور طور طریقوں سے پیراستہ ہے سب سے حسین اور خوشنما ریاست معلوم ہوتی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: جی ہاں، جناب عالی، اور حکومت کی تلاش کرنے والے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی ریاست نہیں ہوگی۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یہ کیوں؟

میں نے کہا: اس ریاست میں جو حریت ہے اس کے سبب سے یہاں ہر طرح کے اساسی دستوروں کا ایک کامل مجموعہ ملے گا۔ اور جس کسی کو ہماری طرح ایک ریاست بنانے کا خیال ہو اسے جمہوریت میں ایسے چلا جانا چاہیے ایک بازار میں جہاں دستور بکتے ہیں اور جو اپنی منشا کے مطابق ہو اسے چن لینا چاہیے۔ پھر اس انتخاب کے بعد وہ اپنی ریاست قائم کر سکتا ہے۔

اس نے کہا: اسے یہاں یقیناً کافی نمونے ملیں گے۔

میں نے کہا: اور اگر آپ خود ہی نہ چاہیں تو صلاحیت کے باوجود آپ کے لیے حکومت کرنا یا محکوم بننا لازمی نہیں، نہ یہ ضروری ہے کہ جب سب جنگ کریں، تو آپ بھی جنگ کریں، یا سب امن سے رہتے ہوں تو آپ بھی امن سے رہیں۔ ہاں آپ ہی کا جی چاہے تو اور بات ہے۔ نہ یہ ہی ضروری ہے کہ اگر کوئی قانون آپ کو کسی عہدے کے پُر کرنے سے یا قاضی بننے سے منع کرتا ہے اور آپ کا جی اس کو چاہتا ہے تو آپ اس عہدے کو حاصل نہیں کر سکیں یا قاضی نہ بن سکیں۔ کیا زندگی کا یہ طریقہ کم سے کم ایک لمحے کے لیے نہایت ہی خوش آیند معلوم نہیں ہوتا؟

ایڈیمنٹس: ہاں، فی الوقت تو معلوم ہوتا ہے۔

میں نے کہا: اور کیا بعض صورتوں میں مجرموں کے ساتھ ان کا انسانیت کا برتاؤ دل کو بہت نہیں بھاتا؟ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جمہوریت میں بہت سے لوگ جنھیں موت کی سزا یا جلاوطنی کا حکم مل چکا ہے وہ جہاں تھے وہیں رہتے ہیں اور ادھر ادھر ساری دنیا میں سرگشت لگاتے ہیں، یہ بزرگ بڑے سورما بنے اکڑتے پھرتے ہیں، اور کوئی نہیں دیکھتا ہے نہ ہی ذرا پروا کرتا ہے۔

اس نے جواب دیا: جی، بہت سارے ایسے ہوتے ہیں، بہت سارے۔

میں نے کہا: اس کے علاوہ جمہوریت کے درگزر کرنے کے جذبے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کے متعلق ''چہ غم'' کا انداز بھی دیکھو، اور ان تمام لطیف اصولوں کی طرف سے بے اعتنائی جو ہم نے اپنے شہر کے بناتے وقت نہایت اہتمام سے قائم کیے تھے، مثلاً یہ کہ ہم نے کہا تھا کہ سوائے نہایت ہی نادر صورتوں کے کوئی اچھا آدمی ہرگز ایسا نہ ہوگا جو بچپن سے حسین چیزوں کے ساتھ کھیلنے، ان سے لطف اندوز اور سبق حاصل کرنے کا عادی نہ ہو۔ یہ جمہوریت کس شان سے ہمارے ان تمام لطیف تصورات کو پاؤں تلے روندتی ہے اور ان مشاغل کی طرف ایک آن دھیان نہیں کرتی جن سے مدبر بنتا ہے بلکہ ہر اس شخص کو عزت بخش دیتی ہے جو جمہور کا دوست ہونے کا مدعی ہو۔

اس نے کہا: یہ جمہوریت تو پھر نہایت ہی شریف الطبع چیز ہوئی۔

میں نے کہا: جمہوریت کی یہ اور ان ہی جیسی اور خصوصیات ہیں، (بہر حال) ہے یہ حکومت کی نہایت دلفریب شکل! تنوع اور بدنظمی سے پُر، اور مساوی اور غیر مساوی سب کو یکساں مساوات دینے والی!

ایڈیمنٹس نے کہا: جی، اس سے تو ہم خوب واقف ہیں۔

میں نے کہا: اب ذرا دیکھیں کہ اس کا فرد کس قسم کا انسان ہے، بلکہ جیسے ہم نے ریاست کے ساتھ کیا ہے یہ بھی دیکھیں کہ یہ فرد کس طرح وجود میں آتا ہے؟

اس نے کہا: بہت خوب۔

میں نے کہا: کیا اس طرح نہیں؟ کہ یہ ایک کنجوس دولت شاہی حکومت سے تعلق رکھنے والے باپ کا بیٹا ہے، جس نے اسے اپنی جیسی عادتوں ہی کی تربیت دی ہے؟

ایڈیمنٹس نے کہا: بالکل۔

میں نے کہا: اور باپ کی طرح یہ بھی اپنی ان تمام خواہشات کو زبردستی دباتا ہے جو کمانے سے نہیں بلکہ خرچ کرنے سے متعلق ہیں کہ یہ وہ حاجتیں ہیں جنھیں غیر ضروری کہا جاتا ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: کیا وضاحت کی خاطر تم ضروری خواہشوں میں امتیاز کرنا چاہتے ہو؟

ایڈیمنٹس نے کہا: ضرور۔

میں نے کہا: ضروری خواہشیں کیا وہ نہیں ہوتیں جن سے ہمیں کوئی مفر نہیں اور جن کے پورا کرنے سے ہمیں فائدہ ہوتا ہے؟ انھیں بجا طور پر ضروری کہا جاتا ہے، کیونکہ ہمیں فطرت نے بنایا ہی اس طرح ہے کہ ہم ان چیزوں کی خواہش کریں جو مفید بھی ہوں اور لازمی بھی اور ان کے خلاف ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: لہٰذا انھیں ضروری بتانے میں ہم غلطی پر نہیں ہیں؟

ایڈیمنٹس نے کہا: جی نہیں۔

میں نے کہا: لیکن وہ خواہشیں جن سے آدمی اگر بچپن سے برابر کوشش کرے تو بچ سکتا ہے اور علاوہ بریں جن کے ہونے سے کوئی نفع نہیں ہوتا بلکہ بعض صورتوں میں اس کا الٹا ہی ہوتا ہے، تو کیا ایسی خواہشوں کو غیر ضروری کہنے میں ہم حق بجانب نہیں ہوں گے؟

ایڈیمنٹس نے کہا: ہاں، یقیناً۔

میں نے کہا: اچھا تو دونوں قسموں کی ایک ایک مثال لیں، تاکہ ان کا ایک عام تصور قائم ہو جائے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بہت خوب۔

میں نے کہا: کیا کھانے کی خواہش ضروری قسم میں شامل نہیں ہوگی، یعنی ایسی سادہ غذا اور مصالحے کی خواہش جو تندرستی اور جسمانی قوت کے لیے درکار ہو؟

ایڈیمنٹس نے کہا: میں تو سمجھتا ہوں ہوگی۔

میں نے کہا: کھانے کی خواہش دو طرح ضروری ہے۔ ایک تو اس سے ہمیں فائدہ ہوتا ہے، اور دوسرے یہ زندگی کی بقا کے لیے لازمی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: لیکن چاٹ اور مصالحے تو بس وہیں تک ضروری ہیں جہاں تک صحت کو فائدہ پہنچائیں؟

ایڈیمنٹس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: لیکن وہ خواہشیں جو اس کے آگے بڑھتی ہیں، مثلاً زیادہ نفیس غذا اور دوسرے تعیشات کی خواہش کہ جسے اگر لڑکپن سے سدھایا اور قابو میں لایا جائے تو عموماً اس سے بچاؤ ہوسکتا ہے اور جو (ادھر) جسم کے لیے مضر اور (اُدھر) خیر و حکمت کی تلاش میں روح کے لیے مضر، تو انھیں تو بجا طور پر غیر ضروری کہا جاسکتا ہے؟

ایڈیمنٹس نے کہا: بہت بجا۔

میں نے کہا: تو یہ کہہ سکتے ہیں نا کہ اِن خواہشوں میں خرچ ہوتا ہے اور اُن میں روپیہ بنتا ہے اس لیے کہ ان سے دولت پیدا کرنے کی ترغیب ہوتی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: سچ ہے۔

میں نے کہا: عشق کی رنگ رلیوں اور دوسری لذتوں کا بھی یہی حال ہے؟

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: وہ نکھٹو جس کا ہم نے ذکر کیا تھا وہ شخص ہے جو اس قسم کی خواہشوں اور لذتوں سے پُر ہو یعنی غیر ضروری خواہشوں کا غلام ہو، برخلاف اس کے جو صرف ضروری خواہشوں کے اثر میں ہو وہ کنجوس اور دولت شاہی حکومت سے تعلق رکھنے والا ہوتا ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بہت درست۔

میں نے کہا: اچھا تو پھر یہ دیکھیں کہ دولت شاہی خواص سے جمہوری آدمی کیسے پیدا ہوتا ہے؟ میرا گمان ہے کہ عام طور پر یہ صورت ہوتی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یعنی کیا؟

میں نے کہا: ایک نوجوان، جس کی تربیت نہایت گندے اور کنجوس طریقے سے ایسی ہوئی ہے جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا، جب ایسے نکھٹو کو شہد کا چسکا لگتا ہے اور اسے ایسی خونخوار اور مکار طبیعتوں کی صحبت ملتی ہے جو اس کے لیے ہر قسم کی نفیس چیزیں اور نت نئی لذتیں مہیا کر سکتے ہیں تو تم خود سمجھ سکتے ہو کہ اس کے اندر جو خواصی اصول ہے وہ جمہوری اصول میں تبدیل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: لازم ہے۔

میں نے کہا: اور جیسے شہر میں مماثل کی مدد کی تھی اور انقلاب اس طرح ہوا تھا کہ باہر سے ایک حلیف نے شہریوں کی ایک جماعت کی کمک کی، اسی طرح اس نوجوان میں بھی تبدیلی یونہی رونما ہوتی ہے کہ اس کی اندرونی خواہشات کی مدد کے لیے باہر سے خواہشات کا ایک گروہ آتا ہے اور یہاں بھی ہم جنس خواہشات، ہم جنس خواہشوں کی مدد کرتی ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: اور اگر کوئی حلیف اس کے اشرافی اصول کی مدد کرتا ہے، چاہے یہ باپ یا رشتہ داروں کی نصیحت ہو یا ملامت، تو اس کی روح میں ایک فریق پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے مخالف ایک اور فریق۔ اور یہ خود اپنے آپ سے برسرپیکار ہو جاتا ہے۔

اس نے کہا: ایسا ہونا لازمی ہے۔

میں نے کہا: چنانچہ بعض اوقات جمہوری اصول دولت شاہی اصول سے دبنے لگتا ہے، اس کی بعض خواہشیں مر جاتی ہیں بعض فرار ہو جاتی ہیں، اس نوجوان کی روح میں احترام کا جذبہ داخل ہو جاتا ہے اور اس طرح (اس کی روح کا) نظم واپس آ جاتا ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔

میں نے کہا: پھر جب پرانی خواہشات نکل جاتی ہیں تو ان جیسی اور نئی اٹھ کھڑی ہوتی ہیں اور چونکہ یہ ان کا پیدا کرنے والا انھیں تربیت دینا نہیں جانتا اس لیے یہ تعداد میں بڑھتی ہیں اور زور پکڑتی جاتی ہیں۔

اس نے کہا: جی اکثر ایسا ہوتا ہے۔

میں نے کہا: یہ پھر اسے اپنے پرانے ہم نشینوں کی طرف کھینچتی اور ان سے خفیہ ربط و ضبط پیدا کر کے خوب بچے دیتی ہیں اور بڑھتی ہیں۔

اس نے کہا: بہت صحیح۔

میں نے کہا: بالآخر یہ اس نوجوان کی روح کے قلعے پر قابض ہو جاتی ہیں اور اسے تمام عمدہ اخلاق، اچھے مشغلوں اور صداقت شعاری سے خالی پاتی ہیں کہ یہ چیزیں تو ان انسانوں کے دماغوں کو اپنا مسکن بناتی ہیں جو دیوتاؤں کے چہیتے اور ان کے بہترین محافظ اور پاسبان ہوتے ہیں۔

اس نے کہا: ان سے بہتر کون ہو سکتا ہے۔

میں نے کہا: چنانچہ جھوٹے اور شیخی خورے عقیدے اور دعوے اوپر چڑھ کر ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔

اس نے کہا: ایسا ہونا تو یقینی ہے۔

میں نے کہا: اب یہ نوجوان پھر افیونیوں کے ملک میں لوٹتا ہے اور وہیں اپنا مسکن بناتا ہے۔ پھر اگر اس کے دوست اس کی فطرت کے خواصی حصے کو کوئی مدد بھیجیں تو یہ شیخی کے خیالات جن کا ذکر ہوا، شاہی قلعے کے دروازے بند کر دیتے ہیں اور نہ اس سفارت کو داخل ہونے دیتے ہیں نہ بزرگوں کی اس پدرانہ نصیحت ہی کو سنتے یا مانتے ہیں جو نجی طور پر کوئی پیش کرے۔ پھر ایک جنگ ہوتی ہے اور معرکہ انہی کے ہاتھ رہتا ہے۔ اب یہ انکسار کو جسے یہ حماقت کہتے ہیں نہایت شرمناک طریقے سے نکال باہر کرتے ہیں اور عفت اور اعتدال کو جس کا عرف انھوں نے نامرادی رکھا ہے دلدل میں رَوند کر الگ پھینک دیتے ہیں۔ یہ لوگوں کو باور کراتے ہیں کہ اعتدال اور ہاتھ روک کر خرچ کرنا کمینہ پن اور کم ظرفی ہے۔ چنانچہ بری خواہشات کی ایک بھیڑ کی مدد سے یہ انھیں سرحد پار بھگا دیتے ہیں۔

اس نے کہا: جی ہاں، دیدہ و دانستہ۔

میں نے کہا: جب اس شخص کی روح پر تسلط حاصل ہو گیا اور انھوں نے اسے بالکل خالی اور صاف کر کے اپنا رازدار بنا لیا تو اب دوسرا قدم یہ ہوتا ہے کہ یہ اپنے مسکن میں گستاخی اور بے راہ روی، تعیش اور بے حیائی کو اس انداز سے واپس لاتے ہیں کہ یہ ایک شاندار جلوس میں سروں پر ہار پہنے آتے ہیں، ان کے ساتھ ایک بڑا مجمع ہوتا ہے جو ان کے گن گاتا اور انھیں پیارے پیارے ناموں سے پکارا کرتا ہے۔ گستاخی کو یہ حسن تربیت

کہتے ہیں اور بے راہ روی کو آزادی۔ تعیش کا نام ان کے ہاں شان وشوکت ہے اور بے حیائی کا جرأت۔ اور اس طرح یہ نوجوان اپنی اصلی فطرت سے، جس کی تربیت ضرورت کے مدرسے میں ہوئی تھی منھ موڑ کر بے کار اور غیر ضروری مسرتوں کی آزادی اور فسق وفجور میں پہنچ جاتا ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔ اس کی یہ تبدیلی تو صاف دکھائی دیتی ہے۔

میں نے کہا: پھر اس کے بعد یہ اپنی زندگی کے دن یوں گزارتا ہے کہ غیر ضروری مسرتوں پر بھی اسی طرح اپنا مال، اپنی محنت اور اپنا وقت صرف کرتا ہے جیسے ضروری پر۔ لیکن اگر یہ قسمت کا اچھا ہے اور اس کے حواس بہت زیادہ منتشر نہیں ہوئے ہیں تو کچھ عمر کٹنے پر جب جذبوں کا شباب ڈھل جائے تو ممکن ہے یہ شہر بدر کی ہوئی خوبیوں میں سے بعض کو پھر اندر آنے دے اور اپنے آپ کو بالکل ان کے جانشینوں کے ہاتھ میں نہ رہنے دے۔ ایسی صورت میں یہ اپنی مسرتوں میں باہم ایک قسم کا توازن پیدا کر لیتا ہے یعنی اپنی حکومت اس کے سپرد کرتا ہے جو سب سے پہلے آئے اور بازی جیت لے، پھر جب اس سے سیری ہو جاتی ہے تو دوسرے کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ یہ کسی کی تحقیر نہیں کرتا، سب کی یکساں ہمت افزائی کرتا رہتا ہے۔

اس نے کہا: بہت صحیح۔

میں نے کہا: یہ اب اس قطعے میں پند ونصیحت کی کسی سچی بات کو نہ قبول کرتا ہے نہ آنے کی اجازت دیتا ہے، مثلاً اگر کوئی اس سے کہے کہ بعض مسرتیں اچھی اور شریف خواہشوں کی تسکین سے عبارت ہیں اور بعض بری خواہشوں سے، اور تمھیں چاہیے کہ بعض کو استعمال کرو اور ان کی عزت کرو، اور بعض کو سزا دے کر ان پر غلبہ حاصل کرو، غرض جب کبھی اس قسم کی کوئی بات اس کے سامنے کہی جائے، تو اپنا سر ہلاتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ یہ تو سب کی سب ایک سی ہیں اور ان میں ہر ایک اتنی ہی اچھی ہے جتنی کوئی دوسری۔

اس نے جواب دیا: جی، اس کا تو یہی رویہ ہوگا۔

میں نے کہا: جی ہاں۔ اسی طرح آنی خواہشات کی تسکین میں صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔ یہ کبھی شراب کے نشے میں مست اور بانسری کے نغموں سے سرشار ہوتا ہے، کبھی خالص پانی پر اتر آتا ہے اور دبلا ہونے کی فکر کرتا ہے۔ کبھی جسمانی ورزش کی طرف توجہ ہو جاتی ہے اور کبھی سہل انگاری پر آتا ہے تو ہر چیز کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے، اور کبھی فلسفیانہ زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ اکثر آپ سیاسیات سے شغل فرماتے ہیں کہ کھڑے ہو کر جو سر میں سمایا کہہ ڈالا اور کر ڈالا۔ اگر کہیں کسی فوجی آدمی پر رشک آ گیا تو اس طرف چل

کھڑے ہوئے اور کسی کاروباری شخص پر آ گیا تو اس طرف۔ اس کی زندگی میں نہ کوئی آئین ہے نہ کوئی نظام اور اس پراگندہ وجود کو وہ خوشی، برکت اور آزادی کے ناموں سے موسوم کرتا ہے اور بس اسی طرح گزرتی ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔ یہ حضرت تو سراپا آزادی اور مساوات کے پتلے ہیں!

میں نے کہا: ہاں۔ اس کی زندگی نہایت متنوع اور رنگا رنگ ہوتی ہے، یعنی بہت سی زندگیوں کا خلاصہ۔ یہ اس ریاست کا جواب ہے جسے ہم نے حسین اور مرصع بتایا تھا۔ بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں اسے اپنا نمونہ بنائیں گی اور اس کے وجود میں بہت سے دستوروں اور طور طریقوں کی مثالیں ملیں گی۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اچھا تو اسے جمہوریت کے مقابل رکھیں کہ اسے بجا طور پر جمہوری انسان کہا جا سکتا ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔ اس کی یہی جگہ ہونی چاہیے۔

میں نے کہا: آخر میں سب سے خوبصورت انسان اور ریاست آتے ہیں یعنی جبر و استبداد اور جابر و مستبد۔ اب ہمیں ان پر نظر کرنی چاہیے۔

اس نے کہا: بالکل درست۔

میں نے کہا: اچھا تو فرمائیے کہ استبداد کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ یہ تو واضح ہے کہ اس کی اصل جمہوری ہے۔

اس نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: کیا جمہوریت سے استبداد اسی طرح پیدا نہیں ہوتا جیسے دولت شاہی سے جمہوریت؟ یعنی ایک معنی کر۔

اس نے کہا: کیسے؟

میں نے کہا: دولت شاہی نے اپنے لیے جو خیر اور اس کے قیام کا جو ذریعہ تجویز کیا تھا وہ کثرت دولت تھا۔ کیوں میں صحیح کہتا ہوں نا؟

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور دولت کی کبھی نہ بجھنے والی پیاس اور روپیہ حاصل کرنے کے لیے ہر چیز سے غفلت، یہی دولت شاہی کی تباہی کا باعث ہوئی؟

اس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: چنانچہ جمہوریت کا بھی ایک اپنا خیر ہے جس کی کبھی تسکین نہ پانے والی آرزو اسے انتشار کا منہ دکھاتی ہے؟

اس نے کہا: وہ کیا؟

میں نے کہا: آزادی جس کے متعلق جمہوریت میں تم سے لوگ کہیں گے کہ یہ ریاست کا فخر ہے۔ اور اسی وجہ سے احرار صرف جمہوریت ہی میں رہنا پسند کرتے ہیں۔

اس نے کہا: جی ہاں۔ یہ بات تو ہر ایک کی زبان پر ہے۔

میں نے کہا: ہاں تو میں یہ کہنے والا تھا کہ اس کی کبھی تسکین نہ پانے والی آرزو اور دوسری چیزوں سے غفلت جمہوریت میں وہ تبدیلی پیدا کر دیتی ہے جس سے استبداد کا مطالبہ پیدا ہوتا ہے۔

اس نے کہا: یہ کیسے؟

میں نے کہا: جب آزادی کی پیاسی جمہوریت میں برے ساقی محفل کے صدر ہوں اور جمہوریت نے حریت کی تیز شراب ضرورت سے زیادہ پی لی ہو تو اب اگر اس کے حکمران اس کی بات مان کر اسے ایک اور بڑا گھونٹ نہ دیں تو یہ ان سے جواب طلب کرتی ہے، سزا دیتی ہے، اور انھیں "منحوس خواص" بتاتی ہے۔

اس نے جواب دیا: جی ہاں۔ یہ تو عام واقعہ ہے۔

میں نے کہا: ہاں۔ اور جو وفادار شہری ہیں انھیں یہ جمہوریت ہیچ جانتی اور حقارت سے انھیں غلام کہتی ہے جو اپنی زنجیروں کو سینے سے لگاتے ہیں۔ یہ تو ایسی رعایا چاہتی ہے جو حاکموں کی طرح ہو اور ایسے حاکم جو رعایا کی طرح ہوں۔ اس کے جی کے سے تو بس یہ لوگ ہوتے ہیں اور یہ انھی کی مداحی کرتی اور انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح سے انھی کی عزت کرتی ہے تو بھلا ایسی ریاست میں حریت کی کوئی حد ہو سکتی ہے؟

اس نے کہا: یقیناً نہیں۔

میں نے کہا: رفتہ رفتہ یہ مزاج گھروں میں راہ پالیتا ہے اور بالآخر جانوروں تک پہنچ کر ان میں بھی یہ وبا پھیلاتا ہے۔

اس نے کہا: آپ کا کیا مطلب ہے، کیسے؟

میں نے کہا: میرا مطلب ہے کہ باپ بیٹوں کی سطح پر اترنے اور ان سے ڈرنے کا عادی ہو جاتا ہے اور بیٹا باپ کی برابری کرتا ہے، اس میں اپنے والدین کی نہ عزت ہوتی ہے نہ حرمت، اور بس یہی اس کی

آزادی ہے۔ یہاں مقیم پردیسی شہری کے برابر ہوتا ہے اور شہری مقیم پردیسی کے اور بالکل اجنبی بھی ایسا ہی جیسے یہ دونوں۔

اس نے جواب دیا: جی ہاں، یہ تو ہوتا ہے۔

میں نے کہا: اور بس یہی خرابیاں تھوڑی ہی ہیں اور بہت سی اس سے کم درجے کی برائیاں بھی ہیں۔ مثلاً اس حالت میں استاد اپنے شاگردوں سے ڈرتا اور ان کی خوشامد کرتا ہے، شاگرد اپنے استادوں اور اتالیقوں کی تحقیر کرتے ہیں، جوان بوڑھے سب یکساں ہیں، جوان بوڑھے کی برابری کرتا ہے اور قول اور فعل میں اس کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہتا ہے، بوڑھے جوانوں کی سطح پر اُتر کر ہنسی مذاق کرتے ہیں، یہ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ لوگ انھیں مستبد اور تلخ مزاج خیال کریں، لہٰذا جوانوں کے انداز اختیار کرتے ہیں۔

اس نے کہا: بہت درست۔

میں نے کہا: عام آزادی کی آخری حد وہ ہے جب زرخرید غلام مرد ہو کہ عورت، اتنا ہی آزاد ہوتا ہے جتنا اس کا خریدار، نیز اس سلسلے میں مردوں اور عورتوں کی باہم گر آزادی اور مساوات کا ذکر بھی نہیں بھولنا چاہیے۔

اس نے کہا: کیوں، بقول ایسکلس منھ پر آئی بات کہہ ہی کیوں نہ ڈالیں؟

میں نے کہا: میں یہی تو کر رہا ہوں۔ ہاں یہ اور کہہ دوں کہ کوئی انجان آدمی اسے یقین نہیں کرے گا کہ انسانی اقتدار میں جو جانور ہیں انھیں جمہوریت میں جس قدر آزادی حاصل ہے کسی اور ریاست میں نصیب نہیں۔ کیونکہ یہ کہاوت سچ ہے کہ کتیاں بھی وہی حیثیت رکھتی ہیں جو ان کی مالکہ عورتیں اور گھوڑے اور گدھے احرار کے تمام حقوق و اعزاز کے ساتھ چلنے کا انداز رکھتے ہیں، اگر کوئی ان کے راستے میں آ جائے اور ان کے لیے سڑک صاف نہ چھوڑے تو یہ اسی کے اوپر سے گزر جائیں۔ الغرض تمام چیزیں، آزادی کی بہتات سے ہیں کہ پھٹی پڑتی ہیں۔

اس نے کہا: جی ہاں، میں جب کبھی دیہات میں ٹہلنے جاتا ہوں تو یہی دیکھنے میں آتا ہے جو آپ نے بیان فرمایا۔ میں نے، آپ نے، ایسا لگتا ہے ایک ہی خواب دیکھا ہے۔

میں نے کہا: ان سب سے بالاتر یہ کہ ان تمام چیزوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شہری نہایت ذکی الحس ہو جاتے ہیں، انھیں کہیں ذرا تحکم چھو نہیں گیا کہ یہ لگے بے صبری سے پیچ و تاب کھانے اور آپ جانتے ہی ہیں

آخر کار تو یہ تمام تحریری قوانین کا لحاظ کرنا چھوڑ دیتے ہیں یہ کسی کو اپنے اوپر نہیں دیکھنا چاہتے۔

اس نے کہا: جی ہاں، میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔

میں نے کہا: تو عزیز من، یہ ہے وہ حسین اور شاندار آغاز جس سے استبداد پیدا ہوتا ہے۔

اس نے کہا: واقعی بڑا ہی شاندار ہے! لیکن یہ فرمائیے کہ اب اس کے بعد کون سا قدم اٹھتا ہے۔

میں نے کہا: جو حکومت اشرافیہ کی تباہی کا باعث تھا وہی جمہوریت کی تباہی کا سبب ہے۔ وہی مرض، حریت سے اور زیادہ بڑھ کر شدید ہو کر جمہوریت کو بھی آن دباتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ہر چیز کی حد سے زیادتی اکثر بالکل مخالف سمت میں ایک ردعمل پیدا کرتی ہے اور یہ بات صرف موسم یا نباتی اور حیوانی زندگی تک ہی محدود نہیں بلکہ سب سے زیادہ یہ حکومت کی اقسام پر اپنا اثر رکھتی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: آزادی کی زیادتی سے خواہ ریاست میں ہو یا افراد میں، غلامی کی زیادتی ہی پیدا ہوتی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔ قدرتاً۔

میں نے کہا: چنانچہ جمہوریت سے استبداد قدرتی طور پر نکلتا ہے، اور جتنی انتہائی قسم کی آزادی ہوتی ہے اس سے اسی درجہ بڑھ کر استبداد اور غلامی پیدا ہوتی ہے۔

اس نے کہا: یہی توقع بھی کرنی چاہیے تھی۔

میں نے کہا: لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تمھارا سوال تو یہ نہیں تھا۔ تم تو شاید یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ وہ کونسی بدنظمی ہے جو جمہوریت اور دولت شاہی میں یکساں پیدا ہوتی اور دونوں کی تباہی کا باعث ہے۔

اس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: اچھا تو میں اس سلسلے میں اس کاہل مسرف طبقے کا حوالہ دے رہا تھا جس میں جو ذرا باہمت ہوں وہ قائد اور جو دبو ہوں وہ متبع ہوتے ہیں۔ ہم نے انہی کی نکھٹوؤں سے مثال دی تھی جن میں بعض ڈنک دار ہوتے ہیں اور بعض بے ڈنک۔

اس نے کہا: بہت ٹھیک تمثیل تھی۔

میں نے کہا: اور یہ دونوں گروہ جس شہر میں پیدا ہو جائیں اس کے لیے جان کا وبال ہو جاتے ہیں۔

ان کی مثال جسم میں بلغم اور صفرا کی سی ہے۔ چنانچہ ریاست کے اچھے طبیب اور قانون بنانے والے کا فرض ہے کہ ہوشیار شہد کی مکھیاں پکڑنے والے کی طرح انھیں دور ہی دور رکھے۔ اور ہو سکے تو کبھی اندر آنے ہی نہ دے۔ اور بالفرض اگر یہ کسی طرح آن پہنچیں تو انھیں اور ان کے خانوں کو جلد سے جلد کاٹ پھینکے۔

اس نے کہا: جی، ضرور۔

میں نے کہا: آؤ ہم جو کر رہے ہیں اسے صاف طور پر دیکھنے کے لیے فرض کریں کہ جمہوریت تین طبقوں میں منقسم ہے۔ اور واقعی ہے بھی ایسا ہی۔ کیونکہ اولاً تو آزادی کی وجہ سے جمہوریت میں دولت شاہی سے بھی زیادہ نکھٹو پیدا ہوتے ہیں۔

اس نے کہا: بجا ہے۔

میں نے کہا: اور جمہوریت میں ان کا رنگ اور بھی چوکھا ہوتا ہے۔

اس نے کہا: یہ کیسے:

میں نے کہا: اس لیے کہ خواص کی حکومت میں ان کی عزت نہیں ہوتی اور یہ اپنے عہدوں سے علیحدہ کر دیے جاتے ہیں، چنانچہ یہ نہ اپنی تربیت کر سکتے ہیں نہ اپنی طاقت بڑھا سکتے ہیں لیکن جمہوریت میں حکومت کی تقریباً ساری طاقت انھیں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ان میں جو ذرا تیز اور ذہین ہوتے ہیں وہ تقریریں اور کام کرتے ہیں اور باقی دوسرے منبر کے اردگرد بھنبھناتے پھرتے ہیں اور کسی کو مخالفت میں ایک لفظ نہیں کہنے دیتے۔ چنانچہ جمہوریت میں کم و بیش ہر چیز کا انتظام و انصرام نکھٹوؤں کے ہاتھ میں ہی ہوتا ہے۔

اس نے کہا: بہت درست۔

میں نے کہا: اس بھیڑ میں ایک اور طبقہ بھی ہمیشہ الگ دیکھا جا سکتا ہے۔

اس نے کہا: وہ کون سا؟

میں نے کہا: ان کا جو فطری طور پر مرتب طبیعت والے ہوتے ہیں جو تجارت میں لگی ہوئی سماج میں سب سے مالدار طبقہ ہوتا ہے۔

اس نے کہا: قدرتاً۔

میں نے کہا: یہ سب سے زیادہ دبنے والے لوگ ہوتے ہیں اور نکھٹوؤں کو انہی سے سب سے زیادہ شہد ملتا ہے۔

اس نے کہا: اور کیا۔ جن بے چاروں کے پاس ہو ہی کم ان کو دبانے سے تو نکلے گا بھی کم۔

میں نے کہا: یہ امیروں کا طبقہ کہلاتا ہے اور نکھٹو انھی سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔

اس نے کہا: اور کیا، یہی بات ہے۔

میں نے کہا: تیسرا طبقہ عام لوگوں کا ہوتا ہے۔ اس میں وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے ہاتھ سے کام کرتے ہیں، یہ نہ سیاست جانتے ہیں نہ کھانے کو ان کے پاس بہت ہوتا ہے۔ جب اکٹھا ہو جائے تو یہی طبقہ جمہوریت میں سب سے بڑا اور سب سے طاقتور ہوتا ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یہ سچ ہے۔ لیکن یہ انبوہ مشکل ہی سے اکٹھا ہونے پر آمادہ ہوتا ہے، ہاں سوائے اس کے کہ اسے بھی کچھ شہد ملے۔

میں نے کہا: تو کیا انھیں حصہ نہیں ملتا؟ کیا ان کے قائد مالداروں سے ان کی جائیدادیں چھین کر عوام میں تقسیم نہیں کرتے؟ ہاں، یہ خیال ضرور رکھتے ہیں کہ اس کا بڑا حصہ خود اپنے لیے محفوظ کر لیں۔

اس نے جواب دیا: ہاں، کیوں نہیں، اس حد تک تو عوام ضرور حصہ دار ہوتے ہیں۔

میں نے کہا: اور جن لوگوں کی املاک چھنی جاتی ہے وہ مجبور ہوتے ہیں کہ انھیں عوام کے سامنے جیسے بن پڑے جواب دہی بھی کریں!

اس نے جواب دیا: اور کر ہی کیا سکتے ہیں؟

میں نے کہا: اور پھر (لطف یہ) کہ چاہے ان غریبوں میں انقلاب کی کوئی خواہش بھی نہ ہو لیکن دوسرے ان پر یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ انھوں نے عوام کے خلاف سازش کی ہے اور دولت شاہی کے دوست ہیں۔

اس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب یہ لوگ عوام کو اپنی مرضی سے نہ سہی بلکہ جہالت اور مخبروں کی فریب دہی سے ہی اپنے نقصان کے درپے دیکھتے ہیں تو مجبوراً واقعی دولت شاہی کے حامی بن جاتے ہیں۔ یہ جی سے چاہتے نہیں لیکن نکھٹوؤں کی نیش زنی انھیں اذیت پہنچاتی اور ان میں انقلاب کی خواہش پیدا کرتی ہے۔

اس نے کہا: بالکل صحیح۔

میں نے کہا: پھر ایک دوسرے پر ملامت کرنے کی، مقدموں اور فیصلوں کی نوبت آتی ہے۔

اس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: عام لوگوں کا سدا کوئی نہ کوئی حمایتی ہوتا ہے، جسے یہ اپنا سردار بناتے اور بڑھا چڑھا کر اس کی عظمت کرتے ہیں۔

اس نے کہا: جی ہاں، ان کا یہی طریقہ ہے۔

میں نے کہا: یہی وہ جڑ ہے (اور اس کے علاوہ اور کوئی نہیں) جس سے مستبد پیدا ہوتا ہے۔ یہ جب پہلے پہل زمین سے اپنا سر نکالتا ہے تو محافظ کی حیثیت سے، عوام کے حقوق کا طالب بن کر۔

اس نے کہا: ہاں، ظاہر ہے۔

میں نے کہا: پھر آخر میں یہ محافظ مستبد میں کیسے بدلنا شروع ہوتا ہے؟ ظاہر ہے کہ جب یہ اس آدمی کی سی حرکت کرنے لگتا ہے جس کا ذکر لائیسیا کے (Lycaean) زیوس کے آرکیڈیا (Arcadian) والے مندر کے قصے میں ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: کون سا قصہ؟

میں نے کہا: قصہ یہ ہے کہ جو کوئی ایک قربان کیے ہوئے آدمی کی آنتوں کو دوسری قربانیوں کی آنتوں کے ساتھ قیمہ کر کے چکھ لے وہ بھیڑیا بن جاتا ہے۔ آپ نے کبھی یہ قصہ نہیں سنا تھا؟

ایڈیمنٹس نے کہا: ہاں، ہاں سنا تو تھا۔

میں نے کہا: چنانچہ جمہور کے محافظ کی مثال بھی اسی آدمی کی سی ہے۔ اس کے بس میں چونکہ ایک انبوہ ہوتا ہے اس لیے اپنے عزیزوں کا خون بہانے سے کوئی چیز اسے نہیں روکتی۔ اسی عام طریقے سے یعنی جھوٹے الزام لگا لگا کر یہ انھیں عدالت میں پیش کراتا اور قتل کراتا ہے، انسانی زندگی کی فنا کا سبب بنتا ہے اور پھر اپنی ناپاک زبان اور لبوں سے اپنے ساتھی شہریوں کا خون چکھتا ہے۔ بعض کو تو یہ مروا ہی ڈالتا ہے اور بعض کو جلاوطن کرا دیتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ قرضوں کی معافی اور زمین کے اشارے بھی دیتا جاتا ہے۔ تو آخر ان سب باتوں کے بعد اس کا کیا حشر ہوگا؟ یا تو اپنے دشمنوں کے ہاتھوں مارا جائے گا یا پھر آدمی سے بھیڑیا یعنی مستبد بن جائے گا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: لازماً۔

میں نے کہا: یہ وہی شخص تو ہے، جس نے مالداروں کے خلاف ایک جماعت بنانی شروع کی تھی؟

ایڈیمنٹس نے کہا: وہی۔

میں نے کہا: کچھ عرصے بعد یہ نکال باہر بھی کیا جاتا ہے، لیکن پھر باوجود اپنے دشمنوں کے واپس آتا ہے اور اب کی دفعہ اچھا پورا مستبد بن کر۔

ایڈیمنٹس نے کہا: صاف بات ہے۔

میں نے کہا: اب اگر یہ اسے نکال نہ سکے یا استغاثۂ عام سے اسے موت کی سزا نہ دلا سکے تو اس کے قتل کی خفیہ سازش کرتا ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں، یہی ان لوگوں کا عام طریقہ ہے۔

میں نے کہا: اس پر جمہور کے اس حمایتی کی حفاظت کے لیے ایک فوج کے دستے کا مطالبہ ہوتا ہے۔ ہر شخص جو اپنی مستبدانہ زندگی میں اس حد تک پہنچ جاتا ہے اس چال کو استعمال کرتا ہے یعنی بقول عوام "جمہور کا دوست ایسا نہ ہو کہ جمہور کے ہاتھ سے جاتا رہے"!

اس نے کہا: بالکل ٹھیک۔

میں نے کہا: جمہور آسانی سے اسے تسلیم کر لیتے ہیں، اب انھیں جو کچھ خوف و خطر ہے سب اسی کے لیے ہے، اپنی ذات کے لیے کوئی نہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بہت صحیح۔

میں نے کہا: اب اگر کوئی مال دار شخص، جس پر عوام کے دشمن ہونے کا الزام بھی ہے، یہ خبر سنتا ہے تو، عزیز من، اس کی حالت پر وہ لفظ صادق آتے ہیں جو کاہن نے کروئیس (Croesus) سے کہے تھے یعنی "وہ ہرموز (Hermus) کے پتھریلے ساحل پر سرپٹ بھاگا جاتا ہے اور ذرا نہیں تھمتا، نہ اپنی بزدلی پر شرماتا ہے"۔

اس نے کہا: اور ٹھیک بھی ہے، اگر اس وقت شرمائے تو پھر کبھی آگے شرمانے کا موقع ہی نہ ملے!

میں نے کہا: ہاں، پکڑا گیا کہ مارا گیا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: اور کیا۔

میں نے کہا: اور یہ محافظ صاحب جن کا ہم نے ذکر کیا انھیں کوئی نہیں دیکھے گا کہ جناب کا موٹا جسم خود زمین کے لیے چربی فراہم کرنے کا کام انجام دے رہا ہے، بلکہ یہ بہت سے لوگوں کو گرا کر اب ریاست کی

بگھی پر ہاتھوں میں باگ تھامے کھڑے ہیں، اب یہ محافظ نہیں بلکہ مطلق العنان مستبد ہیں!

اس نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: اب ہم اس شخص اور اس ریاست کی سعادت پر غور کریں جس میں ایسی ہستی وجود میں آئی۔

اس نے کہا: ضرور، اب اس پر نظر کرنی چاہیے۔

میں نے کہا: پہلے پہل اپنے اقتدار کے شروع شروع میں تو یہ سراپا تبسم ہوتا ہے، جس سے ملتا ہے اسے سلام کرتا ہے۔ بھلا اسے اور کوئی مستبد کہے؟ یہ جو برابر عام اور خاص سے ہر طرح وعدے وعید کر رہا ہے! جو قرض داروں کے قرض معاف کرا رہا اور عام لوگوں اور اپنے پیرووں میں زمین بانٹ رہا ہے اور ہر شخص کے ساتھ نیکی اور مہربانی کرنا چاہتا ہے! بھلا یہ اور مستبد!!

اس نے کہا: واقعی!

میں نے کہا: لیکن جب یہ اپنے خارجی دشمنوں پر فتح پا چکے گا یا معاہدے کر کے نبٹ چکے گا اور اب ان کا کوئی ڈر باقی نہ رہے گا تب بھی یہ برابر کوئی نہ کوئی جنگ چھیڑتا رہے گا تاکہ عوام کو قائد کی ضرورت رہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: اور کیا اس کے علاوہ اس کا ایک اور مقصد یہ بھی نہیں ہوگا کہ یہ لوگ محاصل ادا کر کے مفلس ہو جائیں اور اس طرح اپنی تمام تر توجہ روزانہ ضرورتوں کے پورا کرنے کی طرف رکھیں اور اس کے خلاف سازش کرنے کا کم احتمال باقی رہے۔

اس نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: اور اگر اسے کسی پر شبہ ہے کہ اس کے دماغ میں آزادی کے خیالات ہیں، اور اس کے اقتدار کے خلاف مقاومت کا گمان ہے تو اسے ان کی تباہی کا نہایت اچھا بہانہ یوں ملے گا کہ انھیں دشمن کے رحم پر چھوڑ دے۔ چنانچہ ان وجوہ کی بنا پر مستبد ہمیشہ ایک نہ ایک جنگ برپا کرتا رہتا ہے۔

اس نے کہا: لازماً۔

میں نے کہا: اب (رفتہ رفتہ) یہ غیر ہر دلعزیز ہونا شروع ہوتا ہے۔

اس نے کہا: لازمی نتیجہ ہے۔

میں نے کہا: بعض وہ لوگ جنھوں نے اس کا اقتدار جمانے میں مدد کی تھی اور جواب بھی برسر اقتدار ہیں اس پر، نیز باہم ایک دوسرے پر، اپنے خیالات ظاہر کرنے لگتے ہیں، اوران میں جو ذرا باہمت ہوتے ہیں وہ ساری کارروائی کو اس کے منہ پر مارتے ہیں۔

اس نے کہا: جی، ایسا ممکن ہے۔

میں نے کہا: اب اگر یہ مستبد حکمران رہنا چاہتا ہے تو اسے ان سب سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا، یہ اس وقت تک نہیں رک سکتا جب تک کوئی بھی کام کا آدمی خواہ اس کا دوست ہو خواہ دشمن، باقی ہے۔

اس نے کہا: جی نہیں رک سکتا۔

میں نے کہا: چنانچہ یہ اپنے چاروں طرف نظر دوڑاتا ہے کہ کون بہادر ہے، کون عالی دماغ، کون عقلمند ہے اور کون مالدار۔ کیا خوش نصیبی ہے کہ یہ ان سب کا دشمن ہے۔ اور چاہے اس کا دل کہے یا نہ کہے اس پر اب لازم ہے کہ ان کے خلاف کوئی نہ کوئی موقع ڈھونڈے اور بالآخر تمام ریاست کا تنقیہ ہو جائے۔

اس نے جواب دیا: جی، اور نہایت ہی نادر تنقیہ!

میں نے کہا: ہاں، یہ تنقیہ ویسا نہیں جیسا کہ طبیب جسم کا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ تو برے کو نکالتے اور اچھے کو چھوڑ دیتے ہیں اور یہ اس کا بالکل الٹ کرتا ہے۔

اس نے کہا: اگر اسے حکومت کرنی ہے تو اس سے کوئی مفر نہیں۔

میں نے کہا: کیسا مبارک انتخاب ہے کہ یا تو بروں کی اکثریت کے ساتھ رہنے اور ان کی نفرت برداشت کرنے پر مجبور ہو یا پھر جینے ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اس نے کہا: ہاں، بس یہی ایک صورت ہے۔

میں نے کہا: اور شہریوں کی نگاہ میں اس کے اعمال جتنے نفرت کے قابل ہوتے جائیں گے یہ اتنے ہی زیادہ ہمنشین پیدا کرے گا اور ان سے اتنی ہی زیادہ وفا شعاری کا طالب ہوتا جائے گا۔

اس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: یہ وفادار گروہ آخر کون ہے اور یہ اسے کہاں سے ملے گا؟

اس نے جواب دیا: اگر یہ انھیں دام دے گا تو یہ تو خود بخود اس کے گرد جمع ہو جائیں گے۔

میں نے کہا: قسم ہے کلب مصری (ابوالہول) کی۔ یہ کتنے بہت سے نکھٹو یہاں اکٹھے ہیں، بھانت

بھانت کے اور دیس دیس کے۔

اس نے کہا: جی، بے شک۔

میں نے کہا: لیکن کیا یہ انھیں وہیں جگہ کی جگہ حاصل کرنا نہیں چاہے گا؟

اس نے کہا: آپ کا کیا مطلب ہے، کیسے؟

میں نے کہا: یہ شہریوں سے ان کے غلام چھین لے گا اور انھیں آزاد کر کے اپنے محافظ دستے میں بھرتی کرے گا۔

اس نے جواب دیا: یقیناً، اور ان پر وہ سب سے زیادہ بھروسا کر سکے گا۔

میں نے کہا: کیسی مبارک ہستی ہے یہ مستبد بھی؟ اور سب لوگوں کو تو قتل کر دیا، اب بس اس کے معتمد دوست یہ رہ گئے ہیں۔

اس نے کہا: جی۔ اور یہ ہیں بھی بالکل اسی جیسے۔

میں نے کہا: ہاں، یہ وہ نئے شہری ہیں جنھیں یہ عالم وجود میں لایا ہے۔ یہ اس کی مدح سرائی کرتے ہیں اور یہی اس کے سچے ساتھی ہیں، کیونکہ اچھے لوگ تو اس سے نفرت کرتے ہیں اور اس سے الگ ہی الگ رہتے ہیں۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: سچ ہے، المناک ڈراما بہت ہی دانشمندی کی چیز ہے! اور یوریپیڈس (Euripides) تھا بہت بڑا المیہ ڈراما نویس!!

ایڈیمنٹس نے کہا: یہ کیوں؟

میں نے کہا: کیوں، اس لیے کہ وہی تو اس پُر مغز مقولے کا مصنف ہے کہ:

''مستبد عقلمندوں کے ساتھ رہ کر عقلمند ہوتے ہیں''

اور اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ عقلمندوں کو مستبد اپنا ہمنشین بناتا ہے۔

اس نے کہا: جی، وہ استبداد کی یوں بھی مدح کرتا ہے کہ یہ تمثالِ الٰہی ہے اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں اس نے اور دوسرے شاعروں نے کہی ہیں۔

میں نے کہا: لہٰذا یہ المناک شاعر جو خود سمجھ دار لوگ ہیں ہمیں اور ہماری طرح رہنے والے اور لوگوں

کو معاف کریں اگر ہم انھیں اپنی ریاست میں نہ آنے دیں، کیونکہ یہ تو ٹھہرے استبداد کے قصیدہ خواں۔

ایڈیمنٹس نے جواب دیا: جی ہاں، بے شک جن میں سمجھ ہوگی وہ تو ضرور معاف کریں گے۔

میں نے کہا: لیکن یہ دوسرے شہروں میں جا جا کر برابر عوام کو اپنی طرف کھینچتے رہیں گے۔ اور میٹھے، بلند اور موثر آواز والوں کو کرائے پر رکھ کر یہ شہروں کو استبداد اور جمہوریت کی جانب مائل کرتے رہیں گے۔

اس نے کہا: بہت صحیح۔

میں نے کہا: اور پھر انھیں دام بھی تو ملتے ہیں اور عزت بھی۔ سب سے بڑی عزت تو مستبدوں سے ملتی ہے اور ان کے بعد جمہوریتوں میں سے، لیکن ہمارے دستور کے پہاڑ پر یہ جوں جوں اوپر چڑھتے ہیں ان کی شہرت ساتھ چھوڑتی جاتی ہے ان کا سانس پھول جاتا ہے اور یہ آگے نہیں چل پاتے۔

اس نے کہا: سچ ہے۔

میں نے کہا: مگر دیکھا، ہم اپنے مضمون سے بھٹک گئے۔ اچھا پھر اسی طرف لوٹیں اور دریافت کریں کہ مستبد اپنی اس حسین اور بڑی تعداد والی، متنوع اور ہردم ادلنے بدلنے والی فوج کو کیسے برقرار رکھتا ہے۔

اس نے کہا: اگر شہر میں مقدس مذہبی خزانے ہیں تو یہ انھیں ضبط کر کے خرچ کر ڈالے گا۔ جہاں تک ان لوگوں کا مال کفایت کرے گا جن پر غداری کا الزام ہے، اس حد تک یہ عوام کے محاصل کو کم کر سکے گا۔

میں نے کہا: اور جب ان سے کام نہ چلے؟

اس نے کہا: تو ظاہر ہے کہ یہ خود اور اس کے سب گہرے ساتھی، مرد ہوں کہ عورتیں، اس کے باپ کی ریاست پر گزر اوقات کریں گے۔

میں نے کہا: آپ کا مطلب شاید یہ ہے کہ عوام جن کی وجہ سے یہ وجود میں آیا اسے اور اس کے ساتھیوں کو گزارہ دیں گے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ہاں، سوائے اس کہ ان کے پاس اور چارہ ہی کیا ہے؟

میں نے کہا: لیکن اگر عوام کو غصہ آ جائے اور وہ کہنے لگیں کہ ایک بڑے پالے پوسے لڑکے کو حق نہیں کہ اپنے باپ سے گزارہ لے بلکہ حق تو یہ ہے کہ اب بیٹا باپ کی پرورش کرے، اگر یہ صورت پیش آئی تو پھر کیسی ہوگی؟ باپ نے کچھ اس لیے تو پیدا نہیں کیا تھا اور زندگی کے کاروبار میں کچھ اسے اس لیے تو نہیں جمایا تھا کہ جب یہ صاحبزادے بڑھ کر جوان ہوں تو یہ اپنے غلاموں کا غلام بنے اور پھر ان فرزند دلبند اور ان کے ساتھیوں

اور غلاموں کی پرورش بھی کرے۔ اس کی غرض تو یہ تھی کہ بیٹا میری حفاظت کرے اور اس کی مدد سے مجھے مالداروں اور امیروں کی حکومت سے نجات نصیب ہو۔ چنانچہ یہ ان صاحبزادے اور ان کے ہمنشینوں کو اپنے گھر سے رخصت کرتا ہے جیسے کوئی دوسرا باپ ایک مسرف بیٹے اور اس کے احباب کو اپنے ہاں سے نکال باہر کرے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بخدا۔ باپ کو اب پتا چلے گا کہ وہ اب تک کس بلا کو سینے سے لگائے ہوئے تھا۔ اب جو اسے نکالنے کی ضرورت پڑی تو معلوم ہوا کہ حضرت خود تو کمزور ہیں اور بیٹا ہے زبردست۔

میں نے کہا: کیوں، آپ کا یہ تو کبھی مطلب نہ ہوگا کہ مستبد تشدد سے کام لے گا؟ کیا اگر باپ مخالفت کرے تو یہ اسے مارے گا؟

ایڈیمنٹس نے کہا: ہاں، ضرور مارے گا، نہتا تو اسے پہلے ہی کر چکا ہے۔

میں نے کہا: تو یہ تو پھر پدر کش ہے، یہ بوڑھے باپ کا بے رحم محافظ۔ اصلی استبداد یہی ہے، جس کے متعلق کوئی غلط فہمی ممکن نہیں۔ مثل ہے کہ عوام دھوئیں سے یعنی احرار کی غلامی سے بچنے کے لیے آگ یعنی غلاموں کے استبداد میں جا پڑے۔ اس طرح گویا آزادی نظم اور عقل کی حدود سے تجاوز کر کے غلامی کی سب سے سخت اور کڑوی کسیلی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: سچ ہے۔

میں نے کہا: بہت خوب، اب تو ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے استبداد کی ماہیئت اور جمہوریت سے اس کے تدریجی طور پر پیدا ہونے کے طریقے پر کافی بحث کر لی ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں۔ بہت کافی۔

☆☆☆

نویں کتاب

میں نے کہا: سب سے آخر میں استبدادی آدمی کی باری آتی ہے۔اس کے متعلق بھی ہمیں دریافت کرنا ہے کہ یہ جمہوری آدمی میں سے کس طرح پیدا ہوتا ہے، اور پھر اپنی زندگی کیسے کاٹتا ہے، خوشی میں یا مصیبت سے؟

ایڈیمنٹس نے کہا: ہاں، اب تو ایک یہی بات باقی رہ گئی ہے۔

میں نے کہا: لیکن ابھی ایک پہلے کا سوال بھی تو باقی ہے، جس کا جواب ابھی تک نہیں ہوا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: وہ کیا؟

میں نے کہا: میرے خیال میں ہم نے ابھی اشتہاؤں کی ماہیت اور تعداد کا اچھی طرح تعین نہیں کیا ہے۔اور جب تک یہ نہ ہو لے ہماری تحقیق برابر گنجلک سی رہے گی۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ابھی کچھ ایسی بہت دیر تو ہوئی نہیں، یہ بھول اب دور کی جاسکتی ہے۔

میں نے کہا: بہت صحیح۔اچھا تو میں جو نکتہ سمجھنا چاہتا ہوں اسے دیکھو۔بعض غیر ضروری مسرتوں اور اشتہاؤں کو میں ناجائز سمجھتا ہوں۔ظاہراً یہ ہر شخص میں ہوتی ہیں، لیکن بعض میں یہ آئین اور عقل کے ذریعے قابو میں رہتی ہیں اور ان پر اچھی خواہشوں کا غلبہ ہوتا ہے اور اس طرح یا تو یہ بالکل خارج ہو جاتی ہیں یا ان کی تعداد گھٹ جاتی ہے اور یہ بہت کمزور پڑ جاتی ہیں۔لیکن دوسرے لوگوں میں یہ قوی بھی ہوتی ہیں اور گنتی میں بھی زیادہ۔

ایڈیمنٹس نے کہا: آپ کا مطلب کن اشتہاؤں سے ہے؟

میں نے کہا: میرا مطلب ان سے ہے جو اس وقت چونکتی ہیں جب روح کی عقلی، شریف اور حکمران طاقت سوئی ہوئی ہوتی ہے۔اس وقت ہمارے اندر کا وحشی درندہ خوب گوشت کھا کر اور شراب پی کر اور نیند توڑ کر اچھلنا کودنا شروع کرتا ہے اور اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے نکلتا ہے۔پھر کوئی تصور میں آنے والی

حماقت یا جرم ایسا نہیں، جس کا ایسے وقت کہ اس نے حواس اور شرم وحیا کا ساتھ چھوڑ ہی دیا ہے، انسان مرتکب ہونے پر آمادہ نہ ہو۔ حتیٰ کہ محرمات سے ہم بستری اور دوسرے غیر فطری تعلقات، والدین کا قتل یا حرام غذا کا کھانا تک بھی ان سے مستثنیٰ نہیں۔

اس نے کہا: نہایت درست۔

میں نے کہا: لیکن جس شخص کی نبض صحت اور اعتدال پر ہے وہ سونے سے پہلے اپنے عقلی قویٰ کو بیدار کر لیتا ہے اور شریف خیالات اور مسائل سے ان کی سیری کر کے اپنے وجود کو دھیان میں مجتمع کر لیتا ہے، یہ اپنی اشتہاؤں کو بھوکا نہیں مارتا بلکہ انھیں تسکین دیتا ہے لیکن نہ بہت زیادہ نہ بہت کم یعنی اتنی کہ چپکے سے سو جائیں اور یہ یا ان کا حظ و کرب اس کے اونچے اصولوں کے کام میں مخل نہ ہو۔ اس اصول کو یہ خالص تجرید کے میدان میں تنہا چھوڑ دیتا ہے تاکہ یہ "نامعلوم" کے علم پر فکر کرے اور اس کی آرزو کرے، خواہ یہ علم ماضی سے متعلق ہو یا حال و استقبال سے۔ اسی طرح جب کسی سے اس کا جھگڑا اٹھنا ہو جائے تو یہ اپنے جذباتی عنصر کو دبا دیتا ہے۔ الغرض میرا مطلب یہ ہے کہ یہ اپنے دونوں غیر عقلی اصولوں کو مطمئن کرنے کے بعد آرام کرنے سے قبل تیسری اصل یعنی عقل کو بیدار کر دیتا ہے۔ اس وقت تم جانتے ہو کہ یہ حقیقت کے نہایت قریب ہو جاتا ہے اور کبھی پریشان اور ناجائز خوابوں کا کھیل نہیں بنتا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میں بالکل اتفاق کرتا ہوں۔

میں نے کہا: یہ بات کرتے کرتے میں اصل مطلب سے بھٹک چلا تھا، اس سب میں جو اصل نکتہ میں دکھانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اچھے آدمیوں میں بھی ایک وحشی درندوں کی سی فطرت ہوتی ہے جو سوتے میں جاگتی ہے۔ ذرا دیکھیے کہ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں اور تم مجھ سے متفق ہو کہ نہیں۔

اس نے کہا: جی میں متفق ہوں۔

میں نے کہا: اب ذرا اس سیرت کو یاد کرو جو ہم نے جمہوری آدمی کے ساتھ منسوب کی تھی۔ اس کے متعلق یہی فرض کیا تھا کہ بچپن سے لے کر اس کی تربیت نہایت کنجوس باپ کے سائے میں ہوئی تھی جس نے ان کی تمام بچانے اور پس انداز کرنے والی خواہشوں کو تو اکسایا اور غیر ضروری اشتہاؤں کو، جن کا مقصد صرف تفریح اور تزئین ہے، دبایا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: پھر یہ ذرا زیادہ لطافت پسند اور عیش پرست قسم کے لوگوں کی صحبت میں پڑ گیا، ان کے سارے فضول طریقے اختیار کر لیے اور اپنے باپ کی کم ظرفی سے دل برداشتہ ہو کر بالکل دوسرے مخالف سرے پر جا پڑا۔ لیکن تھا چونکہ یہ اپنے بگاڑنے والوں سے بہتر آدمی اس لیے یہ دونوں طرف کھنچا اور بالآخر بیچ میں رک کر ایسی زندگی بسر کرنے لگا جو اس کے نزدیک بیہودہ جذبات کی پوری غلامی نہیں بلکہ مختلف مسرتوں میں حدِ اعتدال تک انہماک سے عبارت ہے۔ چنانچہ خواص سے جمہوری انسان یوں پیدا ہوا۔

اس نے کہا: جی ہاں۔ اس کے متعلق میرا اپنا یہی خیال تھا اور اب تک ہے۔

میں نے کہا: اب فرض کرو کہ بہت سے سال گزر گئے اور اس شخص کے (یہ جیسا کچھ بھی ہے) ایک لڑکا ہوا جس کی تربیت اپنے باپ کے اصولوں کے مطابق ہوئی۔

ایڈیمنٹس نے کہا: میں اس کا تصور کر سکتا ہوں۔

میں نے کہا: اچھا تو آگے فرض کرو کہ لڑکے پر بھی وہی گزری جو باپ پر گزر چکی تھی۔ یہ اس بالکل بے ضابطہ اور بے قاعدہ زندگی میں آن پڑا جسے اس کے بہکانے والے کامل آزادی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کا باپ اور اس کے احباب معتدل خواہشوں کی طرف داری کرتے ہیں، لیکن دوسری مقابل جماعت ان کے مخالف خواہشوں کو مدد دیتی ہے۔ جہاں ان خطرناک ساحروں، ان مستبدگروں نے دیکھا کہ اب ہمارا اثر اس پر سے ہٹ چلا یہ فوراً ایسی تدبیر کرتے ہیں کہ اس پر ایک ہمہ گیر جذبے کو مسلط کر دیتے ہیں، جو اس کی بے کار اور مستدعانہ شہوتوں پر قابو پا لیتا ہے، یہ ایک طرح کا مہیب پردار نکھٹو ہے کہ میرے خیال میں یہی شکل اس کی اصلیت کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔ اس کی یہی ایک معقول شکل ہے۔

میں نے کہا: اب خوشبو بخارات کے بادل چھائے ہوئے ہیں، عطر ہے، پھولوں کے ہار ہیں، شراب ہے، ایسی حالت میں اس کی دوسری شہوتیں اور اس کی بدکردار زندگی تمام مسرتیں اپنے بندھن توڑ کر اس کے گرد بھنبھنانا شروع کرتی ہیں۔ اور خواہش کے اس ڈنک کو جو انھوں نے اس کی نکھٹو فطرت میں پیوست کیا ہے خوب نشوونما دیتی ہے۔ بالآخر اس کی روح کا یہ بادشاہ جنون کو اپنے محافظوں کا سردار بناتا ہے، اور لگتا ہے کُھل کھیلنے۔ جہاں کسی اچھے خیال یا خواہش کو اپنے اندر پیدا ہوتے دیکھا، یا جب ذرا شرم وحیا کا کوئی شمہ اپنے میں باقی پایا تو ان سب کو ختم کر دیتا ہے، انھیں نکال پھینکتا ہے، حتیٰ کہ عفت اور اعتدال کو بالکل خارج کر کے ان

کی جگہ جنون کو کامل طور پر مسلط کر دیتا ہے۔

اس نے کہا: استبدادی آدمی اسی طرح پیدا ہوتا ہے۔

میں نے کہا: کیا یہی وجہ نہیں کہ عشق کو اگلے وقتوں سے مستبد کہتے آئے ہیں؟

ایڈیمنٹس نے کہا: کچھ عجب نہیں۔

میں نے کہا: اسی طرح کیا جو آدمی نشے میں مست ہو اس میں بھی مستبد کی روح نہیں ہوتی۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ہوتی ہے۔

میں نے کہا: تم جانتے ہو کہ جس آدمی کا دماغ صحیح نہ رہے اور چل نکلے وہ اپنے آپ کو صرف آدمیوں پر ہی نہیں بلکہ دیوتاؤں تک پر حکومت کرنے کے قابل سمجھتا ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ضرور، وہ تو ضرور یہ سمجھے گا ہی۔

میں نے کہا: اور صحیح معنوں میں استبدادی آدمی اسی وقت عالم وجود میں آتا ہے، جب فطرتاً، عادتاً یا دونوں کے اثر سے وہ مخمور، شہوت پرست اور جذبات کا بندہ ہو جائے۔ کیوں میرے دوست، کیا یہی بات نہیں ہے؟

ایڈیمنٹس نے کہا: بالیقین۔

میں نے کہا: یہ تو ہے اس شخص کی حالت اور یہ ہے اس کی اصل۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ رہتا کس طرح ہے؟

ایڈیمنٹس نے کہا: جیسے لوگ ہنسی میں کہتے ہیں، فرض کیجیے کہ یہ بات آپ کو مجھ سے کہنی ہو تو کیسے کہیں؟

میں نے کہا: میرے خیال میں تو اس کی ترقی کی دوسری منزل میں دعوتیں ہوں گی اور شراب نوشیاں، بزمہائے خروش اور دربارداریاں، الغرض اسی نوع کی تمام باتیں۔ اب اس کے سارے وجود پر سلطانِ عشق کی حکمرانی ہوگی، اور اس کی روح کے تمام معاملوں میں اسی کا فرمان جاری ہوگا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: ہاں اور پھر دن رات نت نئی اور بہت زوردار خواہشیں پیدا ہوتی جائیں گی اور ان کے مطالبے، الاماں!

ایڈیمنٹس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: مال و متاع اگر ان حضرت کے پاس کچھ تھا تو سب ختم ہو چکا ہوگا۔ اور اب قرض اور املاک کی قطع و برید کا لگا لگے گا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: لازمی بات ہے۔

میں نے کہا: پھر جب اس کے پاس کچھ نہیں رہتا تو اس کی خواہشیں کیسی امنڈ امنڈ کر ہجوم کرتی ہیں اور اس طرح شور و غوغا کرتی ہیں جیسے گھونسلے میں اپنے چونگے کے لیے کوے کے بچے۔ اور یہ ان سب کے اکسائے سے اور خاص کر خود جناب عشق کے بڑھاوے سے، جو ایک طرح اس سارے لشکر کے سردار ہیں، جنون کے سے عالم میں ہو جاتا ہے اور اسی تلاش میں رہتا ہے کہ کسے دھوکا دوں اور کسے لوٹوں تاکہ کسی طرح ان کا پیٹ بھرے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ہاں، ایسا تو یقیناً ہوگا۔

میں نے کہا: اب تو اس کے لیے کرب و الم سے بچنے کی بس ایک ہی تدبیر ہے، یعنی جس طرح بھی بن پڑے روپیہ ملے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: لازماً۔

میں نے کہا: جیسے اس کے اندر مختلف مسرتوں کی آرزو ایک کے بعد ایک پیدا ہوتی تھی اور نئی خواہشیں پرانی خواہشات سے بڑھ چڑھ کر رہتی تھیں اور ان کے حق مار لیتی تھیں، اسی طرح چونکہ یہ بھی نوجوان ہے اس لیے اپنے ماں باپ سے اور زیادہ کا دعویٰ دار ہوتا ہے اور اگر املاک میں خود اپنا حصہ کھا اڑا چکا تو اب ان کے حصوں کی کتر بیونت کی فکر کرتا ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: اگر والدین نہ مانیں تو سب سے پہلے تو انھیں دھوکا اور فریب دینے کی کوشش کرے گا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بالکل سچ ہے۔

میں نے کہا: اگر اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی تو یہ جبر کر کے انھیں لوٹ لے گا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ہاں غالباً۔

میں نے کہا: اور اگر ماں باپ اپنے حق کے لیے لڑے تو پھر؟ کیا ان پر ظلم و ستم کرتے اس کا دل

کچھ پسیجے گا؟

اس نے کہا: نہیں، والدین غریبوں کا تو جو حشر ہو گا وہ میرے نزدیک کچھ اچھا نہیں۔

میں نے کہا: لیکن ایڈیمنٹس، بخدا ذرا دیکھو۔ کیا تم باور کر سکتے ہو کہ کسی یک روزہ محبوبہ کی خاطر جس کا اس پر کوئی حق نہیں یہ اس ماں پر ہاتھ اٹھائے گا جو ساری عمر اس کی مونس اور ہمدم اور خود اس کے وجود کے لیے ایک ضروری ہستی رہی ہے یا اس نئی آشنا کو اپنے گھر لا کر اپنی ماں کو اس کے ہاتھ رکھے گا۔ یا اسی طرح کسی نو یافتہ جوان رعنا کی خاطر، جو اس کے لیے بالکل ضروری نہیں، یہ اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ جو اس کا سب سے پہلا اور سب سے ضروری رفیق ہے اسی قسم کا سلوک روا رکھے گا؟

اس نے جواب دیا: ہاں، میں تو سمجھتا ہوں کہ ضرور رکھے گا۔

میں نے کہا: سچ ہے۔ ایک جابر و مستبد بیٹا اپنے ماں، باپ کے لیے بڑی ہی برکت ہے!

اس نے جواب دیا: جی ہاں، کیا کہنا!!

میں نے کہا: اب یہ سب سے پہلے تو ان کی املاک ضبط کرتا ہے اور جب اس سے بھی کام نہیں چلتا اور جب اس کی روح پر مختلف خواہشوں کا زغہ یوں جاری رہتا ہے جیسے چھتے پر شہد کی مکھیوں کا تو پھر کسی کے گھر میں ڈاکا ڈالتا ہے یا رات میں کسی راہ چلتے کے کپڑے اتار لیتا ہے۔ اس کے بعد عبادت گاہوں پر ہاتھ صاف کرتا ہے۔ اسی دوران میں بچپن کے جو پرانے خیالات اس کے ذہن میں تھے اور جن کے اعتبار سے یہ نیک و بد میں تمیز کرتا تھا ان سب کو وہ نئے خیالات نکال باہر کریں گے جو ابھی رہا ہوئے ہیں اور اس کے عشق کے محافظ اور اس کی سلطنت کے شریک ہیں۔ جمہوری زمانے میں، کہ یہ ابھی اپنے باپ نیز قوانین کا پابند تھا، یہ خیالات صرف عالم خواب میں آزادی پاتے تھے لیکن اب کہ سلطان عشق کی فرمانروائی ہے اس پر جیتے جاگتے واقعتاً وہ کیفیت ہمیشہ طاری رہتی ہے جو پہلے گاہے گاہے اور وہ بھی خواب میں طاری ہوتی تھی۔ اب یہ حرام غذا کھا لے گا اور ناپاک سے ناپاک قتل اور سنگین سے سنگین جرم کا مرتکب ہو سکے گا۔ عشق گویا اس کا مستبد ہے اور اس کے اندر بے آئین اور بے قوانین فرمانروائی کرتا ہے۔ پھر جیسے مستبد ریاست کو جدھر چاہتا ہے لے جاتا ہے، اسی طرح یہ عشق بھی مطلق العنان بادشاہ ہے اسے ہر اس برے کام پر آمادہ کر لیتا ہے جو اس کے اور اس کے ساتھیوں کی انبوہ کے بقا اور قیام کا باعث ہو۔ پھر چاہے یہ ساتھی کسی برے سلسلے سے باہر آئے ہوں یا خود اس کی بداطواری نے انھیں یہیں پیدا کیا ہو۔ کیوں، کیا یہ اس کے طرز زندگی کی تصویر نہیں؟

اس نے کہا: ہاں، بے شک۔

میں نے کہا: اگر ایسے لوگ ریاست میں تھوڑے ہی سے ہیں اور باقی دوسرے ٹھیک طبیعت والے ہیں تو پھر یہ یہاں سے چل دیتے ہیں اور جا کر کسی ایسے مستبد کے محافظ خاص یا بھاڑے کے سپاہی بن جاتے ہیں جنھیں شاید جنگ کے لیے ان کی ضرورت ہے۔ اور اگر جنگ نہیں تو یہ گھر ہی پر ٹھہرتے ہیں اور شہر میں اکثر چھوٹی چھوٹی شرارتیں برپا کرتے رہتے ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: کیسی شرارتیں؟

میں نے کہا: مثلاً یہ کہ یہی لوگ چور، قزاق، گرہ کٹ، اچکے ہوتے ہیں، یہی مندروں میں ڈاکے ڈالتے اور یہی آدمیوں کو دھوکے سے بھگالے جاتے ہیں، یا اگر زبان ذرا چلتی ہوئی ہے تو مخبر بن جاتے ہیں، جھوٹی شہادتیں دیتے ہیں اور خوب رشوتیں اڑاتے ہیں۔

اس نے کہا: برائیوں کی بہت چھوٹی سی فہرست ہے یہ، اگرچہ ان کے مرتکب تھوڑے سے ہی سہی!

میں نے کہا: جی ہاں۔ مگر، چھوٹا، اور بڑا، یہ تو اضافی لفظ ہیں۔ اور اگر اس خرابی اور تباہی کا خیال کیجیے جو ان سے ریاست پر نازل ہوتی ہے تو یہ چیزیں تو مستبد کو ہزاروں کوس نہیں پہنچتیں۔ کیونکہ جب اس مضر طبقے اور اس کے پیروؤں کی تعداد بڑھتی ہے اور جمہور کی سادہ دلی کی مدد سے ان میں اپنی قوت کا احساس پیدا ہوتا ہے، تو پھر یہ اپنے میں سے اس ایک کو چن لیتے ہیں جس کی روح میں سب سے زیادہ مستبد کی صفات موجود ہوں اور اسے یہ اپنا حاکم جابر بناتے ہیں۔

اس نے کہا: ہاں، اور مستبد بننے کے لیے ہے بھی یہی سب میں موزوں۔

میں نے کہا: اب اگر لوگ دب گئے تو بجا اور درست۔ لیکن اگر انھوں نے مخالفت کی تو اس نے جیسے اپنے ماں باپ کو ٹھوک کر ابتدا کی تھی ویسے ہی اب، اگر اس میں قوت ہوئی تو انھیں ٹھوکے گا اور بقول اہل کریٹ اپنے عزیز و معمر پدر یا مادر وطن کو ان کم عمر ہم نشینوں کی ماتحتی میں رکھے گا جنھیں اس نے ان کا حکمران اور آقا بنایا ہے۔ اس کے سارے جذبوں اور خواہشوں کا ماحصل بس یہ ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بالکل درست۔

میں نے کہا: جب تک ان لوگوں کو طاقت حاصل نہیں ہوتی تو خانگی زندگی میں ان کی سیرت یہ ہوتی ہے کہ تمام تر اپنے خوشامدیوں سے یا ایسے لوگوں سے ملتے جلتے ہیں جو ان کے ہاتھ میں ہر دم ایک آلہ بنے

رہیں۔ اور اگر کہیں خود انھیں کسی سے کچھ ضرورت پڑ جائے تو اس کے سامنے سر جھکانے کو بھی اسی طرح تیار رہتے ہیں۔ ان سے ہر قسم کی محبت اور تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن جہاں مطلب نکل گیا تو جیسے جانتے بھی نہ تھے۔

اس نے کہا: جی صحیح ہے۔

میں نے کہا: یہ ہمیشہ یا تو آقا رہتے ہیں یا غلام؛ کبھی کسی کے دوست نہیں ہوتے (سچ ہے) مستبد کبھی حقیقی آزادی اور دوستی کا مزہ نہیں چکھتا۔

ایڈیمنٹس نے کہا: ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: کیا ہم بجا طور پر ایسے لوگوں کو دغا باز نہیں کہہ سکتے؟

ایڈیمنٹس نے کہا: اس میں کیا کلام ہے۔

میں نے کہا: اور اگر عدل اور انصاف کے متعلق ہمارا تصور صحیح تھا تو یہ لوگ مطلق حیثیت سے غیر منصف و ظالم بھی ہوتے ہیں۔

ایڈیمنٹس نے کہا: جی ہاں، ہم لوگ بالکل صحیح تھے۔

میں نے کہا: اچھا تو اب اس بدترین انسان کی سیرت کو ایک لفظ میں یوں بیان کریں کہ ہم نے جو خواب دیکھا تھا یہ اس کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

ایڈیمنٹس نے کہا: بالکل صحیح۔

میں نے کہا: اور یہ چونکہ بالطبع مستبد ہے اس لیے حکمرانی کرتا ہے اور جتنا زیادہ زندہ رہتا ہے اتنا ہی اس کا استبداد بڑھتا جاتا ہے۔

اب جواب کی باری گلوکون کی تھی۔ چنانچہ وہ بولے یہ "تو یقینی امر ہے"۔

میں نے کہا: اور یہ انسان جس کو ہم نے سب سے زیادہ شریر بتایا ہے کیا سب سے زیادہ تباہ حال بھی نہ ہوگا اور جس نے سب سے شدید اور سب سے زیادہ جبر اور استبداد سے کام لیا ہے وہ گویا متواتر اور حقیقی معنوں میں تباہ حال۔ اگرچہ ممکن ہے کہ عام لوگوں کی یہ رائے نہ ہو۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں، لازماً۔

میں نے کہا: اور کیا استبدادی آدمی کو استبدادی ریاست کی طرح اور جمہوری آدمی کو جمہوری

ریاست کی طرح نہیں ہونا چاہیے اور یوں ہی اور صورتوں میں بھی۔

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: اور نیکی اور خوشحالی کے معاملے میں جو تعلق ریاست کو ریاست سے ہے وہی ایک انسان کو دوسرے انسان سے ہے۔

گلوکون نے کہا: بالیقین۔

میں نے کہا: پھر اگر ہم اپنے اصلی شہر کا، جو ایک بادشاہ کے ماتحت تھا، اس شہر سے مقابلہ کریں جو ایک مستبد کے تحت میں ہے تو نیکی کے اعتبار سے ان کی کیا نسبت ہوگی؟

اس نے جواب دیا: یہ تو ایک دوسرے کی انتہائی ضد ہیں کیونکہ ایک اگر سب سے اچھا ہے تو دوسرا سب سے برا۔

میں نے کہا: اس میں تو کوئی کلام ہو ہی نہیں سکتا کہ کون سب سے بُرا ہے اور کون سب سے اچھا۔ لہٰذا اب فوراً یہ پتا چلانا چاہیے کہ آیا ان کی اضافی خوشحالی اور بدحالی کے متعلق بھی ہم اسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں، البتہ اس معاملے میں ہمیں مستبد کے بھوت کو دیکھ کر بہت سراسیمہ نہیں ہونا چاہیے کہ یہ تو ایک فرد ہے اور اس کے اردگرد شاید چند ہی حوالی موالی ہیں۔ بلکہ ہمیں چاہیے کہ ہم شہر کے کونے کونے میں جا کر دیکھ بھال کریں اور پھر اپنی رائے دیں۔

گلوکون نے کہا: نہایت معقول بات ہے، اور میں تو صاف دیکھتا ہوں (جیسا کہ ہر شخص کو دیکھنا چاہیے) کہ جابر حکومت کی سب سے منحوس اور (فلسفی) بادشاہ کی حکومت سب سے خوشحال قسم ہے۔

میں نے کہا: اسی طرح انسانوں کے متعلق رائے قائم کرنے میں بھی کیا میں بجا طور پر یہی درخواست نہیں کر سکتا کہ مجھے ایک ایسا حَکم چاہیے جس کا دماغ انسانی فطرت میں داخل ہو کر اسے دیکھ سکتا ہو؟ وہ بچے کی طرح نہ ہو جو صرف ظاہر کو دیکھتا ہے اور اس شاندار و پرشوکت ادا کو دیکھ کر خیرہ ہو جاتا ہے جو استبدادی فطرت اپنے ناظر کے سامنے اختیار کرتی ہے بلکہ مجھے تو ایسا آدمی چاہیے جو گہری بصیرت رکھتا ہو۔ کیا میں فرض کروں کہ یہ حَکم ایک ایسا شخص، ہم سب لوگوں کی موجودگی میں سنا تا ہے جو اس پر حکم لگانے کا اہل ہے، اس شخص کے ساتھ ایک ہی جگہ پر رہ چکا ہے، اس کی روزانہ زندگی کو بھی دیکھا ہے اور اسے اس ناٹک کے سے ظاہری لباس سے معرا خانگی تعلقات میں بھی جانتا ہے اور عام خطرے کے وقت بھی اس کا مشاہدہ کر چکا ہے۔ یہ شخص

بتا سکتا ہے کہ مستبد جابر کی خوشحالی یا بدحالی کی کیفیت دوسرے انسانوں کے مقابلے میں کیا ہے؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں، یہ بھی نہایت معقول تجویز ہے۔

میں نے کہا: تو گویا میں سمجھ لوں کہ ہم خود ہی اس کے اہل اور تجربہ کار حَکم ہیں اور اس سے پہلے ایسے انسان سے مِل چکے ہیں؟ تاکہ کوئی تو ہو جو ہمارے سوالوں کا جواب دے سکے۔

اس نے کہا: ضرور۔

میں نے کہا: لیکن فرد اور ریاست کی باہمی مماثلت نہ بھُلائی جائے، یہ ہر وقت سامنے رہے۔ باری باری سے کبھی اس پر نظر ڈال کر کبھی اس پر، ان کی جداگانہ کیفیتیں بتائیے۔

اس نے کہا: آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں نے کہا: ریاست سے شروع کیجیے اور دیکھیے کہ جس شہر پر مستبد کی حکومت ہے اسے آپ آزاد کہیں گے یا غلام؟

اس نے جواب دیا: کوئی شہر اس سے زیادہ کامل طور پر غلام نہیں ہو سکتا۔

میں نے جواب دیا: لیکن پھر بھی آپ دیکھتے ہیں ایسی ریاست میں احرار بھی ہیں اور آقا بھی۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں، میں دیکھتا ہوں۔ لیکن بس گنتی کے۔ عام طور پر جمہور اور ان میں سے بھی جو سب سے اچھے ہیں وہی نہایت درجے ذلت اور غلامی میں ہیں۔

میں نے کہا: پھر اگر فرد ریاست کی طرح ہوتا ہے تو یہی حال یہاں ہوگا۔ اس کی روح کمینہ پن اور بیہودگی سے پُر ہوگی، اس کی طبیعت کے بہترین عناصر غلامی کی حالت میں ہوں گے۔ ایک چھوٹا سا جزو حکمران ہوگا اور یہی ہوگا سب سے برا اور سب سے زیادہ جنون خیز۔

گلوکون نے کہا: لازماً۔

میں نے کہا: اچھا پھر آپ کیا کہیں گے کہ ایسے آدمی کی روح ایک آزاد انسان کی روح ہے یا ایک غلام کی؟

گلوکون نے کہا: میری رائے میں تو اس میں غلام کی روح ہے۔

میں نے کہا: اور جو ریاست مستبد کی غلامی میں ہو تو وہ خود کسی آزاد فعل کے قابل نہیں رہتی؟

گلوکون نے کہا: اس کی یہ قابلیت بالکل سلب ہو جاتی ہے۔

میں نے کہا: اسی طرح جو روح ایک مستبد کے ماتحت ہو (میں روح کا ذکر بحیثیت کل کے کر رہا ہوں) اس میں اپنے من مانے کام کے کرنے کی سب سے کم صلاحیت ہوتی ہے ایک چم چچڑ (Gadfly) ہوتی ہے جو اسے برابر اکساتی ہے اور یہ غریب رنج و تکلیف سے پُر رہتی ہے۔

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: اور مستبد کے ماتحت جو ہوتا ہے وہ مال دار ہوتا ہے یا مفلس؟

گلوکون نے کہا: مفلس۔

میں نے کہا: تو استبدادی روح کو بھی ہمیشہ مفلس، ناقابل تسکین، ہونا چاہیے۔

گلوکون نے کہا: درست۔

میں نے کہا: پھر کیا یہ ضروری نہیں کہ ایسی ریاست اور ایسا انسان ہمیشہ اپنے آپ کو خطرے میں محسوس کرے؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں، یقیناً۔

میں نے کہا: کیا اور کسی ریاست میں اس سے زیادہ نالہ وزاری، آہ و بکا، رنج و الم تمھیں مل سکے گا؟

گلوکون نے کہا: ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: اور کیا کسی اور انسان میں تمھیں مستبد سے زیادہ اس قسم کی مصیبت ملے گی۔ یہ مستبد جس پر جذبوں اور خواہشوں کی ایک بدحواسی سی طاری ہے؟

گلوکون نے کہا: ناممکن۔

میں نے کہا: ان اور ان جیسی دوسری برائیوں کا خیال کر کے ہی تو تم نے استبدادی ریاست کو سب سے بدحال ریاست قرار دیا تھا؟

اس نے جواب دیا: جی ہاں، اور ٹھیک قرار دیا تھا۔

میں نے کہا: بے شک، اور جب یہی سب خرابیاں تم استبدادی آدمی میں دیکھو تو اس کے متعلق کیا کہو گے؟

اس نے کہا: یہ کہ وہ ساری دنیا میں سب سے زیادہ بدحال انسان ہے، سب سے زیادہ مصیبت میں گرفتار۔

میں نے کہا: میرا خیال ہے کہ بس یہیں تم نے غلطی شروع کی۔

اس نے کہا: کیا مطلب؟

میں نے کہا: میری رائے میں یہ ابھی بدحالی اور کلفت کی آخری حد تک نہیں پہنچا ہے۔

اس نے کہا: کیوں؟ اور اس سے زیادہ بدحال اور مصیبت زدہ کون ہوگا؟

میں نے کہا: وہ جس کا ذکر میں ابھی کرتا ہوں۔

گلوکون نے کہا: وہ کون؟

میں نے کہا: وہ شخص جو طبیعت سے جابر ہے اور بجائے اس کے کہ خود اپنی شخصی زندگی اپنے طور پر گزارے اس پر بدقسمتی سے عام جبر واستبداد کا عذاب نازل ہوا ہے۔

اس نے کہا: ہم لوگ پہلے جو کچھ کہہ چکے ہیں اس کی رو سے میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا خیال صحیح ہے۔

میں نے جواب دیا: ہاں، لیکن اس گمبھیر بحث میں آپ کو صرف قیاس پر قناعت نہیں کرنی چاہیے بلکہ اچھا ہے کہ آپ کو ذرا زیادہ یقین ہو، کیونکہ سارے سوالوں میں یہ خیر وشر والا سوال سب سے بڑا ہے اور سب سے اہم۔

اس نے کہا: بہت درست۔

میں نے کہا: اچھا تو میں ایک مثال دوں جو میں سمجھتا ہوں اس مضمون پر روشنی ڈالے گی۔

اس نے کہا: فرمایئے۔ کیا مثال ہے؟

میں نے کہا: شہروں میں بہت سے غلام رکھنے والے مال دار افراد کا جو حال ہوتا ہے اس سے تم مستبد کی کیفیت کا ایک تصور قائم کر سکتے ہو۔ کیونکہ غلام تو دونوں کے پاس ہوتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ موخر الذکر کے پاس زیادہ ہوتے ہیں۔

گلوکون نے کہا: جی، بس یہی فرق ہے۔

میں نے کہا: تم جانتے ہوگے کہ یہ لوگ نہایت چین سے رہتے ہیں اور اپنے نوکروں سے کسی قسم کا اندیشہ نہیں رکھتے؟

گلوکون نے کہا: کیوں، اندیشہ یا ڈر کس بات کا؟

میں نے کہا: کسی کا نہیں۔ لیکن تم نے اس کی وجہ پر بھی دھیان دیا؟

گلوکون نے کہا: ہاں، وجہ یہ ہے کہ سارے کا سارا شہر ہر فرد کی حفاظت کے لیے متحد ہے۔

میں نے کہا: بالکل صحیح، لیکن ذرا فرض کرو کہ ان میں سے ایک مالک کو، جو کہیے پچاس غلاموں کا آقا ہے، کوئی دیوتا اس کے خاندان، املاک اور غلاموں سمیت اڑا کر جنگل میں لے جائے جہاں اس کی مدد کے لیے ایک بھی آزاد انسان نہ ہو تو ایسی حالت میں کیا اسے نہایت شدت سے یہ ڈر نہ ہوگا کہ کہیں اس کے غلام اس کے بیوی بچوں کو مار نہ ڈالیں؟

اس نے کہا: جی ہاں، بے شک، یہ تو بہت ہی ڈرے گا۔

میں نے کہا: اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ یہ اپنے غلاموں کی خوشامد کرنے پر مجبور ہوگا اور ان سے آزادی اور دوسری چیزوں کے بہت سے وعدے کرے گا، اور اپنی مرضی کے خلاف اسے اپنے غلاموں کی ناز برداری کرنی ہوگی۔

اس نے کہا: جی ہاں، اس کے پاس اپنے بچانے کا اب یہی تو ایک طریقہ ہے۔

میں نے کہا: پھر فرض کرو یہی دیوتا جو اسے لے گیا ہے اس کے چاروں طرف ایسے ہمسائے پیدا کر دے جنھیں یہ بات گوارا نہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان کا آقا ہو، اور اگر کوئی اس جرم کا مرتکب ہو اور یہ اسے پکڑ پائیں تو جان ہی لے لیں۔

گلوکون نے کہا: اب تو اس کی حالت اور بھی خراب ہو جائے گی، کیونکہ آپ فرض کرتے ہیں کہ یہ ہر طرف دشمنوں سے گھرا ہوا ہے اور یہ اس پر ہر دم پہرہ چوکی رکھتے ہیں۔

میں نے کہا: تو کیا یہی وہ زنداں نہیں جس میں مستبد جابر مقید ہوتا ہے کیونکہ اس کی طبیعت کا حال تو وہی ہے جو ہم بیان کر چکے یعنی طرح طرح کے اندیشوں اور خواہشوں سے لبریز۔ اس کی روح بہت عشرت پسند اور نہایت حریص ہے، لیکن سارے شہر میں بس یہی ایک شخص ہے جو نہ سفر کر سکتا ہے نہ وہ چیزیں دیکھ سکتا ہے جو آزاد انسان دیکھنا چاہتے ہیں، یہ اپنے بل میں ایسے رہتا ہے جیسے عورتیں اپنے مکانوں میں چھپی رہتی ہیں اور ہر اس شہری سے جلتا ہے جو پردیس میں جا کر کوئی دلچسپ چیز دیکھے۔

اس نے کہا: بہت صحیح۔

میں نے کہا: یہ آدمی جس کی اپنی ذات بہت بری طرح محکوم ہے، یہ استبدادی جسے آپ نے ابھی سب سے بدحال انسان کہنے کا فیصلہ کیا ہے، کیا اس وقت اور بھی زیادہ بدحال نہ ہوگا جب بجائے اس کے کہ یہ

اپنی شخصی زندگی گزارے قسمت سے اس پر مجبور ہو جائے کہ ایک عمومی مستبد بنے؟ اسے دوسروں کا آقا بننا پڑتا ہے جبکہ یہ خود اپنا آقا نہیں، اس کی مثال ایک مریض یا مفلوج انسان کی سی ہے جو بجائے تنہائی کے گوشے میں اپنی زندگی کے دن کاٹنے کے اس پر مجبور کیا جاتا ہے کہ انھیں دوسرے انسانوں سے لڑائی اور معرکہ آرائی میں گزارے۔

اس نے کہا: جی ہاں، یہ تمثیل نہایت صحیح ہے۔

میں نے کہا: کیا اس کی حالت حد درجہ مصیبت ناک نہیں؟ کیا یہ اصلی مستبد اس شخص سے بھی بدتر زندگی نہیں گزارتا جس کی زندگی کو آپ نے بدترین قرار دیا تھا۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: لوگ جو چاہیں سمجھیں، سچ تو یہ ہے کہ جو حقیقی مستبد ہے وہی حقیقی غلام ہے، اسی کو سب سے زیادہ لجاجت اور غلامانہ باتیں کرنی پڑتی ہیں اور اسی کو برے سے برے آدمیوں کی خوشامد کرنا پڑتی ہے۔ اس کے دل میں آرزوئیں ہیں جنھیں وہ کبھی پورا نہیں کر سکتا اس کی حاجتیں اور دوسرے لوگوں سے زیادہ ہیں، چنانچہ اگر آپ اس کی ساری روح کو دیکھ سکیں تو یہ حقیقی معنوں میں مفلس و نادار روح ہے۔ اپنی مماثل ریاست کی طرح یہ ساری عمر خوف زدہ رہتا ہے اور اس کی زندگی درد و الم، تشنج و انتشار کا ایک مجموعہ ہے۔ سچ ہے ایک ریاست اور فرد کی یہ مماثلت بالکل پوری اترتی ہے۔

گلوکون نے کہا: سچ ہے۔

میں نے کہا: اس پر طرہ یہ کہ جیسا ہم کہہ رہے تھے قوت اور اقتدار کی وجہ سے یہ اور بھی برا ہو جاتا ہے۔ یہ لازماً پہلے سے زیادہ حاسد، زیادہ بے وفا، زیادہ غیر منصف، زیادہ بے یار و مددگار اور زیادہ بد دیانت ہو جاتا ہے۔ یہ ہر قسم کا عیب پالتا ہے اور ہر نوع کی برائی کا حامل ہوتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ خود انتہا درجے بدحال ہے اور ہر ایک کو اپنی طرح بدحال بناتا ہے۔

گلوکون نے کہا: کوئی معقول آدمی آپ کے لفظوں کی صحت سے انکار نہیں کر سکتا۔

میں نے کہا: اچھا تو آؤ جس طرح ناٹکوں کے مقابلے میں ایک عام حَکَم نتیجے کا اعلان کرتا ہے اسی طرح تم بھی فیصلہ کرو کہ تمھاری رائے میں خوشحالی کے اعتبار سے کون سب سے اول ہے یعنی پہلے تو حکومت شاہی، اور اس کے بعد دوسرے کس ترتیب سے آتے ہیں۔ یہ سب کل پانچ ہیں یعنی (۱) شاہی و اشرافیہ،

(۲) حکومت امتیازی (۳) دولت شاہی (۴) جمہوریت اور (۵) جابریت یا استبداد۔

اس نے جواب دیا: اس کا فیصلہ تو نہایت سہل ہے۔ یہ گویا میرے سامنے اس طرح آئیں گے جیسے باہم مل کر گانے والے سٹیج پر آتے ہیں اور پھر جیسے جیسے یہ آتے جائیں، میں خیر اور شر، نیکی اور بدی، خوشحالی اور بدحالی کے معیار سے ان پر حکم لگاتا جاؤں۔

میں نے کہا: کیا اس کی ضرورت ہے کہ کوئی نقیب کرایہ پر بلائیں، یا میں ہی اعلان کر دوں کہ ابن ارسٹن نے فیصلہ کر دیا ہے کہ جو سب سے اچھا اور سب سے عادل ہے وہی سب سے زیادہ خوشحال بھی ہے اور وہ سب سے زیادہ شاہی انسان ہے جو خود اپنی ذات کا بادشاہ ہے۔ اور جو سب سے برا اور سب سے ظالم ہے وہی سب سے زیادہ برے حال میں ہے اور یہ وہ ہے جو اپنی ذات کا سب سے بڑا جابر اور مستبد ہے اور اس لیے ریاست کا سب سے بڑا جابر اور مستبد۔

اُس نے کہا: جی آپ ہی اعلان کر دیجیے۔

میں نے کہا: اس میں مَیں یہ الفاظ اور بڑھا دوں کہ "چاہے دیوتا اور انسان اسے دیکھیں یا نہ دیکھیں"؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں، بڑھا دیجیے۔

میں نے کہا: اچھا تو یہ تو ہمارا پہلا ثبوت ہوا، اس کے علاوہ ایک اور بھی ہے، ممکن ہے یہ کچھ وزن رکھے۔

گلوکون نے کہا: وہ کیا؟

میں نے کہا: دوسرا ثبوت روح کی ماہیت سے نکلتا ہے۔ یاد ہوگا کہ ریاست کی طرح ہم نے انفرادی روح کو بھی تین اصولوں میں تقسیم کیا تھا، اور میں سمجھتا ہوں کہ اس تقسیم سے بھی اس بارے میں ایک ثبوت فراہم ہو سکتا ہے۔

گلوکون نے کہا: کس قسم کا ثبوت؟

میں نے کہا: میں سمجھتا ہوں کہ ان تین اصولوں کے مطابق تین مسرتیں ہوتی ہیں نیز تین خواہشیں اور تین حکمران طاقتیں۔

اس نے کہا: کیسے؟ کیا مطلب؟

میں نے کہا: ایک اصول تو وہ ہے جس سے، بقول خود ہمارے، انسان سیکھتا ہے، دوسرا وہ ہے جس

سے وہ غصہ کرتا ہے، تیسرے کی چونکہ بہت سی شکلیں ہیں اس لیے اس کا کوئی خاص نام نہیں البتہ اسے اشتہائیہ کی عام اصطلاح سے اس لیے ظاہر کرتے ہیں کہ کھانے پینے کی خواہشوں نیز دیگر نفسانی شہوتوں کو نہایت غیر معمولی قوت وشدت حاصل ہے اور یہی اس کے خاص عناصر ہیں، روپے کی محبت بھی اس میں شامل ہے، کیونکہ ایسی خواہشیں عموماً روپے کی مدد ہی سے پوری ہوتی ہیں۔

اس نے کہا: بجا ہے۔

میں نے کہا: اگر ہم یہ کہیں کہ اس تیسری قسم کی محبتیں اور مسرتیں تمام تر نفع سے وابستہ ہیں تو ہم ان سب کو ایک واحد تصور کے تحت لا سکتے ہیں اور بجا طور پر کہہ سکیں گے کہ روح کا یہ جزو نفع کا طالب اور دولت کا عاشق ہے اور یہ بات سمجھ میں بھی آئے گی۔

گلوکون نے کہا: میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔

میں نے کہا: اسی طرح جذباتی عنصر کیا تمام تر حکمرانی، فتح مندی، اور شہرت کے حاصل کرنے میں نہیں لگا رہتا؟

گلوکون نے کہا: سچ ہے۔

میں نے کہا: فرض کرو ہم اسے مقابلے، مسابقت یا حوصلے کا اصول کہیں تو کیا یہ مناسب نام نہ ہوگا؟

گلوکون نے کہا: بہت مناسب ہوگا۔

میں نے کہا: برخلاف اس کے ہر شخص دیکھ سکتا کہ علم کا اصول تمام تر حقیقت اور صداقت کی طرف متوجہ رہتا ہے اور نفع یا شہرت کا پہلے والے دونوں اصولوں سے کم خیال رکھتا ہے۔

گلوکون نے کہا: بہت کم۔

میں نے کہا: روح کے اس حصے کو ہم بجا طور پر "عاشق علم" و "محبِ دانش" کا لقب دے سکتے ہیں۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: ایک طبقے کے لوگوں کی روح میں ایک اصول ساری ہوتا ہے، اور دوسرے طبقے میں دوسرا اور اسی طرح قیاس کرو۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اچھا تو ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ انسانوں کے تین گروہ ہوتے ہیں: عقل اور دانش کے

عاشق، عزت کے عاشق اور نفع کے عاشق۔

اس نے کہا: صحیح۔

میں نے کہا: اور تین ہی قسم کی مسرتیں ہوتی ہیں جو ان میں سے ایک ایک کا خارجی مقصود ہوتی ہیں۔

اس نے کہا: بہت بجا۔

میں نے کہا: اب اگر آپ ان تینوں طبقوں کے آدمیوں سے ملیں اور پوچھیں کہ کس کی زندگی سب سے زیادہ پر مسرت ہے، تو ہر ایک اپنی زندگی کی اچھائی اور دوسروں کی برائے کرے گا۔ دولت کا چاہنے والا سونے چاندی کے ٹھوس فائدے سے عزت اور علم کا مقابلہ کر کے کہے گا کہ اگر ان سے روپیہ نہ حاصل ہو تو یہ بالکل ہیچ ہیں۔

اس نے کہا: سچ ہے۔

میں نے کہا: اور جو عزت کا دلدادہ ہے بھلا اس کی کیا رائے ہوگی؟ کیا یہ مال اور دولت کی محبت کو نہایت رکیک نہ تصور کرے گا اور حب علم کو اگر اس کے ہمرکاب عزت و امتیاز نہ ہو تو اپنے لیے محض ایک غبار اور بے معنی چیز نہیں سمجھے گا؟

اس نے کہا: بالکل درست۔

میں نے کہا: اب رہا فلسفی تو کیا یہ حقیقت کے علم کی مسرت کے مقابلے میں دوسری مسرتوں کی کچھ بھی قدر کرے گا؟ یہ تو ہر دم اسی دھن میں مشغول اور ہر آن کچھ نہ کچھ سیکھنے میں مصروف رہے گا اور پھر بھی مسرت کے آسمان سے کیا کچھ بہت دور ہوگا؟ یہ شاید دوسری مسرتوں کو بھی ضروری سمجھے گا کیونکہ اگر یہ ضروری نہ ہوتیں تو پھر یہ ان سے سروکار ہی کیوں رکھتا؟

اس نے کہا: اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

میں نے کہا: اب چونکہ جس مسئلے میں اختلاف ہے وہ یہ ہے کہ مختلف طبقوں کی مسرتیں اور ان کی زندگیاں ہیں اور سوال یہ ہے نہیں کہ کون سی زندگی زیادہ قابل عزت ہے اور کون سی کم، نہ سوال یہ ہے کہ کون بہتر ہے اور کون بدتر، بلکہ چونکہ سوال یہ ہے کہ کونسی زندگی حظ اور مسرت سے زیادہ پُر اور کرب والم سے زیادہ بری ہے، اس لیے ہم کیسے جان سکتے ہیں کہ ان میں سے کونسا گروہ سچ کہہ رہا ہے؟

اس نے جواب دیا: میں تو خود نہیں بتا سکتا۔

میں نے کہا: لیکن آخر کوئی معیار تو ہونا چاہیے اور وہ کیا ہو؟ کیا تجربہ، دانش اور عقل سے بھی بہتر کوئی معیار ہے؟

گلوکون نے کہا: اس سے بہتر بھلا کون سا معیار ہو سکتا ہے۔

میں نے کہا: اچھا تو ذرا غور کرو۔ ہم نے جو مسرتیں گنوائی تھیں ان سب کا سب سے زیادہ تجربہ ان تین افراد میں سے کس کو حاصل ہوگا؟ کیا نفع کے دلدادہ کو حقیقی صداقت کی ماہیت کے جاننے میں علم کی مسرت کا اس سے زیادہ تجربہ ہے جتنا کہ فلسفی کو نفع کی لذت کا؟

اس نے جواب دیا: اس معاملے میں تو فلسفی بڑے فائدے میں رہتا ہے۔ کیونکہ یہ تو ضرور بچپن سے سب ہی مسرتوں کے مزے سے واقف ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ نفع ڈھونڈنے والے کی زبان اپنے سارے تجربے میں کبھی بھی صداقت کے جاننے اور سیکھنے کی مٹھاس سے لذت آشنا ہوئی ہو۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ اگر چاہتا بھی تو مشکل ہی سے اسے چکھ سکتا۔

میں نے کہا: لہٰذا محبِ دانش کو طالب نفع پر بڑی فضیلت ہے، کیونکہ اسے دوچند تجربہ حاصل ہے۔

اس نے کہا: بے شک بڑی فضیلت ہے۔

میں نے کہا: پھر کیا اسے عزت کی لذت کا زیادہ تجربہ ہے یا عزت کے دلدادہ کو علم و دانش کی لذت کا۔

اس نے کہا: نہیں۔ عزت تو تینوں کی اسی نسبت سے ہوتی ہے جس نسبت سے یہ اپنا اپنا مقصد حاصل کر لیں، مالدار، بہادر، اور عقلمند تینوں کے لیے مداحوں کا ایک گروہ ہوتا ہے، اور چونکہ سب کی عزت ہوتی ہے اس لیے سب کو عزت کی لذت کا تجربہ ہوتا ہے لیکن وجود حقیقی کے علم میں جو لذت ہے اس سے صرف فلسفی ہی آشنا ہوتا ہے۔

میں نے کہا: اپنے اس تجربے کی وجہ سے اسی میں سب سے اچھے فیصلے کی قابلیت ہوگی۔

گلوکون نے کہا: کہیں بہتر۔

میں نے کہا: اور یہی تو ایک ہے، جس میں علم اور دانش بھی ہے اور تجربہ بھی۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: مزید برآں وہ قوت اور صلاحیت جو فیصلے کا آلہ ہے، لالچی اور حوصلہ مند آدمی میں تو

ہوتی نہیں، یہ تو صرف فلسفی میں ہوتی ہے۔

گلوکون نے کہانے کہا: کون سی صلاحیت؟

میں نے کہا: وہ ہے عقل، کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، فیصلہ اسی کے ہاتھ میں رہنا چاہیے۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور تعقل اس کا مخصوص آلہ ہے۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: اگر دولت اور نفع معیار ہوتے تو بلاشبہ طالب نفع کی تعریف یا تنقیص سب سے زیادہ بھروسے کے قابل مانی جاتی؟

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: اور اگر عزت، جرأت، یا فتح مندی معیار ہوتے تو حوصلہ منداور فاتح کا فیصلہ سب سے سچا ہوتا؟

اس نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: لیکن چونکہ حَکم تجربہ، عقل ودانش ہیں......

اس نے جواب دیا: اس لیے ایک نتیجہ ممکن ہے کہ جن مسرتوں کو عقل اور دانش کا عاشق پسند کرے وہی سچی مسرتیں ہیں۔

میں نے کہا: چنانچہ ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ روح کے جز وفہیم ودانا کی خوشی تینوں میں سب سے زیادہ پرمسرت ہے اور ہم میں سے جس میں یہ اصول حکم ران ہو اسی کی زندگی سب سے زیادہ پر حظ وخوش آیند ہوگی۔

اس نے کہا: اس میں کیا کلام ہے۔ دانش مند انسان جب اپنی زندگی کو پسند کرتا ہے تو پورے بھروسے سے کہتا بھی ہے۔

میں نے کہا: پھر اس کے بعد کونسی زندگی اچھی ہے اور کونسی مسرت؟ اس کے متعلق ہمارے حَکم صاحب کیا کہتے ہیں؟

اس نے کہا: ظاہر ہے کہ اس کے بعد سپاہی اور عزت کے شیدا کی زندگی ہے کہ یہ نفع کے طالب کے مقابلے میں اس سے زیادہ قریب ہے۔

میں نے کہا: اور سب سے آخر میں نفع کا طالب؟

گلوکون نے کہا: ہاں، اور کیا۔

میں نے کہا: اچھا تو تم نے دیکھا عادل آدمی نے غیر منصف ظالم کو پیہم دو مرتبہ پچھاڑا۔ اب تیسرا امتحان آتا ہے اور یہ اولمپیا کے دیوتا شافع زیوس کے نام سے منسوب ہے۔ کوئی مرد دانا آہستہ سے میرے کان میں کہتا ہے کہ سوائے عقلمند کی مسرت کے اور کوئی مسرت بالکل سچی اور خالص نہیں ہوتی، اور باقی سب بس سایہ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اب کی یہ شکست سب سے بڑی اور فیصلہ کن ثابت ہوگی۔

گلوکون نے کہا: ہاں سب سے بڑی تو ہوگی، لیکن ذرا اپنا مفہوم تو واضح کیجیے؟

میں نے کہا: اچھا، میں اس مسئلے کو حل کرتا ہوں، تم میرے سوالوں کا جواب دیتے جاؤ۔

گلوکون نے کہا: اچھا چلیے۔

میں نے کہا: کہیے مسرت الم کی مخالف ہے یا نہیں؟

گلوکون نے کہا: بالکل ہے۔

میں نے کہا: اور ایک سکون کی کیفیت ہوتی ہے جو نہ مسرت ہے نہ الم۔

اس نے جواب دیا: جی ہاں، ہوتی ہے۔

میں نے کہا: گویا یہ درمیانی حالت ہوتی ہے، اور ان دونوں کیفیتوں کے آس پاس روح کا آرام اور سہارا۔ کیوں تمھارا یہی مطلب تو ہے؟

اس نے جواب دیا: جی ہاں۔

میں نے کہا: تمھیں کچھ خیال ہے کہ لوگ بیماری میں کیسی باتیں کیا کرتے ہیں؟

اس نے کہا: کیوں، کیا کہتے ہیں؟

میں نے کہا: یہی کہ کچھ بھی ہو صحت اور تندرستی سے زیادہ اور کوئی چیز مسرت بخش نہیں لیکن بیمار ہونے تک انھیں کبھی یہ خبر نہ تھی کہ صحت سب سے بڑی مسرت ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں، یہ تو میں جانتا ہوں۔

میں نے کہا: اور جب لوگ کسی شدید کرب میں مبتلا ہوتے ہیں تو تم نے انھیں کہتے سنا ہوگا کہ کرب سے بچنے سے بڑھ کر کوئی حظ نہیں؟

اس نے جواب دیا: جی، سنا ہے۔

میں نے کہا: اسی طرح تکلیف کی بہت سی قسمیں ہیں جن میں یہ لوگ کسی مثبت تفریح کو نہیں بلکہ محض کرب کے بند ہونے کو سب سے بڑا حظ بتاتے ہیں؟

اس نے کہا: جی ہاں۔ اس وقت کے لیے تو یہ اس رہائی اور آرام پر ہی قانع ہو جاتے ہیں۔

میں نے کہا: پھر جب مسرت و حظ رک جائے تو اس رکاوٹ سے کرب ہوتا ہے۔

اس نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: چنانچہ سکون کی درمیانی حالت حظ و مسرت بھی ہوگی اور کرب والم بھی۔

اس نے کہا: معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

میں نے کہا: لیکن کیا یہ ہو سکتا ہے کہ جو دونوں میں سے کچھ نہیں (یعنی نہ حظ ہے نہ کرب) وہ دونوں ہو جائے۔

اس نے کہا: میں تو کہوں گا کہ نہیں ہو سکتا۔

میں نے کہا: اور حظ و کرب، مسرت والم دونوں روح کی حرکتیں ہیں۔ کیوں ہیں نا؟

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور جو نہ حظ ہے نہ کرب، اسے ابھی ابھی ہم نے سکون قرار دیا تھا نہ کہ حرکت، اور ہم نے کہا تھا کہ یہ دونوں کے بیچ کی ایک کیفیت ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: تو پھر یہ کیسے ٹھیک ہو سکتا ہے کہ ہم عدم کرب کو حظ اور عدمِ حظ کو کرب سمجھیں؟

گلوکون نے کہا: ناممکن۔

میں نے کہا: لہٰذا یہ سب کچھ محض ظاہر ہے، حقیقت نہیں۔ یعنی سکون ایک لمحے کے لیے کرب کے مقابلے میں حظ اور حظ کے مقابلے میں کرب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب ان تمام مظاہر کو مسرت حقیقی کی کسوٹی پر پرکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ حقیقت نہیں، بس ایک طرح کا دھوکا ہے۔

گلوکون نے کہا: نتیجہ تو یہی نکلتا معلوم ہوتا ہے۔

میں نے کہا: اب ذرا دوسری قسم کی مسرتوں کو دیکھو جن سے پہلے کوئی کرب نہیں ہوتا۔ اب آپ یہ

فرض نہیں کر سکتے کہ حظ کرب کے رک جانے اور کرب حظ کے بند ہو جانے کا نام ہے۔

اس نے کہا: یہ کونسی مسرتیں ہیں اور کہاں ملتی ہیں۔

میں نے کہا: ایسی تو بہت سی مسرتیں ہیں۔ مثال کے طور پر شامہ کے حظ کو لے لو کہ یہ نہایت عمدہ ہوتے ہیں اور ان سے پہلے کوئی کرب نہیں ہوتا۔ یہ آن کی آن میں آتے ہیں اور جب جاتے ہیں تو کوئی کرب چھوڑ کر نہیں جاتے۔

اس نے کہا: بہت درست۔

میں نے کہا: چنانچہ ہمیں یہ باور نہیں کرنا چاہیے کہ خالص حظ کرب کا بند ہو جانا اور خالص کرب حظ کا بند ہو جانا ہے۔

گلوکون نے کہا: جی نہیں۔

میں نے کہا: مگر پھر بھی اکثر اور عموماً شدید مسرتیں جو روح کو جسم کی وساطت سے پہنچتی ہیں وہ اسی قبیل کی ہوتی ہیں، یعنی کرب سے چھٹکارا۔

گلوکون نے کہا: یہ تو سچ ہے۔

میں نے کہا: اور آنے والے حظ و کرب کی توقع کی بھی یہی کیفیت ہوگی؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: کیا ان کی کچھ مثالیں دوں؟

گلوکون نے کہا: فرمایئے۔

میں نے کہا: یہ تو آپ مانیں گے کہ فطرت میں ایک اعلیٰ ایک ادنیٰ اور ایک درمیانی طبقہ ہوتا ہے؟

اس نے کہا: جی، مانتا ہوں۔

میں نے کہا: ایک شخص اگر ادنیٰ سے درمیانی طبقے کی طرف جائے تو کیا وہ یہ خیال نہیں کرے گا کہ وہ اوپر جا رہا ہے، اسی طرح جو شخص درمیانی طبقے میں کھڑا اسے نیچے سے آتا دیکھتا ہے، اور اس نے حقیقی طبقۂ اعلیٰ کبھی دیکھا نہیں، تو وہ اپنے متعلق سمجھے گا کہ پہلے سے ہی طبقہ اعلیٰ میں ہے۔

اس نے کہا: یقیناً۔ اس کے سوا اور سمجھ ہی کیسے سکتا ہے؟

میں نے کہا: لیکن اس کو پھر واپس لے جائیں تو یہ خیال کرے گا اور بجا طور پر خیال کرے گا کہ اب

یہ نیچے اتر رہا ہے۔

اس نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: یہ ساری غلط فہمی حقیقت میں جو اعلیٰ، ادنیٰ اور متوسط درجے ہیں ان کو نہ جاننے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: تو پھر اس میں بھی کون سی بڑے تعجب کی بات ہے کہ جن لوگوں کو صداقت کا تجربہ نہیں ہوتا وہ جہاں اور بہت سی چیزوں کے متعلق غلط خیال رکھتے ہیں وہاں حظ و کرب اور ان کی درمیانی کیفیت کے متعلق بھی غلط تصورات کو ذہن نشین کر لیں۔ چنانچہ جیسا یہ کرب کی طرف محض کھنچ ہی رہے ہوں تو انھیں کرب محسوس ہونے لگے اور یہ اسے حقیقی کرب تصور کریں، اسی طرح جب کرب سے درمیانی کیفیت کی طرف جا رہے ہوں تو پورا یقین ہو جائے کہ بس اب مسرت و تسکین کی منتہا کو پہنچ گئے۔ یہ غریب چونکہ مسرت اور حظ سے واقف نہیں لہٰذا غلطی سے کرب کا کرب کے عدم سے موازنہ کرتے ہیں اور اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ سیاہ کا موازنہ سفید سے کرنے کے بجائے آپ بھورے سے کرنے لگیں۔ کیوں فرمایئے اگر ایسا ہو تو کونسی ایسی تعجب کی بات ہے۔

گلوکون نے کہا: ذرا تعجب کی بات نہیں، میں تو اس وقت زیادہ متعجب ہوتا کہ صورتِ حال اس کے خلاف ہوتی۔

میں نے کہا: اس معاملے پر یوں نظر ڈالو۔ بھوک، پیاس وغیرہ جسم کی تھکان و پژمردگی سے عبارت ہیں؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور جہل اور حماقت روح کی پژمردگی سے؟

گلوکون نے کہا: درست۔

میں نے کہا: اور ان کے مقابل وجہ تسکین، کھانا پینا اور عقل و دانش ہیں۔

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: اور کونسی تسکین زیادہ سچی ہے، وہ جو ایسی چیز سے پیدا ہو جس کی ہستی کم ہے یا اس سے

جس کی ہستی زیادہ ہو؟

گلوکون نے کہا: ظاہر ہے، اس سے جس کی ہستی زیادہ ہو۔

میں نے کہا: تمھارے خیال میں وجود حقیقی کا زیادہ حصہ کن چیزوں کو ملا ہے، کھانے پینے، مصالحے، یا اور بدنی پرورش کی چیزوں کو یا ان کو جن میں سچی رائے، علم، ذہن اور ہر قسم کی نیکیاں شامل ہیں؟ بلکہ اس سوال کو یوں پیش کرو، کہ کس کا وجود زیادہ خالص ہے، اس کا جو غیر متبدل، غیر فانی اور صداقت سے متعلق ہے اور بالطبع ایسا ہے اور ایسی طبائع میں پایا جاتا ہے یا اس کا جسے تغیر پذیر اور فانی سے تعلق ہے اور اسی میں پایا بھی جاتا ہے اور پھر خود اپنی جگہ بھی تغیر پذیر اور فانی ہے؟

اس نے جواب دیا: اس کا وجود کہیں زیادہ خالص ہے جسے غیر تغیر پذیر سے تعلق ہو۔

میں نے کہا: اور غیر تغیر پذیر جس درجے اصلیت اور حقیقت اپنے اندر رکھتا ہے کیا اسی حد تک علم سے بھی حصہ پاتا ہے؟

اس نے جواب دیا: جی ہاں، اسی درجے کا علم رکھتا ہے۔

میں نے کہا: اور اسی درجے کی صداقت؟

اس نے جواب دیا: جی ہاں۔

میں نے کہا: یا اس کے برعکس یوں کہو کہ جس چیز میں صداقت کم ہو گی اس میں اصلیت اور حقیقت بھی کم ہو گی؟

گلوکون نے کہا: لازماً۔

میں نے کہا: گویا عام طور پر یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو چیزیں جسم کی خدمت گزار ہوتی ہیں ان میں صداقت اور اصلیت کم ہوتی ہے اور ان میں زیادہ ہوتی ہے جو روح کی خادم ہیں۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور کیا خود جسم میں روح سے کم صداقت اور اصلیت نہیں ہوتی؟

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: جو چیز زیادہ حقیقی وجود سے پُر ہو اور واقعتاً زیادہ حقیقی ہستی رکھتی ہو وہ حقیقی معنوں میں اس سے زیادہ پُر ہوتی ہے جو کم حقیقی وجود سے بھری ہو اور خود بھی کم حقیقی ہو۔

گلوکون نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: اور اگر اس چیز سے پُر ہونے میں واقعی کوئی مسرت ہے جو فطرت کے مطابق ہو تو پھر جو زیادہ حقیقی وجود سے زیادہ حقیقی طور پر لبریز ہوگا وہی زیادہ حقیقی اور سچے معنی میں سچی مسرت سے لطف اندوز بھی ہوگا، اور اس کے برخلاف جسے کم حقیقی وجود سے حصہ ملا ہوگا وہ سچ اور یقینی معنوں میں آسودہ بھی کم ہوگا، اور ایک کم حقیقی اور فریب دینے والی مسرت کا حصہ دار ہوگا۔

اس نے کہا: اس میں کیا کلام ہے۔

میں نے کہا: چنانچہ جو لوگ عقل اور نیکی سے ناآشنا ہیں اور سدا زبان کے چٹخارے اور نفسانی شہوتوں کی تسکین میں مشغول، وہ بس درمیانی درجے تک ہی اوپر نیچے آتے جاتے رہتے ہیں اور ساری عمر اسی علاقے میں ادھر ادھر سرگشت کیا کرتے ہیں اور حقیقی عالم بالا میں بیچاروں کا گزر ہی نہیں ہوتا۔ نہ تو خود یہ ادھر آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہیں، نہ وہاں کی راہ کا انھیں پتا چلتا ہے نہ یہ حقیقی وجود سے پُر ہوتے ہیں اور نہ خالص اور دائمی مسرت سے ان کے کام و دہن لذت یاب۔ ان کی مثال بس مویشیوں کے ایک گلے کی سی ہے، کہ آنکھیں نیچی کیے اور اپنا سر زمین کی طرف یعنی اپنے دسترخوان کی طرف جھکائے ہیں کہ کھا کھا کر پھول رہے ہیں اور اپنی نسل بڑھا رہے ہیں۔ پھر ان مسرتوں سے انتہائی عشق کے باعث اپنے آہنی سینگوں اور کھروں سے ایک دوسرے کو ٹکریں اور لاتیں مارتے ہیں اور غیر تسکین پذیر خواہش کی خاطر ایک دوسرے کی ہلاکت کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ اپنے آپ کو ایک غیر حقیقی شے سے بھر لیتے ہیں۔ لہٰذا ان کا وہ حصہ بھی جسے یہ پُر کرتے ہیں غیر حقیقی، بے قابو اور بے لگام ہو جاتا ہے۔

گلوکون نے کہا: جناب سقراط: سچ تو یہ ہے کہ آپ نے ان عوام کی زندگی کا نقشہ ایسا اتارا جیسے کوئی کاہن بول رہا ہو۔

میں نے کہا: ان کی مسرتیں آلام سے مملو ہوتی ہیں اور بھلا ایسا نہ ہو تو کیا ہو؟ کیونکہ یہ تو صداقت کی محض تصویریں اور سائے ہیں: پھر ان پر رنگ کیا گیا ہے، تضاد سے، جو روشنی اور سایہ دونوں میں مبالغہ پیدا کرتا ہے اور اس طرح یہ ان احمقوں کے دماغ میں اپنی مجنونانہ آرزو پیوست کر دیتی ہیں۔ اور پھر ان کے لیے یہ لوگ یوں ہی لڑتے جھگڑتے ہیں جیسے بقول اسٹیسی کورس (Stesichorus) یونانی ٹرائے میں صداقت سے بے خبر ہیلن (Helen) کے سائے کے لیے جنگ آزمائی کر رہے تھے۔

اس نے کہا: ایسی کوئی نہ کوئی بات تو لازمی ہونی چاہیے؟

میں نے کہا: اور کیا یہی معاملہ روح کے جذباتی عنصر کے ساتھ بھی پیش نہ آئے گا؟ کیا ایک جذباتی آدمی کی بھی یہی کیفیت نہ ہوگی، جب وہ اپنے جذبے کو عمل کی صورت میں تبدیل کرنا چاہے گا، پھر اس میں چاہے وہ حاسد اور لالچی ہو، یا متشدد اور جھگڑالو، غصہ اور غضب سے پُر ہو یا اپنے حال سے بیزار، بس اتنا کافی ہے کہ وہ بلا عقل اور ہوش عزت اور فتح مندی حاصل کرنے اور اپنا غصہ اتارنے کی فکر میں ہو۔

اس نے کہا: جی ہاں۔ جذباتی عنصر کو بھی یہی پیش آئے گا۔

میں نے کہا: تو کیا ہم بھروسے سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ دولت اور عزت کے چاہنے والے جب اپنی مسرتوں کو عقل اور علم کی راہنمائی میں اور ان کے دوش بدوش حاصل کرتے ہیں اور انہی مسرتوں کی طلب میں کوشاں ہوتے ہیں جو عقل انھیں بتاتی ہے تو انھیں اس حقیقی مسرت کے اعلیٰ ترین درجے نصیب ہوتے ہیں جو ان کے لیے قابل حصول ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ حقیقت اور صداقت کی پیروی کرتے ہیں۔ اور اگر ہر انسان کے لیے جو کچھ بہترین ہے وہی سب سے زیادہ مطابق فطرت بھی ہے تو انھیں وہ مسرتیں نصیب ہوں گی جو ان کی فطرت کے عین مطابق ہیں۔

اس نے کہا: جی ہاں، یقیناً۔ جو بہترین ہوتا ہے وہ سب سے زیادہ فطرت کے مطابق بھی ہوتا ہے۔

میں نے کہا: اور جب ساری کی ساری روح فلسفیانہ اصول کی تابع ہو، اس میں کوئی تقسیم و مناقشہ نہ ہو، اس کے ترکیبی اجزا سب عدل کے پابند اور اپنے اپنے کام میں مشغول ہوں، ہر ایک اپنی جگہ پر ان اچھی سے اچھی اور سچی سے سچی مسرتوں سے شادکام ہو جس کی اس میں صلاحیت ہے؟

اس نے کہا: جی، بجا۔

میں نے کہا: لیکن جہاں دوسرے دو اصولوں میں سے کسی ایک کا غلبہ ہوا تو یہ اول تو خود اپنی مسرت کے حصول میں ناکام رہتا ہے اور پھر دوسرے حصوں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ایسی مسرت کی طلب کریں جو بس ایک سایہ ہے اور ان کے لیے مخصوص نہیں؟

گلوکون نے کہا: درست۔

میں نے کہا: اور فلسفہ اور عقل سے ان کی دوری جتنی زیادہ ہوگی اسی قدر یہ مسرت ان کے لیے اجنبی اور فریب دہ ہوگی۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور کیا وہی چیز عقل سے بھی سب سے زیادہ دور نہیں ہوتی جو آئین و نظام سے سب سے زیادہ دور ہو؟

گلوکون نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں شہوانی اور ظالمانہ خواہشات ان سے سب سے زیادہ دور ہوتی ہیں۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور شاہی اور منظم خواہشیں سب سے قریب؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: لہٰذا جابر مستبد سچی اور قدرتی مسرت سے سب سے زیادہ اور بادشاہ سب سے کم دوری پر رہیں گے؟

گلوکون نے کہا: یقیناً، ایسا ہی ہے۔

میں نے کہا: لیکن اگر ایسا ہے تو جابر مستبد سب سے زیادہ بدحال اور بادشاہ سب سے زیادہ خوشحال زندگی بسر کرے گا۔

گلوکون نے کہا: لازمی بات ہے۔

میں نے کہا: کیا تم اس دوری کا پیمانہ معلوم کرنا چاہتے ہو؟

گلوکون نے کہا: جی فرمائیے۔

میں نے کہا: معلوم ہوتا ہے کہ مسرتیں تین قسم کی ہوتی ہیں، ایک اصلی اور دو نقلی۔ جابر کی بدعنوانی نقلی مسرتوں سے بھی پرے پہنچتی ہے، یہ عقل اور آئین کی حدود سے گزر کر بعض غلامانہ مسرتوں کے ساتھ رہن سہن اختیار کرتا ہے، یہ مسرتیں اس کے ساتھ ہی لگی رہتی ہیں؛ اور اس کی کم حیثیتی کا اندازہ بس ایک مثال ہی سے ہو سکتا ہے۔

گلوکون نے کہا: کیسے؟

میں نے کہا: میں سمجھتا ہوں کہ جابر مستبد خواص سے تیسرے نمبر پر ہے اور جمہوریت پسند بیچ ہیں؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اگر جو کچھ اب تک کہا گیا ہے وہ صحیح ہے تو جابر مستبد کا مسرت کے ایک ایسے عکس سے تعلق ہوگا جو خواص کی مسرت کے مقابلے میں حقیقت سے تگنا دور ہے؟

گلوکون نے کہا: ضرور۔

میں نے کہا: اور خواص بادشاہ سے تیسرے درجے پر ہیں، کیونکہ ہمارے نزدیک شاہی اور اشرافیہ تو ایک ہی ہیں؟

گلوکون نے کہا: جی بے شک، تیسرے درجے پر۔

میں نے کہا: گویا جابر مستبد کی سچی مسرت سے جو دوری ہے وہ تین کی تگنی ہے؟

گلوکون نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: اچھا تو ظالمانہ مسرت کا سایہ اگر اس کے طول کے عدد سے نکالا جائے تو وہ ایک مسطح شکل ہوگی۔

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: اب اگر اسے اس کی ذات میں ضرب دیں اور اس مسطح کو صلب بنائیں تو ہم بلا دشواری دیکھ سکتے ہیں کہ بادشاہ اور ظالم مستبد کا درمیانی فصل کس درجے وسیع ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں، کوئی حساب دان اس سوال کو آسانی حل کر سکتا ہے۔

میں نے کہا: یا اگر کوئی شخص دوسرے سرے سے شروع کرے اور یہ اندازہ کرنا چاہے کہ بادشاہ سچی مسرت کے اعتبار سے جابر مستبد سے کتنے فصل پر ہے تو ضرب وغیرہ دینے کے بعد اسے معلوم ہوگا کہ بادشاہ ۷۲۹ گنا خوشحال اور ظالم مستبد اسی قدر بدحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اس نے کہا: کیسا عجیب شمار اعداد ہے؟ اور باعتبار مسرت والم عادل اور ظالم کو جو فاصلہ جدا کرتا ہے وہ کتنا وسیع!

میں نے کہا: اور پھر لطف یہ کہ صحیح شمار ہے، اور یہ عدد ایسا ہے کہ اگر انسانوں کو روز و شب اور ماہ و سال سے سروکار ہے تو اس عدد سے بھی انسانی زندگی کو بہت قریبی واسطہ ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔ انسانی زندگی کو اس سے یقیناً واسطہ ہے۔

میں نے کہا: اچھا تو اگر باعتبار مسرت اچھا اور عادل انسان برے اور ظالم سے اتنا افضل ہے تو زندگی کی اچھائی اور حسن وخوبی کے اعتبار سے تو اس کی فضیلت بہت زیادہ ہوگی؟

اس نے کہا: بے حساب اور بے شمار۔

میں نے کہا: اب کہ ہم دلیل کی اس منزل پر آن پہنچے ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان لفظوں کی طرف رجوع کریں جنھوں نے ہمیں یہاں پہنچایا۔ کیوں، کوئی صاحب یہی تو کہہ رہے تھے نا کہ ایسے کامل غیر منصف اور ظالم انسان کے لیے، جسے عادل ہونے کی شہرت حاصل ہو ناانصافی اور ظلم سودمند ہے؟

اس نے کہا: جی ہاں، یہی کہا گیا تھا۔

میں نے کہا: اچھا تو اب کہ ہم نے عدل اور ناانصافی کی کیفیت اور قوت کا تعین کر لیا۔ ان صاحب سے دو دو باتیں ہو جائیں۔

گلوکون نے کہا: اچھا تو ہم ان سے کہیں گے کیا؟

میں نے کہا: ہم روح کی ایک شکل بنائیں گے تاکہ اس کے الفاظ خود اسی کی آنکھوں کے سامنے آ جائیں۔

گلوکون نے کہا: کیسی شکل؟

میں نے کہا: روح کا ایک خیالی مجسمہ جیسے قدیم اساطیر کے مرکب مجسمے ہوتے تھے، مثلاً شمیرا (Chimera)، سکلا (Scylla) یا سربرس (Cerberus) ان میں بہت سے ایسے بھی ہیں جن میں دو یا کئی مختلف طبیعتوں کی یکجا نمود بتاتے ہیں۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں، کہتے تو ہیں کہ اس قسم کے میل ہوئے ہیں۔

میں نے کہا: اچھا تو پھر میرے لیے ایک عظیم الشان بہت سے سروں والے راکشس کا مجسمہ تیار کرو جس کے شانوں پر طرح طرح کے جانوروں کے سروں کا حلقہ ہو، اس میں پالتو جانور بھی ہوں، جنگلی بھی اور یہ انھیں جب چاہے پیدا کر لے اور جب چاہے بالکل بدل دے۔

اس نے کہا: آپ سمجھتے ہیں کہ بت گر میں بڑی قوتیں ہیں، لیکن زبان تو موم یا کسی اور مادی چیز سے زیادہ ہی لوچدار ہوتی ہے اس لیے اس مجسمے کو تو آپ ہی تیار کریں۔

میں نے کہا: تو پھر ایک اور دوسری شکل شیر کی سی اور ایک تیسری انسان کی سی تیار کرو، دوسری شکل

پہلے سے اور تیسری دوسری سے چھوٹی ہو۔

اس نے کہا: یہ تو آسان کام ہے، چلیے، بنائیے!

میں نے کہا: اب ان تینوں کو باہم یوں جوڑ دو کہ یہ تینوں ایک ہو جائیں۔

اس نے کہا: یہ بھی ہو گیا۔

میں نے کہا: اب اس کے ارد گرد ایک آدمی کی شکل بنا دو تا کہ جو اندر نہ دیکھ سکے اور صرف باہر کے خول کو دیکھے وہ یہ سمجھے کہ یہ ایک انفرادی انسانی ہستی ہے۔

گلوکون نے کہا: جی، ہو گیا۔

میں نے کہا: اور اب ہم اس شخص کو جواب دیں جو انسان کے لیے ظالم اور غیر منصف ہونا سود مند اور عادل اور نا انصاف ہونا ضرر رساں بتاتا ہے کہ بھائی اگر تم سچ کہتے ہو تو اس مخلوق کے لیے فائدہ اس میں ہے کہ اپنے سوسرے راکشس کو کھلا کھلا کر خوب پالے، اپنے شیر اور دوسری شیرانہ صفات کو تقویت پہنچائے، لیکن اپنے انسان کو بھوکوں مار کر بالکل کمزور کر دے، تا کہ پھر دوسرے دونوں اسے جدھر چاہیں گھسیٹتے پھریں۔ اور یہ بھی کہ یہ کبھی ان میں باہمی یگانگت و ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش نہ کرے بلکہ آپس میں ہمیشہ لڑنے جھگڑنے، کاٹنے کھسوٹنے اور ایک دوسرے کو کھا جانے کی کوشش میں مشغول رہنے دے۔

اس نے کہا: سچ ہے ظلم اور نا انصافی کا حامی یہی کہتا ہے۔

میں نے کہا: عدل کا جانب دار اس پر یہ جواب دیتا ہے کہ اسے اپنے قول اور فعل سے ہمیشہ یہ کوشش کرنی چاہیے کہ کسی نہ کسی طرح اس کے اندر کے انسان کو پورے انسان نما وجود پر تسلط حاصل ہو جائے۔ اسے چاہیے کہ اپنے سوسرے راکشس پر ایسی نگاہ رکھے جیسے باغبان اپنے پودوں پر یعنی اس میں جو اچھی اور نرم صفات ہیں انھیں نشو و نما دے اور جو وحشی اور جنگلی عناصر ہیں انھیں نہ بڑھنے دے، پھر اسے چاہیے کہ اس کے اندر جو شیر ہے اسے اپنا معاون بنالے اور ان سب کی نگہبانی یوں کرے کہ پہلے تو مختلف اجزا کو باہم ایک دوسرے سے اور پھر خود اپنی ذات سے متحد کر لے۔

اس نے جواب دیا: جی ہاں، عدل کا حامی بالکل یہی کہے گا۔

میں نے کہا: تو کیا ہر لحاظ سے، یعنی مسرت اور حظ، عزت یا فائدہ ہر اعتبار سے، عدل کا حامی صحیح ہے اور سچ کہتا ہے اور نا انصافی کا طرفدار جھوٹ بولتا ہے اور جاہل ہے؟

اس نے جواب دیا: جی ہاں، ہر لحاظ سے۔

میں نے کہا: اچھا آؤ، اب ذرا غیر منصف ظالم کو نرمی سے سمجھائیں، اس لیے کہ یہ جان بوجھ کر تو غلطی پر اڑا ہوا ہے نہیں، کہ "بھائی صاحب! آپ کے نزدیک شریف اور رذیل چیزوں کا معیار کیا ہے؟ کیا وہ شریف نہیں جو درندے کو انسان کے یا یوں کہو کہ انسان میں جو الوہیت ہے اس کے ماتحت لائے اور کیا رذیل وہ نہیں جو انسان کو درندے کا زیر دست کرے؟"۔ تو سوائے 'ہاں' کے اسے کوئی جواب مشکل ہی سے بن پڑے گا۔ کیوں نا؟

اس نے کہا: اگر وہ میری رائے کا کچھ بھی پاس کرے تو، تو اس کے لیے اور کوئی چارہ نہیں۔

میں نے کہا: لیکن اگر اس نے یہ مان لیا تو پھر ہم اس سے یہ سوال اور کریں گے: "اچھا تو پھر کوئی آدمی اگر اس شرط پر سونا چاندی وصول کرے کہ اپنے شریف ترین حصے کو رذیل ترین کا غلام بنا دے گا تو وہ بھلا اس سونے چاندی سے کیسے کوئی نفع حاصل کر سکے گا؟ کوئی شخص اگر اپنی اولاد کو روپے کی خاطر غلام بنا کر بیچ دے، اور پھر وہ بھی وحشی اور بد آدمیوں کے ہاتھوں، تو کون ہے جو اس کو نفع میں سمجھے گا، چاہے پھر اس میں اسے کتنی ہی بڑی رقم مل گئی ہو۔ اور پھر جب کوئی اپنے وجود کے الٰہی جز و کو اس کی خاطر بیچ دے جو الٰہیت سے سب سے زیادہ بعید اور قابل نفرت ہے تو کون ہے جو اسے کمبخت و بدنصیب نہ بتائے گا۔ اریفلی (Eriphyle) نے اپنے شوہر کی جان کی قیمت میں ایک ہار لیا تھا، لیکن یہ تو اس سے کہیں بڑی تباہی کے لیے رشوت لیتا ہے"!۔

اس نے کہا: ہاں ہاں، میں اس کی طرف سے جواب دیتا ہوں، بے شک یہ اس سے کہیں بڑی تباہی ہے۔

میں نے کہا: بے اعتدال اور بے عفت آدمی پر ہمیشہ سے اسی لیے تو لعنت ملامت رہی ہے کہ اس کے اندر اس سو سرے راکشس کو بڑی آزادی ہوتی ہے۔

اس نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: اور جب انسانوں میں شیر اور سانپ والا عنصر تناسب سے زیادہ قوت پکڑ لیتا ہے تو ان پر غرور اور بد مزاجی کا الزام لگایا جاتا ہے نا؟

اس نے کہا: جی۔

میں نے کہا: اسی طرح عیاشی اور بے جا نرمی اس لیے بری سمجھی جاتی ہیں کہ یہ انسان کو کمزور اور ڈھیلا کر کے بزدل بنا دیتی ہیں۔

اس نے کہا: بالکل درست۔

میں نے کہا: اور جب کوئی اپنے اندر کے جری جانور کو اس بے لگام راکشس کا مطیع بنادیتا ہے اور دولت کی خاطر، جس سے اس کا پیٹ کبھی بھرتا ہی نہیں، عین شباب کے عالم میں اپنے آپ کو قدموں تلے روندے جانے کا عادی بناتا اور بجائے شیر کے بندر کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے تو اس پر خوشامد اور کمینہ پن کا الزام لگاتے ہیں۔

گلوکون نے کہا: درست۔

میں نے کہا: اور ذلیل نوکریاں اور دستی کام یہ کیوں قابلِ ملامت سمجھے جاتے ہیں؟ صرف اسی لیے کہ ان سے اصول اعلیٰ کی کمزوری کا پتا چلتا ہے۔ فرد اپنے اندر کی ہستیوں پر قابو پاتا نہیں اس لیے ان کی مصاحبت کرتا ہے اور اس کا سارا علم اور مطالعہ بس اس میں محدود ہے کہ ان کی چاپلوسی کس ڈھب سے کرے۔

اس نے جواب دیا: بظاہر تو یہی وجہ معلوم ہوتی ہے۔

میں نے کہا: اور چونکہ ہم ان لوگوں کو بھی ایسی ہی حکومت میں رکھنا چاہتے ہیں جیسی کہ بہترین انسانوں کی، لہٰذا ہماری رائے ہے کہ انھیں بہترین انسانوں کا خادم ہونا چاہیے جن میں الوہیت حکمران ہے، یہ نہیں کہ تھریسی میکس کی رائے کے مطابق خادم پر اسے نقصان پہنچانے کے لیے حکومت کی جائے بلکہ اس وجہ سے کہ بہترین صورت یہ ہے کہ ہر شخص پر حکمرانی ہو، اس فہم و عرفان الٰہی کی جو خود اس کی ذات میں موجود ہے اور جب یہ ممکن نہ ہو تو پھر کسی باہر کے حاکم کی تاکہ جہاں تک ہو سکے ہم سب کے سب ایک ہی حکومت کے زیر سایہ برابر اور دوستوں کے طرح رہ سکیں۔

اس نے کہا: سچ ہے۔

میں نے کہا: اسی قسم کا ارادہ وہ آئین میں بھی بیّن طور پر ظاہر ہے کہ آئین سارے شہر کے محافظ و مددگار ہوتے ہیں۔ یہی خیال اس اختیار میں دکھائی دیتا ہے جو ہم بچوں کے اوپر عمل میں لاتے ہیں۔ ہم انھیں اس وقت تک آزاد نہیں ہونے دیتے جب تک ان میں ایسا اصول قائم نہ کریں جو ریاست کے اساسی دستور کا مرادف ہو اور جب تک اس اعلیٰ عنصر کی نشو و نما سے ان کے دلوں میں اپنے جیسے ایک محافظ اور حاکم کو نصب نہ کردیں۔ ہاں جب یہ ہو گیا تو وہ اپنی من مانی راہ چل سکتے ہیں۔

اس نے کہا: جی ہاں؛ آئین کا مقصد تو ظاہر ہے۔

میں نے کہا: تو پھر کس نقطۂ نظر سے اور کن وجوہ کی بنا پر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ کسی کو ناانصافی، بے اعتدالی و بے عفتی، یا دوسری رزیل صفتوں سے کوئی نفع پہنچ سکتا ہے کہ یہ تو اسے بہر حال برا ہی بناتی ہیں، چاہے وہ اپنی شرارت اور بدی سے کتنا ہی مال اور دولت یا قوت اور اقتدار کیوں نہ حاصل کر لے۔

اس نے کہا: جی کسی نقطۂ نظر سے نہیں۔

میں نے کہا: اور اس سے بھی اسے بھلا کیا نفع ہوگا کہ اس کی ناانصافی پکڑی نہ جائے اور وہ اس کی سزا سے بچا رہے؟ جو پکڑا نہیں جاتا وہ تو اور بھی بدتر ہوتا جاتا ہے اور جو سزا پا لیتا ہے اس کی طبیعت کا وحشی حصہ تو پھر بھی خاموش ہو کر انسانیت کی طرف مائل ہو جاتا ہے، اس کی ذات کے شریف عناصر آزاد ہو جاتے ہیں اور عدل، عفت اور حکمت کے حصول سے اس کی ساری روح مشرف اور مکمل ہو جاتی ہے اور یہ شرف و کمال اس شرف سے جو انسانی جسم حسن، قوت اور تندرستی کے عطیہ سے حاصل کرتا ہے اسی درجے بدتر ہوتا ہے، جس درجے روح جسم سے زیادہ قابل احترام ہے۔

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: یہ ہے وہ اعلیٰ مقصد جس کے حصول کے لیے سمجھدار آدمی اپنی زندگی کی ساری قوتیں وقف کر دے گا۔ اولاً تو وہ ان علوم کی تکریم کرے گا جو اس کی روح پر ان صفات کا سکہ جمائیں اور دوسرے علوم کو نظر انداز کر دے گا؟

گلوکون نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: دوسرے، وہ اپنی جسمانی عادتوں اور کیفیتوں کو منظم کرے گا۔ حیوانی اور خلاف عقل مسرتوں پر اپنے جسم کو لگنے دینے کا سوال ہی نہیں کہ یہ تو صحت تک کو ایک ثانوی چیز تصور کرے گا، اس کا پہلا مقصد حسین یا قوی، یا تندرست ہونا نہ ہوگا جب تک کہ ان صفات سے اعتدال کا حصول قرین قیاس نہ ہو۔ یہ تو جسم کو ہمیشہ اس طرح ٹھیک کرے گا کہ اس سے روح کی ہم آہنگی کو قائم رکھ سکے۔

اس نے کہا: اگر اس کے اندر سچی موسیقی ہے تو یقیناً اس کا عمل یہی ہوگا۔

میں نے کہا: پھر دولت کے حصول میں نظم اور تناسب کا ایک اصول ہے جسے یہ ہمیشہ پیش نظر رکھے گا۔ دنیا کی ابلہانہ مدح سرائی سے اس کی آنکھیں خیرہ نہ ہوں گی اور یہ اپنے لیے بے گنتی برائیوں کی جڑ یعنی دولت کے انبار جمع نہیں کرے گا۔

اس نے کہا: یقیناً نہیں۔

میں نے کہا: یہ تو اس مدینہ داخلی کا نگران ہوگا جو خود اس میں موجود ہے اور ہمیشہ خیال رکھے گا کہ اس میں بدنظمی پیدا نہ ہو، اور یہ بدنظمیاں پیدا ہوتی ہیں یا تو دولت کی بے حساب فراوانی سے یا پھر اس کے مطلق نہ ہونے سے۔ وہ اپنی ملک اور آمدنی کو اسی اصول کے مطابق منضبط کرے گا اور اپنے وسائل کے اعتبار سے خرچ کرے گا۔

اس نے کہا: نہایت درست۔

میں نے کہا: اور اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر یہ ان تمام اعزازوں کو بخوشی قبول کرے گا جن کی بابت وہ سمجھتا ہے کہ یہ اسے ایک بہتر انسان بنانے میں مدد دیں گے، لیکن جن سے اس کی زندگی کا نظام بگڑتا ہوگا، خواہ وہ شخصی ہوں یا ملکی، ان سے گریز کرے گا۔

اس نے کہا: اگر اس کے عمل کا محرک یہ اصول ہے تو پھر یہ مدبر تو بنے گا نہیں۔

میں نے کہا: کلب مصری (ابوالہول) کی قسم، ضرور بنے گا، اور جو اس کا اپنا شہر ہوگا اس میں تو لازمی بنے گا۔ ہاں ممکن ہے کہ اپنے مولد میں نہ بنے سوائے اس صورت کے کہ اسے کوئی الٰہی ضرورت ہی مجبور کر دے۔

اس نے جواب دیا: جی، میں سمجھا۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس شہر میں حاکم بنے گا جس کی بنیاد ہم ڈال رہے ہیں اور جو صرف تصور میں اپنا وجود رکھتا ہے کیونکہ مجھے یقین نہیں کہ اور کہیں روئے زمین پر اس کا وجود ہو۔

میں نے کہا: ہاں، میں سمجھتا ہوں کہ آسمان پر اس کا نمونہ بنا ہوا ہے۔ اسے جو چاہے دیکھ سکتا ہے اور دیکھ کر اپنا گھر ٹھیک کر سکتا ہے۔ لیکن یہ بات کہ یہاں اس کا وجود ہے، یا کبھی بھی ہو سکتا ہے یا نہیں، اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ یہ دیکھنے والا تو ہمیشہ اسی شہر کے نمونے کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے گا اور دوسرے شہروں سے اسے کچھ سروکار نہ ہوگا۔

گلوکون نے کہا: میں بھی یہی خیال کرتا ہوں۔

☆☆☆

دسویں کتاب

میں نے کہا: ہماری ریاست میں یوں تو بہت سی خوبیاں ہیں، لیکن جب میں سوچتا ہوں تو مجھے کوئی خوبی اتنی پسند نہیں آتی جتنا کہ وہ قاعدہ جو ہم نے شاعری سے متعلق بنایا ہے۔

گلوکون نے کہا: آپ کا مطلب کس سے ہے؟

میں نے کہا: محاکاتی شاعری کے رد سے، کہ یقیناً اسے تو قبول نہیں کرنا چاہیے اور اب جب کہ روح کے اجزا الگ الگ سامنے آ گئے ہیں مجھ پر یہ بات اور بھی زیادہ روشن ہوتی جاتی ہے۔

گلوکون نے کہا: یعنی؟

میں نے کہا: راز کی بات ہے، آپس میں رہے، میں یہ نہیں چاہتا کہ میرے لفظ المیہ ناٹک لکھنے والوں اور نقالوں کے دوسرے قبیلوں کے سامنے دوہرائے جائیں۔ ہاں تم سے کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ تمام شاعرانہ نقالی سننے والوں کی سمجھ کے لیے تباہ کن ہوتی ہے اور اس زہر کے لیے بس ایک تریاق ہے یعنی اس کی اصلی ماہیت کا علم۔

گلوکون نے کہا: ذرا اپنے قول کا مطلب مجھے اچھی طرح سمجھائیے۔

میں نے کہا: اچھا بتاتا ہوں، سنو۔ یہ سچ ہے کہ ابتدائے شباب ہی سے میرے دل میں ہومر کی بڑی عظمت اور محبت ہے اور یہی وجہ ہے کہ میرے لفظ زبان سے نکلتے جھجکتے ہیں، اس لیے کہ المیہ نگاروں کی اس ساری کی ساری دلفریب جماعت کا اُستاد اور سردار یہی شخص ہے۔ لیکن صداقت سے زیادہ تو کسی شخص کی عزت نہیں ہو سکتی، چنانچہ میں کہتا ہوں..........

اس نے کہا: بہت خوب، فرمایئے؟

میں نے کہا: اچھا تو سنو، بلکہ جواب دو۔

اس نے کہا: پوچھیے۔

میں نے کہا: کیا تم بتا سکتے ہو کہ نقالی ہے کیا؟ کیونکہ دراصل مجھے تو یہ معلوم ہے نہیں۔

اس نے کہا: جی ہاں، پھر تو بہت ہی قرین قیاس بات ہے کہ مجھے معلوم ہو!

میں نے کہا: کیوں نہیں؟ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کمزور آنکھ ایک چیز کو تیز آنکھ سے پہلے دیکھ لیتی ہے۔

گلوکون نے کہا: بجا و درست، لیکن مجھے کچھ دُھندلا دکھائی پڑا بھی تو آپ کی موجودگی میں، میں اس کے بیان کی ہمت کہاں سے لاؤں گا۔ لہٰذا براہِ کرم آپ خود ہی تحقیق فرمائیے۔

میں نے کہا: اچھا تو اسی اپنے معمول کے طریقے سے اس تحقیق کو بھی شروع کریں۔ دیکھیے جب کبھی چند افراد کا ایک مشترک نام ہو تو ہم فرض کرتے ہیں ان میں کوئی تصور یا ہیئت بھی مشترک ہوگی، سمجھے؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: کوئی عام مثال لے لو۔ دنیا میں پلنگ ہوتے ہیں، میزیں ہوتی ہیں۔ بکثرت، کیوں ہوتی ہیں نا؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: لیکن ان کی صرف دو شکلیں یا دو تصور ہیں، ایک پلنگ کا تصور اور ایک میز کا تصور۔

گلوکون نے کہا: درست۔

میں نے کہا: اور ان میں سے کسی کا بنانے والا جب پلنگ یا میز بناتا ہے تو اس تصور کے مطابق بناتا ہے۔ ان صورتوں میں ہمارا طریقہ بیان یہی ہے۔ لیکن کوئی کاریگر ان تصورات (اعیان) کو نہیں بناتا، اور بنا بھی کیسے سکتا ہے؟

گلوکون نے کہا: ناممکن۔

میں نے کہا: لیکن ایک کاریگر اور ہے، میں سُننا چاہتا ہوں کہ تم اس کے متعلق کیا کہتے ہو؟

گلوکون نے کہا: وہ کون؟

میں نے کہا: وہ جو تمام دوسرے کاریگروں کے سارے کاموں کا بنانے والا ہے۔

گلوکون نے کہا: کیسا غیر معمولی اور نرالا کاریگر ہوگا وہ!

میں نے کہا: ذرا ٹھہرو تو، اظہارِ تعجب کے اور بھی وجوہ پیدا ہوں گے۔ کیونکہ یہ وہ کاریگر ہے جو صرف ہر قسم کے ظرف ہی نہیں بناتا، بلکہ درخت اور جانور، خود اپنی ذات اور تمام دوسری چیزیں، زمین اور

آسمان اور وہ ساری کائنات جو زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے ہے ان سب کا پیدا کرنے والا، بھی دیوتاؤں کو بھی پیدا کرتا ہے۔

گلوکون نے کہا: یہ تو کوئی جادوگر ہوگا؟

میں نے کہا: اہا تم باور نہیں کرتے، ہیں نا! کیا تمھارا خیال ہے کہ کوئی ایسا بنانے والا یا خالق نہیں؟ یا یہ کہ ایک معنی تو یہ ہے ان سب چیزوں کا کوئی بنانے والا ہو سکتا ہے لیکن دوسرے معنوں میں نہیں؟ کیا تم جانتے ہو کہ ایک طریقہ ایسا بھی ہے کہ تم خود ان سب چیزوں کو بنا سکتے ہو؟

اس نے کہا: وہ کون سا طریقہ ہے؟

میں نے کہا: بہت سہل طریقہ ہے یا یوں کہیے کہ اس کرتب کو نہایت آسانی اور تیزی سے کرنے کے بہت سے طریقے ہیں، سب سے زود اثر یہ طریقہ ہے کہ ایک آئینے کو نہایت تیزی سے گھماتے جاؤ۔ تو تم بڑی جلدی سے سورج، آسمان، زمین کو، خود اپنے آپ کو اور دوسرے جانوروں اور درختوں کو نیز تمام دوسری چیزوں کو، جن کا ابھی ابھی ذکر تھا، اس آئینے میں پیدا کر سکو گے۔

اس نے کہا: ہاں، لیکن یہ تو خالی ظاہری شکلیں ہوں گی۔

میں نے کہا: بہت ٹھیک، اب آپ پتے پر آ رہے ہیں، چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ نقاش و مصور بھی اسی نوع سے تعلق رکھتا ہے، یعنی محض ظاہری شکلوں کا خالق ہوتا ہے، کیوں ہے نا؟

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: لیکن شاید تم یہ کہو کہ یہ جو کچھ پیدا کرتا ہے وہ باطل ہے، تاہم ایک اعتبار سے مصور بھی پلنگ کا خالق ہو سکتا ہے؟

اس نے کہا: ہاں، لیکن اصلی اور حقیقی پلنگ کا نہیں۔

میں نے کہا: اور پھر پلنگ کے بنانے والے کے متعلق کیا کہو گے؟ تم ہی کہہ رہے تھے کہ یہ بھی وہ تصور (عین) تو پیدا کر نہیں سکتا جو ہمارے نزدیک پلنگ کی اصل ہے بلکہ صرف ایک مخصوص پلنگ بنا سکتا ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں، میں نے یہ کہا تھا۔

میں نے کہا: جب یہ وہ چیز نہیں بناتا جس کا وجود ہے تو یہ گویا حقیقی وجود نہیں بنا سکتا بلکہ صرف وجود سے مشابہ کوئی چیز بناتا ہے۔ اور اگر کوئی کہے کہ پلنگ بنانے والا یا کسی دوسرے کاریگر کا کام حقیقی وجود رکھتا ہے تو

مشکل سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔

اس نے کہا: بہر صورت فلسفی تو یہی کہیں گے کہ یہ سچ نہیں۔

میں نے کہا: پھر کوئی تعجب بھی نہیں کہ اس کا کام حقیقت کا ایک دھندلا غیر واضح اظہار ہے۔

اس نے کہا: کوئی تعجب نہیں۔

میں نے کہا: آؤ اب پچھلی مثالوں کی روشنی میں یہ تحقیق کریں کہ یہ نقال ہے کون؟

اس نے کہا: مناسب ہے۔

میں نے کہا: اچھا تو اب تین پلنگ ہیں، ایک تو قدرت میں موجود ہے جس کا بنانے والا خدا ہے، میں سمجھتا ہوں یہی کہنا چاہیے، اس لیے کہ اور کوئی تو اس کا بنانے والا ہو نہیں سکتا۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: پھر دوسرا ہے جو بڑھئی کی کارگزاری ہے۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: تیسرا پلنگ مصور کا بنایا ہوا ہے۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: گویا پلنگ تین قسم کے ہوتے ہیں اور تین صناع ان کے نگران ہیں، خدا، بڑھئی اور مصور؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں، تین ہیں۔

میں نے کہا: خدا نے مجبوراً یا اپنی مرضی سے قدرت میں بس ایک ہی پلنگ بنایا۔ دو یا دو سے زیادہ ایسے تصوری پلنگ نہ خدا نے بنائے ہیں نہ کبھی بنائے۔

گلوکون نے کہا: یہ کیوں؟

میں نے کہا: اس لیے کہ اگر وہ دو ہی بناتا تب بھی ایک تیسرا ضرور ظاہر ہوتا ہے جو ان دونوں کے لیے بمنزلۂ عین ہوتا، چنانچہ یہ تیسرا پلنگ کا عین ہو جاتا اور یہ دونوں عین نہ رہتے۔

گلوکون نے کہا: بہت ٹھیک۔

میں نے کہا: خدا یہ بات جانتا تھا اور ایک حقیقی پلنگ کا حقیقی خالق بننا چاہتا تھا کسی مخصوص پلنگ کا مخصوص خالق نہیں، چنانچہ ایسا پلنگ بنایا جو قدرتی طور پر اور اصل میں بس ایک ہے۔

اس نے کہا: جی، یہ ہمارا عقیدہ ہے۔

میں نے کہا: تو پھر اُسی کو پلنگ کا قدرتی خالق و صانع کہنا چاہیے۔

اس نے کہا: جی ہاں، کیونکہ قدرتی عمل تخلیق میں یہی اس کا اور نیز تمام دوسری چیزوں کا موجد ہے۔

میں نے کہا: اور بڑھئی کے لیے کیا کہیں؟ کیا یہ بھی پلنگ کا بنانے والا ہے؟

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: لیکن کیا نقاش اور مصور کو بھی خالق یا صانع کہو گے؟

اس نے کہا: ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: لیکن اگر یہ خالق نہیں تو پھر پلنگ سے اسے اور کون سا علاقہ اور نسبت ہے؟

اس نے کہا: میرے خیال میں اسے دوسروں کی بنائی ہوئی چیزوں کا نقال کہہ سکتے ہیں۔

میں نے کہا: خوب، گویا آپ اس شخص کو نقال کہتے ہیں جو فطرت سے تیسری منزل میں ہو؟

اس نے کہا: جی، بے شک۔

میں نے کہا: اور المیہ نگار شاعر بھی چونکہ نقال ہے اس لیے دوسرے نقالوں کی طرح یہ بھی بادشاہ اور صداقت سے بہ مراتب سہ گانہ دُور ہے؟

گلوکون نے کہا: معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

میں نے کہا: اچھا تو نقال کے متعلق تو ہم متفق ہیں۔ اب رہا مُصور، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آیا اسے ان چیزوں کا نقال خیال کریں جو اصلاً فطرت میں موجود ہیں، یا محض کارگروں کی بنائی ہوئی چیزوں کا؟

اس نے کہا: میرے خیال میں تو دوسری صورت صحیح ہے۔

میں نے کہا: لیکن ابھی یہ بات اور متعین کرنی ہے کہ ان چیزوں کی اس حالت میں نقل جیسی یہ سچ مچ ہیں یا جیسی کہ یہ ظاہر میں معلوم ہوتی ہیں؟

اس نے کہا: آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں نے کہا: میرا مطلب یہ ہے کہ آپ ایک پلنگ کو مختلف جگہوں سے دیکھ سکتے ہیں، مثلاً سامنے سے، ترچھے، یا کسی اور زاویے سے اور ہر دفعہ پلنگ کچھ اور معلوم ہوگا لیکن اس کی حقیقت میں کوئی فرق نہیں اور یہی حال سب اور چیزوں کا ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں، یہ جو فرق معلوم ہوتا ہے صرف ظاہری ہے۔

میں نے کہا: اب ایک سوال میں اور کروں، فن مصوری کا مقصد کیا ہے؟ چیزوں کی نقل، جیسی کہ وہ دراصل ہیں یا جیسی کہ وہ ظاہرا معلوم ہوتی ہیں، مجاز کی نقل یا حقیقت کی؟

اس نے کہا: مجاز کی۔

میں نے کہا: گویا نقال صداقت سے بہت دور ہوتا ہے اور سب کچھ کر سکتا ہے کیونکہ اسے ہر چیز کے ایک چھوٹے سے حصے سے واسطہ ہوتا ہے اور وہ حصہ بھی عکس، مثلاً ایک مصور ایک چمار کی، ایک بڑھئی کی، یا کسی اور کاریگر کی تصویر بنا دے گا، حالانکہ یہ ان کے فن کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا، اور اگر اچھا مصور ہے تو بچوں اور بھولے بھالے لوگوں کو دھوکا دے لے گا، یعنی جب دور سے یہ بڑھئی کی تصویر انھیں دکھائے گا تو یہ سمجھیں گے کہ کوئی سچ مچ کا بڑھئی دیکھ رہے ہیں۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: چنانچہ جب بھی کوئی شخص ہم سے آ کر کہے کہ مجھے ایک ایسا آدمی ملا جو سارے فن جانتا ہے، اور ان ساری چیزوں سے واقف ہے جو کسی اور کو معلوم ہیں، پھر یہ کہ ان میں سے ہر چیز کو باعتبارِ صحت ہر دوسرے سے بہتر جانتا ہے تو ہم بس یہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ غریب ایک بھولا بھالا آدمی ہے جو کسی جادوگر یا بہروپیے سے جا ملا ہے اور اس کے فریب میں آ کر اسے عالم کل سمجھنے لگا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ خود علم اور جہل اور نقل کی ماہیت کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

اس نے کہا: بالکل درست۔

میں نے کہا: چنانچہ جب ہم لوگوں کو کہتے سنیں کہ المیہ نگار شاعر اور ان کا سردار ہومر یہ سب کے سب تمام فنون سے واقف تھا اور ساری انسانی چیزوں کا اس میں نیکی ہو کہ بدی، اور نیز الٰہی چیزوں کا، انھیں علم تھا، کیونکہ شاعر اس وقت تک اچھا شعر نہیں کہہ سکتا جب تک اُسے اپنے موضوع کا علم نہ ہو اور جو یہ علم نہ رکھتا ہو وہ کبھی شاعر ہو ہی نہیں سکتا، ہاں تو جب ہم لوگوں کو یہ کہتے سنیں تو ہمیں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ کہیں یہاں بھی نظر کا فریب تو نہیں ہے۔ شاید ان لوگوں کو نقالوں سے سابقہ پڑا ہے اور یہ بھی ان کے فریب میں آ گئے ہیں۔ ان لوگوں نے جب ان کی تصانیف دیکھیں تو شاید یہ یاد نہیں رکھا کہ یہ تو محض نقلیں ہیں اور پھر صداقت سے تین درجے دوری پر، ان کا بنانا حقیقت کے جانے بغیر بھی آسانی سے ممکن ہے، کیونکہ یہ تو صرف ظاہری شکلیں ہیں،

حقیقت تو ہیں نہیں؟ یا بھی، ممکن ہے کہ یہ لوگ ٹھیک کہتے ہوں اور شاعر دراصل ان چیزوں کو جانتے ہوں جنھیں عوام کے خیال میں وہ خوبی سے بیان کرتے ہیں؟

اس نے کہا: بہر صورت یہ سوال ہے سوچنے والا۔

میں نے کہا: اچھا اگر ایک شخص اصل بھی بنا سکتا ہو اور نقل بھی تو کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ نقل سازی کی شاخ پر اپنی توجہ صرف کرے گا؟ کیا تمھارے خیال میں وہ نقالی کو اپنی زندگی کا مؤثر اُصول قرار دے گا، گویا اُس کے اندر اس سے بلند تر اور کوئی چیز ہے ہی نہیں؟

اس نے کہا: میں تو سمجھتا ہوں کہ نہیں۔

میں نے کہا: حقیقی صناع جسے علم ہو کہ وہ کس کی نقل کر رہا ہے تو بجائے نقلوں کے اصل میں دلچسپی لے گا اور بہت سے نفیس کاموں میں اپنی یادگار چھوڑے گا اور مدحیہ قصائد کا مصنف ہونے کی جگہ ان کا موضوع بننا زیادہ پسند کرے گا۔

اس نے کہا: جی ہاں، یہ اس کے لیے زیادہ عزت اور نفع کی بات ہوگی۔

میں نے کہا: اچھا تو اب ہومر سے ایک سوال کریں، طب یا کسی اور ایسے فن کے متعلق نہیں جس کا حوالہ ان کی نظموں میں یوں ہی برسبیلِ تذکرہ آ گیا ہے۔ اس سے یا کسی اور شاعر سے ہم یہ تو پوچھنے جائیں گے نہیں کہ آپ نے اسکلی پیئس کی طرح مریضوں کو اچھا کیا ہے یا اسکلی پیئس کے شاگردوں یا ساتھیوں کی طرح طب کا کوئی مدرسہ اپنے بعد چھوڑا ہے یا نہیں یا یہ کہ آپ طب اور دیگر فنون کے متعلق یوں ہی سُنی سنائی باتیں کیا کرتے ہیں۔ ہاں تو یہ تو ہم پوچھنے نہیں لگے۔ البتہ فوجی نقل و حرکت، سیاست اور تعلیم کے متعلق اس سے سوال کرنے کا ہمیں حق ہے کہ یہ چیزیں اس کی نظموں کے مخصوص اور بلند ترین مضامین ہیں۔ اور ہم بجا طور پر ان کے متعلق اس سے پوچھ سکتے ہیں۔ اچھا تو اب ہم اس سے کہیں کہ ''دوست ہومر! اگر آپ نیکی کے متعلق اپنے اقوال میں حقیقت سے صرف دو درجے ہٹے ہوئے ہیں تین درجے نہیں، یعنی اگر آپ عکس بنانے والے اور نقال نہیں، اگر آپ یہ معلوم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ کون سے شغل انسان کی خانگی اور سیاسی زندگی کو اچھا اور کون سے بُرا بناتے ہیں تو ذرا فرمایئے کہ وہ کون سی ریاست ہے جس پر آپ کی مدد سے بہتر حکومت ہوئی ہو؟ لیسی ڈیمون کا اچھا نظام لائی کرگس (Lycurgus) کا رہینِ منت ہے، اسی طرح بہت سے چھوٹے بڑے شہر ہیں جنھیں دوسرے اور لوگوں سے فیض پہنچا ہے، لیکن کون ہے جو یہ کہتا ہو کہ آپ نے ان کے لیے اچھے قانون

نافذ کیے ہوں اور انھیں کچھ فائدہ پہنچایا ہو، اٹلی اور سسلی کو اپنے چرون داس (Charondas) پر ناز ہے اور ہم میں سولون (Solon) کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے، لیکن وہ کون سا شہر ہے جسے آپ کے متعلق کچھ کہنا ہو؟ کیا کوئی شہر ہے جس کا یہ نام لے سکے گا؟

گلوکون نے کہا: میرے خیال میں تو نہیں۔ خود ہومر کے مُقلد اور معتقد اس کے مدعی نہیں کہ وہ قانون بنانے والا تھا۔

میں نے کہا: اچھا تو کیا کوئی ایسی جنگ ہے جو اس کی زندگی میں ہوئی ہو اور اس نے اُسے کامیابی سے انجام کو پہنچایا، یا اپنی صلاح ومشورے سے اس میں مدد دی ہو؟

گلوکون نے کہا: کوئی نہیں۔

میں نے کہا: پھر کیا کوئی ایجاد واختراع اس کے نام سے ایسی منسوب ہے جو مختلف فنون یا انسانی زندگی کے کام آتی ہو جیسی کہ مثلاً میلیشیا (Milesian) کے تھیلس (Tales) اور ساتھی کے اناکارسس (Anacharsis) یا دوسرے ذہین لوگوں نے سوچ کر نکالیں؟

گلوکون نے کہا: ایسی بھی کوئی چیز نام کو نہیں۔

میں نے کہا: خیر، اگر ہومر نے کبھی کوئی عام خدمت انجام نہیں دی تو کیا یہ خانگی طور پر کسی کا رہنما یا اُستاد تھا؟ کیا زندگی میں اس کے ایسے دوست تھے جو اس کی صحبت کے دلدادہ ہوں اور جنھوں نے آنے والی نسلوں تک ہومر کا طریق زندگی پہنچایا ہو، مثلاً ایسا حلقہ جیسا فیثاغورث نے قائم کیا تھا کہ لوگ اس کے عرفان کے باعث اسے محبوب رکھتے تھے اور آج کے دن تک اس کے ماننے والے اس سلسلے سے پہچانے جاتے ہیں جو اس کے نام سے منسوب کیا گیا تھا؟

اس نے کہا: ایسی کوئی بات بھی اس کے متعلق مرقوم نہیں اور سقراط، واقعی ہومر کا وہ ہم نشین کریوفلس (Creophylus) جس کا نام سُن کر ہمیں ہمیشہ ہنسی آ جاتی ہے اس وقت اپنی حماقت کی وجہ سے اور بھی زیادہ مضحکہ خیز ہو جاتا ہے، جب ہم سوچتے ہیں کہ یہ، اور یہی کیا اور سب لوگ بھی، زندگی میں ہومر کا ذرا بھی خیال نہیں کرتے تھے۔

میں نے کہا: ہاں، روایت تو یہی ہے۔ لیکن گلوکون! کیا تم تصور کر سکتے ہو کہ اگر ہومر واقعی لوگوں کو سُدھارنے اور سکھانے کا اہل ہوتا، یعنی اگر بجائے محض نقال ہونے کے اس کے پاس علم ہوتا تو اس کے بہت

سے معتقد اور پیرو نہ ہوتے جو اس کی عزت اور اس سے محبت کرتے؟ ابڈرا (Abdera) والے پروٹاغورس (Protagoras) اور سیوس (Ceos) کے پروڈیکس (Prodicus) اور بہت سے دیگر افراد نے اپنے معاصرین کے کان میں بس اتنی بات آہستہ سے پھونک دی کہ تم اُس وقت تک نہ اپنا گھر سنبھال سکو گے نہ اپنی ریاست جب تک ہمیں اپنا وزیر تعلیم نہ بنادو' اور ان کی یہ چالاک ترکیب ایسی کارگر ہوئی کہ لوگ ان سے محبت کرنے اور انھیں کندھوں پر چڑھائے چڑھائے پھرنے لگے۔ تو کیا یہ دھیان میں آنے والی بات ہے کہ اگر ان میں نوعِ انسانی کو نیک اور صالح بنانے کی صلاحیت ہوتی تو ہومر یا ہزیوڈ کے معاصر انھیں بھاٹوں کی طرح مارے مارے پھرنے دیتے؟ اُن سے جدائی تو ان لوگوں کے لیے اتنی ہی ناگوار ہوتی جتنی سونے سے اور یہ انھیں اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کرتے اور اگر اُستاد ٹھہرنے پر آمادہ نہ ہوتا تو شاگرد اس کے ساتھ ساتھ اس وقت تک ہر جگہ گھومتے رہتے جب تک ان کی کافی تعلیم نہ ہو جاتی۔

اس نے کہا: جی ہاں، میں سمجھتا ہوں کہ یہ بالکل درست ہے۔

میں نے کہا: پھر ہم یہ نتیجہ کیوں نہ نکالیں کہ یہ سارے کے سارے شاعر، ہومر سے لے کر اب تک محض نقال ہیں، یہ نیکی اور دوسری چیزوں کے عکس کی نقل کرتے ہیں لیکن حقیقت تک کبھی نہیں پہنچتے؟ شاعر کی مثال اس مصور کی سی ہے جو چمار کی تصویر بناڈالتا ہے حالانکہ اُس کے فن کو ذرا نہیں سمجھتا۔ اس کی تصویر بس ان کے لیے ٹھیک ہے جو خود اس سے زیادہ نہیں جانتے اور صرف رنگ اور صورت کو دیکھ کر فیصلہ کر لیتے ہیں۔

گلوکون نے کہا: بالکل بجا۔

میں نے کہا: اسی طرح شاعر اپنے لفظوں اور ترکیبوں سے مختلف فنون کا رنگ جماتا ہے اور ان کی ماہیت سے بس اسی حد تک واقفیت رکھتا ہے جتنی کہ نقالی کے لیے کافی ہو، دوسرے لوگ جو خود اسی کی طرح جاہل ہیں اور صرف اس کے لفظوں پر فیصلہ کر لیتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ جب یہ نغمہ اور وزن اور بحر کے ساتھ موچی کے کام کا، فوجی نقل و حرکت کا، یا اور کسی بات کا ذکر کرتا ہے تو نہایت دل نشین انداز میں انھیں بیان کرتا ہے۔ ہاں کیوں نہ ہو، نغمہ اور بحر میں قدرتاً یہ شیریں اثر ہے۔ میں سمجھتا ہوں آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ اگر ان شاعروں کے قصوں کو اس رنگ آمیزی سے معرا کر دیجیے جو موسیقی سے اُن پر چڑھایا جاتا ہے اور معمولی سیدھی سادی نثر میں اُنھیں بیان کیجیے تو ان کی کیسی پھسپھسی شکل نکل آتی ہے۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: ان کی مثال ان چہروں کی سی ہے نا؟ جو کبھی بھی حسین نہ تھے ان میں بس اوپری چمک دمک تھی اور اب شباب کی یہ آب وتاب اُن پر سے اُتر گئی؟

اس نے کہا: بالکل۔

میں نے کہا: ایک نکتہ اور ہے، نقال یا عکسوں کا بنانے والا حقیقی وجود کے متعلق کچھ علم نہیں رکھتا۔ یہ صرف ظاہری شکل کو جانتا ہے۔ کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں یا نہیں؟

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اچھا تو معاملے کو صاف طور پر سمجھ لیں، اُدھوری توضیح سے مطمئن نہیں ہو جانا چاہیے۔

اس نے کہا: فرمائیے۔

میں نے کہا: مصور کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ یہ لگام کی تصویر بنائے گا اور وہ بھی اُس کے صرف ایک ٹکڑے کی؟

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور زین ساز، اور پیتل کا کام کرنے والا خود لگام بنائے گا؟

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: لیکن کیا مصور یہ جانتا ہے کہ لگام اور دہانہ کیسا ہونا چاہیے؟ نہیں، یہ تو زین ساز اور لوہار کو بھی جو انھیں بناتے ہیں مشکل سے معلوم ہوتا ہے۔ صرف شہسوار جو ان کا استعمال جانتا ہے وہی ان کی صحیح شکل بھی جانتا ہے۔

اس نے کہا: بالکل درست۔

میں نے کہا: اور کیا یہی حال اور سب چیزوں کا نہیں؟

اس نے کہا: یعنی کیا؟

میں نے کہا: یہ کہ تین فن ہیں جن کا ہر چیز سے واسطہ ہے، ایک وہ جو اسے استعمال کرتا ہے، دوسرا وہ جو بناتا ہے، تیسرا وہ جو اس کی نقل کرتا ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور ہر جاندار اور بے جان چیز کی، نیز ہر انسانی عمل کی خوبی، حُسن، صداقت اس

استعمال کے اعتبار سے ہوتی ہے جس کے لیے قدرت یا صناع نے انھیں مقصود کیا ہے۔

اس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: چنانچہ ان کے استعمال کرنے والے کو ہی ان کا سب سے زیادہ تجربہ ہونا چاہیے اور یہی بنانے والے کو بتا بھی سکتا ہے کہ استعمال کے وقت کون کون سی اچھی یا بُری صفتیں اس میں پیدا ہوتی ہیں، مثلاً بانسری بجانے والا ہی بنانے والے کو بتا سکتا ہے کہ اس کی کون سی بانسری بجانے میں اچھی ہے اور اسے کس طرح بانسری بنانی چاہیے اور بنانے والے کا فرض ہے کہ اس کی ہدایتوں کی پابندی کرے؟

گلوکون نے کہا: لازماً۔

میں نے کہا: ان میں سے ایک چونکہ جانتا ہے اس لیے بانسریوں کی اچھائی یا بُرائی کے متعلق بھروسے سے بات کر سکتا ہے اور دوسرا اس پر اعتماد کر کے جو کچھ کہا جاتا ہے اس کی تعمیل کرتا ہے۔

گلوکون نے کہا: درست۔

میں نے کہا: بانسری تو وہی ایک ہے، لیکن اس کے بھلے بُرے کی بابت بنانے والے کو تو محض ایک صحیح یقین یا عقیدہ حاصل ہو سکتا ہے اور یہ یوں کہ جاننے والے سے اس کے متعلق گفتگو کرنے اور پھر جو کچھ وہ کہے اس کے سُننے پر مجبور ہو۔ رہا استعمال کرنے والا تو اُسے تو اس کا علم ہوتا ہی ہے۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: مگر نقال کو کیا ان میں سے کوئی بات بھی نصیب ہوگی؟ کیا اسے خود استعمال سے پتا چل سکے گا کہ اس کی نقاشی صحیح اور خوشنما ہے یا نہیں؟ یا کیا یہ ممکن ہے کہ یہ کسی جاننے والے سے ملنے اور اس کی ہدایت سُننے پر مجبور ہو کہ اسے کس طرح نقش اُتارنا چاہیے کہ اس طرح یہ صحیح رائے قائم کر سکے؟

اس نے کہا: دونوں میں سے کوئی صورت ممکن نہیں۔

میں نے کہا: گویا اپنی نقلوں کی اچھائی یا بُرائی کی بابت نہ تو اُسے صحیح رائے ہی حاصل ہوگی نہ ہی علم؟

اس نے کہا: میں تو سمجھتا ہوں کہ نہیں۔

میں نے کہا: پھر تو کیا کہنا، یہ نقال صناع تو اپنی مصنوعات کے متعلق عرفان کی نہایت روشن کیفیت رکھتا ہوگا؟

اس نے کہا: جی، نہ کہیں۔

میں نے کہا: لیکن جناب نقل ضرور کیے جائیں گے، چاہے علم ہو یا نہ ہو، کہ ایک چیز کیونکر اچھی ہوتی ہے اور کیسے بُری، چنانچہ یہی توقع کرنی چاہیے کہ یہ انہی چیزوں کی نقل کریں گے جو جاہل انبوہ کو اچھی معلوم ہوتی ہیں؟

گلوکون نے کہا: بالکل بجا۔

میں نے کہا: اچھا، یہاں تک تو ہم خاصے متفق ہیں کہ جن چیزوں کی یہ نقل کرتا ہے ان کے متعلق نقال کو کوئی قابلِ ذکر علم نہیں ہوتا۔ نقالی بس ایک طرح کا کھیل ہے یا تفریح اور یہ سارے کے سارے المیہ نگار شاعر چاہے، ''آیمبی'' (Iambic) میں لکھتے ہوں چاہے ''رزمیہ'' (Iteroic)، بدرجۂ اولیٰ نقال ہوتے ہیں۔

اس نے کہا: بالکل درست۔

میں نے کہا: ہاں تو قسم ہے آپ کو فرمایئے کہ ہم کیا یہ بات ظاہر نہیں کر چکے ہیں کہ نقالی کو اس چیز سے واسطہ ہے، جو حقیقت سے تین درجے دُوری پر ہوتی ہے۔

اس نے کہا: جی، بے شک۔

میں نے کہا: اور وہ کون سی انسانی صلاحیت ہے جس پر یہ نقالی اپنا اثر رکھتی ہے؟

اس نے کہا: آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں نے کہا: بتاتا ہوں، ایک جسم جو قریب سے دیکھنے میں بڑا معلوم ہوتا ہے، دُور سے چھوٹا معلوم ہوتا ہے؟

اس نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: وہی چیز پانی کے باہر سیدھی دکھائی دیتی ہے اور پانی کے اندر ٹیڑھی نگاہ کو رنگوں میں جو دھوکا ہو جاتا ہے اس کی وجہ سے گردی چیز پیالہ نما نظر آتی ہے۔ الغرض ہمارے اندر اس قسم کے تمام فریب موجود ہیں، اور انسانی دماغ کی اس کمزوری پر روشنی اور سایے سے نظر بندی کرنے اور فریب دینے کا فن اور دوسری چالاکی کی تدابیر اپنا اثر دکھاتی ہیں اور ہم پر جادو کا سا اثر کرتی ہیں۔

اس نے کہا: سچ ہے۔

میں نے کہا: تب ناپنے، گننے اور تولنے کے فن انسانی عقل کی مدد کو آتے ہیں۔ یہی ہے ان کا اصلی حُسن۔ اور وہ جو ظاہراً بڑا یا چھوٹا، ہلکا یا بھاری معلوم ہوتا تھا اب ہم پر غالب نہیں رہ سکتا، بلکہ حساب، پیمانہ اور

وزن کے سامنے قابو میں آجاتا ہے۔

گلوکون نے کہا: حق ہے۔

میں نے کہا: اور یہ یقیناً روح کے حساب دان اور عاقل اصول کا کام ہونا چاہیے؟

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: جب یہ اصول ناپ کر تصدیق کرتا ہے کہ یہ یہ چیزیں برابر ہیں، فلاں فلاں بڑی ہیں اور فلاں فلاں چھوٹی تو اس وقت بظاہر ایک تضاد پیدا ہوتا ہے!

گلوکون نے کہا: درست۔

میں نے کہا: لیکن ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ تضاد محال ہے، وہی صلاحیت ایک ہی وقت میں ایک ہی چیز کے متعلق دو متضاد آرا نہیں رکھ سکتی۔

گلوکون نے کہا: بالکل صحیح۔

میں نے کہا: تو گویا روح کا وہ حصہ جس کی رائے پیمانے کے خلاف ہے اس حصے سے مختلف ہوگا جس کی رائے پیمائش کے مطابق ہے؟

گلوکون نے کہا: ٹھیک۔

میں نے کہا: اور روح کا بہتر حصہ شاید وہی ہوگا جو پیمائش اور حساب پر بھروسا کرے۔

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: اور جو ان کا مخالف ہے وہ اُصول ادنیٰ درجے کا ہوگا۔

گلوکون نے کہا: بلاشبہ۔

میں نے کہا: میرا مقصد دراصل اسی نتیجے پر پہنچنا تھا۔ جیسا میں نے کہا تھا کہ مصوری اور نقاشی اور نقالی فی الجملہ جب اپنا اصلی کام کرتی ہوں تو حقیقت سے بہت دور ہوتی ہیں اور ہماری روح کے ایسے اُصول کی ہمنشین، دوست اور ساتھی ہیں جو خود عقلیت سے اسی درجے دور ہے اور سچ پوچھو تو ان کا کوئی سچا اور اچھا مقصد نہیں؟

اس نے کہا: بالکل ٹھیک۔

میں نے کہا: نقالی کا فن ایک نیچ ذات ہے جو نیچ ذات ہی سے بیاہ کرتا ہے، لہٰذا اولاد بھی نیچ ذات

ہی ہوتی ہے۔

اس نے کہا: بہت صحیح۔

میں نے کہا: اچھا تو کیا یہ معاملہ صرف باصرہ پر محدود ہے؟ یا سامعہ پر بھی اور خصوصاً اس پر جسے ہم شاعری کہتے ہیں اس کا اطلاق ہو سکتا ہے؟

اس نے کہا: غالب گمان ہے کہ شاعری کے متعلق بھی یہی بات صحیح ہوگی۔

میں نے کہا: نہیں بھائی، مصوری کی تمثیل سے جو ظنِ غالب پیدا ہوا ہے اس پر بھروسا کر بیٹھنا ٹھیک نہیں؛ آؤ آگے تحقیق کریں اور دیکھیں کہ جس صلاحیت سے شاعری کو سروکار ہے وہ اچھی ہے یا بُری۔

گلوکون نے کہا: ضرور۔

میں نے کہا: اچھا تو مسئلہ یوں پیش ہوتا ہے، نقالی ان انسانی اعمال کی (خواہ ارادی ہوں یا غیر ارادی) نقل کرتی ہے جن سے اس کے خیال میں کوئی اچھا نتیجہ مرتب ہوا ہو یا کیا کوئی بُرا نتیجہ، اور پھر اسی نتیجے کی نوعیت کے موافق اس پر خوشی مناتی ہے یا رنج کرتی ہے، کیوں کیا اس کے علاوہ اور کچھ بھی ہے؟

گلوکون نے کہا: نہیں، اور کیا ہوگا؟

میں نے کہا: لیکن کیا حالات اور اسباب کے اس تنوع میں انسان خود بھی اپنے آپ سے متفق ہے؟ یا کہیں ایسا تو نہیں کہ جیسے نگاہ کے معاملے میں اسی چیز کے متعلق اس کی رائے میں تضاد تھا اور عدم وضاحت تھی اسی طرح یہاں بھی اس کی زندگی میں کشاکش اور مطابقت کی کمی ہو؟ اگرچہ سچ پوچھو تو اب اس سوال کو دوبارہ اُٹھانے کی کوئی ضرورت تو نہیں۔ مجھے یاد ہے کہ یہ سب تو ہم تسلیم کر چکے ہیں اور ہم نے مان لیا ہے کہ روح ہر لحظہ ان اور ان جیسی اور ہزاروں مخالفتوں سے بھری ہوتی ہے؟

اس نے کہا: جی، اور ہم ٹھیک بھی تھے۔

میں نے کہا: ہاں۔ یہاں تک تو ہم ٹھیک تھے، لیکن ایک بات البتہ رہ گئی تھی جسے اب پورا کر لینا چاہیے۔

اس نے کہا: کیوں، وہ کیا بات رہ گئی تھی؟

میں نے کہا: تمھیں یاد ہوگا کہ ہم نے کہا تھا کہ اگر کسی نیک آدمی پر اس کے بیٹے کی موت کی بلا ٹوٹ پڑے یا اس سے کوئی ایسی چیز چھن جائے جو اسے بہت پیاری تھی تو وہ اور لوگوں کے مقابلے میں اس کو زیادہ

سکون کے ساتھ برداشت کرے گا؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: لیکن کیا اسے رنج ہی نہ ہوگا، یا یہ کہ رنج ہونا تو لازمی ہے البتہ یہ اپنے غم کو جیسے تیسے دور کرنے کی کوشش کرے گا؟

اس نے کہا: دوسری صورت زیادہ صحیح ہے۔

میں نے کہا: اچھا بتاؤ کہ یہ اپنے غم کو دبانے اور دُور کرنے کی کوشش اپنے ہم چشموں کی موجودگی میں زیادہ کرے گا یا تنہائی میں؟

اس نے جواب دیا: جی ہاں، اس سے بڑا فرق پڑے گا کہ کوئی اسے دیکھتا ہے یا نہیں۔

میں نے کہا: یہ جب اکیلا ہوگا تو بہت سی ایسی باتیں ہیں جو یہ کہہ سکتا یا کر سکتا ہے۔ لیکن اگر کہیں دوسرے انھیں دیکھ یا سُن لیں تو یہ شرم سے پانی پانی ہو جائے گا۔

اس نے کہا: درست۔

میں نے کہا: ہم کہہ چکے ہیں کہ جب ایک شخص پر دو مخالف قوتیں عامل ہوں، ایک کسی چیز کی طرف کھینچے اور ایک اُس سے دُور ہٹائے تو اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کے اندر دو جُدا اُصول موجود ہیں۔

اس نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: ان میں سے ایک قانون کی رہنمائی میں چلنے پر آمادہ ہے۔

گلوکون نے کہا: یہ کیسے؟

میں نے کہا: قانون کہتا ہے کہ مصیبت میں صبر کرنا بہترین صورت ہے، ہمیں بے صبری نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ کون جانتا ہے کہ یہ چیزیں اچھی ہیں یا بُری اور پھر بے صبری سے فائدہ بھی کیا؟ نیز اس لیے کہ کوئی انسانی معاملہ ایسی خاص اہمیت نہیں رکھتا اور غم اس چیز کی راہ میں حائل ہوتا ہے جس کی اس وقت سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

اس نے کہا: کس کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے؟

میں نے کہا: اس کی کہ جو کچھ پیش آ چکا اس پر غور کریں اور جب پانسہ پڑ چکا تو اب جو بہترین

صورت ہے اس کے مطابق ہی معاملات کا انصرام کریں، یہ نہیں کہ بچوں جیسے بن جائیں جو جہاں ذرا گر پڑے تو چوٹ کو پکڑ بیٹھے رہتے ہیں اور چیخنے چلانے میں ہی سارا وقت گنوا دیتے ہیں؛ بلکہ ہمیں تو چاہیے کہ روح کو فوراً ہی اس کا علاج کرنے کی عادت ڈلوائیں تاکہ جو مریض اور افتادہ ہو اسے پھر اُٹھا کر کھڑا کرے اور دُکھ کے کراہنے کو علاج معالجے سے دُور کرے۔

اس نے کہا: بے شک، بدبختی کے حملوں کا مقابلہ یونہی کرنا چاہیے۔

میں نے کہا: اور ہماری روح کا اعلیٰ اُصول عقل کے اس مشورے پر عمل پیرا ہونے کو آمادہ ہوتا ہے۔

گلوکون نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: اور دوسرا اُصول جو ہمیشہ غم کی یاد تازہ رکھنے اور اس پر نوحہ وزاری کی طرف مائل ہوتا ہے اور ان سے کبھی سیر نہیں ہوتا، اسے ہم عقل کے خلاف بے سُود اور بُزدلانہ اُصول کہہ سکتے ہیں۔

گلوکون نے کہا: بے شک، کیوں نہیں۔

میں نے کہا: اور کیا یہی مؤخرالذکر یعنی مائل بہ بغاوت اُصول نقالی کے لیے رنگا رنگ مواد فراہم نہیں کرتا؟ کیونکہ کسی فہیم اور متین طبیعت کی نقل اوّل تو اُتارنی آسان نہیں کہ اس میں ہمیشہ ایک توازن اور یکسانیت ہوتی ہے اور اگر اس کی نقل کی بھی جائے تو کوئی اُسے پسند نہ کرے خصوصاً تہواروں کے موقع پر جب ایک عامیانہ انبوہ کسی منڈپ میں ان نقلوں کے دیکھنے کے لیے جمع ہوتا ہے۔ اور وجہ صاف ہے کہ جس جذبے کی نقل اس حالت میں کی جائے گی یہ اس سے یک قلم ناآشنا ہیں۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: چنانچہ نقال شاعر جس کا مقصد قبولِ عام ہے نہ تو قدرتاً اس غرض کے لیے خلق ہوا ہے نہ اس کے ہنر کی غایت ہی یہ ہے کہ روح کے عقلی اُصول کو خوش کرے یا اور کسی طرح اس پر اثر ڈالے، بلکہ یہ تو ترجیح دے گا، جذباتی اور متلون طبیعت کو کہ اس کی نقل اُتارنی آسان ہے۔

گلوکون نے کہا: ظاہر ہے۔

میں نے کہا: اب ہم بجا طور پر اسے لے کر مصور کے پہلو بہ پہلو بٹھا سکتے ہیں کہ یہ دو طرح اس کا مثل ہے: اوّل تو یہ کہ اس کی مخلوق اپنے اندر صداقت کا ایک ادنیٰ درجہ رکھتی ہیں۔ تو ہاں ایک تو اس بات میں یہ مُصور کا مثل ہوا، دوسری بات یہ ہے کہ اسے بھی روح کے ایک ادنیٰ جزو سے سروکار ہے۔ لہٰذا ہم

بالکل حق بجانب ہوں گے اگر اسے ایک منظّم ریاست میں داخل کرنے سے انکار کریں کیونکہ یہ جذبات کو تو بیدار کرتا، ان کی آبیاری کرتا اور انھیں قوت بخشتا ہے لیکن عقل کو ضرر پہنچاتا ہے۔ جیسے کبھی کسی شہر میں بدکرداروں کو سارا اختیار مل جائے اور نیک مار کے الگ کر دیے جائیں تو کیا حال ہو۔ اسی طرح انسانی رُوح میں یہ نقال شاعر ایک باطل دستور کو لا کر بٹھاتا ہے اس لیے یہ روح کے اس غیر عاقل عنصر کی پچ کرتا ہے جسے بڑے چھوٹے کی تمیز نہیں، جو اسی چیز کو کبھی بڑا اور کبھی چھوٹا خیال کرتا ہے۔ یہ شاعر بس صورت گر ہے اور حقیقت سے کوسوں دور۔

گلوکون نے کہا: بالکل درست۔

میں نے کہا: لیکن ہم نے ابھی سب سے بھاری الزام تو پیش ہی نہیں کیا: یعنی نیکوں کو نقصان پہنچانے کی جو قوت شاعری اپنے اندر رکھتی ہے (اور بس گنتی کے لوگ ہیں جنھیں اس سے ضرر نہ پہنچا ہو) وہ واقعی نہایت ہی خوفناک ہے۔

اس نے کہا: بلاشبہ، اگر اس کا اثر وہی ہوتا ہے جو آپ فرماتے ہیں۔

میں نے کہا: اچھا تو سُنو اور فیصلہ کرو۔ ہم میں سے بہترین شخص جب ہومر یا کسی اور المیہ نگار شاعر کا کلام سُنتا ہے جس میں مشاہیر میں سے کوئی اپنے دُکھ درد کی لمبی کہانی دوہرا رہا ہو، رو دھو رہا ہو یا آہ و زاری اور سینہ کوبی میں مصروف ہو تو تم جانو اچھے سے اچھے کا دل پسیج جاتا ہے اور ہم اس شاعری کی خوبی پر سب سے زیادہ عش عش کرنے لگتے ہیں جو ہمارے جذبات کو سب سے زیادہ حرکت دے۔

اس نے کہا: جی، میں اس سے واقف ہوں۔

میں نے کہا: لیکن جب کوئی ذاتی مصیبت آن پڑتی ہے تو تم دیکھ سکتے ہو کہ ہم اس کے بالکل مخالف صفت پر فخر کرتے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ چُپ رہیں اور صبر کریں، کیونکہ مردانہ شعار یہی ہے، اور وہ دوسری چیز جسے سُن کر ہم متاثر ہوئے تھے اسے ہم اب نسائیت پر محمول کرتے ہیں۔

اس نے کہا: بالکل صحیح۔

میں نے کہا: اچھا تو بھلا تم ہی بتاؤ کہ جس کام کو ہم اپنی ذات کے لیے نفرت اور شرم کا باعث سمجھیں تو کیا جب دوسرا اسے کرے تو اس کی تعریف اور ستائش میں، ہم حق بجانب ہو سکتے ہیں؟

اس نے کہا: نہیں، واقعی یہ تو معقول بات نہیں۔

میں نے کہا: کیوں نہیں، ایک نقطۂ نظر سے تو بالکل معقول ہے۔

اس نے کہا: کون سے نقطۂ نظر سے؟

میں نے کہا: دیکھو، ہم اپنی ذاتی بپتا میں رو دھو کر اپنا غم غلط کرنے کی جس قدرتی خواہش کو دباتے اور قابو میں رکھتے ہیں اسی خواہش کو یہ شاعر پورا کرتے ہیں۔ ہماری بلند فطرت جب عقل یا عادت کی تربیت سے کافی بہرہ یاب نہیں ہوتی تو ہمدردی کے عنصر کو اس لیے آزاد چھوڑ دیتی ہے کہ یہ غم تو دوسرے کا ہے۔ ناظر سمجھتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے پاس نیکی کا دعویٰ کرتا اور ساتھ ساتھ اپنی مصیبتوں کا دکھڑا روتا آئے تو ایک بات پر اس کی تعریف اور دوسری پر افسوس کرنے میں بھلا اس کی کیا توہین ہے بلکہ اس اظہار سے جو لذت حاصل ہوتی ہے وہ الگ ایک فائدہ ہے۔ پھر یہ کیوں خواہ مخواہ اس درجے محتاط ہو اور اس لذت کو اور شعر کے لُطف کو کیوں ہاتھ سے جانے دے۔ اور جہاں تک میں جانتا ہوں بہت ہی کم لوگ اس بات پر دھیان کرتے ہیں کہ دوسروں کی بُرائی سے خود ان میں بھی کچھ بُرائی منتقل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ دوسروں کی مصیبت دیکھ کر رنج اور افسوس کے جس جذبے نے قوت پکڑ لی ہے پھر اس کا خود اپنی بپتا میں دبانا بھی بہت دشوار ہو جاتا ہے۔

اس نے کہا: نہایت دُرست۔

میں نے کہا: اور کیا ظرافت کا بھی یہی حال نہیں؟ بہت سے مزاح ہیں کہ تم خود کہتے شرماؤ گے، لیکن جب طربیہ ناٹک میں یا دوستوں کے حلقے میں انھیں سُنتے ہو تو بہت محظوظ ہوتے ہو اور ان کی بیہودگی سے ذرا متنفر نہیں ہوتے، یعنی وہی افسوس والا معاملہ: انسانی رُوح میں ایک اصول ہے جو ہنسی کی طرف مائل ہے، اسے تم نے اس ڈر سے روک رکھا تھا کہ لوگ تمھیں مسخرہ نہ خیال کرنے لگیں، سو اب یہ آزاد ہو جاتا ہے اور چونکہ ناٹک میں تم اسے حرکت دے چکے ہو تو گھر پر تم خود بھی بلا ارادہ بلا شعور ظریف شاعر کا روپ دھار لیتے ہو۔

گلوکون: بہت صحیح۔

میں نے کہا: پھر یہی حال شہوت اور غضب اور دوسرے جذبوں کا ہے، نیز خواہش کا اور حظ و کرب کا جو انسانی افعال سے کبھی جدا نہیں ہو سکتے، ان سب میں شاعری بجائے اس کے کہ جذبوں کے سوتوں کو سکھا دے ان کی پرورش آبیاری کرتی ہے، اور انسانی مسرت اور خوبی کے لیے جن چیزوں کو قابو میں رکھنا ضروری ہے۔ یہ انھی کے ہاتھ میں حکومت کی باگ دے دیتی ہے۔

اس نے کہا: میں اس سے تو انکار نہیں کر سکتا۔

میں نے کہا: چنانچہ، گلوکون، جب کبھی ہومر کے کسی مداح سے ملاقات ہو جس کا دعویٰ ہو کہ ہومر یونان کا معلم تھا، تعلیم اور معاملاتِ انسانی کی تنظیم کے لیے اس کا کلام نہایت مفید ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اسے بار بار پڑھیں اور اسے سمجھ کر اس کی تعلیم کے مطابق اپنی ساری زندگی کی تشکیل کریں تو بھائی ہم ان لوگوں کی تعظیم و تکریم تو سب کچھ کریں گے کہ جہاں تک اُن کی روشنی کام دیتی ہے غریب اچھے لوگ ہیں اور ساتھ ہی ہم ہومر کو سب سے بڑا شاعر اور سب سے پہلا المیہ نگار مصنف بھی تسلیم کرلیں گے لیکن اس عقیدے پر پختگی سے قائم رہیں گے کہ دیوتاؤں کی تسبیح اور سورماؤں کی مدح وستائش بس یہی شاعری کی وہ قسمیں ہیں جنھیں اپنی ریاست میں داخل ہونے دینا چاہیے۔ اس لیے کہ جہاں اس سے آگے قدم بڑھایا اور رزمیہ یا غنائیہ کی شکل میں شعر کی مٹھاس بھری دیوی کو آنے دیا کہ بس قانون اور عقل کی فرمانروائی کی جگہ، جنھیں سب لوگوں نے متفقہ طور پر بہترین حکمران تسلیم کیا ہے، حظ وکرب اور لذت والم کا دور دورہ ہو جائے گا۔

اس نے کہا: نہایت درست۔

میں نے کہا: اب کہ ہم پھر ایک بار شاعری کے موضوع پر لوٹے ہیں ہمیں چاہیے کہ اپنے پہلے فیصلے کی معقولیت اس عذر سے ثابت کریں جس کی رو سے ہم نے اس فن کو جس میں مذکورہ رجحانات ہوں اپنی ریاست سے خارج کیا تھا۔ لیکن اس لیے کہ یہ ہم پر تشدد اور عدم رواداری کا الزام نہ لگا سکے، آؤ ہم اس سے یہ بھی کہہ دیں کہ فلسفے اور شاعری میں تو بڑا پُرانا بیر ہے اور اس کے بہت سے ثبوت ہیں ''کتیا جو اپنے آقا پر بھونکتی ہے'' والا مقولہ، یا ''احمقوں کی بیکار صحبت میں سربلند'' یا وہ ''انبوہ عقلا''، والا حوالہ ''جو زیوس کے دائیں بائیں چکر کاٹا کرتے ہیں'' ۔یا ''وہ باریک بین نازک خیال سارے کے سارے دریوزہ گر'' الغرض اس پُرانی عداوت کی اُن جیسی اور اَن گنت نشانیاں ہیں۔ لیکن باوجود اس کے آؤ ہم اپنی میٹھی دُلاری اور اس کی دوسری بہنوں کو یقین دلائیں کہ بس اگر یہ ایک بار منظم ریاست میں اپنے وجود کا حق ثابت کردیں تو ہم نہایت خوشی سے ان کا خیر مقدم کریں گے۔ ہمیں تو خود اس کی دلاویزی کا احساس ہے لیکن ہم اس وجہ سے بھلا حق کا ساتھ تو چھوڑ نہیں سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ تم بھی اس کی دلفریبی سے اسی قدر متاثر ہوتے ہوگے جتنا کہ میں اور خصوصاً جب یہ ہومر کے پیکر میں رونما ہوتی ہے؟

اس نے کہا: ہاں، سچ ہے، میں بھی بہت متاثر ہوں۔

میں نے کہا: تو میں تجویز کروں کہ اسے جلاوطنی سے واپسی کی اجازت مل جائے لیکن بس اس شرط

پر کہ یہ غنائی یا کسی اور بحر میں اپنی صفائی پیش کرے؟

گلوکون نے کہا: ضرور۔

میں نے کہا: اور یہ بھی کر سکتے ہیں کہ ان شعروسخن کے شیدائیوں اور شاعری کے فن کے حمایتیوں کو جو خود شاعر نہیں اس بات کی اجازت دے دیں کہ یہ اس کی طرف سے نثر ہی میں گفتگو کریں اور ہمیں بتائیں کہ شاعری خالی لذت ہی نہیں بخشتی بلکہ ریاستوں اور انسانی زندگی کے لیے مفید بھی ہے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ نہایت ہمدردی سے ان کا عذر سنیں گے، اس لیے کہ اگر یہ ثابت ہو جائے تو ہمارا بھی تو فائدہ ہے، یعنی میں نے کہا اگر شاعری میں لذت کے علاوہ افادہ بھی ہو تو کیا کہنا۔

اس نے کہا: بے شک اس میں ہمارا فائدہ ہے۔

میں نے کہا: اگر اس کی طرف سے عذر ناکام رہا تو پھر، میرے پیارے دوست، ہر اُس شخص کی طرح جو ایک چیز کا دلدادہ ہے لیکن چونکہ اس کی آرزو اس کی اغراض کے منافی ہے لہٰذا اپنے اُوپر جبر کرتا ہے، ہم بھی کہ شعر کے فدائیوں میں ہیں اسے چھوڑ دیں گے، اگرچہ ایسا کرنا بلا کش مکش تو نہ بن پڑے گا۔ ہم میں بھی تو آخر شعر کی محبت میں وہ روح موجود ہے جو شریف ریاستوں کی تعلیم نے ہمارے اندر پھونکی ہے۔ چنانچہ ہماری خود بھی خواہش ہے کہ یہ اپنی بہترین شکل میں ہمارے سامنے آئے لیکن جب تک وہ یہ صفائی نہ پیش کر سکے تو ہماری گزشتہ دلیل ہمارے لیے ایک منتر کا کام دے گی، ہم جب اس کے نغموں کو سنیں گے تو اپنا یہ منتر بھی برابر دوہراتے جائیں گے، تاکہ ہم بھی اس کے اس طفلانہ عشق کا شکار نہ ہو جائیں جو عوام کو گرفتار کیے ہوئے ہے۔ بہرحال ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ چونکہ شاعری کی حقیقت وہی ہے جو ہم نے بیان کی لہٰذا اس کے ذریعے سے حق تک پہنچنے کی کوئی خاص توقع نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ جو بھی اسے سنے اور اپنے اندر والے شہر کی حفاظت کا کھٹکا بھی رکھتا ہو اُسے چاہیے کہ ہمارے لفظوں کو اپنا آئین بنائے اور اس کے بہکاوے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرے۔

اس نے کہا: جی ہاں، میں آپ سے بالکل متفق ہوں۔

میں نے کہا: ہاں، میرے عزیز گلوکون، جس بات کا فیصلہ کرنا ہے وہ نہایت عظیم الشان ہے، جتنا ظاہر میں معلوم ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ یعنی یہ کہ انسان نیک بنے یا بد؟ اور بھلا اس سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے کہ عزت، دولت، یا قوت کی خاطر یا ہاں شعر کے ہیجان میں کوئی نیکی اور عدل کو بھول بیٹھے۔

اس نے کہا: جی، میں تو اس دلیل سے پُورا قائل ہو گیا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ ہر کوئی قائل ہو جاتا۔

میں نے کہا: اور پھر بھی ابھی ان انعام و اکرام کا ذکر تو ہوا ہی نہیں جو نیکی کے لیے مخصوص ہیں۔

اس نے کہا: کیا؟ کیا ابھی اور بھی بڑے انعام ہیں؟ اور اگر ہیں تو ایسے انعام ہوں گے کہ ان کی عظمت کا تصور بھی مشکل ہو گا۔

میں نے کہا: کیوں، تھوڑے سے وقت میں بھلا کون سی چیز بہت بڑی ہو سکتی ہے؟ یہ تین بیسی اور دس سال کا زمانہ ازل کے مقابلے میں تو نہایت ہی چھوٹی سی چیز ہے۔

اس نے کہا: بلکہ کہیے کہ کچھ نہیں۔

میں نے کہا: تو کیا ایک غیر فانی وجود کو اس کُل کے مقابلے میں اس قلیل زمانے کا خیال کرنا چاہیے۔

اس نے کہا: ظاہر ہے کُل کا خیال کرنا چاہیے۔ لیکن آخر آپ یہ پوچھتے کیوں ہیں؟

میں نے کہا: کیوں، کیا تم نہیں جانتے کہ انسانی رُوح غیر فانی ہے اور کبھی نہیں مرتی۔

اس نے کہا: (میری طرف تحیر و استعجاب سے دیکھ کر) نہیں، بخدا! اور کیا آپ واقعی اسے ماننے کو تیار ہیں؟

میں نے کہا: ہاں، مجھے ماننا چاہیے اور تمھیں بھی۔ اس کے ثابت کرنے میں کوئی دشواری نہیں۔

اس نے کہا: مجھے تو بڑی دشواری معلوم ہوتی ہے۔ لیکن بہر حال میں آپ کی وہ دلیل سنوں گا جسے آپ ایسا سہل بتاتے ہیں۔

میں نے کہا: تو سنیے؟

اس نے جواب دیا: میں متوجہ ہوں۔

میں نے کہا: ایک چیز ہے جسے ہم خیر یا اچھائی کہتے ہیں اور ایک دوسری چیز ہے جسے شر یا بُرائی۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: کیا آپ مجھ سے متفق ہیں کہ خراب اور برباد کرنے والا عنصر شر ہے اور بچانے والا اور ترقی دینے والا عنصر خیر؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور آپ تسلیم کرتے ہیں کہ ہر چیز کی ایک اچھائی ہوتی ہے اور ایک بُرائی مثلاً آنکھیں

دُکھنا آنکھوں کی بُرائی ہے اور مرض سارے جسم کی، پھپھوندی، غلے کی بُرائی ہے، گھن لکڑی کی، زنگ لوہے، تانبے کی۔ ہر چیز میں یا یوں کہو کہ تقریباً ہر چیز میں ایک قدرتی بُرائی اور مرض ہوتا ہے؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اور جب ان میں سے کوئی بُرائی کسی چیز میں پیدا ہو جائے تو یہ چیز بھی بُری ہو جاتی ہے اور بالآخر بالکل تحلیل ہو کر فنا ہو جاتی ہے۔

گلوکون نے کہا: درست۔

میں نے کہا: جو شر اور عیب ہر ایک کی فطرت میں مضمر ہے وہی اس کی تباہی ہے، اور اگر یہ نہ تباہ کر سکے تو پھر اسے کوئی تباہ نہیں کر سکتا، کیونکہ خیر اور نیکی تو تباہ کرے گی ہی نہیں، اور نہ وہ جو نہ شر ہے نہ خیر۔

گلوکون نے کہا: یقیناً نہیں۔

میں نے کہا: چنانچہ اگر کوئی ایسی طبیعت ملے جس میں یہ قدرتی خرابی تو ہو لیکن اسے تحلیل اور تباہ نہ کر سکے تو ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اس کے لیے پھر کوئی تباہی نہیں۔

گلوکون نے کہا: جی یہ تو فرض کیا جا سکتا ہے۔

میں نے کہا: اچھا، پھر کیا ایسی کوئی بُرائی نہیں جو روح کی تخریب کر سکے؟

اس نے کہا: کیوں نہیں، وہ ساری کی ساری بُرائیاں ہیں جن پر ہم ابھی ابھی نظر ڈال رہے تھے، بدی، بے عفتی، بُزدلی، جہالت۔

میں نے کہا: لیکن کیا ان میں سے کوئی بھی اُسے تحلیل یا تباہ کر دیتی ہے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اس دھوکے میں نہیں پڑنا چاہیے کہ جب بے وقوف، غیر منصف انسان پکڑا جاتا ہے تو وہ اپنی ناانصافی کے باعث تباہ ہوتا ہے جو روح کا عیب ہے: جسم کی تمثیل لو، جسم کی بُرائی ایک مرض ہے جو اُسے گھلا گھلا کر گھٹاتی اور بالآخر بالکل برباد کر دیتی ہے اور وہ ساری چیزیں جن کا ہم ابھی ذکر کر رہے تھے ان خرابیوں اور عیبوں سے تباہ ہوتی ہیں جو ان سے وابستہ اور ان میں مضمر ہیں۔ کیوں، سچ ہے نا؟

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: اسی طرح رُوح پر دھیان کرو۔ کیا ناانصافی یا کوئی بُرائی جو رُوح میں موجود ہو اُسے تحلیل کر سکتی ہے؟ کیا بُرائیاں رُوح سے وابستہ رہ کر بالآخر اُس کی موت کا باعث ہوتی اور اس طرح اسے جسم

سے جُدا کرتی ہیں؟

گلوکون نے کہا: ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: اور تاہم یہ فرض کرنا عقل کے خلاف ہوگا کہ جس چیز کو اس کے اپنے اندر کی بُرائی تباہ نہ کر سکے وہ کسی باہر کی بُرائی کے اثر سے تباہ ہو جائے۔

گلوکون نے کہا: جی ہاں۔

میں نے کہا: گلوکون! ذرا سوچو کہ غذا تک کی بُرائی، مثلاً بدمزگی، سڑن یا کوئی اور بُری صفت اگر غذا ہی تک محدود ہو تو یہ نہیں سمجھ سکتے کہ اس سے جسم کی تباہی رُونما ہوئی۔ ہاں جب غذا کی خرابی جسم میں خرابی ڈالے تو اس وقت یہ کہنا چاہیے کہ جسم خود اپنے عیب سے تباہ ہوا یعنی مرض سے جسے غذا نے پیدا کیا۔ لیکن یہ ہم کبھی تسلیم نہیں کریں گے کہ اگر جسم ایک الگ چیز ہے اور غذا ایک الگ چیز جس سے کوئی قدرتی تعدی نہیں ہوتی تو پھر بھی غذا نے جسم کو تباہ کر دیا۔

گلوکون نے کہا: بالکل درست۔

میں نے کہا: اور اسی اُصول پر جب تک ایک جسمانی بُرائی روحانی بُرائی پیدا نہ کر سکے ہمیں کبھی یہ فرض نہیں کرنا چاہیے کہ رُوح جو بالکل جُدا چیز ہے کسی ایسی خارجی بُرائی سے تباہ ہو سکتی ہے جو کسی دوسری چیز سے تعلق رکھتی ہو۔

اس نے کہا: بے شک، اس خیال میں تو کوئی معقولیت نہیں۔

میں نے کہا: لہٰذا یا تو اس نتیجے کا رد ہو، یا پھر جب تک اسے رد نہ کیا جائے ہم کبھی یہ نہیں کہیں کہ بخار یا کوئی دوسرا مرض، گلے پر خنجر کا چلنا، یا جسم کا چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹا جانا رُوح کو تباہ کر سکتا ہے۔ جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ جب جسم کے ساتھ یہ اعمال ظہور میں آئیں تو وہ (روح) بھی اس وجہ سے ناپاک یا بد ہو جاتی ہے لیکن جب رُوح یا کوئی اور شے اپنی داخلی بُرائی سے تباہ نہ ہو تو پھر یہ تو کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی خارجی بُرائی سے تباہ ہو سکتی ہے۔

اس نے کہا: اور یقیناً یہ تو کوئی بھی ثابت نہ کر سکے گا کہ موت کے باعث انسانوں کی روحیں بد یا غیر منصف ہو جاتی ہیں۔

میں نے کہا: لیکن اگر کوئی شخص رُوح کے غیر فانی ہونے کو تسلیم نہ کرے اور اس کا صاف منکر ہو اور یہ

کہے کہ مرنے والے واقعی بد اور غیر منصف ہو جاتے ہیں تو اگر اس کا قول صحیح ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں ناانصافی کو بھی مرض کی طرح غیر منصف کے لیے مہلک تصور کرنا چاہیے یعنی جنھیں یہ روگ لگ گیا وہ بُرائی کی اُس ذاتی تباہ کن قوت سے مر جاتے ہیں جو بُرائی کی فطرت میں مضمر ہے اور جو جلد یا بدیر ہلاکت کا باعث ہوتی ہے لیکن یہ صُورت اس سے بالکل جُداگانہ ہے جس میں آج کل بُرے لوگ دوسرے کے ہاتھوں اپنے بُرے اعمال کی پاداش میں موت کا منھ دیکھتے ہیں۔

اس نے کہا: نہیں۔ اگر ناانصافی غیر منصف کے لیے مہلک ہو تو اس صورت میں تو یہ اس کے لیے کچھ بہت ہیبت ناک نہ ہوگی، اس لیے کہ وہ اپنی بُرائی سے نجات پا جائے گا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ حقیقت اس کے بالکل خلاف ہے۔ یعنی اگر ناانصافی میں طاقت ہو تو دوسروں کو تو قتل کرے لیکن خود قاتل کو سلامت رکھے اور خوب جیتا جاگتا۔ اس کا مسکن کہاں اور موت کا گھر کہاں؟

میں نے کہا: سچ ہے۔ اگر رُوح کی فطری بُرائی اور اس کا ذاتی عیب اسے ہلاک اور برباد کرنے سے معذور ہے تو پھر جو چیز کسی دوسرے جسم کی تباہی کے لیے متعین کی گئی ہے وہ اس رُوح کو، یا سوائے اس چیز کے جس کی بربادی اس کا مقصود ہے کسی اور کو کیونکر تباہ کر سکے گی۔

اس نے کہا: جی ہاں، یہ تو مشکل ہی سے ممکن ہے۔

میں نے کہا: لیکن جو روح کسی بُرائی سے تباہ نہ ہو، نہ خارجی سے نہ داخلی سے، وہ تو ہمیشہ موجود رہے گی اور چونکہ ہمیشہ موجود رہے گی اس لیے غیر فانی ہوگی؟

اس نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: تو یہ نتیجہ نکلا اور اگر یہ نتیجہ صحیح ہے تو روحیں ہمیشہ وہی رہنی چاہئیں، کیونکہ جب ان میں سے کوئی ہلاک نہ ہوگی تو اس کی تعداد بھی نہ گھٹے گی۔ اور نہ ان کی تعداد بڑھے گی، کیونکہ غیر فانی روحوں میں بڑھوتی پھر کسی فانی چیز سے آنی چاہیے اور یوں پھر سب چیزوں کا انجام جا کر بقا میں ہوگا۔

اس نے کہا: بہت بجا۔

میں نے کہا: لیکن یہ تو ہم یقین کر نہیں سکتے۔ عقل اس کی اجازت نہیں دیتی۔ جس طرح ہم یہ بات باور نہیں کر سکتے کہ روح اپنی حقیقی ماہیت میں عدمِ یکسانیت، تنوع اور اختلاف سے بھری ہوئی ہوگی۔

اس نے کہا: یعنی کیا؟

میں نے کہا: جیسا کہ ثابت ہو چکا روح کی ترتیب حسین ترین ہونی چاہیے؟ اور پھر یہ بہت سے عناصر سے کس طرح مرکب ہو سکتی ہے؟

اس نے کہا: جی، ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: اس کا غیر فانی ہونا تو پچھلی دلیل سے ثابت ہو گیا اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سے ثبوت ہیں۔ لیکن اگر اسے اس کی حقیقی شکل میں دیکھنا ہو، ایسے نہیں جس طرح ہم اب دیکھتے ہیں، یعنی جسم اور دوسرے عیبوں کے تعلق سے آلودہ، تو ہمیں اسے اصلی اور خالص حالت میں عقل کی آنکھ سے دیکھنا چاہیے تب اس کا حُسن بے نقاب ہوگا اور اس وقت جا کر کہیں عدل اور ناانصافی اور وہ ساری چیزیں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے نہایت واضح طور پر ظاہر ہوں گی۔ اب تک تو ہم نے اس کے متعلق جو حقائق بیان کیے ہیں وہ اس حالت کے ہیں جس میں وہ اس وقت ظاہر ہوتی ہے؛ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہم نے اسے جس حال میں دیکھا ہے اس کی مثال بحری دیوتا گلاکس (Glaucus) کی سی ہے جس کی اصلی شکل بمشکل دکھائی دیتی ہے کہ اس کے عناصر کو سمندر کی موجوں نے طرح طرح سے توڑا مروڑا اور مجروح کیا ہے، بحری نباتات، گھونگھوں اور پتھروں کے کھپٹ کے کھپٹ اس پر جم گئے ہیں اور اب اپنی فطری شکل سے مشابہ ہونے کے بجائے یہ ایک وحشت خیز اور ہیبت ناک درندہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح جو روح ہم دیکھتے ہیں اس کی شکل بھی ہزار ہا عیبوں سے یوں ہی مسخ ہوتی ہے۔ اس لیے گلوکون بس اُدھر دیکھو ہی نہیں۔

اس نے کہا: پھر آخر کدھر؟

میں نے کہا: اسی کے حبِ عرفان کی طرف، اس کی طرف جسے یہ متاثر کرتی ہے اور غیر فانی، ازلی والٰہی سے اپنے قریبی تعلق کے باعث، جس کی صحبت اور ہم نشینی کی یہ متمنی ہوتی ہے۔ نیز اس طرف کہ اگر اس اعلیٰ اُصول کی اتباع اور ایک ہیجانِ الٰہی سے یہ اس بحرِ تاریک سے نکل آئے جس میں یہ اب ہے اور ان کنکر پتھروں، دنیا کی چیزوں اور چٹانوں سے جو اس لیے اس کے گرد جنگلی چیزوں کی طرح پھوٹی پڑتی ہیں کہ یہ ارضی غذا رکھتی ہے اور اس زندگی کی نام نہاد پسندیدہ چیزوں سے پٹی پڑی ہے، ہاں اگر یہ ان سب سے پاک ہو جائے، تو پھر یہ کچھ اور ہی ہو جائے گی۔ ہاں تو جب اس طرف نظر کرو گے اُس وقت اسے اصلی حالت میں دیکھو گے اور معلوم کر سکو گے کہ اس کی ایک ہی شکل ہے یا بہت سی شکلیں اور اس کی ماہیت کیا ہے۔ موجودہ زندگی، اس کے عوارض، اور جو جو شکلیں یہ اختیار کرتی ہے، ان کی بابت میں سمجھتا ہوں کہ اب ہم کافی کہہ چکے۔

گلوکون نے جواب دیا: درست۔

میں نے کہا: اور اس طرح ہم نے دلیل کی شرائط کو پورا کر دیا۔ ہم نے انصاف کے ان انعامات اور اعزازات کو بیچ میں آنے ہی نہیں دیا جو بقول تمھارے، ہومر اور ہزیوڈ، کے یہاں مذکور ہیں بلکہ ہم نے تو نفسِ عدل کو نفسِ روح کے لیے بہترین شے ثابت کر دیا۔ چاہے کسی کے پاس جائجیس (Gyges) کی انگوٹھی ہو یا نہ ہو اسے انصاف کرنا چاہیے، اور اگر صرف جائجیس کی انگوٹھی ہی نہیں اُس کے ساتھ چھپانے کو ظلمات (ہیڈلیس:Hades) کا خود بھی ہو تب بھی (انصاف ہی کرنا چاہیے)۔

گلوکون نے کہا: نہایت درست۔

میں نے کہا: تو اب چنداں مضائقہ نہیں، گلوکون! اگر ہم، یہ بھی گنوا دیں کہ انصاف اور دوسرے محاسن، روح کے لیے جیتے جی اور مرنے کے بعد دیوتاؤں اور انسانوں سے کتنے اور کیسے کیسے انعام حاصل کرتے ہیں۔

اس نے کہا: جی، کیا مضائقہ ہے؟

میں نے کہا: اچھا تو بھائی تم نے دلیل کے دوران میں جو قرض لیا تھا وہ اب واپس کرو!

اس نے کہا: کیا، قرض کیا لیا تھا؟

میں نے کہا: یہ مفروضہ کہ منصف غیر منصف، اور غیر منصف عادل معلوم ہو۔ تمھارا خیال تھا کہ ہر چند کہ معاملے کی اصلی نوعیت دیوتاؤں اور انسانوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تاہم خالص انصاف کا خالص ناانصافی سے مقابلہ کرنے کے لیے یہ فرض کرنا ضروری تھا۔ کیوں! یاد ہے نا؟

اس نے کہا: اگر بھول جاؤں تو بہت زیادہ الزام کی بات ہوگی۔

میں نے کہا: اب کہ معاملہ فیصل ہو چکا، میں انصاف کی طرف سے مطالبہ کرتا ہوں کہ ہم انصاف کو وہ منزلت اور شہرت واپس دیں جو یہ دیوتاؤں اور انسانوں کی نظر میں رکھتا ہے اور ہم تسلیم کر چکے ہیں کہ یہ اس کا حق ہے اور چونکہ یہ بھی ظاہر ہو چکا کہ یہ اپنے سچے عاملوں کو دھوکا نہیں دیتا بلکہ ان میں واقعی حقیقت پیدا کرتا ہے لٰہذا وہ جو اس سے چھینا گیا تھا اب اسے واپس ملنا چاہیے تاکہ یہ ظاہریت کا نشانِ فتح بھی حاصل کرے جو دراصل اس کا حق ہے اور جو یہ اپنے عاملوں کو عطا بھی کرتا ہے۔

اس نے کہا: مطالبہ تو حق بجانب ہے۔

میں نے کہا: پہلی بات تو یہ۔ اور یہ اوّل چیز ہے جو آپ کو واپس کرنی ہے کہ منصف اور غیر منصف دونوں کی ماہیت دیوتاؤں کو اچھی طرح معلوم ہوتی ہے۔

اس نے کہا: تسلیم۔

میں نے کہا: اور جب یہ دونوں ان کے علم میں ہیں تو ان میں سے ایک ان کا دوست اور دوسرا ان کا دشمن ہونا چاہیے، یہ تو ہم شروع ہی سے تسلیم کرتے آئے ہیں؟

گلوکون نے کہا: بجا ہے۔

میں نے کہا: اور سمجھنا چاہیے کہ دیوتاؤں کے دوستوں کو تو ہمیشہ سب چیزیں اچھی ہی اچھی ملیں گی، سوائے ان بُری چیزوں کے جو پچھلے گناہوں کا لازمی نتیجہ ہوں۔

گلوکون نے کہا: بے شک۔

میں نے کہا: چنانچہ عادل انسان کے متعلق ہمارا تصور یہ ہونا چاہیے کہ خواہ یہ افلاس میں مبتلا ہو یا مرض میں یا اور کسی فلاکت اور مصیبت میں آخر میں چل کر ساری باتیں زندگی اور موت میں اس کی بھلائی کا باعث ہوں گی۔ کیونکہ دیوتا ہمیشہ اُس کی فکر رکھتے ہیں جو عادل بنے اور جہاں تک عملِ صالح سے تمثالِ الٰہی کا حصول ممکن ہے خدا جیسا ہونے کا آرزومند ہوتا ہے۔

اس نے کہا: جی ہاں، جو خود اس کا سا ہو اُسے تو خدا یقیناً نہیں بھولے گا۔

میں نے کہا: اور غیر منصف کے معاملے میں اس کے برعکس؟

گلوکون نے کہا: یقیناً۔

میں نے کہا: تو یہ ہیں فتح مندی کے وہ انعامات جو عادل انسان کو دیوتاؤں سے ملتے ہیں؟

گلوکون نے کہا: جی، میرا تو یہی عقیدہ ہے۔

میں نے کہا: اور انسانوں سے اسے کیا ملتا ہے؟ ذرا واقعات کو ان کی اصلی نوعیت میں دیکھو تو معلوم ہوگا کہ چالاک ناانصاف لوگوں کی مثال ان دوڑنے والوں کی سی ہے جو دوڑ کے شروع والے سرے سے دوسرے سرے تک تو خوب اچھی طرح دوڑ جاتے ہیں لیکن پھر وہاں سے واپس نہیں ہو سکتے، پہلے پہل تو خوب سرپٹ بھاگ لیتے ہیں لیکن آخر میں احمق بنتے ہیں اور فتح کا تاج لیے بغیر کندھوں پر کان ڈالے لشتم پشتم چلے آتے ہیں جو واقعی اچھا دوڑنے والا ہوتا ہے وہ آخر تک پہنچتا ہے، چنانچہ اسے انعام بھی ملتا ہے اور سر پر فتح

کا تاج بھی رکھا جاتا ہے۔ یہی حال عادل آدمی کا ہے، یہ اپنے تمام اعمال اور معاملات کو بہ جبراً اختتام تک پہنچاتا اور اس کی زندگی کے خاتمے پر سب کی زبان پر اس کی بھلائی ہوتی ہے اور یہ وہ انعام پالیتا ہے جو انسان کسی کو دے سکتے ہیں۔

گلوکون نے کہا: درست۔

میں نے کہا: اور اب مجھے اجازت دو کہ میں عادل آدمی کے ساتھ ان تمام برکتوں کو منسوب کروں جو تم خوش نصیب کے لیے بیان کررہے تھے۔ تم جو اوروں کے لیے کہتے تھے میں اب ان کے لیے کہتا ہوں یعنی جب ان کا سن ترقی کرتا ہے تو یہ اگر چاہیں تو اپنے شہر میں حاکم بن سکتے ہیں، جس سے چاہتے ہیں شادی کرتے اور جن سے چاہتے ہیں اپنی بیٹیاں بیاہتے ہیں، غرض جو جو بھی تم نے اوروں کی بابت کہا وہ اب میں سب کا سب ان کے لیے کہتا ہوں۔ اور برخلاف اس کے اب بے انصافوں کی بابت میں کہتا ہوں کہ ان میں سے اکثر چاہے جوانی میں بچ نکلیں بالآخر پکڑے ہی جاتے ہیں اور اپنے دور کے اختتام پر احمق ہی بنتے ہیں۔ پھر جب بڑھاپا آتا ہے تو اپنے پرائے، شہری اور اجنبی، سب کے ہاتھوں ان کی توہین ہوتی ہے؛ مار کھاتے ہیں اور وہ وہ دُرگت بنتی ہے کہ ان کا ذکر بقول تمھارے کانوں پر گراں ہے، طرح طرح کے عذاب ہوتے ہیں، آنکھیں جلا کر نکالی جاتی ہیں۔ بس فرض کرلو کہ میں نے تمھاری کہی ہوئی مصائب کی ساری کہانی دوہرا دی ہے۔ انھیں بیان کیے بغیر میں فرض کرسکتا ہوں نا، کہ یہ ساری باتیں صحیح ہیں؟

اس نے کہا: بے شک، آپ جو فرما رہے ہیں بالکل درست ہے۔

میں نے کہا: تو یہ ہیں وہ انعام واکرام اور تحفے جو عادل انسانوں کو موجودہ زندگی میں آدمیوں اور دیوتاؤں سے حاصل ہوتے ہیں اور یہ سب ان اچھی چیزوں کے علاوہ ہیں جو عدل وانصاف سے بذاتِ خود پیدا ہوتی ہیں۔

اس نے کہا: جی ہاں، اور یہ انعام خوب ہیں اور پائیدار بھی۔

میں نے کہا: اور پھر بھی یہ سب کچھ اس معاوضے کے مقابلے میں گنتی اور بڑائی کے اعتبار سے کوئی اصلیت نہیں رکھتے جو موت کے بعد منصف اور غیر منصف دونوں کے لیے منتظر ہے۔ اب انھیں سنو، تب جا کر کہیں وہ قرض ادا ہوگا جس کا منصف اور غیر منصف دونوں کو ہماری دلیل پر حق پہنچتا ہے۔

اس نے کہا: فرمائیے، فرمائیے۔ کم ہی چیزیں ہوں گی جنھیں میں اس شوق سے سنوں گا۔

میں نے کہا: اچھا تو میں ایک قصہ سُناؤں، ان قصوں میں سے نہیں جو اوڈیسیس (Odysseus) نے بطل السی ناؤس (Alcinous) کو سُنائے ہیں، لیکن ہاں یہ بھی ایک بطل کا قصہ ہے یعنی آرمینیس (Armenius) کے بیٹے ایر (Er) کا جو پیدائشی پامفلیا (Pamphylian) کا رہنے والا تھا۔ یہ لڑائی میں مارا گیا، اور دس دن بعد جب لوگوں نے لاشیں اُٹھائیں تو اور سب کے جسم تو سڑ چلے تھے لیکن اس کے جسم پر کوئی اثر نہ تھا، چنانچہ اس کی نعش کو دفن کرنے کے لیے گھر لے گئے۔ بارھویں دن کہ لاش چتا پر رکھی تھی یہ دوبارہ زندہ ہو گیا اور دوسرے عالم میں اس نے جو کچھ دیکھا تھا وہ لوگوں کو سُنایا۔ اس نے کہا کہ جب میری روح نے جسم کو چھوڑا تو میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ سفر پر چلا، چلتے چلتے ہم ایک مخفی مقام پر پہنچے جہاں زمین دوز دروازے تھے، یہ دونوں دروازے پاس ہی پاس تھے اور ان کے مقابل اوپر آسمان میں بھی دو دروازے تھے۔ درمیانی فضا میں حاکم اجلاس کر رہے تھے۔ جب عادل انسانوں کا معاملہ فیصل ہو چکتا اور فیصلہ ان کے سامنے باندھ دیا جاتا تو انھیں حکم ملتا تھا کہ آسمانی راستے سے سیدھے ہاتھ کی طرف چڑھ جاؤ۔ اسی طرح ناانصافوں کو اُلٹے ہاتھ کی طرف نیچے اُترنے کا حکم ہوتا تھا، ان کے اعمال کی نشانیاں بھی ساتھ ہوتی تھیں لیکن (بجائے سامنے کے) پشت پر آویزاں۔ میں جو قریب بڑھا تو مجھ سے کہا کہ تو وہ پیامبر ہے جو اس عالم کی خبر انسانوں تک لے جائے گا اور مجھے حکم ہوا کہ یہاں جو کچھ دیکھنے سُننے کی باتیں ہیں سب دیکھ سُن لوں۔ میں نے جو نظر کی تو دیکھا کہ جب ان کا فیصلہ سُنا دیا جاتا تھا تو زمین اور آسمان کے ایک ایک دروازے سے تو روحیں رخصت ہو رہی تھیں اور دوسرے دونوں دروازوں سے روحیں کچھ تو گرد آلود اور سفر سے ماندہ زمین کے اندر سے اوپر آتیں اور کچھ نہایت صاف جگمگ آسمان کے نیچے اُترتیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ سب کی سب کسی لمبے سفر سے ابھی ابھی آ رہی ہیں۔ یہ سب خوشی خوشی سبزہ زار پر جاتیں اور وہاں جا کر یوں پڑاؤ ہوتا گویا کوئی تہوار ہے۔ جو روحیں ایک دوسرے سے واقف تھیں وہ گلے ملتیں اور خوب باتیں کرتیں، زمین سے آنے والی روحیں نہایت اشتیاق سے اوپر کا حال دریافت کرتیں اور آسمان سے آنے والی روحیں نیچے کا حال، سب ایک دوسرے سے راستے کے واقعات بیان کرتیں، نیچے سے آنے والی روحیں اُن پر جو کچھ زیر زمین سفر میں گزری تھی (اور یہ سفر ہزار سال کا تھا) اس کی یاد پر روتیں اور افسوس کرتیں، اوپر سے آنے والیاں آسمانی مسرتوں اور حُسن کے ناقابلِ تصور مظاہر کا بیان کرتیں۔ سارا قصہ تو گلوکون، بڑا وقت لے گا، خلاصہ یہ کہ اس نے بیان کیا کہ انھوں نے کسی کے ساتھ جو بُرائی کی تھی اس کا دس گنا عذاب بھگتنا پڑا یعنی اگر سو سال میں ایک دفعہ بُرائی کی

تھی۔(اور انسانی عمر کا یہی اندازہ کیا گیا ہے) تو سزا دس گنی ایک ہزار سال میں پوری ہوئی، مثلاً اگر کوئی بہت سی اموات کا باعث ہوا ہو، اگر کسی نے شہروں یا لشکروں کو غلام بنایا یا انھیں دغا دیا ہو یا کسی اور بدکرداری کا مرتکب ہوا ہو تو ان تمام گناہوں کے لیے اور ایک ایک کر کے دس گنا سزا ملتی ہے۔اسی طرح احسان، عدل اور تقویٰ کا انعام بھی اسی نسبت سے ملتا ہے۔اس کے دوہرانے کی تو چنداں ضرورت نہیں جو اس نے ان چھوٹے بچوں کی بابت کہا جو پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہیں۔دیوتاؤں اور والدین کے ساتھ سعادت مندی یا غیر سعادت مندی کی بابت نیز قاتلوں کے متعلق اس نے اور بہت بڑی بڑی جزاؤں اور سزاؤں کا بیان کیا۔ یہ کہتا تھا کہ جب ایک رُوح نے دوسری سے دریافت کیا کہ ''ارڈیائیسس (Ardiacus) اعظم کہاں ہے''؟ تو میں خود وہاں موجود تھا۔(اور یہ ارڈیائیس ایر کے زمانے سے کوئی ہزار سال پہلے تھا، یہ پامفیلیا کے کسی شہر کا مستبد حاکم تھا، اپنے بوڑھے باپ اور بڑے بھائی کو اس نے قتل کر ڈالا تھا اور کہتے ہیں کہ ایسے ہی اور بہت سے نفرت انگیز گناہوں کا مرتکب تھا) دوسری روح نے جواب دیا کہ ''وہ یہاں نہیں آیا اور نہ کبھی آئے۔اور یہ منجملہ ان ہیبت ناک مناظر کے تھا جن کا ہم نے خود مشاہدہ کیا۔ہم غار کے دہانے پر تھے اور چونکہ اپنا سارا تجربہ حاصل کر چکے تھے اس لیے اب اوپر چڑھنے والے ہی تھے کہ یکا یک ارڈیائیس اور کئی دوسرے لوگ نمودار ہوئے ان میں سے اکثر جابر مستبد تھے۔اور ان ظالموں کے علاوہ اور لوگ بھی تھے جو دنیا میں بڑے بڑے مجرم رہ چکے تھے۔ان کا خیال تھا کہ یہ بس ابھی عالم بالا کو واپس جاتے ہیں لیکن بجائے اس کے کہ دہانے میں یہ داخل ہو سکیں، جب ان میں سے کوئی جس کی کافی سزا نہیں ہو چکی تھی چڑھنے کی کوشش کرتا اس سے ایک سخت چیخ نکلتی۔اس پر کچھ مہیب آتشیں رُوانسان جو پاس کھڑے اس آواز کو سُنتے تھے انھیں پکڑ کر ساتھ لے جاتے ارڈیائیس اور بعض دوسروں کو تو انھوں نے سر پیر ہاتھ سب باندھ کر نیچے پھینک دیا، پھر راستے بھر انھیں خوب گھسیٹا، انھیں کانٹوں پر اُون کی طرح دُھنکا اور راہ چلتے لوگوں سے برابر کہتے جاتے تھے کہ انھوں نے یہ یہ جُرم کیے تھے اور ہم پھر انھیں جہنم میں ڈالنے لیے جاتے ہیں۔ہم نے جو بہت سی صعوبتیں اٹھائی ہیں ان میں کوئی مصیبت اس گھڑی سے کٹھن نہ تھی جب ہم یہ سوچتے تھے کہ کہیں ہمارے لیے بھی یہ آواز نہ نکلے، لیکن جب خاموشی رہی تو ہم ایک ایک کر کے خوشی خوشی اوپر چڑھ آئے'' بقول ایر یہ تو تھے وہاں کے بدلے اور سزائیں اور پھر انعام اور برکتیں بھی ایسی ہی تھیں۔

یہ روحیں سات دن تک اسی سبزہ زار میں ٹھہری رہیں، آٹھویں دن انھیں حکم ملا کر پھر سفر شروع

کریں۔ چوتھے دن یہ ایک جگہ پہنچیں جہاں سے روشنی کی کرن دکھائی دیتی تھی، سیدھی جیسے ستون، آسمان زمین کے آر پار، رنگ میں دھنک سے مشابہ، لیکن پاکیزہ اور روشن تر، ایک دن بھر اور چل کر اس جگہ پہنچ گئے۔ یہاں اس روشنی میں انھوں نے آسمانی زنجیروں کے سرے دیکھے جو اُوپر سے لٹکی ہوئی تھیں۔ یہ روشنی آسمان کی پیٹی ہے اور سارے کرۂ عالم کو اس طرح یکجا کیے ہوئے ہے جیسے تپنکھے جہاز کی نیچے کی کڑیاں، زنجیر کے ان سروں پر جبر ولزوم کا تکلا لٹکا ہوا ہے اور اسی پر سارے چکر ہوتے ہیں۔ اس تکلے کی جھڑ اور قلابے فولاد کے ہیں اور پھرکی کچھ فولاد کی اور کچھ اور دوسرے مسالے کی۔ پھرکی کی شکل وہی ہے جیسی یہاں دنیا میں عام رواج ہے۔ ایر نے اس کا جو بیان دیا اس سے پتا چلتا تھا کہ ایک بڑی سی پھرکی ہے جسے اندر سے بالکل کھوکھلا کر دیا ہے۔ اس کے اندر اس سے ایک ذرا چھوٹی پھرکی بٹھا دی ہے، اس کے اندر ایک اور، پھر ایک اور اسی طرح چار اور، اور الغرض کل آٹھ پھرکیاں ہیں ایسے جیسے ایک برتن کے اندر دوسرا برتن رکھ دیا ہو۔ اوپر کی طرف تو ان پھرکیوں کے سرے دکھائی دیتے ہیں لیکن نیچے سب کے سب مل کر ایک پھرکی بناتے ہیں۔ اس کے اندر سے تکلا گزرتا ہے اور آٹھویں پھرکی کو بیچ میں سے چھیدتا ہے۔ پہلی پھرکی جو سب سے باہر ہے اس کا کنارہ بھی سب میں بڑا ہے، دوسروں کے کنارے اس ترتیب سے چھوٹے ہیں۔ بڑائی میں چھٹی کا نمبر پہلی کے بعد ہے، چھٹی کے بعد چوتھی کا؛ اس کے بعد آٹھویں، پانچواں نمبر ساتویں کا اور چھٹا نمبر پانچویں کا ہے، تیسری ساتویں نمبر پر ہے اور دوسری سب سے آخر یعنی آٹھویں نمبر پر۔ سب سے بڑی پھرکی (یعنی ثوابت) نہایت مرصع ہے۔ ساتویں (سورج) روشن ترین ہے۔ آٹھویں (چاند) ساتویں کی روشنی کے عکس سے رنگ حاصل کرتی ہے، دوسری اور پانچویں (زحل اور عطارد) رنگ میں ایک دوسرے سے مشابہ ہیں، ہاں اوروں کے مقابلے میں ذرا پیلے ہیں؛ تیسرے کی (زہرہ) روشنی سب میں سفید ہے؛ چوتھی (مریخ) کچھ سُرخی مائل اور چھٹی (مشتری) سفیدی میں دوسرے نمبر پر ہے۔ اچھا سارے تکلے کی تو ایک ہی حرکت ہے لیکن جب یہ کُل ایک طرف حرکت کرتا ہے تو اندر کے سات چکر سمتِ مخالف میں آہستہ آہستہ چلنے لگتے ہیں، ان میں آٹھواں سب سے تیز چلتا ہے، اس کے بعد تیزی کے اعتبار سے ساتویں، چھٹے اور پانچویں کا نمبر ہے اور سب کے سب ساتھ ساتھ حرکت کرتے ہیں؛ پھر حرکتِ قہقری کے اس قانون کے ماتحت تیزی کے اعتبار سے تیسرے نمبر پر چوتھا چکر آتا تھا، چوتھے نمبر پر تیسرا اور پانچویں پر دوسرا۔ تکلا جبر ولزوم کے گھٹنوں پر گھومتا ہے، ہر چکر کے اوپر ایک مغنیہ ہے جو ساتھ ساتھ چکر کھاتی اور ایک ہی انداز سے ایک سُر گائے جاتی ہے۔ آٹھوں مل کر ایک متناسب نغمہ مرتب کر لیتی ہیں،

ان کے چاروں طرف برابر برابر فصل سے تین کا ایک اور گروہ ہے، یہ اپنے اپنے تخت پر بیٹھی ہیں۔ یہ ہیں جبر ولزوم کی بیٹیاں، قضاو قدر کی دیویاں یہ سفید لباس زیب تن کیے ہیں، سر پر ہر ایک کے ایک ایک ہار ہے۔ لاچے سس (Lachesis)، کلوتھو (Clotho) اور ایٹروپوس (Atropos) ان کے نام ہیں۔ یہ اپنی آواز سے مغنیہ کی موسیقی کا ساتھ دیتی ہیں۔ لاچے سس ماضی کا ترانہ گاتی ہے، کلوتھو، حال کا اور ایٹروپوس استقبال (مستقبل) کا۔ کلوتھو اپنے سیدھے ہاتھ سے کبھی کبھی تکلے کے باہر والے چکر کو ذرا گھما دیتی ہے۔ اٹروپوس اُلٹے ہاتھ سے اندرونی چکروں کو چھو کر ان کی رفتار سادھتی ہے، اور لاچے سس باری باری دونوں کو چھوتی رہتی ہے۔ کبھی ایک ہاتھ سے، کبھی دوسرے سے۔

ایر اور دوسری روحیں جب یہاں پہنچیں تو ان کا فرض تھا کہ سب سے پہلے لاچے سس کے پاس جائیں۔ لیکن اس سے پہلے ایک پیغمبر نمودار ہوا جس نے ان سب کو ایک نظام سے مرتب کیا، پھر لاچے سس کے قدموں پر سے قسمتیں اور زندگی کے مختلف نمونے لے کر یہ ایک اونچے منبر پر چڑھ گیا اور انھیں یوں مخاطب کیا: ''سنو! جبر ولزوم کی بیٹی لاچے سس کا پیغام سنو! فانی روحو! زندگی اور موت کا ایک اور دور دیکھو۔ تمھارا فرشتہ تمھیں دیا نہ جائے گا بلکہ تم خود اپنے اپنے فرشتے کا انتخاب کروگے جو پہلی چٹھی اٹھائے گا اسی کو پہلا حقِ انتخاب ہوگا، پھر یہ جو زندگی چُنے گا وہی اس کی قسمت ہو جائے گی۔ نیکی آزاد ہے اور بے آقا؛ جو اس کی جتنی عزت یا جتنی ذلت کرے گا اتنی ہی زیادہ یا کم اُسے ملے گی؛ ذمہ داری انتخاب کرنے والے پر ہے اور خدا بری الذمہ''

ترجمان نے یہ کہہ کر بلا امتیاز ان میں چٹھیاں پھیلا دیں، جو چٹھی جس کے قریب تھی وہ اس نے اُٹھالی، اس طرح سوائے ایر کے سب نے اُٹھائیں (اسے اجازت نہ تھی) اور ہر ایک نے دیکھا کہ اسے کون سا عدد ملا ہے۔ اب ترجمان نے ان کے سامنے زمین پر زندگی کے نمونے رکھ دیے۔ جتنی روحیں وہاں موجود تھیں ان سے کہیں زیادہ زندگیوں کے نمونے تھے، اور پھر طرح طرح کے۔ ہر طرح کے جانوروں کی زندگیاں تھیں، اور ہر حالت کے انسانوں کی؛ ظالم استبدادی زندگیاں بھی تھیں، بعض ایسی کہ ظالم کی عمر بھر بلکہ اس سے زیادہ باقی رہیں، بعض ایسی کہ بیچ ہی میں منقطع ہو جاتیں اور خاتمہ افلاس، دریوزہ گری اور جلاوطنی میں ہو۔ پھر سورماؤں کی زندگیاں تھیں، ایسے لوگوں کی جو اپنی شکل صورت اور حسن نیز طاقت اور کھیلوں میں کامیابی کے لیے مشہور تھے، بعض ایسوں کی جو حسب اور نسب اور اجداد کی خوبیوں کے باعث ممتاز تھے، کچھ زندگیاں ایسے افراد کی بھی تھیں جو اُن سے بالکل برعکس صفات کے باعث بدنام تھیں۔ عورتوں کی زندگیاں بھی تھیں؛ لیکن ان روحوں کی

سیرت متعین نہ تھی، کیونکہ جب روح نئی زندگی اختیار کرتی ہے تو لازم ہے وہ بالکل بدل جائے۔ لیکن اور ساری صفتیں موجود تھیں؛ سب کی سب ایک دوسرے میں گڈمڈ، دولت اور افلاس؛ صحت اور مرض کے عناصر کی بھی آمیزش تھی؛ علاوہ بریں دوسری ذلیل کیفیتیں بھی موجود تھیں۔ میرے عزیز گلوکون! یہاں ہے حیاتِ انسانی کا خطرہ عظیم اور یہیں حد درجہ احتیاط درکار ہے۔ ہر ایک کو چاہیے کہ اور تمام علم کو بالائے طاق رکھ کر بس اس ایک چیز کی طلب وجستجو میں لگ جائے۔ کیا عجب کہ ہم نیک وبد میں تمیز کرنا سیکھ جائیں یا ہمیں کوئی شخص مل جائے جو یہ چیز سکھا سکے، تاکہ جب بھی اور جہاں کہیں موقع ملے ہم بہتر زندگی منتخب کر سکیں۔ اس کے اسباب پر دھیان رکھنا چاہیے کہ یہ جو چیزیں ہم نے اوپر بیان کیں ان میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ اور پھر سب مل کر نیکی پر کیا اثر ڈالتی ہیں؛ اسے جاننا ہوگا کہ کسی خاص روح میں اگر صورت کے حُسن کو دولت سے یا افلاس سے ملا دیں تو اس کا کیا اثر ہوگا اچھے یا بُرے حسب نسب؛ خانگی یا سرکاری عہدے، طاقت یا کمزوری، چالاکی اور کند ذہنی، روح کی ساری فطری اور کسبی صفتیں اور ان کے باہمی عمل، ان سب کے اچھے بُرے نتائج سے اُسے آگاہ ہونا چاہیے۔ تب کہیں یہ روح کی ماہیت کو دیکھ کر اور ان تمام باتوں پر نظر کر کے بتا سکے گا کہ کون سی زندگی بہتر ہے کون سی نہیں۔ اور اس طرح انتخاب کرے گا کہ جو زندگی روح کو زیادہ ناانصاف بنائے وہ بُری اور جو اُسے زیادہ منصف بنائے وہ اچھی۔ باقی دوسری باتوں کو یہ بالکل نظر انداز کر دے گا۔ ہم دیکھ ہی چکے ہیں کہ زندگی اور موت دونوں میں یہی بہتر انتخاب ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اپنے ساتھ عالمِ زیریں میں بھی حق اور صداقت پر ایسا ایمان ساتھ لے جائے جو کبھی نہ ڈگمگائے، تاکہ وہاں بھی دولت کی آرزو اور باطل کے فریب اس کی نگاہ کو خیرہ نہ کر سکیں، اور یہ نہ ہو کہ ظلم اور استبداد اور دوسری بداطواری کی زندگیوں کو دیکھ کر یہ دوسروں کو ناقابلِ تلافی اذیت پہنچائے اور خود اپنی ذات کو اس سے بھی بڑی مضرت دینے کا باعث بنے۔ اسے جاننا چاہیے کہ اسی زندگی میں نہیں بلکہ اس کے بعد کے تمام مراحل میں بھی یہ جہاں تک بن پڑے دونوں طرف کے انتہائی سروں کو چھوڑ کر درمیانی راہ کس طرح اپنے لیے منتخب کرے کہ یہی سعادت وشادمانی کی راہ ہے۔

دوسرے عالم کے اس خبر دینے والے نے پھر بیان کیا کہ اس موقع پر اس پیغمبر نے یہ اور کہا ''بالکل آخر میں آنے والے کے لیے بھی اگر وہ سمجھ بوجھ کر انتخاب کرے اور محنت سے زندگی گزارے تو ایک مسرت بخش اور خاصی پسندیدہ زندگی مقرر ہے جو سب سے پہلے انتخاب کرتا ہے یہ نہ ہو کہ وہ بے پروا ہو جائے اور جو سب سے آخر میں ہے اسے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں''۔ یہ جب کہہ چکا تو جسے سب سے پہلا

حق انتخاب ملا تھا وہ آگے بڑھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے سب سے بڑے ظلم اور استبداد کو اپنے لیے مان لیا۔ اس کا دماغ چونکہ حماقت اور حرص سے تاریک ہو چکا تھا اس نے چناؤ سے پہلے سارے معاملے پر غور نہیں کیا اور پہلی نظر میں یہ بات اسے نہ بھائی دی کہ منجملہ دیگر برائیوں کے اس کی قسمت میں یہ بھی لکھا تھا کہ یہ اپنی اولاد کو خود نگل جائے گا۔ لیکن جب ذرا غور کرنے کا موقع ملا اور اس نے دیکھا کہ اس کی قسمت میں کیا کیا آیا تو لگا چھاتی پیٹنے اور اپنے انتخاب پر رونے دھونے اور پیغمبر کے سابقہ اعلان کو بھول گیا اور بجائے اس کے کہ اپنی بدنصیبی کا الزام خود اپنے آپ کو دے، لگا بخت و اتفاق اور دیوتاؤں کو ذمہ دار ٹھہرانے۔ غرض ہر ایک ملزم تھا، بس یہی ایک بے قصور۔ سنو! یہ ان لوگوں میں سے تھا جو آسمان سے آئے تھے، سابقہ زندگی میں یہ ایک نہایت عمدہ منتظم ریاست میں رہ چکا تھا، لیکن اس کی نیکی خالی عادت پر مبنی تھی، اس کے پاس کوئی فلسفہ نہ تھا۔ یہی حال اوروں کا تھا جن پر اسی قسم کی افتاد پڑی یعنی ان میں سے اکثر آسمان سے آئے تھے، امتحان و آزمائش سے ان کی تعلیم نہیں ہوئی تھی۔ ہاں زمین سے آنے والے چونکہ تکلیفیں جھیل چکے تھے، اور دوسروں کو تکلیفیں اُٹھاتے بھی دیکھ چکے تھے اس لیے انھیں انتخاب کرنے میں جلدی نہیں تھی۔ کچھ تو اس ناتجربہ کاری کے باعث کچھ اس سبب سے کہ چٹھیوں کا نکلنا کچھ اتفاق پر منحصر تھا، بہت سی روحوں نے بُری کے بدلے اچھی اور بہت سے لوگوں نے اچھی کے بجائے بُری قسمت پائی۔ ہمارے قاصد کا بیان ہے کہ اگر اس دنیا میں آنے کے بعد انسان اپنے آپ کو تمام تر سچے فلسفے کے لیے وقف کر دے اور پھر چٹھی نکلنے کے معاملے میں بھی معمولی سا خوش قسمت ہو تو وہ یہاں خوش رہے اور دوسری زندگی میں اس کا سفر اور پھر وہاں سے دوبارہ واپسی دشوار گزار اور زیر زمین راستوں سے نہ ہو بلکہ نہایت ہموار آسمانی راہوں سے۔ یہ کہتا تھا کہ یہ منظر بھی نہایت حیرت خیز اور عجیب تھا ایک ہنسی تھی ایک دکھ۔ اکثر روحوں کا انتخاب پچھلی زندگی کے تجربوں پر مبنی تھا۔ مثلاً اس نے یہاں وہ روح دیکھی جو کبھی آرفیئس (Orpheus) تھی، اسے چونکہ عورتوں نے قتل کیا تھا اس لیے یہ عورت کے پیٹ سے پیدا ہونے کے خیال سے بھی نفرت کرتا تھا اور عورتوں کی ساری نسل سے اس عداوت کے باعث اس نے ہنس کی زندگی انتخاب کی۔ اس نے تھیمائرس (Thamyras) کی رُوح کو بھی بلبل کی زندگی منتخب کرتے دیکھا۔ برخلاف اس کے چڑیاں مثلاً ہنس اور دوسرے گانے والے پرند انسان بننا چاہتے تھے۔ جس روح کو بیسواں عدد ملا تھا اس نے شیر کی زندگی پسند کی، یہ اجیکس بن ٹیلامون (Telamon) کی روح تھی جو اس لیے انسان بننا نہیں چاہتی تھی کہ ہتھیاروں کے معاملے میں اس کے ساتھ ناانصافی کی گئی تھی۔ اس کے بعد آگا میمنون کی باری تھی، اس

نے عقاب کی زندگی اختیار کی، کیونکہ اجاکس کی طرح اپنی مصیبتوں کا خیال کر کے یہ بھی انسانی فطرت سے نفرت کرتا تھا۔ تقریباً بیچ میں اٹلانٹا (Atalanta) کا نمبر آیا؛ اس نے ایک کھلاڑی پہلوان کی شہرت جو دیکھی تو اس لالچ کا مقابلہ نہ کر سکی؛ اس کے بعد پنوپیس (Panopeus) کے بیٹے اپیئس (Epeus) نے ایک مکار حرافہ عورت کی زندگی اختیار کی؛ آخر میں انتخاب کرنے والوں میں کہیں دور کو مسخرہ تھرسیٹیس (Thersites) بھی تھا، اس نے بندر کی شکل قبول کی۔ اب اوڈیسیس کی روح آئی کہ اس کا نمبر آخری تھا اور اسے ابھی اپنے لیے انتخاب کرنا تھا۔ پچھلی مشقتوں کی یاد نے اس کے حوصلے کو پست کر دیا تھا، یہ بڑی دیر تک ادھر اُدھر ایک خانگی آدمی کی زندگی ڈھونڈتا پھرا جسے کوئی غم اور فکر نہ ہو۔ اس کے ملنے میں ذرا دشواری ہوئی، یہ کہیں ایک طرف کو پڑی تھی اور سب لوگوں نے اس کا ذرا خیال نہ کیا تھا۔ یہ جو اس زندگی کو دیکھ پایا تو بولا کہ اگر مجھے بجائے آخر کی جگہ انتخاب کا پہلا حق ملتا تو بھی میں اسی زندگی کو منتخب کرتا، اور اسے پا کر وہ واقعی بڑا خوش تھا۔ یہی نہیں کہ آدمی ہی جانوروں کی زندگیاں اختیار کرتے تھے، میں یہ بھی ضرور کہہ دوں کہ جنگلی اور پالتو جانور آپس میں بھی اپنی زندگیاں بدل رہے تھے اور اپنی طبیعت کی مناسبت سے انسانی زندگیاں بھی اختیار کرتے تھے، مثلاً اچھے نرم مزاج بھلے مانسوں کی زندگی اور بُرے وحشیوں کی، غرض طرح طرح اور ہر ممکن طریقے سے۔ اب جب سب روحیں اپنی اپنی زندگی منتخب کر چکیں انتخاب کی ترتیب سے لاچے سس کے سامنے پہنچیں، اس نے ان کے ساتھ وہ فرشتہ کر دیا جو ہر ایک نے منتخب کیا تھا، تاکہ یہ ان کی زندگی کا نگہبان رہے اور ان کے انتخاب کو پورا کرے۔ یہ فرشتہ پہلے تو انھیں کلوتھو کے روبرو لے گیا اور یہ اپنے ہاتھ سے جس تکلے کو چلا رہی تھی اس میں رکھ کر انھیں چکر دیا اور اس طرح گویا ہر ایک کی قسمت کی تصدیق ہو گئی۔ پھر خود تکلے کو چھو کر یہ انھیں ایٹروپوس کے پاس لے گیا جو (قسمت کے) ڈورے کات رہی تھی تاکہ یہ ناقابلِ تغیر ہو جائے۔ یہاں سے یہ بے منھ پھیرے جبر ولزوم کے تخت کے تلے سے گزرے، جب سب اس کے نیچے سے نکل لیے تو خود فراموشی کے جلتے تپتے میدان میں پہنچے، یہ ایک چٹیل میدان تھا جس میں نہ درخت کا پتا تھا نہ سبزے کا نام ونشان۔ شام ہوتے ہوتے دریائے تغافل کے کنارے پڑاؤ کیا۔ اس دریا کا پانی کسی برتن میں نہ سماتا تھا، ہر ایک کو مجبور کیا گیا کہ اس میں سے تھوڑا تھوڑا پانی پیئں، جنھیں عقل نے نہیں سنبھالا، وہ ضرورت سے زیادہ پی گئے۔ اس کے پیتے ہی سب کے سب ساری باتیں بھول گئے۔ پھر سب پڑے سوتے تھے کہ آدھی رات کو برق وباد کا طوفان اور زلزلہ شروع ہوا اور جیسے ٹوٹے ہوئے تارے ادھر ادھر ہو جاتے ہیں یہ بھی دیکھتے دیکھتے مختلف راستوں سے

اپنی جائے ولادت تک پہنچا دیے گئے۔ ہمارے قاصد کو یہ پانی البتہ نہیں پینے دیا۔ لیکن یہ کیونکر اور کس طرح پھر جسم میں واپس آیا اور اس کا خود اسے پتا نہیں؛ صبح جو یک بیک آنکھ کھلی تو دیکھا کہ تابوت پر لیٹا ہے۔

اور یوں، میاں گلوکون یہ قصہ باقی رہ گیا فنا نہیں ہوا۔ اب اگر ہم بھی قول کے تابع رہیں تو یہ ہمیں بھی بچالے اور ہم اطمینان سے اپنی روح کو آلودہ کیے بغیر تغافل کے دریا میں سے گزر جائیں۔ لہٰذا میرا مشورہ ہے کہ ہم ہمیشہ اس آسمانی راہ پر ثابت قدم رہیں، ہمیشہ عدل اور خیر کا تتبع کریں، اور یقین رکھیں کہ روح غیر فانی ہے اور ہر طرح کی اچھائی نیز ہر طرح کی بُرائی برداشت کر سکتی ہے۔ یوں ہم ایک دوسرے کی نظر میں بھی عزیز اور محترم رہیں گے اور دیوتاؤں کی نگاہ میں بھی، جب تک یہاں ہیں تو یہاں اور اس وقت بھی جب انعام لینے کے لیے ہم اُن کھیلوں میں بازی جیتنے والوں کی طرح جائیں گے جو تحفے وصول کرنے کے لیے چکر لگاتے ہیں۔ اس سے اس زندگی میں بھی ہمارا بھلا ہوگا اور اس ہزار سالہ سفر میں بھی جسے ہم ابھی بیان کر رہے تھے۔

ادارۂ فروغِ قومی زبان
۲۰۲۲ء